

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سُورَةُ الرُّومِ ، سُورَةُ الْقَمَنِ ، سُورَةُ السَّجْدَةِ

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب مطالب القرآن فی دروس الفرقان۔ سورۃ الاحزاب۔ سورۃ سبا۔ سورۃ فاطر
دروس از: جناب غلام احمد پرویز
ناشر بزم طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام ادارہ طلوع اسلام 25 بی 2 گلبرگ، لاہور
ایڈیشن اول فون نمبر 5714546-5753666
 نومبر 2009ء

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآن فی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

مطبع باقر پرنٹنگ پریس، لاہور

سرٹیفیکیٹ تصحیح

الانساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب میں کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قدیل آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلب نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شام جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطربیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہیں منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محراب کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغام محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں ادھر ادھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقام محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ و تابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستارے گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے، یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے، یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیر کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں، یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے، یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے، یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے، یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے، یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی، یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست

رحمۃ للعالمین انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیِ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ و رپکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر

بحق، دل بند و راہِ مصطفیٰ رو

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے انکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ”اسوۂ حسنہ“ قرار دیا ہے۔ اس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رہبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو
آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام
خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

مجھے اپنے فہم قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ
نہیں ہو سکتا کہ وہ سہو و خطا سے منزہ ہے۔ یہ
قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر
انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا
امکان ہے۔ لہذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ
کو صحیح نظر آئے وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔۔ معراجِ انسانیت)



فہرست مشمولات سورۃ الروم

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

خدا تعالیٰ کے وعدہ سے مراد خدا کا غیر متبدل قانون ہوتا ہے
مستقل کامیابی کا انحصار مادی اسباب کے ساتھ ساتھ
انسان کی نفسیاتی تبدیلی پر منحصر ہوتا ہے
جب انسان کی نفسیات خدا کے قانون کی ترجمان
بن جائے تو پھر ہر مزان بھی شکست کھا جاتا ہے
دین اسلام میں مال غنیمت کی کیفیت اور صحابہ کرام ﷺ کا کردار
جیسا سربراہ حکومت ویسی ہی قوم
نصرت کا حصول کس طرح ممکن ہوتا ہے؟
جواب دہی کے عمل سے لاطعلقی کا تصور انسان کی
ابدی زندگی کے لیے پیغام موت ہے
قرآن تاریخ کے اوراق اور اجڑی ہوئی بستیوں کے
کھنڈرات بطور شہادت پیش کرتا ہے
اگر پانی کشتی پر غالب آ جائے تو پھر وہ ڈوب جاتی ہے
جنتی اور جہنمی معاشرے کا بنیادی فرق: طبقاتی انداز سے
ناہمواریاں پیدا کرنا ہے
قرآن حکیم نے اپنے ہاں محنت کے معاوضہ کے بجائے

پہلا باب: سورۃ الروم (آیات 1 تا 16)

روزوں کا مقصد نیا انسانیت میں خدا کی کبریائی
کو قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہے
میدان بدر میں خدا کی کبریائی کے قیام کے لیے پہلا معرکہ
قرآن حکیم میں ایران اور روم کی مملکتوں کا ذکر اور ان کا تاریخی بیان
ایرانی اور بازنطینی حکومتوں کی 602 عیسوی سے
612 یا 614 عیسوی تک باہمی جنگ و جدل کی روئداد
قرآن حکیم کے نزدیک معاشرتی طور پر اہل کتاب
اور مشرکین میں پائے جانے والے فرق کی نوعیت
سورۃ الروم کو ان تاریخی واقعات کی روشنی میں
دیکھنا یا سمجھنا زیادہ مفید ہے
روم اور ایرانیوں کے متعلق قرآن حکیم کا بیان
جنگ بدر کے بعد خود مشرکین قریش کے الم انگیز ماتم کی کیفیت
قرآن حکیم کے غلط تراجم نے ہماری سوچ کا رخ ہی بدل دیا
ذات خداوندی اگر غلبے اور قوت کی مالک ہے
تو اس میں بھی صفت رحیمی کا ہی ظہور ہوتا ہے

ہندوؤں کے ہاں فنون لطیفہ کی شکل و صورت
اسلام کے برعکس سیکولرزم میں صرف مادی طور پر ہی
افادیت پہلو کو پیش نظر رکھا جاتا ہے
اہل مغرب کی ساری تاریخ کا نچوڑ یہ ہے کہ پھولوں میں
رنگ تو ہے مگر خوشبو نہیں ہے
قرآن حکیم کے نزدیک کائناتی امتزاج کا ذکر کثیر
زندگی کے متعلق قرآنی حقائق کی بیان کردہ علامات کو
سمجھنے کے لیے تغیرات کا سمجھنا نہایت ہی اہم ہے
تغیرات کے اس عمل میں بڑے بڑے رموز مضمحل ہوتے ہیں
قرآن حکیم نے قوموں کی موت و حیات کے بھی
پیمانے متعین کر رکھے ہیں
قدیل آسمانی انسانی زندگی کے تاریک راستوں کو
منور کرنے کے لیے ہی عطا کی گئی ہے
صراطِ مستقیم ”ضالین“ کی راہنمائی کے لیے ہی عطا ہوا تھا
انسان کی اپنی تخلیق بذاتِ خود ایک قابلِ غور امر ہے
آدم کی پسلی سے حوا کے پیدا کرنے کی یہ کہانی
تورات کی بیان کردہ ہے قرآن کی نہیں
مرد اور عورت باہمی طور پر ایک دوسرے کے زوج ہیں
لفظ مودۃ کا قرآنی مفہوم
قرآن حکیم نے اپنی ہر وہ بات جو سمجھانی ہو وہ اسے اپنی نشانی کہتا ہے
قوموں کی ارتقائی کیفیت کو جاننے یا ماننے کا طریق

اس کے ماحصل کا تصور پیش کیا ہے
خدا تعالیٰ اپنے کسی قانون کے رخ کو کسی دوسری طرف نہیں بدلتا
اقدارِ خداوندی کے تابع عالمِ انسانیت ایک تندرست
اور صالح بیج کی مانند شو و نما پاتی ہے
لفظ مجرم کا قرآنی مفہوم اور اپنی داستانِ غم
عربوں کے ہاں جنت کا تصور اور قرآن حکیم کا بیان
فنونِ لطیفہ میں موسیقی جیسی نعمت بھی جنت کا خاصہ ہوگی
کائناتی اشیاء جو اقدارِ خداوندی کے تابع ہوں
وہ زندگی کا حسن پیش کرتی ہیں

دوسرا باب: سورة الروم (آیات 17 تا 24)

ہمارے ہاں قرآنی تراجم نے قرآن حکیم کی تعلیم کو
محدود سے محدود تر کر دیا ہے
رزق کی فراوانی سے معمور خوف و حزن سے پاک
اور ذوقِ جمالیات سے سرشار زندگی بندہ مومن کی میراث ہے
ذوقِ جمالیات سے لطف اندوز ہونے والی چشمِ بینا کی کیفیت
قرآن حکیم کی دفتنین کے ایک ایک ورق پر ذوقِ جمالیات
کے مناظر بکھرے دیکھائی دیتے ہیں
عہدِ مغلیہ کے دورِ زوال نے ابھرے ہوئے
فنونِ لطیفہ کے خوبصورت چہرے کو مسخ کر دیا
فنونِ لطیفہ میں علامہ اقبالؒ کا مقام بدرجہ اتم بلند تھا
عیسائیت کے ہاں تمدنی و سیاسی زندگی کے لیے کوئی مستقل اقدار نہیں

چودہ سو سال قبل بھی عربوں کی زبان دانی دنیا بھر میں بے مثل تھی

قرآن حکیم کے نزدیک لفظ علماء کی تعریف

اس کائنات کا ایک ایک ذرہ الفاظ کی شکل میں ملنے

والے قرآن کی ہی ایک تفسیر ہے

کائنات میں ہر آن ایک تغیر واقع ہو رہا ہوتا ہے

کائنات کا حسن اسی تغیر کا ہی رہن منت ہے

تیسرا باب: سورة الروم (آیات 25 تا 27)

مذہب اپنے تباہ کن نتائج پر غور و فکر کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا

ذہنی سکون تو ہر مذہب کا پیروکار اپنے اپنے طریق سے حاصل کر لیتا ہے

قرآن حکیم دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جو بغیر سوچے

سمجھے دن رات پڑھی جاتی ہے

دین پر عمل پیرائی کا نتیجہ تو ہمیشہ محسوس شکل میں سامنے آتا ہے

دعا کے قبول ہونے کی عملی شکل

کسان کی اگر فصل نہ اُگے تو پھر ثواب بھی نہیں ہوتا

قرآن حکیم کا تین چوتھائی حصہ مظاہر فطرت کی حقانیت پر مبنی ہے

قرآن حکیم کو پڑھنے کے سلسلہ میں حافظہ اسلم جبراجپوری

کا ایک سبق آموز طریق

قرآن فہمی کے سلسلہ میں اہل مغرب کے سائنسدان

ہم مسلمانوں کے بالمقابل زیادہ فعال ثابت ہوئے ہیں

ارض و سما کی وسعتوں کے پیش نظر اس کی ہیئت پر غور و فکر کی تاکید

اربوں کی تعداد میں پائے جانے والے گزروں کا

باہمی ربط بڑے ہی غور و فکر کا متقاضی ہے

آسمانی گزروں کی طرح عربی زبان کا دامن بھی بڑا ہی وسیع ہے

امیر المؤمنین اور امر کے لفظ کا قرآن فی مفہوم

اس کائنات میں فطرت یا نیچر کے قوانین کسی انسان

کے بنائے ہوئے ہیں ہی نہیں

کائنات کا تو ذرہ ذرہ ہر آن خدا تعالیٰ کی نظر میں مصروف عمل ہے

قانون خداوندی کی حکمیت اور باخبری کے سلسلہ میں

چاند پر جانے والوں کی مثال

Cause And Effect (علت و معلول) کی

بنیاد پر قانون کی اہمیت اور اس کو نافذ کرنے والی قوت کا وجود

زندگی کی مثال ایک جوئے رواں کی سی ہے جو موت سے آشنا نہیں

قبروں سے اٹھ کھڑے ہونے کی حقیقت

خدا کی طرف سے آواز آنے کا مفہوم

ارض و سماوات قرآن حکیم کی دو اصطلاحات ہیں

ورنہ نہ کوئی چیز نیچے ہے اور نہ کوئی اوپر

قدرت نے تو فضا کے اندر پھیلے ہوئے گزروں میں بھی

تنفس پھیلا رکھے ہیں

کائنات کو مسخر کرنے کے سلسلہ میں ہماری ذہنی

پستی کی حالت زار اور قرآن حکیم کا ارشاد

اس قدر عظیم کارگہ کائنات کو پیدا کرنے اور اسے

اس قدر خوبی سے چلانے کا مقصد کیا ہے؟

فطرت کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ کسی شکل میں بدلتی ہی نہیں
 انسانی فطرت کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ایک تجربہ
 انسانی فطرت کا تصور پیدا کرنے میں فلاسفوں کا کردار
 ہندوستان میں انسانی فطرت کا یہ غلط تصور یونان سے آیا
 اور گہرے مضمرات رکھتا ہے
 انسانی فطرت کا تصور قرآن حکیم کی تعلیم ہی کے خلاف ہے
 جہاں فطرت ہوتی ہے وہاں اختیار و ارادہ نہیں ہوتا
 فطرت رکھنے والی کسی شے کی طرف کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا
 انسانوں کو غلام بنانے کے تصور کے بعد نظام سرمایہ داری
 کا حربہ اور اس کے اثرات
 لفظ ”فطر“ کا قرآنی مفہوم
 انسانی کاوش کا تعلق ”فطر“ سے نہیں خلق سے ہے
 ذاتِ خداوندی نے خود کو احسن الخالقین تو کہا ہے
 لیکن احسن الفاطرین نہیں کہا۔ کیوں؟
 انسانی فطرت کے مروجہ تصور سے قرآن حکیم کی
 ساری تعلیم بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے
 انسان کی فطرت کے مطابق خدا کی فطرت کا تصور
 وحی کی تعلیم کے بغیر انسان کی حالت زار
 آج انسانی زندگی نے اپنی ارتقائی منزل کے لیے
 اس مادی جسم کا سہارا حاصل کر رکھا ہے
 انسان کے لیے خدا کی طرف سے ارادہ و اختیار کا عظیم تحفہ

آج کے دور میں تہذیب مغرب کی سوچ کا حاصل
 خدا جو اس کائنات کا خالق ہے اس نے اس کو بے سود پیدا نہیں کیا
 لفظ قانت کے مفہوم کے تحت انسان کی عملی زندگی
 پر پڑنے والے لازوال اثرات
 کائنات کا ذرہ ذرہ قانت ہونے کے باعث
 اسی سنہری اصول پر کار بند ہے
 وحی خداوندی کی روشنی میں انسانی معاشرے میں ایک ایسی
 بہار نو آئے گی کہ اس کا کونہ کونہ نغموں کی آواز سے
 گونج اٹھے گا اور پھر فرشتے تم پر درود بھیجیں گے
 خدا بھی فرشتوں کے سامنے سر اٹھا کے بات کرے گا
 تخلیق کے بالمقابل خدا کا عالم امر ارتقا کا رہن منت نہیں ہوتا
 تخلیق کے مختلف مراحل
 ذاتِ خداوندی کو اس عظیم تیراگیز کا رگہ کائنات کو
 بنانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی
 قوت اور غلبے کے ساتھ حکمت کا ہونا بھی ضروری ہے
 چوتھا باب: **سورة الروم** (آیت 30: انسانی فطرت)
 علمی سطح پر صدیوں سے دنیا بھر میں فطرت کے متعلق
 پائے جانے والے غلط تصور کی وضاحت
 نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کردہ ایک روایت کہ
 ہر بچہ فطرت پہ پیدا ہوتا ہے
 خارجی کائنات میں فطرت کا مفہوم بڑا واضح، ٹھوس اور غیر متبدل ہے

انسان کے بالمقابل کائنات کی ہر شے کی صلاحیت محدود ہے

وحی کی روشنی کے بغیر انسانی صلاحیتوں کا استعمال سراپا جہنم کو جنم دیتا ہے

انسان کے اندر حیوانی جبلتوں کی تفصیل اور ان کے اثرات

انسان کے لیے حیوانی جبلتوں کو کنٹرول کرنے کی

خاطر وحی کے کنٹرول کی ضرورت

نوع انسانی کے متعلق خدا کی مشیت

خدا تعالیٰ نے انسان کے اندر فطرت نہیں رکھی اسے

خود ہی مومن یا کافر بننا ہوتا ہے

انسان کے لیے شرف انسانیت کا معیار

انسانوں کی دنیا میں جنگ و جدل کی وجہ جواز

خیر و شر کے تصور کی حقیقت اور انسان کے نزدیک اس کا مختلف تصور

انسانی جذبات کی مختلف شاخیں

تصوف کی دنیا میں انسانی جذبات کی تحقیر

پانچواں باب: **سورة الروم** (آیات 28 تا 32)

لفظ قائم کا قرآنی مفہوم: اس طرح کھڑے ہو جانا کہ

اس میں کسی قسم کی لڑکھڑاہٹ پیدا نہ ہو

کائنات کے اندر قدم قدم پر بکھری ہوئی نشانیاں دعوتِ غور و فکر دیتی ہیں

یہ ارض و سما قانونِ خداوندی کے تابع ایک پروگرام کی

تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہیں

دورِ جہالت میں انسانی سوچ کی کیفیت

مذہبی پیشوائیت کی سیاست و ملوکیت کے ساتھ

گٹھ جوڑ کی داستان روزِ اول سے چلی آرہی ہے

مملکتِ اسلامیہ کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کی ایک گہری سازش

خدا تعالیٰ کی ذاتِ قادر بھی ہے اور قدر بھی

صرف خدا کی ذات ہی اقتدار کا سرچشمہ ہے

لہذا کوئی اور ظل اللہ علی الارض نہیں ہے

ارتقا کے مرحلہ میں انسانیت کی دنیا کا ایک جہانِ نو کی طرف سفر کا آغاز

انسان کی موجودہ ہیئت کروڑ در کروڑ

ارب در ارب سال کی رہن منت ہے

زندگی بھر کے لیے بچے کی تربیت کا ایک اہم سنہری اصول:

اس کے سامنے متبادل راستہ کھلا رکھو

بچہ ہو یا کوئی قوم یہ اس وقت سرکش ہوتی ہے

جب اس کے سامنے کوئی متبادل راستہ نہیں ہوتا

لفظ ھوئی کا قرآنی مفہوم

وحی انسانی جذبات کے استعمال کا طریق وضع کرتی ہے

خدا کی ذات اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتی

فطرت اللہ کا اور دینِ قیم کا مفہوم

دینِ قیم کے برعکس ہمارے ہاں تقلید پرستی کا

مروجہ اسلام جو صدیوں سے رائج ہے

دینِ قیم پر پوری اترنے والی قوم کی نظریں ہمیشہ اپنے

آشیانہ پر ہوتی ہیں: امتِ مسلمہ کا مقام اقبال کی نظر میں

وہی صلوٰۃ جو ہماری اجتماعیت کا نشان تھا آج فرقہ پرستی

کوئی کمزوری یا کمی محسوس نہیں کر سکے گی

چھٹا باب: **سورة الروم** (آیات 33 تا 39)

نوع انسانی کے لیے دینِ خداوندی خارجی کائنات کی مانند متناسب بھی ہے اور محکم بھی

مادی کائنات کا ایک ایک ذرہ انسانی زندگی کی ارتقائی منزل کی شہادت ہے

خدا تعالیٰ نے انسان کو فطرت کی قید سے آزاد کرتے ہوئے اختیار و ارادہ کی نعمت سے نوازا ہے

خارجی کائنات نے سکون اپنے ہاں خود ساختہ فقہی نظام سے آزادی حاصل کر رکھی ہے

لفظ ”ابتلا“ کا قرآنی مفہوم

خواہ کوئی قوم ہو یا کوئی Species (انواع) ہوں

آگے وہی بڑھتی ہے جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو

انسانی سوچ کی کم ظرفی

انسان ضرورت سے زیادہ جو کچھ چھپاتا ہے

اس کی سند قرآن حکیم میں نہیں ملتی

خدا تعالیٰ اپنے احکام خود ہی تحریر کرتا ہے

کوئی انسان اسے تحریر نہیں کر کے دیتا

نظام ربوبیت کے خدو خال اور اس کا عملی طریق تو پھر یہ بھوک کیوں؟

تمام مصائب انسان کے اپنے پیدا کردہ ہیں

خدا کی طرف سے تو شر نہیں آیا

کائنات بن چکا ہے

نظام صلوٰۃ کے لیے سبّح کا قرآنی مفہوم ایک

بنیادی حیثیت کا حامل ہے

کائنات کی کوئی شے بھی خدا کے قانون سے

سرتابی اختیار نہیں کرتی یعنی وہ مشرک نہیں

مشرک وہ ہیں جو امت واحدہ کے تصور کے

برعکس فرقہ واریت کے پیروکار بن جائیں

دنیا کے تمام جانور اپنی اپنی نوع میں امت واحدہ ہیں

فروقوں کا وجود مختلف فقہوں کا رہن منت ہے

یہ فقہ بندی مملکتِ خداوندی میں بغاوت کے مترادف ہے

آخر فرقہ واریت کے اس شرک کو مٹانے کا کیوں خیال پیدا نہیں ہوتا؟

فرقہ واریت کی اس مہلک بیماری سے نجات حاصل کرنے کا طریق

فرقہ پیدا کرنا خدا کے ساتھ بغاوت ہے

شرک تو کسی ایک جگہ رہتا ہی نہیں

بئالہ شہر میں مذہبی مناظراتی ماحول اور ذاتی تحقیق و تجسس کا نتیجہ: پرویز

انسانی سوچ کی نشوونما کے لیے غور و فکر کی آبیاری کرنا ضروری ہے

جھوٹے اور سچے کو پرکھنے کے لیے ایک معیار کا ہونا ضروری ہے

قرآن حکیم کو اپنا امام تسلیم کیے بغیر فرقے ختم نہیں ہو سکتے

خدائے رحمن کی تخلیق کردہ کائنات میں اختلاف تو کیا

اس میں تو کہیں دراز نہیں، درز بھی نہیں

انسان کی نگاہ اس کا رخا نہ قدرت میں کہیں

قرآن حکیم کا نظام حیات اجتماعیت کی شکل میں نافذ ہوتا ہے	اثر انداز ہوتے ہیں
جب خدا کے نظام میں ناہمواری کے لیے	مسکین کا قرآن فی مفہوم
انسان کا ہاتھ دخل انداز ہوتا ہے	قرآن حکیم کے معاشی نظام کی ابتدا اس کی انتہا کا پیش خیمہ ہے
شروع شروع میں خرابیوں کی وجوہات اکثر نظروں سے اوجھل رہتی ہیں	قرآن حکیم کے اصولوں کی پیروی کی مثال کھیتی کی مانند ہے
برائی کے ذرائع کو فوری طور پر متعین شکل میں	نظام ربوبیت کا ایک اہم جز
سامنے لانے کی ضرورت ہوتی ہے	دولفظوں میں قرآن حکیم کا معاشی نظام
قصہ ابلیس و آدم کو ایک تمثیلی انداز میں بیان کرنے کا مقصد اور مدعا	”نہ ضرورت سے زیادہ نہ ضرورت سے کم“
آج کی سائنکولوجی کے تحت قصہ ابلیس و آدم کو دیکھنا	زکوٰۃ کا اڑھائی فی صد کا تصور قرآن فی تعلیم قل العفو کے بالکل برعکس ہے
نہایت ہی ضروری ہے	ریو نظام سرمایہ داری کا حصہ ہی نہیں بلکہ اس کی بنیاد ہے
مایوسی کا نتیجہ ہمیشہ سرکشی کی شکل میں نکلتا ہے	قرآن حکیم اور فقہ کے معاشی نظام کی پیدا کردہ
نوجوان نسل کے مایوس ہونے کی وجہ	ذہنوں میں بنیادی فرق کا ظہور
اسلامی نظام کے نفاذ پر 11 فروری 1979ء کو	ریو جیسے بغاوتی معاشی نظام کے خلاف خدا رسول کا اعلان جنگ
صدر ضیاء الحق کا انٹرویو	مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ریو کے مفہوم کو الجھا
سب سے بڑی مایوسی یہ ہے کہ انسان	دینے کی ایک فریب انگیز کوشش
قانون خداوندی سے ہی مایوس ہو جائے	سود کے متعلق قرآن مبین کی واضح Definition (تعریف)
جو قانون اپنے اندر سدا بہار پھولوں کی مہک لیے	بلا سود بنکاری کے سلسلہ میں مودودی کا جاری کردہ فتویٰ
ہوئے ہو اس سے مایوسی کیسی اور کیوں؟	سود کے عذاب سے بچنے کے لیے کتاب الحیل ملاحظہ فرمائیں
انسان کی بربادی کی اصل وجہ اپنی ذات کا انکار ہے	کتاب الحیل کی چند ایک مثالیں
رزق کے معاملے میں قرآن حکیم کی آیات کا غلط ترجمہ اور تفاسیر	ساتواں باب: سورة الروم (آیات 40 تا 47)
خدا کی طرف سے عطا کردہ نظام ربوبیت کے خدوخال	ریو کی بنیاد پر قائم کردہ معاشی نظام قرآنی نظام کے
نظام ربوبیت کے تمام پہلو انسان کی نفسیاتی تبدیلی پر	خلاف اعلان جنگ متصور ہوگا

اڑھائی ڈول نکالنے کا کیا مقصد؟
 مذہب کے معاشی نظام کو قرآن کا معاشی نظام سمجھتے ہوئے
 اہل مغرب کی تنقید
 ہر فرد کی معاشی ذمہ داری مملکت کو پوری کرنا ہوں گی
 قوموں کے اندر کمانے کی استطاعت کیونکر کمزور پڑتی ہے
 بھوک کا خوف ختم ہونے پر انسانی صلاحیتیں کہیں زیادہ نشوونما پاتی ہیں
 جو قوم اپنا رشتہ قرآنی نظام سے وابستہ رکھے
 تو اس کی خزاؤں میں بھی بہار کا عنصر پوشیدہ ہوتا ہے
 رحم مادر میں ایک جرثومے سے انسانی جسم کی
 تکمیل اور اس کی پرورش کا حیرت انگیز کرشمہ
 پیدائش سے پہلے رحم مادر میں کوئی بچہ بھوک سے نہیں مرتا
 حیوانی اور انسانی زندگی میں ایک بنیادی فرق ہے
 نظام کو عملی شکل دینے کے سلسلہ میں نماز روزہ کا مقام اور اس کی اہمیت
 خدائے علیم وخبیر اس نظام کائنات کو صرف
 آئینی قوت کے ساتھ کنٹرول کرتا ہے
 بقا اسی نظام حکومت کو ہوگی جو پوری نوع انسانی
 کے لیے منفعت بخش ہوگا
 انسانی ضرورتوں کو متعین کرنے کا فارمولہ
 دنیا بھر میں ہر قسم کا فساد رزق کی غلط تقسیم کی بنا پر ہی برپا ہوتا ہے
 خدا تعالیٰ کی ذات انسانوں کو ان کی بد عملیوں کی بنا
 پر ساتھ کے ساتھ جھٹکا دیتی رہتی ہے

ہم راکٹ کا پرزہ سائیکل کے اندر لگانے کی
 بے سود کوشش میں مصروف ہیں
 فقہہ کے بیان کردہ فارمولے کے مطابق
 اس حرام سودی کاروبار کو حلال کرنے کا طریق
 ہم نے اسلام کو دنیا بھر کی نظروں میں مذاق بنادیا ہے
 خدا کی ذات کے علاوہ قانون سازی کا حق تو کسی نبی کو بھی حاصل نہیں
 قرآن حکیم کی تعلیم قرآنی معاشرت کے لیے ہوتی ہیں
 انسان کی سب سے زیادہ ذلت اور رسوائی معیشت کی بنا پر ہی ہوتی ہے
 انسان کی انسانیت قرآن حکیم کے معاشی نظام سے ہی وابستہ ہے
 مذہبی سوچ نے دین اور دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے
 دین خداوندی کی عطا کردہ بنیادوں کے بغیر
 مذہبی سوچ کا محل کھڑا کرنے کی ناکام کوشش
 محنت کے بغیر حاصل کردہ دولت خدا داد انسانی
 صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی ہے
 Investors ہوں یا Business Men
 یا Industrialists، اگر ان کی جیب خالی کر دی جائے
 تو یہ ایک وقت کی روٹی کمانے سے عاجز دکھائی دیں گے
 ریو کے نظام کا حاصل ہمیشہ دولت اور صلاحیتوں کی
 کمی کی شکل میں ظاہر ہوا ہے
 مروجہ تراجم نے قرآن کے معاشی نظام کی اصطلاحات کو بدل کر رکھ دیا
 اگر ریو کا کتابانی میں ہی رہے تو زکوٰۃ کے

ان سبق آموز جھکوں کے باوجود سبق حاصل نہ کرنے والوں کا انجام
 دین خداوندی کا سہارا بننے والے کو پھر
 کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں رہی
 قوموں کی آخری تباہی کے نشانات کی شکل و صورت
 نظام خداوندی کے عملی نتائج کی محسوس شکل اور علامات
 موسموں کے تغیر و تبدل میں فرق
 اچھے نظام کے ابتدائی دور میں بھی راحت کا عنصر موجود ہوتا ہے
 شکر اور کفر کے معنی
 خدا تعالیٰ نے مومن کی مدد کرنا اپنا فرض قرار دیا ہے
 خدا تعالیٰ کی ذات بھی اگر اپنا وعدہ (معاذ اللہ) پورا نہ کرے
 تو اس سے بھی پوچھا جاسکتا ہے
 خدا سے اپنا کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کی بجائے دعائیں مانگتے رہتے ہیں
 آٹھواں باب: **سورة الروم** (آیات 48 تا اختتام)
 تاریخ انسانیت میں ابلیس کا کردار
 ابلیس کو زندگی بھر کے لیے ضمانت دینے کا وعدہ
 حق کا دامن تھامتے ہوئے شکست کی قدر و قیمت
 کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا
 شرف انسانیت کا وقار دلائل و براہین کے مقدس ترازو میں تولا جاتا ہے
 اس قدر مجیر العقول کائنات کا مالک اپنے وعدہ کو پورا کرنا
 اپنا فریضہ قرار دیتا ہے
 نصرت خداوندی کی مثال سمندر کی شکل میں بادلوں کی

شکل میں بارش کی شکل میں کھیتی کی شکل میں دیکھیے
 فصل اس کی پروان چڑھتی ہے جو زراعت کے
 اصولوں کے مطابق محنت کرتا ہے
 تعمیری پروگرام کی تکمیل کی خاطر مستحکم طور پر عمل پیرا ہونا اولین شرط ہے
 قوموں کی زندگی کے غیر متبدل اصول اسی طرح
 موثر ہیں جس طرح انسانی جسم کے لیے طبعی اصول
 انسان کے لیے سطح ارض پر معیشت کے شعبے کی اہمیت
 مثلاً ہم کو کافر اور کافر ہم کو مُلّا کہتا ہے: پرویز
 وقت کے تقاضوں نے آج یہ ثابت کر دیا ہے کہ دنیا کا
 کوئی نظام خدا کے تصور کے بغیر چل ہی نہیں سکتا
 کمیونزم کو عملی شکل دینے کے سلسلہ میں مارکس کی ناکامی کی وجہ
 مارکس کے پاس مطلوبہ معاشی نظام کے لیے کوئی جذبہ محرکہ نہ تھا
 زندگی بھر کے لیے ایک قابل عمل جذبہ محرکہ صرف
 قرآن حکیم ہی دیتا ہے
 چین میں ماؤزے تنگ کی پرستش کے بعد
 اس کے اصولوں کی انتہا درجے کی نفی
 ہر آنے والا انسان پہلے اصولوں کو چھوڑ کر نئے قانون بنا لیتا ہے
 وحی کی طرف سے دیئے گئے اصولوں کو نہ بدلنے کی ضمانت
 تمام عالم انسانیت کے لیے سکون قلب قرآن حکیم
 کے غیر متبدل اصولوں میں ہی مضمر ہے
 اسلام کے خلاف گہری سازش

قوموں کی زندگی میں نشیب و فراز زندگی کا ایک لازمی جز ہے
 جسمانی صحت کی طرح قوم کی صحت کو برقرار رکھنا زندگی
 بھر کے لیے ضروری ہے
 موت و حیات کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد قابل غور ہے
 ہر وہ طاقت یا نظام جو انسانیت کے راستے میں رکاوٹ ہے
 خدا تعالیٰ کا قانون اسے اپنے راستے سے ہٹا دے گا
 مہلت کا وقفہ ختم ہو جائے تو پھر توبہ کی قبولیت کا وقت بھی ختم ہو جاتا ہے
 دلوں پر مہر کیونکر لگتی ہے؟
 خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کے قلب حساس کا
 ذکر اور بدرجہ اتم استقامت کی تلقین
 آخر کار نوع انسانی کو وحی کی روشنی سے استفادہ
 کرتے ہوئے استقامت کا سبق حاصل کرنا ہی پڑے گا

کائنات کا ایک ایک ذرہ پوری انسانیت کے لیے
 بلا مزد و معاوضہ ایک تحفہ ہے
 نعمائے خداوندی سے انسان صرف استفادہ کرنے
 کا حق رکھتا ہے، ملکیت کا نہیں
 سورج کے ذریعے سمندر کے نمکیاتی پانی کو کشید
 کرنے کا محیر العقول سلسلہ
 کاروبار حیات میں انسانی زندگی کی نشوونما کے لیے
 قدرت کی کاریگری کا حصہ
 خدا تعالیٰ کا نظام ربوبیت لامحدود و سمیع کی صفات عظمیٰ کا حامل ہے
 قرآنی حکومت میں نظام ربوبیت کی نشانی الارض للہ
 کی ترجمانی علامہ اقبالؒ کی زبانی
 سورج کی روشنی سے وہی شخص استفادہ کر سکتا ہے
 جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے



فہرست مشمولات سورۃ القمان مطالب القرآن فی دروس الفرقان

انسان کا ہر آنے والا سانس پہلے سانس کی آخرت ہوتا ہے
قرآن حکیم کے Basic Concepts (بنیادی تصورات)
کو سمجھنے بغیر اس کتاب عظیم کا پروگرام سمجھ میں نہیں آ سکتا
نفسیاتی طور پر سب سے زیادہ نحو اور تکبر میں گرفتار علما
کی اکثریت ہوتی ہے
انسانی ذات کی نشوونما انسان کی اپنی صلاحیتوں کی رہن منت
ہوتی ہے
اونٹ کا معدہ چاک کر کے پانی پینے والی قوم کو جنت کی خوشخبری
صداقت اور حق کے الفاظ کے فرق کو واضح کرنے کے لیے
چالیس ہزار شہروں اور قلعوں کا ثبوت
خدا العزیز ہے اور اس کا وعدہ نظری، ذہنی یا لفظی نہیں بلکہ الحق ہوتا ہے
زندہ قوموں کی پہچان
کائنات کے اس وسیع و عریض محیر العقول سلسلہ کی پہچان
خدا تعالیٰ کا قائم کردہ نظام ربوبیت اور اس کے متعلق ہدایات

پہلا باب: سورۃ لقمن (آیات 1 تا 11)

حروف مقطعات کی وضاحت
حکمت کے لفظ کا قرآنی مفہوم: زندگی کی حدود کو متعین کرنا
قرآن حکیم کو قرآن کی زبان میں ہی سمجھا جاسکتا ہے
انسانیت کے لیے دوسری اہم شرط محسنین کا کردار ہے
کائنات کو حسین سے حسین تر بنانے کے فریضہ کی ادائیگی اور اس کا ثمر
فضا کے اندر نظام صلوٰۃ پر عمل پیرا ہونے والے پرندوں کی مثال
اشیائے زکوٰۃ کا طریق اور اس کا مقصد و منتہا
مارک جہاں ناکام رہ گیا اس سے آگے
مارکس کی ناکامی کے بعد سوشل ازم کی شکل میں لینن کی ناکامی
اس سلسلہ کے حل کے لیے قرآن حکیم کی طرف سے
پیش کردہ جذبہ محرکہ کی لم
روس کی تباہی و بربادی کے بعد چین میں لال کتاب کا حشر
انسانی اعمال کے سلسلہ میں کھیتی کی مثال کی اہمیت

دوسرا باب: سورۃ لقمن (آیات 12 تا 13)

تاریخی طور پر حضرت لقمان کے متعلق مختلف بیانات کی وضاحت عربوں کے ہاں الفاظ کو محسوسات کی بنیاد پر جانا اور سمجھا جاتا تھا شکر کے لفظ کا وہ مفہوم جو محسوس شکل میں سمجھا جاسکتا ہے اسلام مذہب نہ ہونے کی بنا پر ہی سچا دین ہے مذہب کے اندر انسان کا ہر عمل خدا کے لیے کیا جاتا ہے جب کہ دین میں انسان کا ہر فعل اس کی اپنی ذات کے لیے ہوتا ہے مذہب میں خدا کی پرستش کا تصور دین کی ساری عمارت کو ہی منہدم کر دیتا ہے

انسانی دنیا میں جبر کا پہلو انسان کی انسانیت کو پامال کر دیتا ہے انسان کا ہر عمل خالصتاً انسانی ذات کے متعلق ہی ہوتا ہے جبین نیاز کا ایک ایک سجدہ انسانی ذات کو قدم قدم پر سرفرازیوں کی نوید دیتا ہے حقوق اللہ کا تصور بنیادی طور پر ہی غلط ہے انسانوں کی طرح خدا تعالیٰ کی ذات کسی سے اپنی تعریف کروانے کی محتاج نہیں

خدا تعالیٰ نے بھی اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں قرآن حکیم نے عبادت، پرستش، توحید اور شرک کے بنیادی تصورات کے فرق کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے

خدا تعالیٰ نے انسان کو جو حکم دینا تھا اسے قرآن حکیم میں محفوظ کر دیا ایک دوسرے پر حکومت کرنے کا تصور حیوانات میں بھی نہیں پایا جاتا ہے انسان میں کسی ادنیٰ سی سطح پر بھی حکومت کرنے کا تصور اسے فرعون بنا دیتا ہے

مالک یوم الدین کا عملی مفہوم اور اس کی خصوصیت 1935ء میں توحید کے ہی سلسلہ میں ملازمت کے دوران علامہ پرویز کے ساتھ ایک ہونے والا ذاتی واقعہ اسلام کا احیا تو مذہب کی بجائے دین کی حکمرانی سے مشروط ہے تیسرا باب: سورۃ لقمن (آیات 14 تا 16)

والدین سے حسن سلوک: لقمان کی بات بچے کی پیدائش کے بعد ماں کی ممتا کا بدرجہ اتم کردار پرورش کے سلسلہ میں انسانی بچے اور حیوانی بچے میں بنیادی فرق ہے ماں کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے دامن کے حسین و جمیل خوابوں کے تصور میں گزرتا چلا جاتا ہے خدائے رحیم کی رحمانیت میں طبقاتی تقسیم کوئی وجود نہیں رکھتی انسانیت کی برادری کو سامان نشوونما کے بل بوتے پر تقسیم کرنا عظیم شرک ہے انسانی دنیا میں انسان کے اختیار و ارادے پر پہلی پابندی

قرآن حکیم کی تعلیم

اپنی غلطی کا اعتراف اپنی اصلاح کا ایک لازمی جز ہے

لغزش کے سلسلہ میں توبہ کرنے والے کے لیے

خدا کی طرف سے رحمانیت کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں

عدل کے سلسلہ میں پلڑے کی مثال ایک بڑی واضح مثال ہے

انسانی اعمال کا حساب تو ہر سانس میں ساتھ کے ساتھ ہوتا چلا جاتا ہے

چوتھا باب: **سورة لقمن** (آیات 17 تا 21)

اڑھائی ہزار سال سے مسئلہ خیر و شر کی پیچیدگیوں کا قرآنی حل

قوموں کے لیے الفاظ کے حقیقی مفہوم کی اہمیت کے سلسلہ

میں لفظ ”صبر“ کی ایک مثال

قرآن حکیم کے مروجہ تراجم کی وجہ سے غلط نظریات کے

پیدا ہونے کا نتیجہ

الصبرۃ کا قرآنی مفہوم

کٹھن سے کٹھن منزل کو سر کرنے کے لیے پوری دل جمعی

کے ساتھ سرگرم عمل رہنا صبر کہلاتا ہے

انا للہ کے الفاظ کا قرآنی مفہوم

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب ”اعمال قرآنی“

میں قرآن پر عمل کرنے کے طریق

مذہبی دنیا میں عزم کی نوعیت نیز اعمال اور العزم کا تذکرہ

قرآن کی تعلیم کی بنا پر ماں باپ کی اطاعت کا تصور باطل ہے

ماں باپ کی اطاعت کے سلسلہ میں رام چندر کی کہانی

والد کے سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کا اسوۂ حسنہ

بڑھاپے میں قید تنہائی کا احساس

قرآن حکیم کے نزدیک فیملی سسٹم ایک نعمت سے کم نہیں

یورپ میں سوائے انکل کے نہ بچا ہوتا ہے نہ ماموں، پھوپھانہ خالو

Homes (گھروں) کے بجائے Houses (مکانات) ہیں

قرآن حکیم کی روشنی میں والدین اور اولاد کے لیے حدود کا تعین

اطاعت اور اتباع میں ایک بنیادی فرق ہے

قرآن حکیم کے نزدیک عدل کا مقام شہادت کی اہمیت اور

اس کی نوعیت

ہوم لائف (گھریلو زندگی) کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی ہدایت

ماں باپ کے لیے فرمانِ ربی

قرآن حکیم کی ساری کی ساری تعلیم کا مقصد زندگی کا

محور انسانی ذات کی نشوونما ہے

قرآن حکیم قدم قدم پر انسانی عقل کو وحی کی روشنی سے

منور کرتا چلا جاتا ہے

قرآن حکیم اپنے ہاں زندگی کا ایک اعلیٰ و ارفع تصور پیش کرتا ہے

گناہ اور جہنم کے سلسلہ میں یہودیت کے تصور کے برعکس

تمدنی زندگی کے سلسلہ میں لقمان کی قابل قدر تعلیم

انسان کی عقل مندی کا ثبوت اس کی نفسیاتی کیفیات

سے ملتا ہے اور انسانی نفسیات کے مختلف پہلو

تنگ نظری یا کم ظرفی کی خطرناک بیماری

کسی کے لیے کچھ نہ کرنے کے باوجود تعریف کروانے کی

انتہائی خواہش

خیالی بدگمانی کی کیفیت

خیالی طور پر اپنی اما جگہ میں خوش فہمی کے اندر گرفتار شخص کی کیفیت

قدم قدم پر ان گنت بکھرے ہوئے کائناتی حقائق کو سمجھنے

کے لیے غور و تدبر ایک گہرنا بار ہے

تسخیر کائنات کے سلسلہ میں دوسروں کے بالمقابل قرآن کریم

کی حامل یہ قوم آخر کیوں دسترس حاصل نہ کر سکی؟

تحریک طلوع اسلام 50 سال سے مذہب اور دین کے

فرق کو واضح کرتی چلی آرہی ہے: پرویز

قرآن حکیم کے نزدیک تقلید پرست قوموں کی حالت زار

پر مقلد کی تعریف

تقلید کے مفہوم کو سمجھانے کی ایک دوحسوس اور عملی مثالیں

کسی شخص کا بحیثیت مومن خدا کی آیات پر ایمان لانے کا طریق

ایمان لانے کے سلسلہ میں خود نبی اکرم کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد

مذہب میں تو صرف اسلاف پرستی ہوتی ہے: نہ دلائل و براہین

اور نہ فہم و فراست

ہر صحیح فارمولا اپنے صحیح ہونے کا ثبوت خود پیش کرتا ہے

مذہب ہمیشہ دلیل کا دشمن ہوتا ہے

آج ہمارے ہاں ان فتوؤں کو قانونی حیثیت سے تسلیم کیا جا رہا ہے

نبی اکرم کی زندگی کے دو سو سال بعد بنائی ہوئی تاریخ کی حیثیت

تاریخ کی کسی صحیح بات کی سند کو بھی کتاب اللہ کے ترازو میں تولنا ہوگا

عقل و شعور سے محروم ہو جانے کی وجہ جواز

اگر قدرت انسان کو ارتقائی صلاحیتوں سے نہ نوازی تو آج اس

کا حشر بھی حشرات الارض یا جنگلی جانوروں جیسا ہی ہوتا

پانچواں باب: **سورة لقمن** (آیات 22 تا 32)

اسلاف پرستی یا اندھی تقلید کے تباہ کن نتائج

تقلید پرستی کے باعث قوم صراط مستقیم کی منزل سے ہی محروم ہو جاتی ہے

ٹیکسلا کے میوزم میں 5 ہزار سال پیشتر رکھی ہوئی اشیاء اور

آج وہاں کے گاؤں کی حالت

تقلید پرست قوم کی حالت: گڑکی ڈلی اور کڑوے

تیل کی جست و گوئیوں کے لیے

احیائے اسلام کے سلسلہ میں کی جانے والی کوشش کی نوعیت

ہمارے ہاں کی آسودہ حالی اور تحقیق کرنے کا معیار

ہمارے دارالعلوموں کے نو سالہ کورس میں قرآنی حقائق

کو سمجھنے کے سلسلہ میں بے رخی کی کیفیت

قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ تعلیم کا انداز

وحی خداوندی کی مقرر کردہ حدود کو نظر انداز کرنے کی بنا

پر اہل یورپ کی حالت

مذہب پرست قوموں کی حالت

تقلید پرستی کے برعکس ایک دوسرا مسلک: ایسا سہارا جو کبھی نہ ٹوٹے

نبی اکرم ﷺ کی حساس خیالی اور وحی کا سہارا اور اس کی اقلیم

انسان کی انسانیت اس کے دل میں گزرنے والے خیالات

کی ہی پرتو ہوتی ہے

خدا کو ماننے اور نہ ماننے میں بھی ایک بنیادی فرق ہے

خدا کے نام پر مسلمانوں کو Exploit (سلب و نہب)

کرنے کا ایک خطرناک حربہ

قرآن انسان سے ارض و سما کے خدا کو ماننے کا مطالبہ کرتا ہے

خدا کی ذات اپنی صفات میں لامحدودیت کی حامل ہے

اسے محدود نہیں کہا جاسکتا

کائنات میں وحدت کا محیر العقول سلسلہ نیز سائنسی

انکشافات اور وحی کی راہنمائی

وقت (Time) کے سلسلہ میں آئن اسٹائن اور

برگسان کے انکشافات اور قرآن حکیم کے بیان کردہ حقائق

یہ پوری کائنات ایک نفسِ واحد کی مانند ہے

یہ کائنات بھی ایک وقت تک کے لیے ہے اور خدا کا قانون الحق ہے

خدا کے قانون کے الحق ہونے کے سلسلہ میں کشتی کی مثال

زندگی کی کشتی کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے استقامت

کے ساتھ خدا کے قانون کو اپنانا ہوتا ہے

خدا کے قانون کو مسلسل زندگی بھر دھوکا دینے والوں کا انجام

چھٹا باب: **سورة لقمن** (آیات 33 تا اختتام)

کسی مشکل حالت میں خدا کو یاد کرنے یا اسے ماننے کی نوعیت

خدا کو ماننے کے حقیقی معنی دراصل اس کے قانون کے مطابق چلنا ہے

انسانی زندگی کے لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا

قانون پوری نوعِ انسانی کے لیے ہوتا ہے

متقی اور تقویٰ کا حقیقی مفہوم

خدا کے خشیت و خوف سے ڈرنے کا تصور قرآنِ حکیم کی روشنی میں

اصل بات تو مکافاتِ عمل کی ہوتی ہے ڈرنے نہیں ہوتا

خشیت کا قرآنِ حکیم مفہوم

اعمالِ انسانی کے ظہورِ نتائج کے وقت کو قرآنِ حکیم نے یوم بھی کہا ہے

انسان کے لیے اس کی انفرادیت کی اہمیت اور اس کی کیفیت

خدا کا وعدہ دراصل خدا کا وہ اٹل قانون ہوتا ہے جو کبھی

قرآن فہمی کے سلسلہ میں ہماری بدقسمتی ہماری غلط سوچ ہے	اپنا نتیجہ نہیں بدلتا
اختیار و ارادہ کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس کا	کسی بات کو واضح انداز میں بیان کرنے کا قرآنی طریق
مستقبل Determine (متعین و مقرر) نہیں ہوتا	کلمہ طیبہ اسلام کی ایک ایسی آئیڈیالوجی ہے جس کی کوئی مثل ہی نہیں
دنیا کا کوئی شخص بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ مکھی اڑ کر کہاں بیٹھے گی	انسان ہمیشہ مفادِ عاجلہ سے دھوکا کھاتا ہے
زندگی کی تمام تر لطف اندوزیوں کا راز انسان کے	انسانی زندگی نظروں سے تو اوجھل ہوتی ہے مگر ختم نہیں ہوگی
اختیار و ارادہ کا رہن منت ہے	نتائج مرتب ہونے کے سلسلہ میں دو محسوس مثالیں
سعی بے حاصل انسانی زندگی میں رنگینی پیدا کر دیتی ہے	آیت یَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ کے سلسلہ میں پیدا
حضرت صاحب کی پیشین گوئیوں کے بالمقابل قرآن حکیم کا ارشاد	ہونے والے الجھاؤ اور ان کی حقیقت



فہرست مشمولات سورۃ السجدہ مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پیش لفظ	دن سے مکمل شکل میں پیدا کر دی گئی
پہلا باب: سورۃ السجدۃ (آیات 1 تا 4)	دو تین سو سال پہلے خارجی کائنات اور انسان کی تخلیق کے متعلق سائنس کی تحقیق کا آغاز
لفظ ربیب کا قرآنی مفہوم	کوئی شے بھی By Revolution (انقلاب سے)
نبوت کے سلسلہ میں عربوں کی تاریخ	وجود میں نہیں آئی
ارض و سما کی اصل حقیقت اور تورات کا بیان یوم کا مفہوم اور جمعہ کی چھٹی کا معاملہ	خدا کی دو دنیاؤں کا ذکر: عالم امر اور عالم خلق
لفظ امر اور خلق کا مفہوم نیز عرش کے سلسلہ میں خدا کے متعلق پیدا ہونے والا تصور	عالم امر کے متعلق انسانی سوچ کی بے چارگی
یورپ کے سائنٹسٹ (سیکولر ازم کے حامیوں) کے نزدیک کائنات کا تصور	14 سو سال پیشتر نظریہ ارتقا کی وضاحت اور لفظ تدبیر کا مفہوم
نبی اکرم ﷺ کی ذات کے متعلق شیعہ المذنبین کے تصور کی حقیقت	آغاز سے تکمیل تک کے تمام مراحل کو پیش نظر رکھتے ہوئے
لفظ شفیق کا مفہوم	ارض سے سما کے سفر کی روئداد
کائنات کے اندر انسان کا مقام بلند ہونے کی وجہ	کائنات کو صرف دائروں کی گردش میں محدود کرنے کا تصور فکر قرآنی کے خلاف ہے
دوسرا باب: سورۃ السجدۃ (آیات 5 تا 9)	ارتقائی منازل کے لیے قدرت کا ایک ایک دن
سورۃ السجدۃ کی جلیل المرتبت آیت	پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے
انسانی علم کتاب فطرت لکھتا نہیں ہے بلکہ اسے پڑھتا ہے	کسی منزل کے حصول کے لیے Direction (سمت) کی اہمیت
صدیوں سے رائج ایک غلط عام تصور: ہر چیز پہلے	ہم نے جیسے علامہ اقبالؒ کو صرف شاعر مشرق کے الفاظ میں ہی محدود کر رکھا ہے

لفظ عزیز کے ساتھ رحیم کا استعمال کیوں؟

انسانی زندگی کی ارتقائی سوچ کے سلسلہ میں ایک غلط نگاہی

آج پوری نوع انسانی کے لیے عذاب کا باعث بنی ہوئی ہے

انسان کو زندگی گزارنے کے لیے کہا گیا ہے نہ کہ عمر بسر کرنے کے لیے

تہذیب مغرب کی تعریف کے متعلق ہمارے ہاں کی پیدا

کردہ سوچ کی نوعیت

30 سال کی عمر میں تہذیب مغرب کے متعلق علامہ اقبالؒ

کی سوچ اور لادینیت کی وضاحت

خالق کائنات اپنی ہر تخلیق کا آغاز پست ترین سطح سے

کرتا ہے اور بلند ترین سطح تک لے جاتا ہے

قدرت نے انسان کو انسانیت کی ایک نئی منزل سے روشناس کرایا

انسان کے لیے اطوار کی صورت میں تخلیق نو کی نعمت خدائی

توانائیوں کا ایک کرشمہ

انسان خدا کی ذات کا حصہ نہیں ذات کے حصے بخرے نہیں ہو سکتے

لفظ روح کا قرآنی مفہوم انسان کا اختیار و ارادہ ہے

یعنی یہ اس کا صاحب مشیت ہونا ہے

انسان کو اختیار و ارادہ کے استعمال کرنے کے لیے

حواس خمسہ اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت ملی ہے

یہ آدم خاکی حیوان سے انسان اختیار و ارادہ کی

سرفرازی کے بعد بنانا کہ اسے مخاطب کیا جائے

کسی شخص کو ٹوکھنے سے پہلے اسے اپنی ”میں“¹ کو ثابت کرنا ہوگا

ہماری دعا اس لیے قبول نہیں کہ ہم ”میں“ نہیں

انسان کی منزل انسان کا خدا ہے

یورپ کے سائنسٹسٹ ہوں یا اہل تصوف ان دونوں کی دنیا

میں ”میں“ کا اپنا الگ وجود کہیں باقی نہیں رہتا

منزلِ مؤمن

تیسرا باب: **سورة السجدة** (آیات 10 تا 13)

تجدید یادداشت

قرآن حکیم کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت اس کی

تعلیم اور اس کے حقائق ہیں

اگر یہاں کی زندگی زندگی ہے تو اس کے بعد کی زندگی

زندگی کی زندگی ہے

قرآن کے حقائق کو سمجھانے کے لیے اقبال کا اسلوب

محکمات اور متشابہات کی اصلیت اور ان کی اہمیت

قرآن حکیم کے نزدیک یہ زندگی اخروی زندگی کا دیباچہ ہے

خدا کا دین مذہب میں کچھ اس طرح بدلاجس

طرح بناس بقی یا ڈالڈال کو گھی کی شکل میں بدلا ہے

اگر انسانی صحت کے لیے غیر متبادل طبعی قوانین ہیں تو

انسانی ذات کے لیے بھی غیر متبادل اقدار ہیں

انسانی ذات کی نشوونما کا تمام تر انحصار قرآنی اقدار پر منحصر ہے

ذات کی نشوونما کے لیے قرآنی اقدار کی کہانی اقبالؒ کی زبانی

یورپ کی مادہ پرست سوچ اور مؤمن کے نزدیک تسخیر کائنات

کی سوچ میں ایک بنیادی فرق ہے

کائنات کی وسعتیں لامحدود ہونے کے باوجود محدود ہیں

قرآنی زبان کی بلاغت کی ایک مثال

آگے نکلنے کے لیے لفظ نفذ کا استعمال کیوں؟

حصول منزل کے لیے پروگرام کے ساتھ عشق ہونا ضروری ہے
 انسان کی ارتقائی حدود کی اگلی منزل کے متعلق برگسان کا نقطہ نظر
 خدا کا قرب حاصل کرنے کے لیے اس کے قانون کے آگے جھکنا ہوگا
 خدا انسان کو جیسا بنانا چاہتا ہے قرآن اس کو وہ کچھ بنا دیتا ہے
 مومن کے لیے قضائے اکبر بھی کچھ حیثیت نہیں رکھتی
 انسانی خودی کا قطرہ جب گوہر کی شکل اختیار کر جائے تو
 پھر وہ حیات جاوید سے ہم کنار ہو جاتا ہے
 انسان کے ہر عمل کا نتیجہ اس کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے
 انتظامی امور کے سلسلہ میں مملکت اسلامیہ کے سربراہ
 کی حیثیت نیز مکافاتِ عمل کی اہمیت
 گزرا ہوا وقت خواہ ایک سیکنڈ ہی کیوں نہ ہو واپس نہیں آیا کرتا
 خدا تعالیٰ کی طرف سے ایمان لانے کے لیے انسان پر کوئی جبر نہ ہوگا
 قرآن کی اس قدر واضح تعلیم کے برعکس ہمارے ہاں کے
 تراجم کی ایک مثال
 اس سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد
چوتھا باب: سورة السجدة (آیات 14 تا 19)
 تجدیدِ یادداشت
 قرآن حکیم نے اپنی تعلیم کو کئی جگہ مجازی طور پر بھی پیش کیا ہے
 قرآنی قوانین کو عملی طور پر دل و جان سے تسلیم
 کرنے والوں کی خصوصیات
 تشریف آبیات کی روشنی میں قرآن حکیم کا کوئی مقام بھی مشکل نہیں رہتا
 قرآن تعلیم کے مطابق آیاتِ خداوندی پر علی وجہ البصیرت
 ایمان لانا ہوگا

ایمان لانے کے سلسلہ میں ہماری حالت
 انسان کو کافر بننا پڑتا ہے اور ایمان لانا پڑتا ہے
 لفظ ربوبیت کا قرآنی مفہوم
 قرآنِ تعلیم کے برعکس مذہب کی دنیا میں قرآن حکیم کے
 لفظ ”سج“ کا مفہوم
 مردِ مومن کی سعی و کوشش اور اس کی کبریائی کے مقامِ بلند کی کیفیت
 جماعتِ مومن کی پہچان الاعلون کے سوا کچھ اور ہے ہی نہیں
 انسان کی اپنی پہچان اس کی ”میں“ سے وابستہ ہے
 بندہ مومن خدا کے آستانے کے سوا کہیں کسی اور کے سامنے نہیں جھکتا
 Ego (ایگو) میں اور نفس یا خودی میں فرق
 ایسا استکبار جو بغیر الحق ہو وہ شیطنیت ہے
 روزِ قیامت غیر مسلموں کے متعلق ان کے نیک اعمال کی جزا کا سوال
 خدا اور اصول پرستی میں فرق یعنی بغیر الحق استکبار کا نتیجہ فرعونیت ہے
 دلی طور پر کسی بات کو تسلیم کرنے کے باوجود اپنی انا کے بت کی پوجا کرنا
 زعمِ باطل انسان کی صلاحیتوں کو غیر شعوری طور پر مفلوج کرتا رہتا ہے
 ایک رات میں ہزار ہزار نفل اور عمر میں نواکھ مرتبہ قرآن حکیم
 کے ورد کی حقیقت
 نبی اکرمؐ کے متعلق خدا تعالیٰ کا ارشاد
 ضربیں لگانے والوں کے برعکس راتوں کو کم سونے والوں
 کی عملی زندگی کی کیفیت
 قرآنِ تعلیم کے برعکس دنیائے تصوف کے نزدیک
 کائناتی نعمتوں کی قدر و منزلت
 کائنات کے تخلیقی مقصد کو پیش نظر نہ رکھنے والوں کی حالت زار

ابتدائی طور پر بیماری کی شکل میں درد کے چھوٹے چھوٹے
جھٹکے بھی ایک رحمت ہے

خدا تعالیٰ کی ذات کے متعلق انتقام لینے کا تصور صحیح نہیں ہے
قرآن حکیم کی تعلیم کے مطابق انتقام کا صحیح مفہوم

تاریخی لحاظ سے قرآن حکیم کا انداز بیان

خدا سے ملاقات کا قرآنی مفہوم اور ذکر سے مراد

اقتصادیات پر یہودی اور بنیہ کا قبضہ اور ان کے قبضے

میں مسلمان کی جان

لفظ امام کا حقیقی مفہوم

مسلمانوں میں باہمی اختلافات کے سلسلہ میں ایک غلط روایت کی تشہیر

صدیوں سے موجود باہمی اختلافات مٹانے کا علاج

قدیل آسمانی کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتا

زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا نتیجہ اور قیامت کا مفہوم

سلطنت عباسیہ کے دور میں مذہبی اختلافات کی

ناگفتہ بہ حالت کے باعث ہلا کو اور چنگیز کی چڑھائی

سلطنت عباسیہ (750-1258AD) کے علاوہ مغلیہ

سلطنت اور مسلمانوں کی ہزار سالہ ہسٹری کا سیاہ دور

مذہبی فرقہ بندی کا ہی ثمر ہے

حضرت عمر فاروق ♦ کی عدالت میں ہرمزان کا حقائق پر مبنی بیان

وحی کے ذریعے قرآن حکیم کا آخری پیغام ہی انسانیت

کا آخری سہارا ہے

نبی اکرم کے لیے ہجرت کا حکم قوم کی تباہی کی آخری علامت تھی

عربوں کے ہاں رزق اپنے اندر وسیع تر مفہوم کی شکل میں
استعمال ہوتا ہے

رزق کی دوسروں کے لیے کھلا رکھنے پر اجر کی تفصیل لامنتہا ہے

جنت مومن کا کوئی آخری مسکن نہیں

قرآن حکیم کو سمجھنے اور سمجھانے کی تخلیقی کاوشوں کی ایک جھلک

پانچواں باب: **سورة السجدة** (آیات 20 تا اختتام)

دنیا بھر کے مسلمانوں کی حالت اور یہودیوں کی تباہی کے لیے

دعاؤں کا سلسلہ دراز

جہنم میں جہنمیوں کی بے بسی کی کیفیت

جہنم کا ذکر ہو یا جنت کا، یہ سب کا سب تمثیلی طور پر ہی بیان کیا گیا ہے

انسان نے کڑھ ارض پر ہی لکیریں نہیں کھینچیں بلکہ پوری

انسانیت کو ہی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے

ہجرت کا تصور

خدا کی زمین کا انسانوں کے ہاتھوں ہی تنگ ہو جانے کی

ایک سبق آموز مثال

رب کریم نے انسانی اختیارات کو وسیع تر کرنے کے لیے

کڑھ ارض کو مستقر بنایا تھا

انسان کی اس میکاوی سیاست نے پوری دنیا کو ایک

وسیع جہنم میں تبدیل کر رکھا ہے

جنتی معاشرے میں کسی مجرم کو ذلیل نہیں کیا جائے گا

تاکہ اس کی انسانیت پامال نہ ہو

دنیا بھر کے ستم ظریف انسانوں کے لیے قرآنی نظام

کی طرف سے اعلان ضمانت

سُورَةُ الرُّومِ

پہلا باب : سورة الروم (آیات 1 تا 16)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزانِ من! آج اگست 1979ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الروم کے شروع سے ہوتا ہے۔ یہ اکیسویں پارے کی تیسویں سورة ہے: (30:1)۔

روزوں کا مقصد دنیائے انسانیت میں خدا کی کبریائی کو قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہے رمضان المبارک شروع ہوا ہے۔ جہاں تک روزوں کے احکام کا تعلق ہے وہ اسی مہینے کے طلوعِ اسلام میں دیدیئے گئے ہیں۔ قرآن کی دو چار آیات میں وہ سارے آگئے ہیں۔ جہاں تک روزوں کے مقصد کا تعلق ہے اُس کے متعلق دو ایک سابقہ درسوں میں بڑی تفصیل سے بیان کرچکا ہوں۔ قرآن نے کہا ہے کہ صیام یعنی روزوں کا مقصد یہ ہے کہ لَتُكْبَرُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدٰكُمْ (2:185) تاکہ تم دنیائے انسانیت میں خدا کی کبریائی کو قائم کر سکو۔ کبریائی کے معنی اقتدارِ مطلق (Sovereignty) ہوتا ہے۔ یہ روزے اس مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہیں کہ دنیا میں انسانی نظام کی جگہ خدا کی حکومت قائم کی جاسکے۔ عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ جو لَتُكْبَرُوا اللَّهَ کہا گیا ہے تو وہ کہا ہی یہ گیا ہے کہ روزے اس لیے فرض کیے گئے ہیں کہ تم دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کرنے کے قابل ہو جاؤ۔ اور اُس کا عملی ثبوت ہمیں تاریخ دے رہی ہے۔

میدانِ بدر میں خدا کی کبریائی کے قیام کے لیے پہلا معرکہ

روزے 2 ہجری میں پہلی بار فرض ہوئے اور 17 رمضان کو حق اور باطل کا سب سے پہلا معرکہ بدر^① کے میدان میں ہوا۔

① جنگ بدر 17 رمضان 2 ہجری مطابق 13 مارچ 624ء

اسی لیے اُسے یوم الفرقان کہا گیا ہے۔ ابھی سترہ ہی دن کے روزے رکھے تھے کہ اس جماعت کو حق کی پہلی فتح بدر کے میدان میں ہوئی اور اُس آغاز کے بعد اُس کی تکمیل فتح مکہ ^① میں جا کر ہوئی اور وہ بھی رمضان ہی کے مہینے میں۔ قرآن نے جو کہا تھا کہ اس لیے ہم نے یہ صیام یا روزے فرض کیے ہیں تاکہ تم خدا کی کبریائی کو قائم کر سکو۔ پہلی دفعہ جب روزے فرض ہوئے تو خدا کی کبریائی کے قیام کا آغاز ہوا۔ آخر میں جا کر 8 ہجری میں مکہ فتح ہوا اور وہ بھی رمضان میں ہی اُس احاطے کے اندر ہوا جہاں سے خدا کی کبریائی کی یہ بات شروع کی گئی تھی۔ اس کے بعد اس کی وسعت تو بہت دور تک پھیل گئی لیکن وہ مقام جہاں سے نبی اکرم ﷺ نے اس کا آغاز کیا تھا وہ ہے جسے آپ جزیرہ ^② العرب کہہ لیجیے اُس میں خدا کی کبریائی کی تکمیل فتح مکہ سے ہوئی۔ یہ تھا قرآن کا مقصد اور اس طرح سے اُس مقصد کو حاصل کر کے دکھا دیا۔ اس چیز کو میں دو ایک درسوں میں بڑی تفصیل سے بیان کر چکا تھا اس لیے یہاں اُسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اب ہم اپنے تسلسل سے ہی آج کے درس کا آغاز کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں آنے والے واقعات کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن وہ کچھ ایسی باتیں ہیں جن کا تعلق حوادثِ کائنات سے ہے۔ جب ہم آگے آئیں گے تو دیکھیں گے کہ ان کی زیادہ تفصیل آخری پاروں میں ہی ہے۔ نظر آتا ہے کہ وہ جو اس کے بعد دنیائے انسانیت یا خارجی کائنات کے اندر تبدیلیاں پیدا ہونے والی ہو گئی جو انقلابات آئیں گے ان کے متعلق ان آیات میں یا ان سورتوں میں بتایا گیا ہے۔ یہ جو قبل از وقت یا جسے آپ پیشین گوئیاں کہیں گے یا جسے آپ مستقبل کے متعلق کچھ کہنا کہیں گے تو یہ حوادث کے متعلق ہے آنے والے واقعات کے متعلق ہے لیکن قرآن میں ایک پیش گوئی ایسی ہے جو زمانہ نزول قرآن کے اندر متعین طور پر نام لے کر کی گئی ہے اور وہ اُسی دور کے اندر پوری بھی ہو گئی۔

قرآن حکیم میں ایران اور روم کی مملکتوں کا ذکر اور ان کا تاریخی بیان

وہ پیشین گوئی سورۃ الروم میں ہے جس سے آج کے درس کا آغاز ہوتا ہے۔ عربوں کے دائیں بائیں کہہ لیجیے یا دونوں اطراف میں کہہ لیجیے دنیا کی وہ دو بڑی مملکتیں تھیں جن کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایک طرف ایران کی مملکت تھی اور دوسری طرف رومن ایمپائر تھی۔ ایران میں تو مجوسی تھے جنہیں آپ آتش پرست کہتے ہیں وہ کھلے بندوں مشرک ہو چکے تھے۔ رومن عیسائی تھے۔ ان

① فتح مکہ رمضان 8 ہجری مطابق جنوری 630ء

② محل وقوع کے اعتبار سے عرب کے مشرق میں خلیج فارس جنوب میں بحیرہ عرب اور مغرب میں بحیرہ قلزم واقع ہے۔ اس اعتبار سے اسے جزیرہ نمائے عرب کہا جاتا ہے لیکن اس کے شمال میں دریائے دجلہ اور فرات بہتے ہیں (پرویز: شاہکار رسالت، ادارہ طلوع اسلام لاہور، 1987ء، ص 163)

دونوں کی تہذیبیں بھی صدیوں سے چلی آ رہی تھیں اور ساری دنیا پر ان کا سکہ رائج تھا۔ عربوں کے ہاں مملکت کا ہونا تو ایک طرف رہا، کوئی منظم حکومت بھی نہیں تھی۔ یہ قبائلی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان ایران والوں اور رومنز کی آپس میں آویزشیں، کشمکشیں، تصادمات اور لڑائیاں ہمیشہ لگی رہتی تھیں۔

میں جب رومنز کہتا ہوں تو اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے ہاں قیصر قسطنطین نے جسے Constantine کہتے ہیں، عیسائیت کو قبول کیا تو اپنا دار السلطنت قسطنطنیہ کو بنایا۔ چوتھی صدی عیسوی میں رومن ایمپائر یعنی مملکت روم دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حصہ کا دار السلطنت روم ہوا۔ یہ وہی ہے جسے ہمارے ہاں روم کہتے ہیں اور دوسری سلطنت جو عرب کی سمت میں واقع ہوئی تھی اس کو بازنطینی حکومت کہتے تھے۔ اس کا دار الخلافہ قسطنطنیہ تھا۔ گویا یہ جو تاریخ میں آپ کو بازنطین ملے گا جس کا دار الحکومت قسطنطنیہ تھا، یہ وہی ہے جو چوتھی صدی میں جب رومن ایمپائر دو حصوں میں تقسیم ہوئی ہے تو ان کا مشرقی حصہ جو عرب کی سمت واقع تھا، اُسے بازنطینی حکومت کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد عرب کے مسلمانوں سے براہ راست جن کا تصادم ہوا ہے تو وہ یہی مشرقی رومن ایمپائر تھی جسے بازنطینی ایمپائر کہا جاتا ہے اور جس کا دار السلطنت قسطنطنیہ تھا۔ شام، آج کا بیت المقدس، فلسطین، مصر اور عراق کے علاقے اس بازنطینی حکومت کے ماتحت تھے۔ انہوں نے عرب کا جو بارڈر تھا، اس پر چھوٹے چھوٹے جاگیردار سمجھ لیجیے یا سردار کہہ لیجیے، بسا رکھے تھے، ان کو کچھ فوج بھی دے رکھی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عرب کی سمت سے ان کو کسی قسم کا خطرہ نہ ہو۔ تاریخ میں انہیں غسانی کہتے ہیں۔

ایرانی اور بازنطینی حکومتوں کی 602 عیسوی سے 612 یا 614 عیسوی تک باہمی جنگ و جدل کی روداد یہ تاریخی تفصیل اس لیے ضروری ہے کہ آگے چل کر بات سمجھ میں آئے گی کہ جب بازنطینی حکومت کہیں گے، یا رومن ایمپائر کہیں گے تو رومن ایمپائر سے مفہوم بازنطینی ایمپائر ہوگا جو عرب کی سرحد کی طرف واقع ہوئی تھی۔ رومن ایمپائر جو دوسری طرف واقع ہوئی تھی جو مغربی حصہ تھا، عربوں کا اُس سے تعلق نہیں ہے۔ ایرانیوں کی کشمکش اس بازنطینی حکومت کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لڑائیوں کا سلسلہ اس زمانے میں بڑا لمبا چوڑا ہوا کرتا تھا۔ ایٹم بم تو تھے نہیں کہ ایک سیکنڈ کے اندر پوری کی پوری مملکت کو تباہ کر کے رکھ دیا جائے۔ چھ سو دو عیسوی (602ء) میں ان کی جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا اور وہ اچھا خاصا عرصہ یعنی چھ سو بارہ (612ء) یا چودہ (614ء) تک وہ سلسلہ جاری رہا۔ اُس میں ایرانیوں کو بازنطینی عیسائیوں کے خلاف فتح پر فتح ہوتی چلی گئی۔ انہوں نے شام کو فلسطین کو فتح کر لیا، مصر تک بھی پہنچ گئے، ان کے ہاں یروشلم میں جو صلیب مقدس تھی وہ یہ بھی اٹھا کر لے گئے۔ گویا بہت بڑی شکست تھی جو رومنز کو ملی۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ایرانی مجوسی تھے ان کا شمار مشرکین کی صف میں کیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے عیسائیوں اور یہودیوں کو تو اہل کتاب کہا ہے۔ یہ جو مجوسی تھے یہ بھی حالانکہ ایک پیغمبر کے ماننے والے تھے لیکن ان کے پاس اُس کی کوئی کتاب نہیں تھی یہ آتش پرست تھے اس لیے انہیں مشرکین کی صف میں رکھا جاتا تھا۔ یہ چیزیں معلومات کے لیے ہیں ورنہ قرآن کریم کی رو سے دنیا میں تو میں بھی دو ہیں، جماعتیں بھی دو ہیں، انسانیت بھی دو حصوں میں ہی بٹی ہے۔ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (64:2) ایک وہ جو خدا کی کبریائی پر ایمان رکھنے والے ہیں، عملاً اُس کو قائم کرتے ہیں یہ ہیں جنہیں وہ مومن کہتا ہے۔ ایک وہ ہیں جو اسے تسلیم نہیں کرتے بلکہ اس کے سوا اس کو چھوڑ کر کوئی نظام حکومت بھی وہ قائم کر لیں، وہ ان میں سے نہیں ہیں، وہ دوسروں سے ہیں اس لیے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ آگے اصطلاحی طور پر ان کو پارسی کہا ہے، مشرکین بھی وہ ہوتے ہیں، کفار بھی ہوتے ہیں، منافق بھی ہوتے ہیں۔ یہ دو شقیں تھیں۔ ان مجوسیوں کو اہل کتاب پر غلبہ حاصل ہوا۔

قرآن حکیم کے نزدیک معاشرتی طور پر اہل کتاب اور مشرکین میں پائے جانے والے فرق کی نوعیت قرآن کریم میں ان اہل کتاب کو بھی کفار ہی کی صف میں رکھا گیا ہے کیونکہ یہ قرآن کی حکومت کو نہیں مانتے تھے لیکن اس کے باوجود قومی سطح پر یا تمدنی سطح پر یا معاشرتی طور پر قرآن نے اہل کتاب میں اور مشرکین میں کچھ فرق رکھا ہے۔ مثلاً اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز رکھا ہے ان کے ہاں کا ایسا کھانا جو ہمارے نقطہ نگاہ سے حرام کی صف میں نہ آتا ہو تو ان کے ہاں کے ایسے کھانے کو بھی جائز رکھا ہے لیکن جو مشرکین ہیں ان کے ساتھ اس قسم کے تعلقات بھی قرآن نے روا نہیں رکھے۔ گویا اتنا سا فرق تھا۔ اس فرق کے اعتبار سے مکے کے مشرکین ایرانیوں کے ساتھ اپنی نسبت رکھتے تھے۔ اور ان عیسائیوں یعنی بازنطینی رومنز اور اس نئی جماعت جو مکے میں پیدا ہوئی ہے کے متعلق یہ تھا کہ ان کا آپس میں رابطہ ہو سکتا ہے۔

یاد رکھیے! ابھی یہ جماعت مکے میں ہی تھی یہ جو 602ء سے 613ء تک کا واقعہ ہے اُس زمانے میں حضور ﷺ کی مکی زندگی ہے۔ اس کو چھٹا یا ساتواں نبوی سال کہیں گے۔ حضور ﷺ پہ چالیس سال کی عمر میں وحی کا نزول ہوا۔ اُس کے پانچ چھ سات سال کے بعد کی بات ہی سمجھ لیجیے کہ اتنا ہی عرصہ اس جماعت کو ہوا تھا۔ اس تفریق کے باعث مکے کے مشرک اپنی نسبت ان ایرانیوں کے ساتھ رکھتے تھے۔ اور یہ جو نئی جماعت مکے کے اندر پیدا ہو رہی تھی وہ عیسیٰ ﷺ کو بھی نبی مانتی تھی، حضرت موسیٰ کو بھی نبی مانتی تھی۔ وہ اپنے ذہن میں یہ سمجھتے تھے کہ ان کا اُن کے ساتھ تعلق اور رابطہ ہو سکتا ہے اسی لیے یہ ہمارے بھی خلاف ہیں اور ایرانیوں کے بھی خلاف ہیں۔ اس نسبت سے جب ایرانیوں کو ان رومنز پر یا عیسائیوں پر مسلسل فتوحات حاصل ہوئیں اور آخر الامر وہ اتنی بڑی فتح عظیم ہوئی کہ وہ یروشلم کی صلیب کو بھی اٹھا کر لے گئے تو اس سے اہل مکہ نے ایک بڑا جشن منایا حالانکہ ان اہل مکہ یا اہل عرب کو

اس فتح سے خود کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے اس اعتبار سے انہوں نے بھی خوشی منائی۔ یہ جو اتنی سی جماعت ہے ان کے لیے مکے میں پانچویں یا چھٹی نبوی سال کے دن انتہائی تکالیف، مشکلات اور پریشانیوں کے دن تھے۔ لیکن دعویٰ ان کا اُس وقت بھی یہ تھا کہ یہی نہیں کہ قریش ہمارے مغلوب ہو گئے، یہی نہیں کہ عرب میں خدا کی حکومت قائم ہوگی، بلکہ یہ بھی کہ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (9:33) دنیا کے ہر نظام کے اوپر ہم غالب آ کر رہیں گے۔ وہ اس پر ہنسا کرتے تھے کہ

ذُرَّةُ نَاجِزٍ وَ تَعْمِيرٍ بَيَابَانِ نَمِرٍ

اندازہ لگائیے کہ یہ چند نفوس ہیں: غریب ترین، کمزور ترین، اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ دعویٰ یہ کیا جا رہا ہے کہ ہم قریش پر ہی فتح نہیں بلکہ سارے عرب پر، عجم پر، ایران پر فتح حاصل کریں گے۔ اس پر وہ مخالفین کہا کرتے تھے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے چنانچہ جب ایرانیوں کی رومنز پر یہ فتح ہوئی ہے تو انہوں نے یہ کہہ کر ذہن بنایا کہ آپ دیکھیے اتنی بڑی خدا پرستوں کی قوم کا حال کہ خدا نے ان کا کیا کیا۔ کیا خدا نے ان کی کوئی مدد کی؟ اور یہ جن کو آتش پرست کہہ رہے ہیں انہوں نے کس طرح ان کو رگید کر رکھ دیا۔ اُس کے بعد وہ ان سے کہتے تھے کہ صاحب! رومنز ایمپائر جیسے لوگوں کی خدا کچھ مدد نہ کر سکا تو آپ کس کھیت کی مولیٰ ہیں۔ یہ تھا وہ پوائنٹ جو ایسے وقت میں وہاں اٹھا۔ اس کا اثر بھی یقیناً ان دلوں کے اوپر ہو سکتا تھا کہ واقعی رومنز ایمپائر جیسی جو ایک مملکت ہے وہ بھی ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکی تو اگر کل کو ان قریش نے ایرانیوں کے ساتھ اپنا Alliance (اتحاد) کر لیا جو کہ مشرک ہونے کی جہت سے اپنے آپ کو ایک دوسرے کے ساتھ متحدہ حماز والوں میں سے سمجھتے ہیں، اگر انہوں نے Alliance (اتحاد) کر لیا تو بات تو واقعی بڑی سخت ہو جائے گی۔ اس کا بھی ایک اثر تھا جو دلوں پہ پڑنا تھا۔

سورة الروم کو ان تاریخی واقعات کی روشنی میں دیکھنا یا سمجھنا زیادہ مفید ہے

میں یہ اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ یہ جو سورة الروم ہے اس کو عام طور پہ اس تناظر میں سمجھا نہیں جاتا۔ معاملہ رومنز ایمپائر کا، ایرانیوں کی سلطنت کا، آتش پرستوں کا، عیسائیوں کا تھا۔ اور ان کی آپس میں لڑائی تھی۔ ایک نے فتح حاصل کی اور دوسرا مغلوب ہو گیا۔ اُس کی اتنی بڑی اہمیت سے قرآن کریم میں اس کے لیے وحی نازل ہو رہی ہے۔ ایک سورة کی ابتدا یہاں سے کی جا رہی ہے اور اس کا نام ہی سورة الروم ہے۔ یہ کیوں اتنی اہمیت ہے؟ اس پس منظر کو سمجھنا بڑا ضروری ہے اور اس اہمیت کی وضاحت تو قرآن کریم نے دوسری ہی آیت کے اندر سمجھا دی۔ اور اب اس پس منظر کے بعد دیکھیے۔ پہلی ہی آیت سے کہ اَلَمْ (30:1)۔ یہ وہ مقطعات ہیں جن کے متعلق کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں کہ قرآن کریم کی بہت سی سورتیں ہیں جن کے ابتدا میں یہ حروف آتے ہیں۔ ان

کو الفاظ نہیں کہتے، یہ حروف ہی ہوتے ہیں، یہ Abbreviations (مخففات) ہوتی ہیں۔ میں اس کے متعلق بہت کچھ کہہ چکا ہوں^① اس لیے بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں۔

روم اور ایرانیوں کے متعلق قرآن حکیم کا بیان

اس سورۃ کی ابتدا بھی اَلَمْ ہي ہے جو میں ہمیشہ یوں کہا کرتا ہوں کہ ”خدا نے علیم و حکیم کا ارشاد یہ ہے کہ غُلِبَتِ الرُّومُ ۝ فِي اَذْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ ۝ فِي بَضْعِ سِنِينَ“^② (4-2:30)۔ ان رومیوں اور ایرانیوں دونوں کی یہ لڑائی ہو رہی ہے ان کا براہ راست قریش سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ وحی نازل ہو رہی کہ روم مغلوب ہو گیا، عیسائی مفتوح ہو گئے، ان کو شکست ہو گئی ہے۔ یہ تمہارے قریب ہی واقع ہوا ہے لیکن ان مشرکین مکہ کو کہہ دو کہ اس میں جشن منانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ہے وہ پیشین گوئی جو کہ ان سے کہہ دو کہ چند سالوں کے اندر تم دیکھو گے کہ یہی رومی ایرانیوں کو شکست دے دیں گے۔ یہاں ”بضع“ کا لفظ آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ جو بضع کا لفظ آتا ہے اس کا ترجمہ چند سال کیا جاتا ہے اور یہ عرصہ عربی زبان میں تین سے نو کی تعداد کے لیے بولتے ہیں۔ گویا تین سے نو سال کا عرصہ متعین کر دیا۔ کہا کہ ان سے کہہ دیجیے کہ تین سے نو سال کے اندر تم دیکھو گے کہ یہی رومی کس طرح ایرانیوں کو شکست دیتے ہیں۔ یہ جسے میں نے ایک قسم کی Specific (متعین) پیشین گوئی کہا، یہ قرآن کریم میں صرف ایک ہی واقعہ میں ملتی ہے۔ جس کا ذکر سورۃ الروم کی ان ابتدائی آیات میں آیا ہے۔ ان سے یہ کہا گیا ہے کہ ٹھیک ہے یہ رومی، یہ بازنطینی، یہ عیسائی مفتوح ہو گئے لیکن تم دیکھو گے کہ یہ پھر غالب آئیں گے اور یہ بھی ساتھ کہہ دیا گیا ہے کہ تین سے نو یا چھ سال کے عرصے میں تم دیکھو گے کہ ایسا ہو جائے گا۔ پھر کہا کہ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ (4:30) بات یہ ہے کہ جس کے لیے کہا گیا ہے کہ ماضی کے واقعات ہوں یا مستقبل کے سب قانون خداوندی کے مطابق واقع ہوتے ہیں وَ يَوْمَئِذٍ يُفْرِخُ الْمُؤْمِنُونَ ۝ يَنْصُرُ اللّٰهُ (5-4:30) اور یہ جو تم دل میں ٹھانے بیٹھے ہو اور اس وقت طنزاً تمسخر اڑا رہے ہو کہ یہ اتنی سی جماعت

- ① ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویز: مفہوم القرآن، تعارف ص۔ نیز: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورہ طہ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2005ء ص۔ 21 تا 22۔ مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ الکہف و سورۃ مریم، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2004ء ص۔ 215 تا 216 نیز مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 مکمل، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2006ء ص۔ 97۔
- ② اس سرزمین میں جو عرب کی سرحد سے قریب واقع ہے (یعنی فلسطین اور شام میں) رومی (ایرانیوں سے) مغلوب ہو گئے۔ (اور یہ چیز مشرکین عرب کے لیے بڑی خوشی کا باعث ہوئی کہ اہل کتاب، مشرکین کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔) لیکن تم دیکھو گے کہ چند سال کے اندر اندر یہی مغلوب رومی اپنے دشمنوں پر غالب آجائیں گے (پرویز: مفہوم القرآن ص۔ 929)۔

ہے اور ان کے اتنے اتنے بڑے عزائم ہیں گویا ”کیا پدی کیا پدی کا شور با“۔ کہا کہ یہ جو تم نے رومن ایمپائر کے متعلق کہا ہے تو اسے تم دیکھ لو گے کہ زیادہ سے زیادہ چھ سے 9 (نو) سال کے عرصے میں یہی رومن پھر ایرانیوں کے اوپر غالب آئیں گے۔ اور آپ حیران ہونگے کہ نو سال کے اندر 622ء میں رومن نے پلٹ کر پھر حملہ کیا اور ایران کے دارالخلافہ تک جا پہنچے تھے۔ اور جب یہ یہاں ایران کے دارالخلافہ تک پہنچے ہیں تو یہ وہ دن تھا جس دن بدر کے میدان میں مسلمانوں کی جماعت کو قریش پر فتح حاصل ہوئی۔ بات یہ کہنی تھی۔ یَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ ۝ بِنَصْرِ اللَّهِ (30:4-5)۔ آج یہ جشن منا رہے ہیں، چند سالوں کے عرصے میں جو زیادہ سے زیادہ تین سے نو یعنی چھ سال کا عرصہ ہو سکتا ہے یہ رومی پھر ایرانیوں پر فتح پالیں گے۔

جنگ بدر کے بعد خود مشرکین قریش کے الم انگیز ماتم کی کیفیت

کہنے والی بات تو قریش سے تھی کہ تم جو انہیں کہہ رہے ہو کہ یہ اس قدر کمزور اور ناتواں قوم ہے اور ان کے یہ عزائم اس قدر اعلیٰ ہیں اور تم ان کا مذاق اڑا رہے ہو اور اس کے لیے اتنی بڑی مملکت بازنطینی ایمپائر کی نظیر پیش کر رہے ہو تو کہا کہ جہاں تک اس شکست کا تعلق ہے تو یہ بھی تمہیں ہم بتائے دیتے ہیں کہ اسی چھ سال کے عرصے میں تم دیکھو گے کہ یہی رومن ایمپائر، یہی عیسائی، کس طرح سے ان مجوسیوں کے اوپر غالب آتے ہیں۔ اور بات یہ ہے کہ یہ جو تم اس ننھی سی جماعت کا، اس ضعیف سی جماعت کا، آج اس طرح سے مذاق اڑا رہے ہو، مضحکہ اڑا رہے ہو، تم دیکھو گے کہ ادھر یہ ہوگا اور ادھر انہی کے ہاتھوں تمہیں وہ شکست نصیب ہوگی کہ روتے رہو گے۔ اور واقعی جنگ بدر کے بعد قریش کے ہاں جو ماتم ہوا ہے تو پوچھیے نہیں کہ کتنا عظیم ماتم تھا۔ کہرام مچ گیا تھا یعنی اہل مکہ کو آرڈیننس ایٹھ کرنے کی ضرورت پڑ گئی تھی کہ کسی گھر سے اونچی آواز سے رونے کی آواز نہیں آنی چاہیے کیونکہ اس سے قبائل کے اوپر بڑا اثر ہو جاتا تھا۔ قریش کے ہاں ہونا اور پھر رونا باعث تعجب تھا۔ انہوں نے By Ordinance (آرڈیننس سے) منع کر دیا کہ رونے کی کوئی آواز نہ اٹھے۔ بدر کے میدان میں ان کے بڑے بڑے ابنائے قوم کسی کا بیٹا، کسی کا باپ، کسی کا بھائی، کسی کا شوہر، تمام کے تمام وہاں قتل ہو گئے تھے^①۔ ہر گھر کے اندر ماتم کی صف پچھی ہوئی تھی لیکن انہوں نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ کوئی شخص رونے نہ پائے۔ تاریخ میں بڑا دلچسپ واقعہ آتا ہے کہ ان کے ہاں کا ایک سردار^② تھا۔ اُس کا بیٹا اس جنگ میں مر گیا تھا۔ اُس کو بھی وہ

① رؤسائے قریش جو شجاعت میں نامور اور قبائل کے سپہ سالار تھے، ایک ایک کر کے مارے گئے۔ ان میں شیبہ، عقبہ، ابو جہل، ابوالختر، زعمہ بن الاسود، عاص بن ہشام، امیہ بن خلف، منبہ بن الحجاج، قریش کے سر تاج تھے۔ (شبلی نعمانی: سیرۃ النبیؐ، ناشران قرآن، ص-335)۔

② تاریخ اس سردار کا نام اسود بتاتی ہے (شبلی نعمانی: سیرۃ النبیؐ، ناشران، ص-340)۔

ضبطِ فغاں کرنا پڑا تھا کیونکہ یہ جوان کے ہاں پنچائیت کے احکام ہوتے تھے وہ بادشاہوں کے حکموں سے بھی زیادہ سخت ہوتے تھے۔ اُس کو بھی ضبطِ فغاں کرنا پڑا۔ ایک دن اُس نے سنا کہ کہیں کوئی رونا کی آواز آرہی ہے، تو اُس نے اپنے نوکر سے کہا: جاؤ دیکھو کہ کیا قریش نے اپنا وہ حکم واپس لے لیا ہے جس میں رونا بند کیا ہوا تھا۔ جاؤ اور جا کر دیکھو تا کہ میں بھی اپنے دل کی بھڑاس نکال سکوں۔ وہ گیا، واپس آیا، کہنے لگا کہ جی نہیں، وہ تو فلاں (عورت) کا اونٹ مر گیا تھا وہ اُس پہ رو رہی تھی۔ اُس پہ ایک نے بڑا عجیب^① مرثیہ لکھا ہے کہ ہماری حالت بھی اے آسمان! دیکھ اونٹ کے مرنے کے اوپر تو رونے کی اجازت ہے لیکن مجھے بیٹے کے مرنے پہ رونے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ جو بدر کی جنگ ہے اس کے متعلق دنیا کے مورخین سے پوچھیے۔ Historian's History of the World کے اندر دیکھیے کہ وہ کس طرح سے اس جنگ کے متعلق لکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس جنگِ بدر نے تو دنیا کی تاریخ کو بدل دیا تھا۔ مسلمان صرف تین سو تیرہ نفوس تھے۔ اب اس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ یہ جو قرآن نے اس وقت مشرکین کو یہ کہا تھا کہ یہ جشن یوں نہ مناؤ، یہ جن کے متعلق تم کہتے ہو تو انہی کو تم نے دیکھ لینا ہے کہ اتنے دنوں میں کیا ہوتا ہے۔ اور یہ جن کا تم اس وقت طر اور مذاق اڑا رہے ہو ان کے متعلق تم دیکھ لینا کہ انہی چھ سال کے عرصے میں کیا ہوتا ہے۔ یہ 2 ہجری کا واقعہ ہے۔ اُس دوران میں یہ جو انقلاب تھا کہ بدر کے میدان نے دنیا کی تاریخ کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ یہ ہے وہ بات جس کے لیے یہ جو سورۃ الروم ہے یہ وحی کی رو سے نازل ہوئی اور اُس میں یہ بات کہی گئی تھی کہ تم دیکھو گے خارجی دنیا میں، ان ایرانیوں و رومیوں اور خود تمہاری اپنی دنیا کے اندر بھی کہ یہ کس طرح سے ایک انقلاب واقع ہوتا ہے۔ تم جو قریش ہو تمہیں اپنی قوت و مملکت کے اوپر جو اس قدر فخر و ناز ہے تو تم دیکھو گے کہ اس کمزور اور ناتواں سی جماعت کے ہاتھوں تمہیں کتنی بڑی شکست اٹھانی پڑتی ہے۔ پہلی دفعہ جو روزے فرض ہوئے تھے تو یہ 17 روزے رکھنے کا نتیجہ تھا۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ پہلے سال کے روزے تھے۔

③ شبلی نعمانی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

اونٹ کے گم ہونے پر روتی ہے، اور اس کو نیند نہیں آتی، اونٹ پر مت رو، بدر پر آنسو بہا، جہاں قسمت نے کی کی، تجھ کو رونا ہے، تو عقل پر رو، اور حادثہ پر رو، جو شیروں کا شیر تھا۔

اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

وَيَمْنَعُهَا مِنَ النَّوْمِ السُّهُودِ	ابکی ان یضل لها بعیر
عَلَى بَدْرِ تَقَاصِرُ الْجُدُودِ	وَلَا تَبْكِي عَلَى بَكْرٍ وَلَكِنْ
وَتَبْكِي حَارِثًا اسد الاسود	فَتَبْكِي ان بکیت علی عقیل

(شبلی نعمانی: سیرۃ النبی، ناشران قرآن، ص 340 تا 341)۔

اُس کے بعد سن 8 ہجری کے جو رمضان کے روزے تھے اُس میں تو ابھی نو دس روزے ہی رکھے تھے کہ مکہ فتح ہو گیا۔ آپ صیام یا روزوں کا فلسفہ پوچھتے ہیں تو فلسفہ مجھ سے کیوں پوچھیے بلکہ قرآن سے پوچھیے کہ جس نے کہا ہے کہ لَتَكْبَرُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَيْنٰكُمْ (2:185) تاکہ تم خدا کی کبریائی قائم کر سکو اور پھر دنیا کی تاریخ سے پوچھیے کہ ان روزوں نے کس طرح سے انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ پھر بیان وہیں چلا جاتا ہے:

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

وَيَوْمَئِذٍ يَقَرُّحُ الْمُؤْمِنُونَ ۝ يَنْصُرِ اللَّهُ ط يَنْصُرُ مَنْ يَشَاءُ ط وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (5-4:30) یہ دن مومنین کے لیے بڑی خوشی کا موجب ہوگا۔ یہ نصرت ہے لیکن ملتی اُسے ہے جو حاصل کرنا چاہے۔

قرآن حکیم کے غلط تراجم نے ہماری سوچ کا رخ ہی بدل دیا

میں بار بار اس لفظ ”من يشاء“ کے ترجمے پہ آیا کرتا ہوں کہ جب ہم نے سب کچھ تقدیر کے حوالے کر دیا تو اس کے ترجمے کر دیئے کہ جسے وہ چاہتا ہے اپنی نصرت دیدیتا ہے۔ تو ہم تو بے بس ہو کر رہ گئے۔ اگر ہمیں نہیں مل رہی ہے تو ہمارا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ وہ دینا نہیں چاہتا۔ اور اگر اُس کے بعد ہم لینا چاہیں کوشش کریں تو یہ تو خدا کے خلاف جنگ ہوگئی کہ وہ دینا نہیں چاہتا اور ہم لینا چاہتے ہیں۔ یہ تو پھینا چھٹی ہوگئی۔ کیا پوچھتے ہو کہ ہم نے اس قرآن کے ساتھ کیا کیا۔ اور پھر اس قرآن نے جو ہمارے ساتھ کیا ہے اُس کو دیکھیے۔ يَنْصُرُ مَنْ يَشَاءُ ط وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (5:30) غلبے کی کیفیت یہ ہے کہ اسی مٹھی بھر جماعت نے چند سالوں کے عرصے میں اُس دور کی ساری تاریخ کی کاپی لٹ کر رکھ دی ہے۔ وہ قریش کہ جن کی یہ کیفیت تھی وہ اسی مٹھی بھر جماعت کے سامنے پابجولاں قیدیوں کی حیثیت سے حضور ﷺ کے سامنے کھڑے تھے۔

ذاتِ خداوندی اگر غلبے اور قوت کی مالک ہے تو اس میں بھی صفتِ رحیمی کا ہی ظہور ہوتا ہے

خدا تو عزیز تھا، غلبے کی کیفیت تو یہ تھی۔ کہا کہ وہ ساتھ رحیم بھی ہے، وہ چنگیز اور ہلاکو ❶ نہیں ہے، مستبد حاکم نہیں ہے کہ غلبہ ہی

❶ چنگیز اور ہلاکو کے کوائف کے لیے ملاحظہ کیجیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005ء، ص۔ 310

غلبہ ہے بلکہ اُس کے ساتھ رحمت کی کیفیت بھی یہ ہے یعنی وہ مواقع بہم پہنچاتا ہے کہ تم میں جو کمزوریاں رہ گئیں تھیں ان کو پورا بھی کر لو۔ اور مواقع کی کیفیت یہ تھی کہ یہ سارے سردار پابجولاں حضور ﷺ کے سامنے کھڑے تھے، آپ ﷺ نے پوچھا کہ کہو تمہارے ساتھ اب کیا سلوک کیا جائے؟ وہ خواہ قیدی تھے، مفتوح تھے لیکن پھر بھی ان کی رگوں میں حمیت تھی وہ معافیاں مانگنے والی قوم نہیں تھی، انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے ہم نے جنگ کی ہے اور جنگ میں فتح بھی ہوتی ہے، شکست بھی ہوتی ہے۔ ہمیں شکست ہوئی ہے تو فاتح مفتوح کے ساتھ جو سلوک کیا کرتا ہے تو ہم اس کے مستحق ہیں۔ ان کے ہاں گردن اڑا دیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے کہا کہ یہ تم نے ٹھیک کہا ہے کہ فاتح مفتوح کے ساتھ یہ کیا کرتا ہے لیکن ایک شریف انسان دوسرے شریف انسان کے ساتھ یہ نہیں کیا کرتا۔ لَا تَثْرِبَنَّ عَلَىٰ كُمْ الْيَوْمَ (12:92) کوئی تمہارے اوپر گرفت نہیں ہے، کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (30:5) آپ نے دیکھا کہ خدا کی یہ صفت کہاں آئی ہیں۔ عزیز ہے تو ایسا کہ قریش کے اوپر فتح ہے تو اس قسم کی فتح ہے اور اُس کے بعد رحمت ہے تو ایسی رحمت ہے کہ کسی ایک سے بھی کوئی انتقام نہیں لیا گیا۔ چھوٹے چھوٹے سے بھی واقعات آتے ہیں۔ ایک شعر^① تھا، وہ حضور ﷺ کے خلاف ہجو میں بڑی سخت کلامی سے کام لیا کرتا تھا، وہ بھی سامنے آیا تو ایک صحابی^② نے کہا کہ حضور ﷺ اتنی تو اجازت دیدیجئے کہ اس کے سامنے سے دو دانت میں اکھیڑ دوں تاکہ یہ وہ الفاظ جو یہ کہا کرتا تھا دوبارہ نہ کہہ سکے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اُس زمانے میں یہ ان دانتوں سے ہمارے اور خدا کے اسلام کے خلاف کہتا تھا اب یہ دانت رہنے دو تاکہ ان سے یہ خدا کی حمد و ستائش کیا کرے۔ قرآن نے کہا ہے کہ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (94:1)۔ دیکھا ہم نے تمہارے دل میں کشادہ پیدا کر دی ہے۔ یہ شرح صدر ہے۔ عزیز کے ساتھ رحیم ہے۔

خدا تعالیٰ کے وعدہ سے مراد خدا کا غیر متبدل قانون ہوتا ہے

وَعَدَ اللَّهُ ط لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (30:6)۔ جہاں بھی خدا کا وعدہ آتا ہے تو اُس کے معنی وہ بات ہوتی ہے جو اُس کے قانون کی رو سے ہو کر رہتی ہے۔ اُس کے قانون کی رو سے تو یہ ہے کہ جو اُس نے قانون بنایا ہے وہ اٹل ہے، وہ الحق ہے۔ اُس کے خلاف کوئی کچھ نہیں کر سکتا، اُس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے جب یہ کہا گیا ہے کہ نو سال کے اندر اندر یہ ایسا ہو کر رہے گا تو اُس وقت بھی یہ خدا کی رو سے ہم نے یہ کہا تھا۔ یہ ہوا ہے اور خدا کا قانون کبھی بدلتا ہی نہیں ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

① یہ سہیل بن عمرو تھا، نہایت فصیح اللسان تھا (شبلی نعمانی: سیرۃ النبیؐ ناشران قرآن، ص-336)۔

② یہ ہیں حضرت عمرؓ جنہوں نے یہ کہا تھا (شبلی نعمانی: سیرۃ النبیؐ ناشران قرآن، ص-336)۔

مستقل کامیابی کا انحصار مادی اسباب کے ساتھ ساتھ انسان کی نفسیاتی تبدیلی پر منحصر ہوتا ہے آگے بات کہی ہے کہ وہ کون نہیں جانتے اور کیوں نہیں جانتے؟ کہ **يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ** (30:7) ان کی نگاہیں صرف Physical (طبعی) سامان اور اسباب پر ہوتی ہیں۔ یہ بھی نہایت ضروری ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ توپ پہ نہیں بلکہ توپ کے پیچھے جو آدمی کھڑا ہوتا ہے شکست و فتح کا انحصار اُس پہ ہوتا ہے۔ شمشیر و سناں ضروری ہیں، توپ اور بندوق نہایت ضروری ہیں لیکن یہ **ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (30:7) ہے، یہ طبعی اسباب ہیں اور طبعی اسباب بھی ضروری ہیں لیکن اصل شے تو وہ انسان ہے اُس انسان کے اندر کی تبدیلی ہے اُس کی ذہنیت کی تبدیلی ہے جو شکست کا اور فتح کا معیار ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ظاہری اسباب کی بنا پہ کچھ وقت کے لیے آپ غلبہ حاصل کر لیں۔ عربی زبان کے اندر **ظَاهِرًا** کا لفظ عجیب لفظ ہے۔ ویسے تو ظاہر کے معنی وہی ہیں کہ جو نمود میں آ جائے **ظَاهِرًا** کے معنی غالب آ جانا بھی ہوتے ہیں۔ یہ ٹھیک بات ہے کہ محض طبعی ساز و سامان کی بنا پر بھی غالب آیا جاسکتا ہے لیکن وہ بہت تھوڑے وقت کے لیے ہوتا ہے۔ **وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ** (30:7) مستقبل کے اوپر ان کی نگاہ نہیں ہوتی لیکن وہ لوگ جن کے ذہن میں جن کی نگاہوں میں **ظَاهِرًا** سامان دنیا کے علاوہ اقدارِ خداوندی بھی ہوتی ہیں تو یہ اصل وہ لوگ ہیں جن کو حقیقت میں فتح اور نصرت حاصل ہوتی ہے۔ اور جو مستقبل ہے وہ انہی کے حصے میں آتا ہے۔ وہ عارضی چیز ہوتی ہے، ہنگامی چیز ہوتی ہے، حادث کی رو سے آتی ہے۔ یہ قانون کی رو سے آتی ہے اس لیے مستقبل ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو اقدارِ خداوندی کے بھی قائل ہوتے ہیں اور اُس پہ بھی قائم رہتے ہیں۔ یہ جو 313 لوگ تھے جن کو بدر کے میدان میں اس طرح سے فتح حاصل ہوئی ہے اور مکہ اس طرح سے جفتح کیا، اور اُس کے بعد تو آپ تاریخ میں دیکھیے گا کہ سارا ایران فتح کیا، رومن ایمپائر کے یہ سارے حصے صرف چند سالوں کے عرصے کے اندر فتح کیے۔ لیکن فتح کیسے کیے تھے؟ یہ ٹھیک ہے کہ **ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (30:7) جنگی ساز و سامان کی بھی ضرورت تھی، وہ بھی حاصل کیا، وہ بھی ان کے پاس تھا کیونکہ اُس کے بغیر تو جنگ لڑی نہیں جاسکتی تھی لیکن ان کا مدار صرف اُس پر نہیں تھا، ان کا مدار کیریکٹر کے اوپر تھا۔ دراصل یہ جتنی فتوحات حاصل ہوئی ہیں تو یہ ان کے حسن کردار اور کیریکٹر کی مضبوطی کی بنا پر حاصل ہوئی ہیں۔

جب انسان کی نفسیات خدا کے قانون کی ترجمان بن جائے تو پھر ہر مزان بھی شکست کھاتا ہے آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے ہرمزان کا واقعہ سنایا تھا۔ یہ ایران کا گورنر تھا۔ جب وہ قید ہو کر حضرت عمرؓ (644/45-581ء) کے سامنے آیا تو آپؐ نے اُس سے یہ سوال کیا تھا کہ تمہارا معاملہ تو بعد میں طے کریں گے، پہلے ایک سوال کا جواب دو کہ تم وہ ایرانی

تھے جو ہمیں اس قدر حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے کہ ہمارے ساتھ کوئی حسن معاملہ یا معاملات یا روابط قائم کرنا تو ایک طرف رہا، تم ایرانی عرب والوں کے ساتھ جنگ کرنا بھی باعثِ جنگ سمجھتے تھے۔ کہا کہ تم تو ہمیں اس قدر باعثِ نفرت سمجھا کرتے تھے ہمارے ساتھ جنگ کرنا بھی باعثِ جنگ سمجھتے تھے۔ آج کیا ہوا ہے کہ ہم وہی عرب ہیں اور تم وہی ایرانی ہو، کیفیت یہ ہے کہ سارا ایران ہمارے پاؤں تلے ہے تمہارا بادشاہ جان^① بچانے کے لیے پن چکیوں میں پناہ ڈھونڈ رہا ہے۔ کہا: ہمیں یہ بتادو کہ یہ ہوا کیا ہے یہ کیسے ہوا ہے؟ ہم سے پوچھا جاتا تو ہم کوئی جواب ہی نہیں دے سکتے، یہی کہتے کہ اللہ کی مرضی سے ہو گیا۔ وہ جواب دے رہا ہے۔ کہنے لگا کہ عمر ♦! مجھ سے کیوں پوچھتے ہو اپنے آپ سے پوچھو بات تو بڑی صاف ہے۔ اس سے پیشتر جب ایرانی اور عرب ایک دوسرے کے سامنے آتے تھے تو ایک طرف ہم اکیلے ایرانی ہوتے تھے اور دوسری طرف تم عرب اکیلے ہوتے تھے۔ اب جب میدانِ جنگ میں آتے ہو تو ہم ایرانی تو اکیلے ہوتے ہیں اور تم عرب اور تمہارے ساتھ تمہارا خدا ہوتا ہے یہ دہل جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت تم کو شکست نہیں دے سکتی۔ یہ ہرمزان کے الفاظ ہیں کہ عمر ♦! ایران کیا شے ہے؟ یہ ہے نصرتِ خداوندی۔ لیکن یہ نصرت کیا تھی؟

عزیزانِ من! ایک چیز کو یاد رکھیے کہ صرف ان الفاظ کو ذہن میں اس طرح نہ رکھیے کہ ہاں صاحب! وہ کوئی اللہ کی طرف سے ایسا ہو جاتا ہے ہمیں اس پہ ایمان رکھنا چاہیے کہ اللہ کی نصرت ہوتی ہے اور اُس کی وجہ سے یہ ہو جاتا ہے۔ آج کل بھی آپ دیکھتے ہو گئے کہ عام طور پہ اشتہارات بھی لگے ہوتے ہیں، رمضان کے مہینے کی برکات کا لکھا ہوتا ہے کہ اس مہینے کا پہلا عشرہ (یعنی دس دن) رحمت کے ہوتے ہیں، درمیان کے دس دن مغفرت کے ہوتے ہیں اور آخری دس دن نجات کے ہوتے ہیں۔ یہ ہزاروں لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں اشتہار بانٹے جاتے ہیں، ہر سال بانٹے جاتے ہیں۔ ہر ایک ان کو پڑھتا بھی ہے لیکن کبھی کسی نے کھڑے ہو کر سوچا بھی ہے کہ یہ بات کیا ہے؟ یہ ہوتا کیا ہے؟ ان عربوں نے پورے کا پورا ایران فتح کیا ہے۔

دینِ اسلام میں مالِ غنیمت کی کیفیت اور صحابہ کرام ؓ کا کردار

یہ ”غنیمت“ کیا ہوتا ہے؟ یہ عرب بھیڑیں اور بکریاں پالتے تھے اور جب جنگ میں لوٹ مار ہوتی تھی تو یہ بھیڑ بکریاں لوٹ کر لے جاتے تھے۔ وہ غنم بھیڑ کو کہتے ہیں اور ”غنیمت“ کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ”ان کی اتنی بھیڑیں لے گئے۔“ اور آج ہمارے ہاں غنیمت کا لفظ اس طرح ہو گیا کہ ”صاحب! اس کو غنیمت جانو۔“ یہ وہی عرب تھے جنہوں نے پورے کا پورا ایران فتح کیا ہے۔ ان کی

ہزاروں سال کی جمع شدہ دولت، نوادرات انہیں ملے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ وہاں پہ ایک ایک ہیرا کتنی کتنی قیمت کا ہوگا، یہ سارا کچھ وہاں ایران میں ان عربوں کے ہاتھ میں آیا۔ پہلے میدان جنگ میں ہوتا یہ تھا کہ جب فتح ہوتی تھی تو جو کسی سپاہی کے ہاتھ میں آتا تھا وہ اُس کا مالِ غنیمت ہوتا تھا، ہر فرد جتنا لوٹ سکتا تھا وہ زیادہ سے زیادہ لوٹ لیتا تھا۔ اسلام کی جنگ میں پہلی تبدیلی تو یہ آئی کہ جنگ مالِ غنیمت کے لیے نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ (581-644/45 AD) کا وہ فقرہ بڑا عجیب ہے کہ ”جس طرح مملکت کے لیے جنگ ملک فتح کرنے کے لیے نہیں ہے، اسی طرح سپاہی کے لیے جنگ مالِ غنیمت لوٹنے کے لیے نہیں ہے۔“ فتح ایران کے بعد وہ سارا جتنا مال تھا وہ اپنے مرکز میں بھیج دیا۔ پوچھو نہیں کہ وہ کتنا تھا۔ اُس کے ساتھ جرنیل ^① نے ایک چٹھی بھی بھیجی۔ اُس میں لکھا یہ تھا کہ ”خلیفۃ المؤمنین! آپ کو یہ مال و دولت دیکھ کر یقیناً تعجب ہوگا، ہمارے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ہمیں ایک دن یہ کچھ بھی مل جائے گا۔ ہم کھجوروں کی گٹھلیوں کے ستوپہ گزارہ کرنے والی قوم تھے۔ یہ سارا کچھ ہمارے حصے میں آیا ہے۔ آپ کے لیے یہ دولت، یہ انبار، یہ نوادرات بڑی خوشی کا موجب ہو گئے۔ لیکن عمرؓ! اس سے زیادہ خوشی کا موجب ایک اور خبر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ ساری دولت اور نوادرات جو ہیں یہ پورے ملک میں بکھرے ہوئے تھے اور ہمارے سپاہی فاتحین کی حیثیت سے پورے ملک میں بکھرے ہوئے تھے، جہاں انہیں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ عمرؓ! ان سپاہیوں میں سے کسی نے ایک سوئی بھی اپنے پاس نہیں رکھی اور سارے کا سارا لاکر یہاں جمع کر دیا ہے۔“ آپ دیکھتے ہیں کہ خدا کی نصرت کس کو ملتی ہے۔ خط کا یہ حصہ پڑھا تو حضرت عمرؓ (581-644/45 AD) کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ حضرت علیؓ (600-661 AD) ساتھ کھڑے تھے۔ کہا کہ عمرؓ کیا بات ہے؟ آپ نے وہ خط ان کو دیا کہ یہ ہے۔ کہتے لگے کہ ”عمرؓ! واقعی خوشی کی بات ہے لیکن عمرؓ! تم سمجھ بھی ہو کہ یہ سپاہی اتنے دیانتدار کیوں ہو گئے؟ اس لیے کہ مملکت کا سربراہ دیانتدار ہے۔“

جیسا سربراہ حکومت ویسی ہی قوم

عزیزانِ من! تاریخ کے اس ایک ایک فقرے کے اندر آپ کے اسلام کی ساری تاریخ پنہاں ہے۔ تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ ”جس انداز کی حکومت ہوگی، اُسی انداز کی قوم ہو جائے گی۔“ وہ کہتے ہیں کہ تاریخ کی اس حقیقت کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ ”عمرؓ! تمہارا سپاہی اس لیے دیانتدار ہے کہ سربراہ مملکت دیانتدار ہے۔“ یہ جو اللہ کی نصرت ”من یشاء“ والی چیز ہے وہ یہی ہے جو لینا چاہے

① یہ ہیں فاتح ایران حضرت سعدؓ جنہوں نے 16ھ مطابق 637ء فتح مدائن کے بعد یہ چٹھی بھیجی تھی (پرویز: شاہکار رسالت، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 1987ء، ص 181)۔

یہ اُس کو ملتی ہے، یہ انہیں ملی تھی، جنہوں نے اسے لینا چاہا تھا۔ یہ نصرت اس لیے ملی تھی کہ ان کی نگاہیں مستقبل کے اوپر تھیں، مفادِ عاجلہ کے اوپر نہیں تھیں: اس زندگی کے مستقبل پہ بھی اور آنے والی زندگی کے مستقبل کے اوپر بھی۔ اسی کو کہتے ہیں کہ یہ جتنے طبعی اور مادی اسباب ہیں ان کے ساتھ اقدار و اصول جو خدا نے بیان کیے ہوئے ہیں کی پابندی ساتھ رکھیے تو یہ ظاہراً مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (30:7) بھی تمہیں حاصل ہوگا اور مستقبل کی شادمانیاں بھی حاصل ہونگی۔ کہا کہ اس پہ غور کرو۔ یہ وہی ہے جو میں نے کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ اُس نے کہہ دیا نصرت حاصل ہوگی اور ہم نے سمجھ لیا کہ سبحان اللہ جی واقعی اللہ کی نصرت ہے، جسے چاہتا ہے دیدیتا ہے۔ کہا کہ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا (30:8) یہ غور و فکر کی بات ہے جو ہم کہہ رہے ہیں۔ جو بات غور و فکر کی ہوتی ہے وہ تو ہمیشہ اسباب اور دلائل کے ساتھ سامنے آتی ہے جب Cause (سبب) ہوتا ہے تو Effect (نتیجہ) سامنے آتا ہے۔ فکر کے تو معنی ہی یہ ہیں۔ اس لیے کہا کہ اس پہ سوچو۔

نصرت کا حصول کس طرح ممکن ہوتا ہے؟

فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (30:8) پہلے اپنے اندر غور کرو کہ یہ نصرت کیسے ملی ہے؟ یہ غور تو ہو گیا جو میں نے ابھی ایران کے فاتح جرنیل کے خط کا یہ واقعہ سنایا ہے۔ میں نے تو ایسا ایک واقعہ سنایا، اُس دور کی تو پوری ہسٹری اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی بات سے بھی یوں گزر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ تو بڑی بات بتا دی کہ ایران کی اُس دولت میں سے کسی فاتح سپاہی نے ایک سوئی بھی نہیں لی۔ خلیفہؓ نے شاید کہیں کہہ دیا کہ دودھ میں پانی مت ملایا کرو۔ راتؓ کو خیمے کے باہر خلیفہؓ خود سنتے ہیں کہ ماں بچی سے کہہ رہی ہے کہ بیٹا! اٹھو دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا کر چولہے پر رکھ دو۔ ہمارے ہاں ہر گھر میں یہ ہوتا تھا۔ اب تو ہمارے ہاں دودھ وہ ہوتا ہی نہیں کہ چولہے پہ رکھا جائے۔ ہمارے ہاں جو دودھ میں پانی ملایا جاتا تھا، اُسے ”دھون“ؓ کہتے تھے، وہ اس لیے ڈالا جاتا تھا کہ گرم کرتے وقت پانی اڑ جائے گا اور دودھ رہ جائے۔ اسی طرح سے ماں نے کہہ دیا کہ بیٹا! چولہے پہ دودھ رکھ دو اور وہ تھوڑا سا پانی اُس میں ڈال دینا۔ بچی کہنے لگی کہ اماں جان! دودھ کو تو میں چولہے پہ رکھ دوں گی لیکن پانی نہیں ڈالوں گی۔ ماں کہنے لگی کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے، روز تو یہ کرتے تھے۔ بچی کہنے لگی کہ وہ تو ٹھیک ہے لیکن آج خلیفہؓ نے یہ کہا تھا کہ دودھ میں پانی نہ ڈالا

① یہ حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ دوم (634-644/45AD) ہیں۔

② حضرت عمر فاروقؓ ایک رات گشت کرتے کرتے تھک گئے تو ایک خیمہ کے باہر کہیں ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

③ پانی ملا ایسا دودھ جس میں دودھ کم ہو اور پانی زیادہ (یہ لفظ موجودہ مشرقی پنجاب کے ضلع گورداسپور اور اس کے گرد و نواح میں بولی جانے والی پنجابی زبان کا ہے)۔

کرو۔ ماں نے اسے Seriously (توجہ و سنجیدگی سے) لیا ہی نہیں، اُس نے کہا کہ ڈالو جیسے روزِ ذاتی ہو ”اتھتھے کبھڑا تیرا خلیفہ دیکھدا پیا ہیگا اے۔“ ❶ کہنے لگی کہ امی جان! خلیفہ نے کہا تھا کہ یہ خدا کا حکم ہے اس لیے یہ خلیفہ کی بات نہیں ہے، خدا دیکھ رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ انہیں یہ نصرت کیسے ملی تھی؟ قرآن کہتا ہے کہ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (30:8) اپنی دنیا میں تم کیا دیکھو گے ہماری دنیا میں دیکھو کہ کیا تمہیں اُس میں کہیں بددیانتی نظر آتی ہے۔ سوچو کہ ایک پودے کو جتنی کھاؤ جتنا پانی، جتنی روشنی کی ضرورت ہے تو کیا اُس میں وہ ذرا سی بھی بددیانتی کرتا ہے اور کس طرح سے تمہیں وہ عمدہ پھل دیدیتا ہے، وہ اپنے حصے میں تو کچھ نہیں رکھتا۔ کبھی بھی یہ نہیں ہوتا کہ شام کو دیکھو کہ اُس میں کچھ نہایت عمدہ آم لٹک رہے ہوں اور صبح دیکھیں کہ دو آم غائب ہیں کہ جی، دو آم یہ درخت کھا گیا۔ وہ درخت اُس میں سے نہیں کھاتا۔ یہ سارا سلسلہ پوری دیانت سے چل رہا ہے۔ اگر سورج اپنی حرارت کے اندر سے اربواں حصہ ایک دن کم کر دے تو یہ ساری زمین اُسی وقت بے بس ہو جائے، دیکھو کہ پوری مشینری، مفادِ کلی کے قانون کے مطابق چل رہی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اس خارجی کائنات پر غور کریں کہ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ ❷ (30:8)۔ اسے بالحق کہتے ہیں کہ کہیں کوئی بددیانتی نہ ہو، کسی کے حق میں کمی نہ کی جائے کہ وہاں کچھ بھی نہ ہو اور پھر کہا کہ یہ چیز ابدی نہیں ہے۔ یہ ایک وقتِ معینہ تک کے لیے ہے۔

جوابِ دہی کے عمل سے لا تعلقی کا تصور انسان کی ابدی زندگی کے لیے پیغامِ موت ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے اسے اَجَلٍ مُّسَمًّى (30:8) کہا ہے یعنی یہ کائنات تو ایک وقتِ معین تک کے لیے اس طرح سے کام کرنے والی چیز ہے۔ لیکن انسان ہے کہ اُس نے تو یہ طبعی زندگی بسر نہیں کرنی، اس نے تو اس سے بھی آگے چلنا ہے۔ اس قدر بین شہادت کے باوجود اکثر لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ (30:8) بددیانتیاں وہی کرتے ہیں جن کو اس پہ ایمان نہیں ہوتا کہ ہم نے اپنی ان تمام چیزوں کا جواب دینا ہے، اس کا نتیجہ بھگتنا ہے۔ ذہن میں یہی ہوتا ہے کہ جو دنیاوی اسباب و سامان ہیں ان کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں، انتظام کر لیا ہے کہ پکڑا نہ جاؤں، اگر پکڑا جاؤں تو رشوت سے چھوٹ جاؤں۔ یہ ذہن میں ہوتا ہے تو پھر اُس نے کہا کہ ان کے لیے کوئی نصرتِ خداوندی نہیں ہے۔ یہ کچھ وہی کرتے ہیں کہ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ (30:8) جنہیں اس کا انکار ہو۔ ایک ایمان ہے جسے قرآن لقاء رب کہتا ہے تو

❶ یہاں کونسا تمہارا (وہ) خلیفہ دیکھ رہا ہے۔

❷ یہ تمام نظام (ارض و سما اور جو کچھ ان کے درمیان ہے) ایک وقتِ معینہ تک تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے (پرویز: مفہوم القرآن

یوں ترجمہ کرنے سے کہ جیسے کسی دن تو سامنے آؤ گے بات سمجھ میں آتی ہے۔ پہلی چیز تو شہادت میں قرآن کریم نے کارگہ کائنات پیش کی۔

قرآن تاریخ کے اوراق اور اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات بطور شہادت پیش کرتا ہے میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن جہاں کوئی دعویٰ کرتا ہے تو اُس کے لیے ہمیشہ شہادات پیش کرتا ہے۔ اُس کی پہلی شہادت خارجی کائنات ہوتی ہے کہ اُس میں کس طرح نظم و نسق سے خدا کا یہ نظام چل رہا ہے کس طرح اُس کی کبریائی کا فرما ہے۔ پہلی شہادت تو وہ یہ پیش کرتا ہے۔ اُس سے اگلی شہادت تاریخ کی شہادت ہوتی ہے کہ اَوَّلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ط كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَ آَثَرُوا الْأَرْضَ وَ عَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا (30:9) یہ قریش جو تمہارا مذاق اڑا رہے ہیں کہ اتنی ننھی سی جماعت ہے اور اس کے بل بوتے پر نصرتِ خداوندی کے دعویدار بنے پھرتے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ایک دن تم دیکھو گے کہ تمام نظام ہائے عالم کے اوپر یہ نظام فاتح ہوگا غالب آئے گا۔ کہا کہ ان سے کہو کہ یہ راستے جن پہ تم صبح و شام چلتے رہتے ہو ان میں تم اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات دیکھتے ہو ان کی کہانیاں تمہارے ہاں ازبر ہیں بچوں سے بڑوں تک سب ان کی کہانیاں بیان کرتے ہیں ان کھنڈرات کی ایک ایک اینٹ پر ان کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں۔ تو کیا ان اقوام کے انجام سے تم نہیں سوچتے؟ تم تو ہو ہی کچھ نہیں ان کے پاس تو بڑے بڑے ساز و سامان تھے ان کی زمینیں سونا اگلتی تھیں۔ وہ اگلنے کا لفظ تو کسی زمانے میں یونہی محاورہ تھا اب تو واقعی عرب کی یہ جتنی زمینیں ہیں سونا اگل رہی ہیں۔

اگر پانی کشتی پر غالب آ جائے تو پھر وہ ڈوب جاتی ہے

کہا کہ انہوں نے بڑی بڑی بستیاں بسا رکھی تھیں۔ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً (30:9) ان کے پاس بڑی قوت تھی۔ وَ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ (30:9) ان کی طرف تو خدا کے فرستادہ آئے کہ طبعی اسباب کی یہ ساری قوت جو تم نے حاصل کر لی ہے تم اسے اقدارِ خداوندی کے تابع رکھو ورنہ یاد رکھو! یہی پانی جو کشتی کے اندر آ کر پڑ گیا تو اسی کے بوجھ سے کشتی ڈوب جائے گی۔ پانی کشتی کے تیرنے کا سہارا ہوتا ہے بشرطیکہ وہ کشتی پانی پر غالب رہے لیکن جب وہ پانی کشتی پہ غالب آ جاتا ہے تو وہی پانی اُسے ڈبو دیتا ہے۔ کہا کہ یہ جس قدر ان کی خوشحالیاں تھیں ان کا افراطِ زر ان کی اتنی دولت تھی وہ جب ایسا پانی بنا کہ وہ کشتی کے اندر آ گیا تو اُسی نے ان کی کشتیوں کو ڈوبا دیا۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے ان کے یہ کھنڈرات ہیں تو کیا تم انہیں نہیں دیکھتے کہ جو آخری فیصلہ ہے وہ طبعی سامان سے نہیں ہوتا بلکہ Values (اقدار) کے تابع ہوتا ہے۔ یہ وَ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ (30:9)۔ درمیان میں جلدی

سے ایک ٹکڑا لا کر قرآن نے آگے بات پھر چلائی ہے۔ کہا کہ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (30:9)۔ کیسا حسین انداز ہے قرآن کا! وہ کہانی بیان کرتے کرتے درمیان میں یہ کہہ گیا کہ وہ دیکھنا کہ وہ بستیاں ہم نے گنائی ہیں ان کے کھنڈرات دیکھو وہ تباہ ہوئی ہیں، برباد ہوئی ہیں۔ یاد رکھو کہ ہم یونہی کسی بستی کو تباہ نہیں کر دیتے بلکہ وہ اپنے ہاتھوں آپ تباہ ہوا کرتی ہیں۔ یہ سمجھ لیا ہے تو اب آگے چلو۔ کہا کہ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ (30:10) اُسی وقت درمیان میں جو ذہن میں خیال آسکتا تھا کہ اب خدا یہ کہے گا کہ اتنی قوتوں والے دولت والے افراد زروالے جو لوگ تھے ہم نے ان کو اس طرح سے تباہ و برباد کر دیا تو دیکھتے نہیں ہو کہ ہم کتنی سختی سے پکڑتے ہیں ہم ہڈیاں توڑتے ہیں۔ کہنے لگے کہ یہ بات نہیں ہے ہم کسی کو ظلم و زیادتی سے تباہ نہیں کیا کرتے بلکہ یہ سب اپنے اوپر ظلم و زیادتی کیا کرتے ہیں جو تباہ ہوا کرتے ہیں۔

جنتی اور جہنمی معاشرے کا بنیادی فرق: طبقاتی انداز سے ناہمواریاں پیدا کرنا ہے

قرآن کریم نے کہا کہ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ اسَاءُوا السُّوْاۤى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ (30:10) ہوتا یہ ہے کہ جب معاشرے کے اندر ناہمواریاں پیدا کی جاتی ہیں جہاں بھی دولت کا اور قوت کا اور خوشحالیوں کا ذکر آئے گا تو یہ وہ قومیں ہیں جو اس کی وجہ سے طبقاتی ناہمواریاں پیدا کرتی ہیں۔ یعنی ایک طبقہ جو اتنی زیادہ دولت کا مالک بنتا ہے تو وہ ایک طبقے سے دولت چھین کر مالک بنتا ہے۔ وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا نوٹ نہیں چھاپ رہا ہوتا بلکہ وہ جوج سے شام تک محنت کرتا کرتا مر جاتا ہے تو اُس بیچارے کو شام کو جو چار پیسے ملتے ہیں وہ لے کر گھر تک چلتا ہے تو راستے میں جو کچھ اپنے گھر کے لیے نمک تیل لکڑیاں وغیرہ لیتی ہوتی ہیں اُس میں سے یہ 75% دوسروں کو دیتا ہے۔ یہ نوٹ وہ ہوتے ہیں۔ کیا لفظ ہے اسَاءُوا السُّوْاۤى (30:10) ناہمواریاں پیدا کرنا۔ یہ ناہمواریاں تھیں جو پیدا ہوئی تھیں۔ آپ نے کبھی اس پہ بھی غور کیا ہے کہ جنت کی نعمتوں کا آسائشوں کا آسائشوں کا ذکر کیا جاتا ہے کہ اُس سے آگے انسان کا تصور ہی نہیں جاسکتا۔ اتنی بڑی خوشحالی کی زندگی اتنی بڑی امارت کی زندگی لیکن اُس میں کسی ایک غریب کا نام نہیں آتا کوئی ایک محروم نہیں ہوتا بلکہ ان سب کو یکساں طور پہ وہ زندگی ملتی ہے۔ اُسی کو طبقاتی انداز سے ناہمواریوں میں تقسیم کیجیے تو جہنم ہو جاتی ہے۔ اور ایسے تقسیم کیجیے کہ ہر ایک کا لیول وہی ہوتا ہے تو وہ جنت ہوتی ہے۔ یہ ہے اسَاءُوا السُّوْاۤى۔ یہ جو ظلم کہا تھا تو یہ وہ ظلم تھا کہ وہ دوسروں کی محنت میں کمی کرتے تھے۔

قرآن حکیم نے اپنے ہاں محنت کے معاوضہ کے بجائے اس کے ماحصل کا تصور پیش کیا ہے

ضمناً ایک بات یاد آگئی اس کو ذہن میں رکھیے گا۔ یہ جو ہمارے ہاں ہے کہ مزدور کو اُس کی محنت کا صحیح معاوضہ ملنا چاہیے تو یہ بڑا

فریب انگیز ہے۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ یہ تو بڑا صحیح ہے کہ محنت کا معاوضہ صحیح ملنا چاہیے۔ یہ جو معاوضہ ہے یہی تو سارا ظلم ہے یہی تو تباہی کا نکتہ ہے۔ معاوضہ دینے والا معاوضہ مقرر کرتا ہے، مزدور خود اپنا معاوضہ مقرر نہیں کرتا بلکہ وہ مقرر کرتا ہے۔ قرآن معاوضہ نہیں کہتا۔ عزیزانِ من! سنیے اور جھوم جائیے۔ قرآن کہتا ہے کہ محنت کش یا کام کرنے والے کو اُس کی محنت کا حاصل ملنا چاہیے۔ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (53:39) میں ماسعی کا ترجمہ ہی حاصل ہے۔

خدا تعالیٰ اپنے کسی قانون کے رخ کو کسی دوسری طرف نہیں بدلتا

قرآن حکیم کہتا ہے کہ عَاقِبَةُ الَّذِينَ اسَاءُوا السُّوْأَى اَنْ كَذَبُوا بِآيَاتِ اللّٰهِ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ (30:10) ان سے کہتے تھے کہ یاد رکھو! اس کا انجام تباہی ہے۔ اور وہ کہتے تھے کہ کوئی تباہی نہیں ہوتی۔ وہ اتنا ہی نہیں کہتے تھے بلکہ ان لوگوں کا مذاق اڑاتے تھے کہ یہ کہتے ہیں اس قسم کے نظام کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ ایک دوسری جگہ اس چیز کو اور بھی خوبصورت الفاظ میں بیان کیا ہے: اسْتَجْبَارًا فِي الْأَرْضِ (35:43) پہلی قوموں کے متعلق یہ کہا کہ استکبار یعنی تکبر کرتی تھیں۔ وَمَكْرُ السَّيِّئِ (35:43) اور ایسی سازشیں کرتی تھیں جو اس قسم کی ناہمواریاں پیدا کریں۔ یہ ساری ان کے مخالفین کی طرف سے ہو تو سازش کہلاتی ہے اگر ان کی اپنی طرف سے ہو تو پلاننگ (Planning) کہلاتی ہے۔ تو یہ ساری اس قسم کی جو پلاننگز (Plannings) ہیں اس کے متعلق کہا کہ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئِ إِلَّا بِأَهْلِهِ (35:43) یاد رکھو! اس قسم کی پلاننگز (Plannings) کرنے والوں کا انجام انہی کے خلاف الٹ کے پڑتا ہے۔ کہا کہ فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ (35:43) کیا یہ اسی انتظار میں ہیں کہ جو حشر پہلوں کا ہوا تھا، وہی ان کا ہو؟ اگر اس انتظار میں ہیں تو ان سے کہہ دیجیے کہ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا (35:43)۔ خدا کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں آیا کرتی، خدا کی روش کا تبدیل ہونا تو ایک طرف رہا اُس کا رخ بھی نہیں بدلا کرتا کہ رخ تمہاری طرف ہو اور وہ اُدھر جا نکلے۔ ایسا بالکل نہیں ہوا کرتا۔ پھر انتظار کرنا ہے تو کرو۔ اصول یہ بیان کیا تھا کہ اس قسم کے ناہمواریاں پیدا کرنے والے جو پلاننگز (Plannings) یا تدابیر یا سازشیں ہیں تو انجام کار یہ پلٹ کر انہی کے اوپر آیا کرتی ہیں۔ یہ ہے جو کہا تھا کہ ہم نے تو ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے آپ پہ ظلم کیا تھا۔ کہا کہ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ (30:10) یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا رہا اور وہ تھے کہ اس کا مذاق اڑاتے رہے۔

اقدارِ خداوندی کے تابع عالمِ انسانیت ایک تندرست اور صالح بیج کی مانند نشوونما پاتی ہے
نظامِ کائنات میں تم دیکھو کہ ہم کیا کرتے ہیں؟ اَللّٰهُ يَبْدُوْا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهُ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (30:11) ہر شے
کی ابتدا ایک ننھے سے بیج سے ہوتی ہے اگر وہ قانونِ خداوندی کے مطابق بیج صالح ہے یعنی پہلی شرط یہ ہے کہ اُس میں اگنے کی
صلاحیت ہے دوسری شرط یہ ہے کہ قانونِ خداوندی نے اس کے اگنے کے لیے جتنے ذرائع مقرر کیے ہیں کہ زمین یعنی Soil کا اچھا
ہونا، اُس میں کھاد ہونا، پانی وقت پہ ملنا، روشنی کا ملنا، حرارت کا ملنا، اگر یہ سارا کچھ ہو تو پھر اُسے ہم گردشیں دیتے ہوئے بڑھاتے چلے
جاتے ہیں۔ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (30:11) اور وہ ہماری مقرر کی ہوئی منزل کی طرف آ جاتا ہے۔ یہ ہے جو عالمِ انسانیت میں
بھی ہونا چاہیے۔ ان بڑھنے، پھولنے، پھلنے والی اقدار کے مطابق اگر نظام قائم کرتے چلے جاؤ گے تو اُس میں نشوونما ہوتی چلی جائے
گی، تمہاری ذات کی Development (نمود) ہوتی چلی جائے گی۔ وہ جو ہم نے آخر میں انسانیت کی منزل، نصب العین
حیات مقرر کی ہے یہ انسانیت وہاں چلی جائے گی۔

لفظ مجرم کا قرآنی مفہوم اور اپنی داستانِ غم

یہ انسانیت تو اُس منزل کی طرف چلی جائے گی لیکن وَ يَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ (30:12) یہ اپنے
ہاں قانون شکن کو مجرم کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ جب ان کے سامنے انقلاب آ کھڑا ہوگا تو ان بڑے بڑے سرکش، مجرموں پر ہر طرح کی
مایوسیاں چھا جائیں گے۔ عربوں کے ہاں بنیادی طور پہ جرم اُس کو کہتے تھے کہ ”کسی دوسرے کے درخت کی پھلدار شاخ کو کاٹ کر
اپنے گھر لے جانا۔“

دانہ ایس می کارڈ آں حاصل بُرد

اُمتے بر امتے دیگر چرد

ایک قوم کی بھیتی دوسری قوم چر رہی ہے، بوتا یہ ہے کاٹنا وہ ہے۔ اس نظام میں تو کیفیت یہ ہے لیکن وَ يَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ
(30:12) جب ہمارے نظام کے تابع انقلاب آئے گا تو اُس انقلاب میں وہ جو دوسروں کے پھلوں کو کاٹ کر لے جائیں گے تو
سب سے زیادہ مایوس وہ ہوں گے۔ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ مِّنْ شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاؤُاْ وَكَانُواْ بِشُرَكَائِهِمْ كَافِرِينَ (30:13)
یہ سازشیں، یہ تدبیریں تنہا نہیں ہوا کرتیں بلکہ ان کے ساتھ بہت سے مشیر بھی ہوتے ہیں، صلاح کار بھی ہوتے ہیں۔ یہ سارے ان
کے اس دور کے یار ہیں۔ جب وہ انقلاب کا دور آتا ہے تو اس سے ہر ایک انکار کر دیا کرتا ہے، مکر جاتا ہے اور کہہ دیا کرتا ہے کہ

صاحب! ہم تو ساتھ تھے ہی نہیں، ہم اس میں شریک نہیں تھے۔ ”دھیے نی! تُوں گل سن، نوئے نی! تُوں کن کر۔“^① یہ باتیں اقوام سابقہ کی ہو رہی ہیں۔ ذرا توجہ دیجیے تو لگتا ہے کہ

ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

یہ اپنی داستاں ہی نہیں بلکہ انسان کی داستاں ہے۔ انسان کی تاریخ بیان ہو رہی ہے۔ جہاں یہ ہوگا وہاں یہی ہوگا، وہ ہزار سال پہلے ہو یا دس ہزار سال پہلے یا آج کے زمانے میں ہو یا آنے والے زمانے میں، ہوتا یہی ہے۔ یہ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (35:43) ہے۔ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُومِئِذٍ يَنْفَرُ قَوْمٌ (30:14) انقلاب کی گھڑی آنے دیجیے، ان میں نفسا نفسی پڑ جائے گی، ایک کے ساتھ دوسرا وہاں کھڑا نہیں ہوگا، جی چرائے گا کہ کہیں کوئی یہ نہ کہہ دے کہ یہ بھی اس کا ساتھی تھا۔ کہا کہ یہ جو کھنڈرات تمہیں نظر آ رہے ہیں یہ ایسے ہی بارشوں اور زلزلوں سے نہیں ہو گئے تھے بلکہ وہ ان چیزوں کا نتیجہ تھا۔ ان کی یہ کیفیت ہو گئی اور دوسری طرف کہا کہ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ (30:15) ان کے برعکس جن لوگوں نے خدا کی ان اقدار اور قوانین پر یقین محکم رکھ کر ان کے مطابق نظام قائم کیا ہوگا تو ان کے لیے قرآن کہیں جنت کہتا ہے کہیں روضہ کہتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ عربوں کے پس منظر میں تو میل ہا میل تک کہیں درخت تو ایک طرف جھاڑی تک نظر نہیں آیا کرتی تھی۔ جہاں کہیں چھوٹا سا چشمہ ہوا اور وہیں چار درخت نخلستان کے بھی ہوئے تو وہ ان کے ہاں جنت کہلایا کرتی تھی۔ ہم پانی کی اور سبزے کی قدر نہیں کر سکتے یہ تو عربوں سے پوچھیے۔ ہمارے ہاں بھی یہ جو تھل کے علاقے ہیں وہاں معلوم ہوتا ہے کہ سبزے کی اہمیت کتنی ہے۔

عربوں کے ہاں جنت کا تصور اور قرآن حکیم کا بیان

قرآن کریم نے جنت کی جتنی بھی تفصیل دی ہے تو میں نے عرض کیا ہے کہ انہی کو عربوں کی زندگی کے بیک گراؤنڈ (پس منظر) میں دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا کیفیت تھی، ورنہ ذہن میں یہ آتا ہے کہ آبِ رواں بھی جنت میں کہا تو ہمارے ہاں تو کوئی اس کو Appreciate (پسند) نہیں کر سکتا۔ یہ عرب سے پوچھیے کہ جہاں پانی کا چشمہ ہوتا تھا تو وہاں ڈیرہ ڈال لیتے تھے اور جب وہاں سے پانی سوکھ جاتا تھا تو خانہ بدوش وہاں سے چل کر پھر کسی اور چشمہ پر آباد ہوتے تھے۔ اگر انہیں آبِ رواں مل جائے تو پھر تو پوچھو ہی نہیں پھر تو موج ہو گئی: درختوں کے سائے، جھکے ہوئے درخت، پھلوں سے لدے ہوئے درخت، دودھ کی رواں ندیاں، شہد کی رواں

① اے بیٹی! تُوں بات سن، اے بہو! تو ذرا غور کر، توجہ دے۔

ندیاں، سبزہ زار، گلستان، پرندوں کے چہچہے اور اُس کے بعد جب رومن ایمپائر اور ایران کی تہذیب بھی سامنے آئی، یہ جسے آپ ایرانی قالین کہتے ہیں تو ان کا بھی ذکر قرآن میں ہے، یہ حریر و اطلس کے پردے، عالی شان صوفے وہاں بتائے گئے، اور پرندوں کا گوشت بھی۔ آپ اس کو نہ بھولیے کہ یہ ہر ایک کو دیا جا رہا ہے۔ یہ وہ نقشہ ہے جو قرآن نے جنت کا کھینچا ہے کہ ہر قسم کی آستائش ہوگی۔ اس میں ایک لفظ یحبرون آ گیا ہے۔ ویسے تو عربوں کے ہاں ہر وہ شے جس میں زیبائی اور رعنائی اور دلکشی اور خوبصورتی اور جنت نگاہ ہو تو اُس کے لیے یہ لفظ استعمال کیا کرتے تھے حتیٰ کہ یہ لکھنے والی روشنائی جو ہے اُس کے لیے بھی استعمال کرتے تھے۔ گویا ہر شے جس میں رعنائی ہو اور زیبائی ہو اور دلکشی ہو اُس کے لیے استعمال کرتے تھے۔ میں نے اسے جنت نگاہ کہا ہے۔

فنون لطیفہ میں موسیقی جیسی نعمت بھی جنت کا خاصہ ہوگی

آپ حیران ہونگے کہ عربوں کے ہاں فردوس گوش کو بھی حبر ہی کہا کرتے تھے، بہترین موسیقی کو بھی حبر کہتے تھے۔ اور جنت کے لیے یہ ذکر آیا ہے کہ رَوْضَةٌ يُخَبَّرُونَ (30:15) بہترین موسیقی بھی وہاں ہوگی۔ انسان کو یہ صرف روٹی پہ ہی جینے والا جانور نہیں بنایا، یہ تو حیوانی زندگی ہے بلکہ اس کو تو حس لطیف بھی دی گئی ہے۔ فنون لطیفہ سے جو Appreciation (نگاہ استحسان) ہے یہ خاصہ انسانیت ہے، یہ اس کو Appreciate (پسند) کرتا ہے۔ پچھلے ہی پرچے¹ میں میرا وہ آرٹیکل شائع ہوا ہے ”اسلام اور آرٹ“ تو اُسے ذرا ایک نظر دیکھیے۔ قرآن کریم نے آرٹ کے متعلق بتایا ہے کہ اس کے کون کون سے گوشے ہیں، اصل تو یہ ہے کہ اس نے ان کو کس حسن و کیف سے بیان کیا ہے! آپ سوچتے ہیں کہ جب فنون لطیفہ میں وہ ان چیزوں کو اس طرح سے بیان کرے تو یہ جو موسیقی ہے یہ تو فنون لطیفہ میں بلند ترین مقام ہے۔ اتنا وقت نہیں کہ میں اس تفصیل میں جاؤں لیکن بہر حال اس کا اثر براہ راست انسان کے جذبات کے اوپر ہوتا ہے۔ اب آپ کہیں گے کہ ہمارے ہاں تو یہ بحث چلی آتی ہے کہ صاحب! موسیقی حرام ہے۔ پہلے تو یہ سوچ لیجیے کہ یہ اتنی سی بات ہے جو جنت کی موسیقی کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہاں یہ حرام ہے۔ یہاں ہمارے مولوی صاحبان کے ہاں، کوئی چیز ایسی ہے جو حرام نہیں ہے: سونا یہاں حرام جبکہ جنت میں سب سے بڑی نعمت ہے ریشم پہننا ان کے ہاں حرام جبکہ قرآن نے ریشمی پردے تک بیان کر دیئے لباس تو ایک طرف رہا۔ عجیب چیز یہ ہے کہ اس کو کہا جاتا ہے کہ موسیقی بھی حرام ہے اور مصوری بھی حرام ہے۔

کائناتی اشیا جو اقدارِ خداوندی کے تابع ہوں، وہ زندگی کا حسن پیش کرتی ہیں

عزیزانِ من! بات ساری یہ ہے کہ یہ فنونِ لطیفہ ہیں، ان کو Appreciate (تحسین کی نظر) کرنے کے لیے حسِ لطیف کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں حسِ لطیف نہیں ہوتی وہ ان کو Appreciate (پسند) نہیں کر سکتا، وہ Animal Level (حیوانی سطح) کے اوپر زندہ رہتا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ اس کا اعتراف کریں کہ صاحب! یہ چیز ہمارے حسِ لطیفہ سے بلند ہے، ہمیں یہ چیز دی نہیں گئی، ہمیں اس سے نواز ہی نہیں گیا۔ جس چیز سے وہ خود محروم رہ رہے ہیں، اُس کو انہوں نے حرام قرار دیدیا ہے۔ عزیزانِ من! ویسے تو دنیا کی ہر شے جو حلال سے حلال تر ہے، اگر وہ اقدارِ خداوندی کی حدود سے تجاوز کر جاتی ہے تو حرام ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہ ان اقدار کے تابع رہتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو بھی انسان کے لیے پیدا کیا ہے، بجز ان کے کہ جن کو اس نے بہ نصِ صریح خود حرام کہہ دیا ہے، اس کے علاوہ اور کوئی چیز انسان کے لیے حرام نہیں ہے بشرطیکہ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے یہ کچھ کرے۔ اس ضمن میں اقبالؒ (1877-1938) کے دو چار شعر یاد آ گئے:

وہ نغمہ سردی، خونِ غزل سرا کی دلیل
کہ جس کو سُن کے ترا چہرہ تاب ناک نہیں
نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود
وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

(ضربِ کلیم: موسیقی)

انہی کا ایک اور شعر ہے:

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں ناے و چنگ و رباب!

(ضربِ کلیم: سرودِ حرام)

جنت کی موسیقی میں تو حیات کا پیغام ہوتا ہے۔ ہر وہ شے جس میں ضعف اور ناتوانی کا پیغام ہے وہ آپ کے ہاں کی فقہ کی رو سے خواہ کتنا ہی آپ اس کو حلال کہہ لیں لیکن وہ قرآن کی اقدار کی رو سے حرام ہوگی۔ حدودِ خداوندی کے اندر رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ

نے جو بھی انسان کے لیے پیدا کیا ہے اُس سے تمتع ہونا اور زندگی اور حیات حاصل کرنا عین حلال اور منشاء قرآن کے مطابق ہے۔
 فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ ① (30:15) اُس معاشرے کے اندر جس کا قرآن نے کہا ہے ہر قسم کی رعنائی، زیبائی، دلکشی، جنت نگاہ اور
 فردوس گوش ہوگی۔ اُس کے بعد کہا ہے کہ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ فَأُولَٰئِكَ فِي
 الْعَذَابِ مُحْضَرُونَ ② (30:16) اس کے برعکس جو ان صدقاتوں کے انکار پہ چلنے والے ہیں تو پوچھو نہیں کہ یہ کس قسم کے جہنم
 کے اندر زندگی بسر کریں گے۔

عزیزانِ من! سورۃ الروم کی آیت 16 تک ہم آگئے 17 ویں سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



① وہ زندگی کی شادابیوں اور خوشگوار یوں سے بہرہ یاب (42:22) اور نعماتِ حیات آور سے لذت اندوز ہوں گے (43:70) (پرویز: مفہوم القرآن ص-932)۔

② اور جو لوگ ہمارے قوانین کی صداقت سے انکار کرتے ہیں اور ان کی اور مستقبل کی زندگی کی تکذیب کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو تباہیوں کے اندر موجود پائیں گے (پرویز: مفہوم القرآن ص-932)۔

دوسرا باب: سورة الروم (آیات 17 تا 24)



عزیزانِ من! آج اگست 1979ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الروم کی آیت 17 سے ہو رہا ہے: (30:17)

ہمارے ہاں قرآنی تراجم نے قرآنِ حکیم کی تعلیم کو محدود سے محدود تر کر دیا ہے
 ارشادِ خداوندی ہے کہ فَسُبْحَنَ اللّٰهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ
 الْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ (30:17-18)۔ ان دو آیات کا عام لفظی ترجمہ تو آپ کو یہی نظر آئے گا کہ صبح کا وقت
 ہو یا شام کا، سبحان اللہ! اُس کے لیے حمد ہے۔ سماوات اور ارض میں رات کا وقت ہو یا دوپہر کا۔ اس سے آپ نے دیکھا کہ محض ان
 تراجم سے نہ آپ کے دماغ پر کوئی خاص اثر ہوا ہے نہ دل پہ کوئی چوٹ پڑی ہے نہ ادراک میں اور نہ جذبات میں کسی قسم کا کوئی تحریک
 پیدا ہوا ہے: سبحان اللہ صبح ہو یا شام! الحمد للہ رات ہو یا دوپہر۔ لیکن جب قرآن کی گہرائیوں میں جائیے تو نظر آتا ہے کہ قرآن انہی

لفظوں کے اندر کیا کیا کچھ نہیں کہہ جاتا۔ ان الفاظ کے دو پہلو ہیں: ایک تو یہ ہے کہ پیچھے سے سلسلہ یہ چلا آ رہا تھا کہ جو لوگ صرف ایک خدا کے قوانین کے سامنے جھکنے والے ہیں، ان کا سینہ کس طرح خوف اور حزن سے پاک ہو جاتا ہے اور کتنی پیا کیوں کا محور اور آماجگاہ بن جاتا ہے، ان کی زندگی کس قدر جنت کی زندگی ہوتی ہے۔ اور اُس کے مقابلے میں جو لوگ ان قوانین کے خلاف چلتے ہیں، وہ کس طرح اضطراب اور درد اور اذیت کے جہنم میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ قوموں کے تغیرات کا ذکر آ رہا تھا تو اُسی ربط کے اندر اگر ان آیات کو دیکھا جائے گا تو میں ابھی عرض کروں گا کہ قوموں کے اشارے سے، ان کی نسبت سے، ان الفاظ کے اندر کیا معنویت پوشیدہ ہے۔ لیکن ایک چیز اور ہے جس سے نگاہ کا رخ دوسری طرف چلا جاتا ہے۔

رزق کی فراوانی سے معمور، خوف و حزن سے پاک اور ذوقِ جمالیات سے سرشار زندگی، بندہٴ مومن کی میراث ہے جنت کے متعلق اور نعمائے گنہگار کے بعد اُس نے کہا تھا کہ **فِی رَوْضَةٍ یُّخْبَرُونَ** (30:15)۔ اس میں ایک تو جنت کو نہایت سربسز و شاداب باغ کہا اور اُس باغ کے اندر حسن و جمال، زیبائی اور رعنائی کی تمام جتنی بھی بلند ترین خوبصورت چیزیں ہوتی ہیں، ان کا ذکر کیا۔ میں نے کہا تھا کہ اس بحسبِ رُوح میں فردوسِ گوشِ موسیقی کا بھی ذکر ہے۔ گویا جن چیزوں کا تعلق انسان کی حسِ لطیف سے ہے، جسے ذوقِ جمالیات کہتے ہیں، اُس کی تسکین کا سامان بھی مہیا کیا جاتا ہے۔ حیوانی سطح تک جو زندگی ہے اس میں افادی پہلو ہے جسے انگریزی میں Utility (افادیت پہلو) کہتے ہیں۔ یہ چیزیں ان کی طبعی زندگی کے لیے مفید ہوتی ہیں: گھاس ہے، چارہ ہے، درختوں کے پتے ہیں، یہ تمام چیزیں ہیں۔ یہ صرف ان کی طبعی زندگی کے تقاضے کو پورا کرنے کی چیزیں ہوتی ہیں، اس سے زیادہ ان میں ذوقِ جمالیات کی بات نہیں ہوتی۔ لیکن جب انسان کی زندگی شروع ہوتی ہے تو جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ انسان صرف روٹی کے سہارے زندہ نہیں رہتا بلکہ اس میں ایک اور چیز بھی دی گئی ہے جسے آپ ذوقِ جمالیات (Aesthetic Sense) کہیں گے۔ یہ انسانی سطح کی خصوصیت ہے۔ یاد رکھیے کہ جس میں Aesthetic Sense (جمالیاتی حس) نہیں ہوتی اُس کی Development (نشوونما) میں کمی رہ گئی ہوتی ہے، وہ حیوانی سطح کے اوپر ہوتا ہے، وہ انسانی سطح پر نہیں پہنچ سکتا کیونکہ فطرت نے جو اپنا شاہکار پیدا کیا ہے اسے اس نے جسے احسنِ تقویم کہا ہے تو اس کے اندر یہ دونوں چیزیں ہیں۔ افادی پہلو بھی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ روٹی بھی ضروری ہے لیکن بکری اور بیل کی طرح کی روٹی نہیں کہ صرف چارہ مل گیا اور زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔ آپ غور کیجیے کہ اگر صرف افادی پہلو ہی ہوتا تو کیا ہوتا؟ سنیے! گلاب کا پھول بڑی دوائیوں کے کام آتا ہے، یہ اُس کا افادی پہلو ہے یہ تاثیر اُس پھول کے اندر ہے۔ اگر مقصد صرف افادی پہلو ہوتا تو اُس پودے کی جڑوں میں اُس کی شاخوں میں اُس کے پتوں میں اُس کے کانٹوں میں بھی یہ تاثیر رکھ دی جاسکتی تھی لیکن اس کے ساتھ ایک اور چیز بھی ہے۔

ذوقِ جمالیات سے لطف اندوز ہونے والی چشمِ بینا کی کیفیت

عزیزانِ من! یہ کیا ہے کہ وہ جو تاثیر ہے اُس کے لیے ان شاخوں، جڑوں، کانٹوں کے اوپر حسن و زیبائی کا ایک مجسمہ، قہقہہ مارتا اور مسکراتا ہوا آپ کے سامنے آتا ہے:

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست

آپ اُس کے پاس سے آنکھیں بند کر کے نہیں گزر سکتے۔ بکری اور بیل تو گزر جائیں گے اور وہ انسان بھی گزر جائے گا جو اس سطح کے اوپر زندگی بسر کر رہا ہے۔ جو انسانیت کی سطح پہ پہنچ جاتا ہے وہ اُس سے ایسے نہیں گزر جاتا۔ وہ کیا چیز ہے جو اُس کی نگاہوں کو کھینچ رہی ہے۔ وہ اس کے ذوقِ جمالیات کی تسکین ہے۔ یہ کتنی ضروری ہے اُس کی تو ایک ہی دلیل کافی ہے کہ خالق کائنات نے اس کی ربوبیت کے لیے جو چیزیں پیدا کی ہیں وہ صرف افادی پہلو لیے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر ذوقِ جمالیات کی تسکین کا پہلو بھی موجود ہے۔ یہ تو خالق کائنات کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں۔ اُس کا تو کوئی ذرا سا کام بھی بے مقصد اور بے مطلب نہیں ہوتا۔ ایسے ہی نہیں اُس نے پھول میں رنگینیاں اور رعنائیاں پیدا کر دیں۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ اگر مقصد صرف Utility Value (افادی قدر و منزلت) ہوتا یعنی افادی پہلو ہوتا تو کیکر (بول) کے کانٹوں میں بھی یہ چیز رکھی جاسکتی تھی۔ اُس کے لیے یہ رنگینیاں، رعنائیاں، خوشبو اور نزاکت کیوں رکھی؟ کبھی کھڑے ہو کر اُس پتی کو لے کر دیکھیے کہ ایک حسن کی پوری دنیا اُس کے اندر مسکراتی ہوئی، ناچتی ہوئی، نظر آتی ہے بشرطیکہ نگاہ انسانی سطح پہ پہنچی ہوئی ہو۔ آپ حیران ہونگے کہ قرآن کریم نے شروع سے آخر تک ان دونوں پہلوؤں پہ زور دیا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے وہ بات آگئی تھی لیکن چونکہ وہ دیر کی بات ہے، وہ سورۃ النحل ① تھی جس میں یہ بات سامنے آئی تھی لیکن چونکہ یہاں بھی وہ بات پھر آئی ہے تو وہ جو میرا انداز قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کا تصریف آیات کی رو سے ہے تو میں نہیں چاہتا کہ اس طرح جو میں نے کہا ہے کہ کھلے ہوئے پھول کے پاس آدمی یونہی گزر جائے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح سے یہ بھی میرے لیے مشکل ہے کہ اس مقام پہ میں آؤں اور وہ جو قرآن کریم نے مقام پیش کیا ہے اُس سے ویسے ہی گزر جاؤں۔

آپ غور کیجیے کہ Aesthetic Sense (ذوقِ جمالیات) پر قرآن نے کتنا زور دیا ہے! ذکرِ موسیٰ کیوں کا آ رہا ہے بتایا جا رہا ہے کہ دیکھو تمہارے لیے یہ موسیٰ کس قدر افادیت کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ ان کا گوشت کھاتے ہو ان کا دودھ پیتے ہو ان کی اون سے تم کبیل اور کپڑے بناتے ہو خیمے بناتے ہو ان کی کھالوں سے مختلف قسم کی اپنی مفید مطلب چیزیں بناتے ہو۔ دیکھتے ہو کہ ایک

② اس کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن، سورۃ النحل، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2003، ص 16 تا 9۔

ایک مویشی کے اندر کس قدر افادیت کے پہلو پنہاں چلے آتے ہیں۔ یہ بالکل صحیح بات ہے۔ تو یہیں تک ہی بات دینی چاہیے تھی۔ کہا کہ یہیں تک بات نہیں ہے۔ میں نے جو لفظ کہا تھا کہ ذوقِ جمالیات بھی ہے یہ میری اصطلاح نہیں ہے۔ یہ سارا گنانے کے بعد کہا کہ **مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ** (16:5) یہ تمہاری منفعت کی چیزیں ہیں یہ افادی پہلو لیے ہوئے ہیں یہ اس کا Utilitarian Aspect (افادیت پہلو) ہے۔ یہ کہہ کر ساتھ ہی ساتھ آگے بڑھ جانا چاہیے تھا۔ لیکن نہیں کہا کہ **وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ** (16:6) عزیزانِ من! یہ مقامات ہیں جہاں انسان کی بصیرت وجد میں آ جاتی ہے۔ افادی پہلو سے تو صرف انسان کی طبعی اور حیوانی زندگی کی تسکین مقصود ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کہا کہ **وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ** ^① (16:6)۔ ذہن میں نہیں آ سکتا کہ مویشیوں کا ذکر ہو رہا ہے تو ان میں جمال کا پہلو کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ جو بات کہی گئی ہے اُسے ہم شہر کے رہنے والے تو شاید Appreciate (پسند) ہی نہ کر سکیں، ہمیں یہ چیزیں نصیب ہی نہیں ہونیں۔

قرآن حکیم کی دفتتین کے ایک ایک ورق پر ذوقِ جمالیات کے مناظر بکھرے دیکھائی دیتے ہیں
 اول تو ویسے ہی افادی (Utility) چیزوں کی جو پریشانیاں ہیں انہوں نے اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ ہم انسانی سطح کے اوپر آئیں۔ جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ گدھا اور اُس کا کہار سارا دن اتنا سفر کرتے ہیں کہ ہار گدھے سے بھی زیادہ سفر کرتا ہے۔ وہ جب واپس آتا ہے تو گدھے کے چارے کا فکر گدھے کو نہیں ہوتا، اُسے یہ پریشانی نہیں ستاتی کیونکہ اُس کے لیے تو کہار لے آتا ہے لیکن اپنے اور اپنے بچوں کی روٹی کا فکر گدھے والے کو ستاتا ہے۔ انسان ان پریشانیوں میں مبتلا ہے جن میں حیوان مبتلا نہیں ہے۔ ایک تو اتنی ہی فرصت کہاں کہ ”تیری تمنا کرے کوئی“ اور ویسے بھی ہمیں یہ مواقع میسر نہیں۔ میں اس لیے اس پہ زور دے رہا ہوں کہ آگے جو دو الفاظ آ رہے ہیں یہ سمجھ میں نہیں آ سکتے تاوقتیکہ وہ مناظر ہم نے خود نہ دیکھیں ہوں۔ کہا کہ جمالیات کا پہلو دیکھنا چاہتے ہو؟ آؤ تمہیں بتائیں کہ **حِیْنٌ تُرِیْحُوْنَ وَ حِیْنٌ تَسْرَحُوْنَ** (16:6) صبح کی اذان کے ساتھ نور کے تڑکے آخری تارے جگمگا رہے ہوں چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی ہو فضا گرم گرم سے بھری ہوئی ہو عین اُس سکوت کے عالم میں گاؤں سے مویشیوں کا گلہ جس طرح خراماں خراماں باہر چراہ گا ہوں کی طرف جاتا ہے کہا کہ اگر تمہاری آنکھوں میں خدا نے بصیرت دی ہے تو پوچھو نہیں کہ کتنے حسن و جمال کی رعنائیاں ان میں پوشیدہ ہیں! میں تو گاؤں کا رہنے والا تھا مجھے پتہ ہے کہ یہ منظر کیا ہوتا ہے۔
 عزیزانِ من! خدا بیان کر رہا ہے اور قرآن کے اندر بیان کر رہا ہے افادی پہلو کے بعد کہتا ہے کہ اس کے اندر کچھ اور بھی ہے۔

② یہ مناظر حسن و جمال کی کس قدر دلآویز کیفیتیں اپنے اندر لیے ہوئے ہیں (پرویز: مفہوم القرآن ص 594)۔

اور اُس کچھ اور کے لیے وہ ایک لفظ استعمال کرتا ہے کہ اگر خدا نے دیدہٴ بینا عطا کیا ہو تو ذرا اس نقشے کو سامنے لاؤ کہ وہ کیا منظر ہوتا ہے۔ یہ وہی موسیٰ ہیں، کچھ بھیڑیں بکریاں بھی ہوگی، اُس کے ساتھ گائے بیل بھی ہوتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اُس وقت جس انداز سے یہ چراہ گاہوں کی طرف خاموشی سے چلے جا رہے ہیں، یہ منظر کس قدر حسین ہوتا ہے! کہنے لگے کہ وہاں حِیْنَ نُسْرِیْحُوْنَ (16:6) دن بھران کا افادی پہلو ہوتا ہے اور پھر شام کے سکوت میں جب وہ سورج ڈوبتا ہے اور وہ لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑتا ہے اُس وقت بھی نہ اندھیرا ہوتا ہے نہ روشنی ہوتی ہے، اُس کے بین بین سماں ہوتا ہے، فضا ہلکی ہلکی گرد آلود ہوتی ہے، سکوت ہوتا ہے، خاموشی ہوتی ہے لیکن یہ خاموشی صبح کی خاموشی سے مختلف ہوتی ہے۔ اُس وقت جب یہ ان چراہ گاہوں سے اُسی انداز سے لوٹتے ہیں تو اس خاموشی کو ان کی گھنٹی کی آواز توڑتی ہے۔ کہا کہ کبھی دور سے تم نے اس منظر کو دیکھا ہے کہ یہ کتنا حسین ہوتا ہے! اس انداز سے اگر یہ تمہاری نگاہ ذوقِ جمالیات کو لیے ہوئے چلتی ہو تو تم دیکھو گے کہ ہم نے تو صبح اور شام کے مناظر بنائے ہیں۔ صبح ہو، شام ہو، دوپہر ہو یا رات ہو، ہر مقام پر تم دیکھو گے کہ یہ Physical Value (طبعی قدر و منزلت) کے گوشے کے ساتھ ساتھ ذوقِ جمالیات کی تسکین کے سامان کس طرح ہم نے بکھیر دیے ہیں! کہا کہ جب انسانی سطح پہ زندگی پہنچتی ہے تو اس کی نشوونما و ارتقا کے لیے صرف روٹی کافی نہیں ہے۔ وہ روٹی تو طبعی اور حیوانی زندگی کے لیے ضرورت ہے لیکن جو انسانی زندگی ہے وہ تو اس سے آگے چلتی ہے۔ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہمارے ہاں پینٹنگز (Paintings) کے اندر بھی یہ مناظر بہت کم نظر آتے ہیں، مغرب میں یہ چیز ہے۔ آپ نے ان کے ہاں کی بہترین تصاویر کو دیکھا ہوگا جو ان کے ہاں کے پینٹنگز (Paintings) کے ماسٹرز (ماہرین) نے بنائی ہیں۔ ان تصاویر کے اندر آپ دیکھیں گے کہ کہیں کسی جاندار کا تصور تک بھی نہیں آئے گا، یونہی ایک ندی سی ہے، اُس کے اوپر ٹوٹا ہوا پل ہے، ادھر ادھر چراہ گاہیں ہیں، دور دور درخت ہیں، ان درختوں کے اندر سے دور ڈوبتے ہوئے سورج کی شفق آ رہی ہے، شعاع آ رہی ہے۔ یہ تصویریں Master Piece (شاہکار) ہوتی ہیں۔ ان کے ہاں کے Master Pieces (شاہکاراں) قرآن کے دو لفظوں کے اندر بیان کیے گئے ہیں۔ یہ ہیں پہلو کائنات کی تخلیق کے کہ جو قرآن اس طرح سے سامنے لاتا ہے لیکن پھر میں وہیں آ جاؤں گا کہ جب تو میں زوال پہ پہنچتی ہیں تو یہ ساری اس قسم کی خوشگوار یوں کی چیزیں جو قلب و نگاہ اور دیدہٴ بینا کے ارتقا کا موجب بنتی تھیں، وہ ان پر حرام قرار دے دی جاتی ہیں: جاندار کی تصویر بھی حرام، موسیقی بھی حرام، بہترین شاعری بھی حرام:

جناب شیخ سے سے کا جواز کیا پوچھیں

کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

عہدِ مغلیہ کے دورِ زوال نے ابھرے ہوئے فنونِ لطیفہ کے خوبصورت چہرے کو مسخ کر رکھ دیا ہمارے ہاں بد قسمتی سے یہ ہوا کہ یہ جو ہمارے زوال کا ہندوستان میں آخری دورِ مغلیہ سلطنت کا زوال تھا وہ دورِ فنونِ لطیفہ کے خوبصورت چہرے مسخ کرنے میں زیادہ پنپا۔ اُس دور کے آپ کے ہاں کے جو فنونِ لطیفہ ہیں، وہ مصوری ہو، شاعری ہو، موسیقی ہو، اُس میں آپ دیکھیں گے کہ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں یا تو بیچاروں کے اعصاب پہ عورت سوار ہے یا ان کے ہاں زوال پذیرِ حزن کی اور افسردگی کی کیفیت ہے۔ ہمارے ہاں بہترین شعروہ ہوتا ہے جسے سننے کے بعد ”واہ“ نہ کہے بلکہ ”آہ“ کہے یعنی زبان سے آہ نکلے۔ بہترین موسیقی وہ ہوتی ہے کہ دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے۔ یہ زوال کے زمانے کی چیزیں ہوتی ہیں۔ قوموں کے عروج کے زمانے میں یہی جو چیزیں ہیں وہ ان کے اندر حرکت اور حرارت پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں۔ یہ مناظر ان کے ہاں بھی ہوتے ہیں لیکن ایک اور انداز لیے ہوئے ہوتے ہیں!

فنونِ لطیفہ میں علامہ اقبالؒ کا مقام بدرجہ اتم بلند تھا

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس کے بعد ہمارے ہاں ایک ایسا آرٹسٹ^① پیدا ہو گیا جس کے سامنے قرآن کی بصیرت تھی۔ اور یہ فطرت کا عطیہ تھا کہ اُسے افادی پہلو جسے آپ فلسفہ کہہ لیجیے، پیغام کہہ لیجیے سے بہرہ وافر ملا تھا اور وہ ذوقِ جمالیات کے مظاہر کے کھینچنے میں بھی بڑی بلندیوں پر تھا۔ اب آپ کے ذہن میں یہ بات آئی ہوگی کہ میں کیوں قرآن کی آیات کے اندر جہاں جہاں آتا ہے وہاں جھٹ سے اقبالؒ لے آتا ہوں۔ اس میں یہ دونوں چیزیں موجود تھیں۔ گویا یہ جانتا تھا کہ قرآن نے آگے ایک بہت بڑی بات کہنی ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ ذرا ان مناظر کو دیکھیے کہ جو صبح کے وقت مویشیوں کے گلے (Herd) میں اور شام کے وقت ان کی واپسی میں ہوتا ہے۔ اُس کو معلوم تھا کہ اس کی اہمیت کتنی ہے کہ اس تناظر میں اس پس منظر کے اندر بات کہی جائے گی۔ آپ دیکھیے گا اقبالؒ کے ہاں شعریت بھی اپنے معراج پر پہنچی ہوئی ہوتی ہے اور افادیت کا وہ پہلو نہیں ہے جو عرب کی شاعری میں اور مغلیہ زوال کے پیدا کردہ فنون میں ہے۔ نہ اُس میں عورت سوار ہے نہ اُس میں حزن کی کیفیت ہے نہ خوردگی کی کیفیت ہے بلکہ زندگی کی کیفیت ہے، حرارت کی کیفیت ہے، حرکت کی کیفیت ہے۔ لیکن یہ تمام چیزیں پابندیوں کے اندر ہیں، حدود کے اندر رہتے ہوئے ہیں۔ یہ ہے وہ بڑی خوبی۔ یوں تو کونسا درس ہے جس میں اقبالؒ (1877-1938) کو پیش نہیں کرتا، باگِ درا میں ”جوابِ حضر: زندگی“ نظم ہے اُس میں زندگی اور حرارت کا اتنا بڑا سامان ہے کہ وہ نظم یہ کہتی ہے کہ

① یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
 جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
 یہ نظم ہے۔ اُس نے یہاں تک آنا ہے لیکن اُس سے پہلے وہ دلوں کو کس قدر نرماتا ہے اور کہتا ہے کہ
 اے رہیں خانہ تُو نے وہ سماں دیکھا نہیں
 گوشتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل
 صحرا میں وہی صبح نور کا تڑکا ہوتا ہے جب یہ قافلے والے اٹھتے ہیں اور وہاں اُس خاموشی کو توڑنے والی چیز جسے بانگِ رحیل کہا ہے وہ
 گھنٹی ہوتی ہے۔

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
 وہ کھڑ بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل
 عزیزانِ من! شاعری اسے کہتے ہیں:

وہ نمودِ اخترِ سیماں پا ہنگامِ صبح
 صبح کے وقت ایک تارہ طلوع ہوا کرتا ہے۔ پوچھو نہیں کہ وہ کیا کرتا ہے!

وہ نمودِ اخترِ سیماں پا ہنگامِ صبح
 یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبریل
 وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
 جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیں

عیسائیت کے ہاں تمدنی و سیاسی زندگی کے لیے کوئی مستقل اقدار نہیں

اقبال (1877-1938) کے سامنے وہی قرآن کے دو الفاظ ہیں کہ حِیْن تَرْیَحُونَ وَ حِیْن تَسْرَحُونَ (16:6)

آپ نے دیکھا کہ جس نکتے پر پہنچانا ہے تو وہ کیسے پہنچا رہا ہے کہ جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیں۔

اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
 اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل

اس نے یہ قرآن سے لیا ہے یہی جو قرآن نے دو الفاظ کہے تھے: وہ صبح کے وقت کا سماں، وہ شام کے وقت کا سماں۔ تصور اُس سے لیا ہے اور اُس کے بعد جو فطرت نے صلاحیتیں دی ہیں، ان سے کام لیا ہے۔ ذوقِ لطیف کی تسکین کا جو سامان ہے اُس میں یہ چیز نہ ہو کہ جذبات ہی جذبات ہوں کہ جیسے عیسائیت کے ہاں ہوا۔ عیسائیت کے ہاں Laws (قوانین) نہیں ہیں، احکام نہیں ہیں، تمدنی و سیاسی زندگی کے لیے وہاں کوئی پیغام نہیں ملتا بلکہ ان کے ہاں صرف جذبات کی تسکین کا سامان ہے۔ جس قدر ان کے ہاں کی پینٹنگز (Paintings) ہیں آپ دیکھیے ان میں کوئی افادی پہلو نہیں ہے، صرف جذبات کا پہلو ہے۔

ہندوؤں کے ہاں فنونِ لطیفہ کی شکل و صورت

دوسری طرف ہمارے ہاں یہ ہندوؤں کی قوم ہے جو انسانی سطح پہ پہنچی ہی نہیں ہے۔ ان کے ہاں کے سنیا سیوں، سادھوؤں کے غاروں کے اندر جا کر وہ تصاویر دیکھیے، ان کے خداؤں کے مجسمے دیکھیے، پھر اندازہ لگائیے کہ وہ کیا ہوتے ہیں: کالی سیاہ اور اتنی بڑی سرخ زبان لگی ہوئی، گلے میں انسانوں کی کھوپڑیوں کا ہار ڈالا ہوا، چار ہاتھ ایک میں تلوار ایک میں نیزہ، اتنی بڑی بھیا نک صورت۔ اس میں خوف ہے، ڈر ہے، لطافت کا کوئی پہلو ہی نہیں ہے۔ نیچے کی طرف آئیے تو درویشی مہاراج ہیں: آدھا دھڑ ہاتھی کے سوٹڈ کا اور نیچے کا دھڑ، آپ دیکھیں گے کہ ان کے ہاں یہ ذوق نہیں ہے۔

عزیزانِ من! کیا خوب بات کہہ گیا ہے بابر^①! وہ اپنے ساتھ چند آدمی لے کر غربت کی حالت میں اپنے وطن^② سے یہاں ہندوستان میں پہنچا تھا۔ اس نے کس قسم کی نگاہ پائی تھی، اُس کے لیے آپ ترک بابر دیکھیے کہ اس کے بعد وہ صرف چار سال زندہ رہا اور چار سال ہی لڑائیوں میں مصروف رہا۔ ہندوستان کے معاشرے، ہندوستان کے تناظر، ہندوستان کے جغرافیہ، ہندوستان کی سیاحت کے متعلق اُس نے اپنی اس کتاب میں جو کچھ کہا، اُس کا کہیں جواب نہیں۔ اُس کے دوست نے لکھا کہ جہاں تم گئے ہو وہ تو بہت بڑا ملک ہے وہاں اتنی بڑی قوم بستی ہے اُس کا مقابلہ تم کس طرح سے کرو گے اور کیا اس قوم پہ فتح حاصل کر لو گے؟ بابر (1483-1530AD) اُس کے جواب میں لکھتا ہے کہ اس قوم پر فتح حاصل کرنا کونسا مشکل ہے کہ جس قوم کے ذوقِ جمالیات کی کیفیت یہ ہے کہ وہ دریا کے کنارے مکان بناتے ہیں اور مکان کی پشت دریا کی طرف رکھتے ہیں۔ اس کا فتح کر لینا کونسا مشکل ہے! یہ تعلق ہے انسانی زندگی میں ذوقِ جمالیات کا۔ اور پھر اس قوم کی ساری تاریخ ایسی ہے کہ جو اوپر سے آیا وہ دھڑا دھڑان لوگوں کو مارتا دھاڑتا چلا گیا۔

① ظہیر الدین بابر (1483-1530) ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کا بانی، پہلا شاہنشاہ (1526-1530ء)۔ باپ کی طرف سے میرلین اور ماں کی طرف سے چنگیز خاں کا رشتہ۔

② مغلوں کا آبائی وطن سمرقند تھا۔ اپنے باپ کے بعد 12 سال کی عمر میں ظہیر الدین بابر سلطنتِ فرغانہ (موجودہ ازبکستان) کا حکمران بنا۔ اکتوبر 1504ء میں کابل پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے ہندوستان کا رخ کیا اور 1526ء میں سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد رکھی۔

موسیقی کی کیفیت کیا ہے؟ مسلمانوں کی وجہ سے اب موسیقی کی صورت حال یہ ہے ورنہ مندروں کے گھنٹے اور گھڑیاں ہیں جو سارے محلے کو سونے نہیں دیتے۔ عیسائیت کی خالص Emotionalism ہے جس میں صرف جذبات کی تسکین کا پہلو ہے؛ افادیت کا پہلو ہی اُس میں نہیں تھا۔ یا یہ Jews (یہودی) یا ہندو ہیں کہ ان کے ہاں جمالیات ہوتی ہی نہیں؛ ان کے ہاں ساری بات اس طرح ہے جس طرح بنیا ہوتا ہے کہ لکشی ہو یعنی سارا معاملہ روپے کا ہے؛ زندگی کا صرف افادی پہلو ہے؛ ذوقِ جمالیات ہے ہی نہیں۔ قرآن آیا اور اُس نے یہ کہا کہ دیکھیے! ان کے اندر کس قدر افادی پہلو ہے اور اُس کے ساتھ ہی کہتا ہے کہ انہی کے اندر ذوقِ جمالیات کی تسکین بھی دی ہے۔

اسلام کے برعکس سیکولرازم میں صرف مادی طور پر ہی افادی پہلو کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اگر آپ کے ہاں صرف افادی پہلو ہی غالب آیا ہوا ہے تو یہ حیوانی زندگی ہے یہ سیکولرازم (Secularism) ہے۔ اگر صرف جذباتی پہلو آپ کے اوپر غالب آیا ہوا ہے تو یہ موت کی زندگی ہے یہ درحقیقت زندگی نہیں ہے یہ جذبات انسان کی عقل و فکر و شعور کے اوپر غالب آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے امتزاج سے قرآن اپنی زندگی کا ایک تصور دیتا ہے کہ زندگی جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں بھی ہے اور اُس تک پہنچنے کے لیے یہ جو منظر میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے تو یہ منظر بھی اُس کے سامنے ہے۔ ان دونوں کو اکٹھا کیجیے تو پھر اسلام آتا ہے۔ خدا نے جو کہا تھا کہ ہم نے دین کو تکمیل تک پہنچا دیا ہے تو یوں تکمیل تک پہنچتا ہے کہ اُس میں دونوں پہلو ہونے چاہئیں۔

اہلِ مغرب کی ساری تاریخ کا نچوڑ یہ ہے کہ پھولوں میں رنگ تو ہے مگر خوشبو نہیں ہے عجیب بات ہے جو میں نے ابھی پھول کے متعلق کہا ہے کہ پہلے یہ ہمارے ہاں بھی ذوق تھا لیکن اب اس قسم کا ذوق بھی ہمارے ہاں سے ختم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مغرب والوں کے ہاں ابھی تک بھی پھولوں کے ساتھ ان کی محبت و وابستگی ضرب المثل ہے لیکن ان کی بد نصیبی ہے کہ ان کے ہاں پھول میں رنگ تو ہوتا ہے خوشبو نہیں ہوتی۔ اور ان کی ساری تاریخ کا نچوڑ ہی وہ ہے کہ اُس میں رنگ ہی ہوتا ہے خوشبو نہیں ہوتی۔ یہاں یہ چیز تھی کہ ہمارے ہاں کے حکماء نے گلاب کے پھول کے افادی پہلو کے اوپر ایک کتاب لکھ دی اور جب ہمارے ہاں کے شعراء ذوقِ جمالیات کی طرف آئے تو پوچھو نہیں کہ انہوں نے پھول کی خوشبو اور رنگینیوں سے کیا کیا کام لیا۔^①

① ان تمام تفصیل کے لیے یہ پمفلٹ دیکھیے: پرویز علامہ غلام احمد: آرٹ اور اسلام، ادارہ طلوع اسلام لاہور، ص 32 تا 1۔

قرآن حکیم کے نزدیک کائناتی امتزاج کا ذکر کثیر

قرآن میں اس افادی اور جمالیاتی پہلو کا امتزاج ہے۔ اب اس تناظر کی روشنی میں یہ چار الفاظ لیجیے جو قرآن نے کہے ہیں کہ

فَسُبْحَنَّ اللَّهَ حِينَ تُمْسُونَ وَ حِينَ تُصْبِحُونَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَ حِينَ تُظْهِرُونَ ① (30:17-18)۔ کیا بات ہے صبح نور کا تڑکا ہو یا شام کا سکوت اُس میں بھی آپ کو نظر آئے گا کہ خالق کائنات کی تخلیق میں کہیں کوئی کمی نہیں، کوئی نقص نہیں اور مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفَوُّتٍ ② (67:3) تمہیں کائنات کی تخلیق میں کہیں کوئی سلوٹ نہیں نظر آئے گا۔ کہا کہ وہ اُس سے بہت دور ہے کہ اُس کی تخلیق ہو اور اُس میں کہیں ذرا سا قسم رہ جائے۔ شاعری ہے تو کہیں کوئی ذرا سافر پڑ جائے موسیقی ہے تو کسی مقام کے اوپر بھی وہ بے سُرا ہو جائے یا بے تالہ ہو جائے۔ اُس کی تخلیق میں تم یہ بات نہیں پاؤ گے: مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفَوُّتٍ (67:3)۔ یہ لفظ توری محسوس چیزوں کے لیے آتا ہے کہ اُس کی تخلیق میں تم کسی قسم کا قسم نہیں پاؤ گے۔ حِينَ تُمْسُونَ وَ حِينَ تُصْبِحُونَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَ حِينَ تُظْهِرُونَ (30:17-18)۔ اس میں تمام پہلو ہیں اس میں زمان اور مکان دونوں آگئے: سموات و الارض کہا تو Space (مکان) آئی، جب یہ صبح اور شام اور زوال آفتاب، عشاء، رات کا وقت کہا تو اُس میں ٹائم (زمان) آ گیا۔ اور کہا کہ سُبْحَنَّ اللَّهَ۔ خدا Space & Time (مکان و زمان) کی نسبتوں سے بلند ہے لیکن اُس کی جو تخلیق ہے وہ انہی حدود کے اندر ہے۔ جوں جوں نگاہ بلند ہوتی چلی جائے گی یہ Space (مکان) اور ٹائم (زمان) کی حدود پہلے سے وسیع ہوتی چلی جائیں گی اور آخر میں تو مٹ ہی جاتی ہیں پھر انسان ③ Durationless Time (بلا دورانیہ زمان) پہ پہنچ جاتا ہے۔

- ① لہذا کسی قوم کی زندگی کے آغاز کا وقت ہو یا اس کے ختم ہونے کا زمانہ اس کا آفتاب نصف النہار پر ہو یا زوال کے قریب، وہ کسی دور سے بھی گزر رہی ہو جب اس کے سامنے قوانین خداوندی آئیں تو اُسے ان قوانین کی مسلسل اور پیہم اطاعت کرنی چاہیے۔ وہ دیکھ لے گی کہ جس طرح قوانین خداوندی خارجی کائنات میں ایسے خوشگوار نتائج پیدا کرتے ہیں جنہیں دیکھ کر ہر ایک بے ساختہ واہ و اہ پکار اٹھتا ہے جب یہ اپنے معاشرے کو ان قوانین کے قالب میں ڈھالے گی تو وہ بھی اسی قسم کے قابل تحسین ثمرات کی حامل بن جائے گی۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 832-833)۔
- ② تمہیں خدائے رحمن کی تخلیق کردہ کائنات میں کہیں بے ترتیبی یا عدم تناسب نظر نہیں آئے گا (پرویز: مفہوم القرآن، ص 1339)۔
- ③ اسے مثال سے یوں سمجھیے کہ جیسے سونے والے کو (غیند کی حالت میں) وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ یہ احساس اسے ہوتا ہے جو جاگ رہا ہے اسی طرح جسے کلوروفارم سگھا دیا جائے اسے بھی وقت کا احساس نہیں ہوتا۔ اسے اصطلاحی زبان میں یوں کہیں گے کہ زمان (Time) ایک اعتباری یعنی اضافی (Relative) شے ہے اس لیے اہل فلسفہ اُس زمان (Time) کو جس کے گزرنے کا احساس نہ ہو Durationless Time (زمان بلا دورانیہ) کہتے ہیں۔ اس کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ النور، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور (2007، ص 202-203)۔

زندگی کے متعلق قرآنی حقائق کی بیان کردہ علامات کو سمجھنے کے لیے تغیرات کا سمجھنا نہایت ہی اہم ہے قرآن نے انسانی ارتقا کے لیے یہ مقام بتایا ہے۔ ان دو آیات کے اندر وہ جو پہلا پہلو جمالیات کا تھا، میں نے کہا ہے کہ اُس کے ربط کو دیکھیے تو اس میں یہ چیز سامنے آئے گی۔ اور اگر اس اعتبار سے دیکھیے کہ قوموں کے زوال اور عروج کے متعلق قرآن ذکر کرتا چلا آ رہا تھا تو اُس نے ان چیزوں کو آغاز کہا ہے کہ قرآن جو کچھ کہنا چاہتا ہے اُس تک پہنچنے کے لیے اُس کی علامات کے طور پر جو تغیر ہے Change ہے یہ بہت بڑی چیز ہے۔ قرآن نے اس کو بہت اہمیت دی ہے۔ درس کے تھوڑے سے وقت کے اندر نہ تو فرصت ہوتی ہے نہ گنجائش کہ میں ان پہلوؤں کو آپ کے سامنے لاؤں، ویسے بھی یہ کچھ فلسفے سے متعلق چیزیں ہیں لیکن قرآن جسے اختلاف لیل و نہار کہتا ہے جہاں لفظ اختلاف آیا ہے تو وہ تغیر ہے۔ اور قرآن کی رو سے تغیر بڑی چیز ہے۔

تغیرات کے اس عمل میں بڑے بڑے رموز مضمحل ہوتے ہیں

میں ابھی عرض کرونگا کہ قرآن کریم کیا کہتا ہے۔ قوموں کے تغیرات میں بھی وہ کہتا ہے کہ قوموں کی ابتدائی نمود کا زمانہ ہو جسے آپ صبح کہہ رہے ہیں یا اُس کے غروب کا زمانہ ہو جسے آپ شام کہہ رہے ہیں اُس کا آفتابِ سطوت نصف النہار پہ ہو جسے قرآن نے نُظْمُہُورُونَ کہا ہے جسے آپ ظہر کا وقت کہتے ہیں یا اُس کے بعد وہ قوم بالکل ختم ہو گئی ہو جسے آپ رات کہتے ہیں وہ کہتا ہے کہ قوموں کی زندگی پوری تاریخ ہے۔ آپ دیکھ لیجیے وہ انہی تغیرات سے ہی مرتب ہوئی نظر آئے گی۔ تو میں ابھرتی ہیں ترقی کرتی چلی جاتی ہیں۔ وہ جیسے ”نصف النہار پہ آفتاب“ تو محاورہ ہے تو وہاں تک پہنچتی ہیں پھر آمادہ بہ زوال ہوتی ہیں پہلے ان کا انحطاط ہوتا ہے Decline (زوال) ہوتا ہے اور اُس کے بعد Fall (ہبوط) ہو جاتا ہے اسے اُس نے عشاء سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان چیزوں کے اندر آپ دیکھیں گے کہ یہاں ایک قانون کام کر رہا ہے۔ یہ سارا کچھ By Chance یا Accidentally (اتفاقاً) نہیں ہو رہا، یونہی اتفاقیہ نہیں ہو رہا بلکہ ان کے متعلق قوانین ہیں جیسے باہر کی کائنات کے متعلق یہ قانون کہ کس طرح آہستہ آہستہ درخت کی سرسبزیاں شادابیاں ہیں پھر اس کی ایک ایک پتی جھڑنی شروع ہوتی ہے تو آخر میں وہ ٹنڈ منڈ رہ جاتا ہے اور ایک پتی بھی نہیں ہوتی لیکن اگر اُس کے اندر زندگی حاصل کرنے کی صلاحیت ابھی باقی ہے جڑیں مضبوط ہیں تو اس میں از سر نو زندگی کی ایک نمود ہوتی ہے جو پہلے سے زیادہ مسکراتی ہوئی تمہارے سامنے آتی ہے۔ یہ تغیر ہے۔ ابھی تغیر کی آیات آ رہی ہیں اس لیے اس پہ زیادہ تفصیل سے نہیں جاتا آگے چل کر میں عرض کرونگا۔ یہ بڑی چیز ہے۔ اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ جو قرآن نے صبح اور شام اور دوپہر اور رات کے اوقات کا ذکر کیا ہے اسے قوموں کی زندگی کے ربط میں دیکھیے تو تاریخ کا یہ فلسفہ جو تغیر کا Change

کا ہے وہ اس میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اسی اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ اگلی آیت کے ساتھ اس کا گہرا ربط ہے۔

قرآن حکیم نے قوموں کی موت و حیات کے بھی پیمانے متعین کر رکھے ہیں

اگلی آیت ہے کہ **يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَمِيتِ وَيُخْرِجُ الْمَمِيتَ مِنَ الْحَيِّ** ① (30:19)۔ اس آیت میں قرآن کہتا ہے کہ اسی طرح سے تم دیکھو گے کہ خدا کس طرح سے ایک مردہ قوم کو از سر نو زندہ کر دیتا ہے اور کس طرح سے ایک زندہ قوم موت کے آغوش میں جا کر سو جاتی ہے۔ جس طرح دن اور رات کے لیے ہمارا قانون مقرر ہے اُس کے مطابق یہ کچھ ہوتا ہے اسی طرح قوموں کی زندگی عروج اور زوال اور موت کے لیے بھی ہمارا قانون مقرر ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ زندہ قومیں اس طرح قبرستان بن جاتی ہیں کہ ان کی صرف احادیث باقی رہتی ہیں، صرف تاریخ میں ان کے نام باقی رہتے ہیں۔ وہ عرب کی قوم جو صدر اول میں امت محمدیہ M بن گئی تھی وہ ایک نئی جماعت قریش میں پیدا ہو رہی تھی بات وہاں سے چلی تھی۔ وہ اس پہ ہنستے تھے کہ

ذُرَّةُ نَاجِزٍ وَ تَعْمِیرُ بَیَابَانِ نَکَرًا!

اندازہ لگائیے! کھانے کو روٹی نہیں ملتی، پہننے کو کپڑا نہیں ہے، ان کے پاس تلواریں بھی پوری نہیں ہیں اور دعویٰ یہ ہے کہ عرب اور عجم پہ صرف ہمارا نظام قائم ہوگا۔ قرآن مجید نے کہا کہ ان سے کہیے کہ تم نے کبھی دیکھا ہے کہ **وَيُخْضِی الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا** (30:19) بنجر زمین ہے اس میں نمود کا سبزی کا شادابی کا نشان تک نہیں ہے تمہارے ذہن میں اس سبزی و شادابی کا امکان بھی نہیں ہے۔ کیا تم نے اُس کی ویرانیوں کو دیکھا ہے؟ اور پھر جب ہمارے ابر کرم کا ایک چھینٹا اُس پہ پڑتا ہے تو پھر اُس کو جا کر دیکھا کرو۔ ریت کا ایک ایک ذرہ شگوفہ بنا ہوا ہوتا ہے۔ ہمارا قانون یہ کر سکتا ہے تو ہمارے قانون کی پابندی کرنے والی یہ جماعت جسے تم اس قدر کمزور حرکت اور حرارت سے عاری سمجھتے ہو جس کو تم زمین بنجر سمجھ رہے ہو تو کیا اس میں زندگی کی نمود نہیں ہو سکتی؟

تبدیل آسمانی انسانی زندگی کے تاریک راستوں کو منور کرنے کے لیے ہی عطا کی گئی ہے

آپ دیکھ رہے ہیں کس کس انداز سے قرآن بات سمجھاتا ہے! کہتا ہے کہ **يُخْضِی الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ كَذَٰلِکَ تُخْرِجُ جَوْنَ** ② (30:19)۔ ارے اس طرح سے زندگی ہوگی۔ ٹھیک ہے کہ مرنے کی زندگی پہ تو ہمارا ایمان ہے لیکن وہ یہاں کی

① انہی قوانین کی اطاعت سے مردہ قوموں کو حیات تازہ مل جاتی ہے اور انہی کی خلاف ورزی سے زندہ قومیں موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 933)۔

② تم دیکھتے نہیں کہ جب زمین مردہ کی قوانین فطرت کے مطابق آبیاری کی جائے تو اس میں سے کس طرح زندگی لہلہاتی ہوئی نمودار ہو جاتی ہے۔ اسی قانون کے مطابق تمہیں بھی زندگی مل جائے گی۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 933)۔

زندگی کے اوپر زور دیتا ہے کہ مایوس نہیں ہو جانا چاہیے۔ ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے واقعی کسی کو کوئی راستہ بھائی ہی نہیں دیتا۔

عزیزانِ من! مایوسی اُسے کہتے ہیں کہ جب کوئی راستہ بھائی ہی نہ دے۔ راستہ ہو تو مایوسی نہیں ہوتی۔ غلط ہی ہو تو چلنے کے بعد احساس ہو جاتا ہے کہ غلط تھا تو اُس سے آدمی پھر لوٹ کر صحیح راستے پہ آ جاتا ہے لیکن جب کوئی راستہ ہی بھائی نہ دے تو وہاں مایوسی ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے: كَذَلِكَ تُخْوِرُ جُؤْنَ ① (30:19)۔ مایوس ہونے کی بات نہیں ہے۔ سنو! لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ② (29:69)۔ ٹھیک ہے تم نے ہائی وے پر پہنچنا ہے، صراطِ مستقیم پہ جانا ہے، شاہراہِ اعظم کے اوپر پہنچنا ہے۔ اگر تم دور افتادہ گاؤں میں ہو تو کوئی بات نہیں، ہم نے پگڈنڈیاں بنا رکھی ہیں جو تم گاؤں سے اُس پگڈنڈی کے اوپر چلو گے تو اُس سڑک پہ جا پہنچو گے۔ اگر کسی ملک کے اندر یہ شاہراہ ہی نہ ہو تو کراچی سے چلنے والا کون یقین سے کہے گا کہ میں پشاور جا پہنچوں گا؟ اس شاہراہِ اعظم کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں لیکن اگر کسی ملک کے اندر ایک ہی شاہراہ ہو اور کسی دور افتادہ بستی یا گاؤں سے کوئی راستے وہاں تک پہنچ ہی نہ پائیں تو صراطِ مستقیم تک تو آ ہی نہیں سکتا۔

صراطِ مستقیم ”ضالین“ کی راہنمائی کے لیے ہی عطا ہوا تھا

سورة الفاتحة میں صراطِ مستقیم کے بعد کہا کہ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ③ (1-7)۔ ضالین وہ ہوتے ہیں جن کے سامنے پگڈنڈیاں نہ ہوں، تلاش کر رہے ہوں کہ صراطِ مستقیم پر پہنچنا ہے لیکن پہنچنے کے لیے پگڈنڈیاں نظر نہ آئیں۔ تو یہ جو چیزیں ہیں اُن کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے یہ انتظامات کر رکھے ہیں۔ اگر ان کے اوپر چلتے جاؤ گے تو كَذَلِكَ تُخْوِرُ جُؤْنَ (30:19) اس طرح سے مردوں کی بستیوں پہ حیاتِ تازہ لے کر نئی قوم ابھر سکتی ہے۔ اسی لیے اس نے مایوسی کو کفر قرار دیا ہے۔ قرآن سامنے ہوگا تو اس مقام پہ تم کبھی نہیں پہنچو گے کہ تمہارے سامنے کوئی راستہ ہی نہ ہو۔

① اسی قانون کے مطابق، تمہیں بھی زندگی مل جائے گی۔

② ہمارے قانونِ ہدایت کے مطابق ان کے سامنے زندگی کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں جو ہر طرف سے آ کر صراطِ مستقیم میں مل جاتی ہیں اور اس طرح انسانی سعی و عمل کا رُخ ہمارے متعین کردہ پروگرام کی طرف پھیر دیتی ہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص-928)۔

③ اس کی مکمل تشریح کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورة الفاتحة، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور

انسان کی اپنی تخلیق بذاتِ خود ایک قابلِ غور امر ہے

قرآن کریم کہتا ہے کہ دیکھنا چاہتے ہو کہ ایک ذرہ ناچیز سے تعمیرِ بیاباں کس طرح سے ہوتا ہے تو اپنی حالت پر غور کرو کہ وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَا اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿30:20﴾۔ تمہاری تخلیق کا آغاز کس طرح سے ہوا؟ زندگی سے عاری Inanimated (غیر جاندار) مادہ جس میں زندگی نہیں ہوتی یعنی مٹی اور پانی کا جب جوہروں کے کنارے امتزاج ہوتا ہے تو وہاں لائف سیلز (جرثومہ زندگی) پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ننھا سالائف سيل (جرثومہ حیات) اس قسم کا بشر بن سکتا ہے تو تم تو بشر ہو۔ تمہیں پتہ ہے کہ اس ننھے سے لائف سيل (جرثومہ حیات) نے زندگی کے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں تو کتنی کتنی مشکلات اور موانع اس کے راستے میں آئے ہیں۔

عزیزانِ من! ہم کیا جانیں! یہ تو مغرب کے سائنسٹس سے قرآن کی ان آیات کا ترجمہ پوچھیے۔ وہ بتائیں گے کہ قرآن یہ کیا بات کہہ گیا ہے کہ اُس مادے سے جس کے اندر زندگی کا نشان تک نہیں تھا، اس انداز کی زندگی جو انسان میں ہے کن ارتقائی مراحل سے گزر کر یہاں تک آئی ہے۔ قرآن کہنا یہ چاہتا ہے کہ کیوں گھبرا رہے ہو، کیوں مایوس ہو رہے ہو، تم جب وہاں سے چل کر یہاں تک پہنچ سکتے ہو تو ان مزاحمت سے گھبراتے کیوں ہو۔ یہاں کہا ہے کہ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿30:20﴾ ایک ہی بشر نہیں پیدا کیا، دیکھو تو سہی کتنے پھیلے ہوئے ہیں، کرہ ارض ان سے بھرا ہوا ہے۔ اور پھر اس کو انسان بنایا۔

عزیزانِ من! اُس زندگی کو سامنے رکھیے کہ اس نوعِ بشری میں ایک ہی نوع ہو یعنی مرد ہی مرد ہوں یا عورتیں ہی عورتیں ہوں ”تے کڈی بے سوادئ تے پھکی زندگی ہوندی“۔ ﴿2﴾ کہا لائف سيل نے، اُس جرثومے نے، تو بشر ہی بننا تھا۔ وہ بشر جو بنا ہے تو ایسا نہیں بنا ہے کہ وہ صرف مرد ہی بن جاتا یا صرف عورت ہی بن جاتا۔ میں کیا عرض کروں کہ آج کی سائیکولوجی نے کیا کچھ ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے کہ اس تنوع کے اندر کیا چیزیں پوشیدہ ہیں! کہا کہ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا ﴿30:21﴾۔

① قانونِ خداوند کی حیات بخشی کا اندازہ لگانا ہو تو تم خود اپنی پیدائش پر غور کرو۔ جامد مادہ (مٹی) میں زندگی کے کوئی آثار نہیں ہوتے۔ خدا نے اس جامد مادہ سے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی۔ اور پھر اسے مختلف گردشیں دیتا ہوا، اس مقام تک لے آیا جہاں تم جیکر بشریت اختیار کر کے ساری دنیا میں پھیل گئے (پرویز: مفہوم القرآن، ص-933)۔

② تو کتنی بے مزہ اور روکھی پھکی زندگی ہوتی۔

③ جامد مادہ سے جب زندگی کی ابتدا ہوئی تو وہ ایک جرثومہ (Life Cell) کی شکل میں تھی۔ وہ جوشِ نمو سے پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تو اس کا ایک حصہ نر بن گیا اور دوسرا مادہ۔ اس طرح تم، مرد اور عورت، ایک دوسرے کے زوج (جوڑے یعنی Complementary to each other) بن گئے (پرویز: مفہوم القرآن، ص-933)۔

وہ جو ایک جڑوئمہ ہوتا ہے وہ نہ Female (مادہ) ہوتا ہے اور نہ Male (نر) ہوتا ہے وہ نہ مذکر ہوتا ہے نہ مؤنث ہوتا ہے۔ وہ ذوقِ نموسے شق ہوتا ہے۔ اس کے لیے سائنسدانوں^① نے بھی ذوقِ نموی کی ایک اصطلاح وضع کی ہوئی ہے۔ اُسے اپنی نموکا ایک ذوق ہوتا ہے۔ جب اُس سے وہ شق ہوتا ہے تو اُس میں سے اُسی کا ایک حصہ نر ہو جاتا ہے اور دوسرا حصہ اُس کا مادہ ہوتا ہے۔ اور پھر چل سوچل۔ یعنی تَنْتَشِرُونَ (30:20) تم ساری دنیا میں پھیل گئے۔ یہ ہے اس کا ترجمہ۔ یہ ہے مِنْ أَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (30:21)۔ ہمارے ہاں تو ”زوج“ بیوی کو کہتے ہیں خاوند کو کبھی زوج نہیں کہتے۔ یہ چیزیں ہمارے اوپر ایسی مسلط ہوئیں کہ وہ مرد کی کچھ زوج ہوتی ہے مرد اس کا یہ کچھ زوج نہیں ہوتا۔ ”تے اوتے برابر دی گل ہو جانی ہیگی“۔^② یہ تصور لے لینا کہ صاحب! یہ دونوں برابر ہیں کتنی بڑی عمدہ بات ہے! اس لیے تو کہا جاتا ہے کہ توبہ توبہ توبہ۔

آدم کی پسلی سے حوا کے پیدا کرنے کی یہ کہانی تورات کی بیان کردہ ہے قرآن کی نہیں

ہمارے ہاں قصوں میں ہے کہ ابتدا یہاں سے ہوئی تھی کہ خدا نے مرد پیدا کیا پھر وہ اداس ہو گیا ”ادہدی اداسی لہان واسطے ادہدی پسلی وچوں بیوی پیدا کردی“۔^③ اب پسلی کے اندر سے جو بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ تو اُس کی بیٹی ہوتی ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق وہ بابا آدم کی پسلی سے جو پیدا کیا تو وہ اُس کی بیوی بنی۔ یعنی یہ ہے وہاں۔ یہ تورات کے قصے ہیں اور آپ کے ہاں آگئے ہوئے ہیں۔ آپ کے ہاں حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں یہی لکھا ہوا ہے کہ وہ آدم اداس ہو گیا تو اُس کی اداسی مٹانے کے لیے پسلی سے عورت پیدا کی۔ یعنی مقصود بالذات تو وہ مرد ہی تھا اب وہ جو اداس ہوا جیسے بچے کے پاس اگر کھلونا نہ ہو تو اتنا اداس ہوتا ہے کہ وہ رونے لگ جاتا ہے اور پھر اُسے کھلونے دیدیتے ہیں گویا ہمارے ہاں عورت کی یہ حیثیت رکھی گئی ہے۔

عزیزانِ من! عربی زبان میں لفظ زوج اس معنی میں آتا ہی نہیں ہے۔ زوج کے معنی ہوتا ہے کہ دو ایسی چیزیں جن میں سے اگر ایک اُس کے برابر نہ ہو تو گاڑی چل ہی نہ سکے۔ جیسے یہ گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں تو ان کو ازواج کہتے ہیں یعنی ایک دوسرے کی زوج۔ اُس کے بغیر یہ ناکارہ اس کے بغیر وہ ناکارہ۔

مرد اور عورت باہمی طور پر ایک دوسرے کے زوج ہیں

اگر کیفیت یہ ہو کہ ٹانگے کا ایک پہیہ تو اتنا بڑا ہو اور دوسرا چھوٹا سا ہو تو کیا ٹانگہ چل پڑے گا؟ اور اگر ایک پہیہ گول ہو اور دوسرا

① اس کی تشریح و تفسیر کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورة العنکبوت، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2008، 169 تا 170 کے فٹ نوٹ [2 1 (170)]

② وہ پھر ہم سری کی بات ہو جاتی ہے۔

③ اس کی اداسی دور کرنے کے لیے اس کی پسلی سے بیوی پیدا کر دی۔

چوکور ہو تو کیا پھر گاڑی چل سکے گی؟ آج ہمارا سارا معاشرہ یہی ہو چکا ہے۔ عرب ”زوج“ اُس وقت کہتے تھے جب دو چیزیں وہ ہوں اور ان میں سے ہر ایک ایک دوسرے کے ساتھ اتنی موافقت رکھے ہو کہ ان میں ذرا سا بھی تفاوت نہ ہو۔ یہ تو بات ہی الگ ہے کہ اُس میں سے ایک نہ ہو تو پھر بھی زندگی کی گاڑی چل نہیں سکتی۔ یہاں کہا ہے کہ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا (30:21) تمہارے لیے ازواج پیدا کیے۔ ہمارے ہاں یہ کہہ دیا کہ صاحب! مرد کے لیے ازواج پیدا کیے جبکہ خَلَقَ لَكُمْ میں مرد اور عورتیں دونوں آتی ہیں۔ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا (30:21) تمہارے لیے ازواج پیدا کیے اور وہ جوڑا ہم کہیں باہر سے نہیں لائے بلکہ تم میں سے ہی ہے۔ اس کے اندر آپس میں بڑی ہی محبت اور پیار کی بات ہے یعنی تم میں سے۔

عزیزانِ من! قرآن کے ایک ایک لفظ پہ غور کیجیے کہ کتنے اہم مسائل حل ہوتے چلے جاتے ہیں! یہاں مِنْ أَنْفُسِكُمْ ازواجًا (30:21) کہا ہے اگر وہ جوڑا مِنْ أَنْفُسِكُمْ نہیں ہے تو زوج نہیں ہو سکتا اور اگر یہ زوج نہیں ہے تو زندگی کی گاڑی چل نہیں سکتی۔ آپ اندازہ لگائیے۔ اندازے کی کیا ضرورت ہے اس کا تو نقشہ ہر گھر میں موجود ہے۔

لفظ مودة کا قرآنی مفہوم

پھر بات وہی ہوئی کہ کیا اس سے مقصد صرف Procreation (تولید) تھا، افزائشِ نسل تھا؟ حیوانی زندگی میں تو یہیں تک بات ہوتی ہے۔ وہاں بھی یہ نر اور مادہ ہوتے ہیں لیکن وہ ازواج نہیں ہوتے۔ وہ تو صرف Procreation (تولید) کا، افزائشِ نسل کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں، مشینیں ہوتے ہیں۔ کہا کہ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لَتَسْكُنُوا إِلَيْهَا (30:21) انسانی زندگی کے اندر صرف Procreation (تولید) نہیں بلکہ ایک دوسرے سے تسکین حاصل کرو۔ یعنی صرف افزائشِ نسل نہیں ہے بلکہ ایک ایسی زندگی بن رہی ہے جس میں سکون ہو۔ اس لیے کہا کہ وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً (30:21)۔

مودۃ کا لفظ عربی زبان میں محبت سے بھی ایک اگلے درجے کا ہوتا ہے۔ ہمیں تو محبت کا بھی پتہ نہیں تو اگلا درجہ کیسے پتہ ہو۔ یہ تو زبان اتنی بڑی وسیع ہے کہ محبت ہی کوئی کم درجے کا لفظ نہیں تھا کہ مودۃ کہا۔ یہ کچھ یوں سمجھ لیجیے کہ دو تختیوں کا اس طرح سے آپس میں جڑ جانا کہ وہ جوڑ نظر نہ آئے اور محسوس نہ ہو کہ یہ جڑی ہوئی ہیں اس کے لیے وہ لفظ مودۃ استعمال کرتے تھے۔ یہ جو کیفیت ہے تو یہ Psychological (نفسیاتی) ہوتی ہے جسے ہم آہنگی کہتے ہیں۔ وہ نہ خیالات کی ہوتی ہے نہ جذبات کی ہوتی ہے بلکہ وہ Personality (شخصیت) کی ہوتی ہے لیکن اس طرح سے ہوتی ہے کہ اپنی اپنی Individuality (انفرادیت) بھی قائم ہوتی ہے اور اُس کا جوڑ (Joint) بھی اس قسم کا ہوتا ہے کہ اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس دور میں آ کر یہ باتیں سامنے آتی ہیں کہ محبت

سے یہ مودۃ کیسے بنا۔ محبت میں جڑنا نہیں ہوتا بلکہ الگ الگ ہوتے ہیں۔ مودۃ میں اس انداز کی یہ چیز ہوتی ہے کہ دونوں جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور پھر ان کا تشخص الگ الگ رہتا ہے۔

اس مودۃ کے اس مقصد کا اگلا پہلو یہ ہے کہ وَرَحْمَةً (30:21) تاکہ تمہاری مضر صلاحیتیں نشوونما پاتی چلی جائیں۔ اگر زوج کی زندگی نہ ہو تو تسکین و مودۃ اور رحمت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو۔ یہ جو رحمت کہا ہے کہ مضر صلاحیتیں نشوونما پائیں اور اُس انداز سے وہ نشوونما پائیں کہ جس طرح رحم مادر میں بچہ نشوونما پاتا ہے۔ ماں اپنا خون جگر پلا پلا کر اُس بچے کی نشوونما کرتی ہے، کبھی اُس کے سر احسان نہیں دھرتی ”کدی اوہنوں میہنڈا نہیں ماردی“ کدی اوہنوں طعنہ نہیں دیندی“۔^① احسان تو ایک طرف رہا اگر کہیں ڈاکٹر یہ کہہ دے کہ بچے کا وزن کچھ کم ہو رہا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ اپنا خون اس کے اندر انڈیلتی ہے۔ کہا کہ کیا پیدا ہونے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا؟ نہیں صاحب! بلکہ وہ یہی خون جو براہ راست دے رہی تھی اب وہ دودھ کے چشموں کے ذریعے سے اس کو دیتی چلی جاتی ہے۔ دودھ کم ہوتا ہے تو اپنا علاج کراتی پھرتی ہے تاکہ اس کی نشوونما نہ رک جائے۔ کہا کہ یہ چیز جو تم بچے میں دیکھتے ہو، تم دونوں جو زوج بنے ہو تو تمہارے اندر جو انسانی صلاحیتیں ہیں ان کو اس طرح نشوونما پانا چاہیے۔ یہ ایک اندرونی جذبہ ہے جس کی رو سے جی یہ چاہتا ہے کہ یہ سب کچھ بن جائے۔ خدا یہ چاہتا ہے کہ یہ سب کچھ بن جائے۔

قرآن حکیم نے اپنی ہر وہ بات جو سمجھانی ہو وہ اسے اپنی نشانی کہتا ہے

قرآن کریم نے کہا کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَا یَسِتِ (30:21) اس کے اندر بھی زندگی کے مقصد تک پہنچنے کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ قرآن جن چیزوں کو سمجھاتا ہے ان کو نشانیاں کہتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ نشانیاں تو ہیں لیکن لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (30:21) یہ اُس قوم کے لیے ہیں جو عقل و فکر سے کام لے۔ کہتا ہے کہ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَاَلْاَرْضِ وَ اٰخِثَافِ السِّنِّیَّتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ (30:22) آؤ تمہیں اور بتائیں۔ ہماری نشوونما میں تخلیق ارض و سما تو تم نے دیکھی انسانوں کی زندگی کے اندر زبانوں کا اور رنگوں کا اختلاف ہے۔ عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے یہ بات کہی جا رہی ہے۔ کسی کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ کوئی اتنا اہم مسئلہ ہے جس کو آیتِ خداوندی قرار دیا گیا ہے۔

① کبھی اسے طعنہ کا شائبہ تک نہیں دیتی۔

قوموں کی ارتقائی کیفیت کو جاننے یا ماننے کا طریق

ہمارے اس دور میں آکر اس پہ تحقیق ہوئی ہے۔ ڈاکٹر بک^① کی ایک کتاب ہے: "Cosmic Consciousness" یہ بڑی اہم کتاب ہے۔ یہ بڑے عجیب لوگ ہیں۔ یہاں یہ لَقَوْمٌ يَتَّفَكُرُونَ کہا ہے۔ ان میں سے ایک ایک شخص ایک ایک پوائنٹ (نکتے) کے اوپر تحقیق کرتے ہوئے اپنی زندگی بسر کر دیتا ہے۔ اُس نے تحقیق یہ کی ہے کہ نوعِ انسانی ارتقائی منازل میں سے گزرتی ہوئی آگے بڑھی ہے اگر یہ دیکھنا ہو کہ کسی ایک درجے میں مختلف ملکوں کی مختلف نسلوں کی قوموں کی ارتقائی سطح کتنی بڑی تھی یعنی گراف بنانا ہو کہ وہ اُس سطح پہ یہ اس سطح پہ یعنی Evolution (ارتقا) کے منازل کے اندر مختلف قوموں کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا گراف بنانا ہو تو کہا کہ اُس کے لیے السنہ والوان (Languages & Colours) ذریعے (Means) ہیں۔ اُن میں ایک تو یہ ہے کہ اُس قوم میں زبان کی وسعت کتنی تھی اور دوسرا یہ ہے کہ اس قوم میں کتنے رنگوں کی پہچان کا مادہ تھا۔

چودہ سو سال قبل بھی عربوں کی زبان دانی دنیا بھر میں بے مثل تھی

زبان کے لیے یہ جو^② Perceptual الفاظ ہوتے ہیں یعنی پانی، روٹی، درخت، وہ کہتا ہے کہ یہ نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ Concepts یعنی ایک چیز کا تصور ہوتا ہے وہ دیکھنا چاہیے^③۔ وہ کہتا ہے کہ جب ہم درخت کہتے ہیں تو اُس سے مراد یہ سامنے کا درخت نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک چیز کا تصور (Concept) دیتا ہے جسے درخت کہا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دیکھو کہ کسی قوم کے اندر Concepts (تصورات) کتنے ہیں۔ اور آپ حیران ہونگے کہ وہ اپنی تحقیق میں جب عربوں کے اوپر پہنچا ہے تو کہتا ہے کہ اُس دور میں جس دور میں عربوں کی ہسٹری لے رہا ہوں ساری دنیا کی قوموں کے اندر ملا کر بھی اتنے Concepts (تصورات) نہیں تھے جتنے اس ایک قوم کے اندر تھے۔ گراف کے اعتبار سے وہ کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ تھی۔ جس قوم کی لغتِ زبان کے اندر اونٹ کے لیے پانچ ہزار سات سو چوالیس (5744) الفاظ ہوں تو پوچھو نہیں کہ وہ قوم کیا تھی۔

عزیزانِ من! بقول ڈاکٹر^① بک عقلی سطح کو جانچنے کی اگلی چیز رنگوں کا اختلاف ہے۔ ہم نے تو یہی سمجھ لیا کہ تین رنگوں میں

① Bucke, Richard Maurice: Cosmic Consciousness

② محسوس کی جانے والی اشیاء کے لیے الفاظ۔

③ یعنی تاریخ کے کسی خاص دور میں کسی قوم کی ذہنی سطح کا اندازہ لگانا ہو تو دیکھنا یہ چاہیے کہ اس دور میں اس قوم کی زبان میں کتنے الفاظ ایسے تھے جو تصورات (Concepts) کے مظہر تھے۔

قومیں ❶ تقسیم کی گئی ہیں: White Race (سفید فام)، Black Race (سیاہ فام) اور Red or Yellow Race (سرخ یا زرد فام)۔ قرآن یہ اختلاف نہیں کہتا۔ اُس نے ایک تو یہ کہا ہے کہ اُس قوم کی زبان کے اندر Concept (تصور) کے لیے کتنے الفاظ تھے۔ اور دوسری عجیب چیز ہے شاید آپ پہلی دفعہ سنیں، میں نے بھی جب پڑھا تھا تو پہلی دفعہ ہی یہ سامنے آیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ کسی اسٹیج پر کسی قوم میں کتنے رنگوں کی پہچان کا مادہ ہوتا ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ Basic Colours (بنیادی رنگ) ہیں جو گنے جاتے ہیں تو یہ شروع سے تھے، انسان شروع سے پہچانتا تھا۔ اُس نے یہ تحقیق کی ہے کہ جس طرح حیوان کی زندگی کے اندر رنگ کی پہچان ہی نہیں ہوتی۔ یہاں سے آگے انسان کی زندگی شروع ہوتی ہے تو رنگوں کی پہچان ہوتی ہے۔ جو قوم پست درجے کے اوپر ہوتی ہے، اُس قوم کے اُس دور کے لٹریچر کے اندر صرف ایک رنگ کا نام ملتا ہے۔ نظر آتا ہے کہ وہ دوسرا رنگ پہچانتی ہی نہیں تھی اور وہ اس طرح چلتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس دور میں ہندوؤں جیسی قوم جن کا اتنا بڑا لٹریچر ہے، ان کے سارے لٹریچر میں تین رنگوں کے نام ملتے ہیں۔ عربوں کے ہاں اُس دور میں بھی چھ رنگوں کے نام ملتے ہیں۔ آج پتہ چلا کہ قرآن یہاں کیا کہہ گیا ہے۔ ہماری نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے: وَ اٰخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ (30:22) زبانوں اور رنگوں کا اختلاف۔ عزیزانِ من! بک ❷ سے پوچھیے، مغرب کے مفکرین سے پوچھیے کہ قرآن چودہ سو سال پہلے کیا کہہ گیا ہے۔ قوموں کی ارتقائی کیفیت ماپنے کے لیے یہ معیار اور پیمانے ہیں جنہیں قرآن ”و من ایلہ“ کہتا ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک لفظ علماء کی تعریف

عزیزانِ من! اس کے لیے آگے وہ پھر شرط لگا دیتا ہے کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ (30:22)۔ اب اگر میں اس کا ترجمہ علماء کردوں تو آپ بھی ہنسیں گے اور میں بھی ہنسوں گا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بات تو اہل علم ہی سمجھیں گے۔ اگر میں ترجمہ علمائے کرام کروں گا تو ان میں تو ایک بھی نظر نہیں آتا اور ان کے متعلق اقبالؒ (1877-1938) کہتا ہے کہ

- ❶ علم الاقوام والسنہ کے محققین نے اقوام عالم کو مختلف مماثلت و مشابہت کی بنا پر تین شاخوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) آریائی (ایرین) مثلاً ہندی اقوام، ایرانی اور فرنگستانی (۲) تورانی (منگولین) مثلاً ترکستانی، چینی (۳) سامی (سمیک) مثلاً عرب، آرامی، عبرانی، سریانی، کلدانی وغیرہ۔ بعض علمائے انساب، اقوام عالم کی تقسیم اختلاف رنگ کی بنا پر کرتے ہیں یعنی سفید فام (White Race) مثلاً ام سامیہ اور فرنگی، سیاہ فام (Black Race) یا سرخ فام (Red Race) مثلاً باشندگان افریقہ، اور زرد فام (Yellow Race) مثلاً جاپانی اور چینی وغیرہ۔
- ❷ اس کے لیے رچرڈ مورس بک کی کتاب Cosmic Consciousness (کائناتی شعور) کے صفحات 20-30 کا مطالعہ کیجیے۔

مکتب و مٹا و اسرار کتاب
کور مادر زارد و نور آفتاب

(جاوید نامہ)

کہ یہ پیدائشی اندھے ہیں۔ اور دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ نور آفتاب۔

قرآن کہتا ہے کہ لَا يَسْتَلْعِلْمِينَ^① (30:22)۔ آپ آیات گنتے چلے جائے دیکھتے چلے جائے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ ہم تو جب آیت سمجھتے ہیں تو وہ تو قرآن کی ایک آیت ہی ہمارے ذہن میں ہوتی ہے۔ لیکن دیکھیے کہ وہ کن چیزوں کو آیات بتا رہا ہے۔ اس کائنات کا ایک ایک ذرہ الفاظ کی شکل میں ملنے والے قرآن کی ہی ایک تفسیر ہے

او بابا! یہ قرآن تو ایک چھوٹا سا حصہ ہے جو ہمارے پاس ایک جلد کے اندر ہے، یہ ساری کائنات ایک دوسرا قرآن ہے، وہ ان میں بکھری ہوئی آیات کو آیات کہتا ہے۔ اس قرآن میں تو ساڑھے چھ ہزار کے قریب آیات ہوں گی لیکن وہاں تو ایک ایک پتے میں چھ چھ ہزار آیتیں موجود ہوتی ہیں۔ کہتا ہے کہ وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ مِنْ فَضْلِهِ (30:23) پھر ہماری آیات میں دیکھو۔ کہتا ہے حرکت اور سکون زندگی کے لیے دونوں ضروری ہیں۔ حرکت میں جتنی بھی انرجی ہے وہ صرف ہوتی ہے تو اس کی Generation (پیدا کرنے) کا سامان بڑا ضروری ہے کہ وہ دوبارہ واپس آئے۔ اگر اُس میں خرچ ہی ہوتا رہے تو کتنے ہی اچھے ماڈل کی Latest Motor (جدید ترین موٹر) ہی کیوں نہ ہو اُس میں ایک دفعہ پٹرول ڈال کر آپ چلاتے چلے جائے اور دوبارہ پٹرول نہ ڈالے تو وہ موٹر دوبارہ چل ہی نہیں سکتی۔

زندگی کے لیے حرکت اور سکون دونوں ضروری ہیں۔ یہ جو دن اور رات کا اختلاف ہے تو کہا ہے کہ یہ بھی ٹھیک ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے تو یہ کہہ لو گے کہ یہ اس طرح سے ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی گردش ہوتی ہے یہ ہوتا تو اسی طرح سے ہے۔ لیکن جہاں تک تمہارا تعلق ہے اُس میں صورت یہ ہوتی ہے کہ یہ دن ہوتا ہے تو اُس کے اندر تم اپنے تمام کاروبار کرتے ہو، تمہاری انرجی صرف ہوتی چلی جاتی ہے۔ اُس کے بعد رات آ جاتی ہے، پرند چرند سب اپنے اپنے گھونسلوں میں چلے جاتے ہیں، انسان گھروں کے اندر چلے جاتے ہیں۔ اور اُس میں پھر یہ جو نیند ہے تو یہ بھی ہماری آیات میں سے ہے۔ ایک چیز محاورہ تا ہوتی ہے کہ ”تے اوتے کدی جاگدا ای نہیں“^② ہیگا۔ نیند کے اوپر جواب تحقیق ہوئی ہے تو وہ تو پوچھو نہیں کتنا وسیع میدان ہے۔ اگر واقعی نیند جس کو آپ

① اس میں ارباب علم و بصیرت کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں (پرویز: مفہوم القرآن ص۔ 934)۔

② وہ تو کبھی بیدار ہی نہیں ہوتا۔

Sleep Sound (گہری نیند) کہتے ہیں وہ نیند ہے جو ان کے نزدیک اگر دس منٹ کی بھی آجائے تو وہ پورے دن کی انرجی واپس لے آتی ہے۔ یہ سارا دماغی کنٹرول ہی کا تو نام ہے۔ دماغ کو سکون کا ملنا ہے اس قسم کا سکون کہ اس صرف ہونے والی انرجی کی دوبارہ Generation (پیدائش) ہو جائے^①۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو دونوں حرکت اور سکون ہیں ان کے اجتماع سے زندگی بنتی ہے۔ لیکن یہ آیت تو ہے ہماری کہ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ (30:23) یہ اس قوم کے لیے ہے جو دل کے کانوں سے اس کو سنے۔ یہ جو ہمارے کان ہوتے ہیں ان کے اندر اس کان سے اُس کان تک ایک سرنگ ہوتی ہے ”ادھروں گل پیندی اے تے ادھروں نکل جاندی اے“۔^② کہتا ہے کہ وہ کان جو بات کو دل تک پہنچانے کا ذریعہ ہوتے ہیں تو اس کی آیات وہ پہچان سکتے ہیں۔ کہتا ہے کہ وَمِنْ اٰيٰتِهِۦ يُرِيْكُمْ الْبُرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيِيْ بِهٖ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (30:24) کہتا ہے کہ یہ اختلافی چیزوں کا امتزاج دیکھنا ہو کہ بادل کس طرح سے جھوم کر آ رہا ہے تو سنو:

وہ اٹھی وہ آئی وہ گھٹا چھا گئی ساقی

میخانے پہ اللہ کرے جھوم کے برسے

کائنات میں ہر آن ایک تغیر واقع ہو رہا ہوتا ہے

قرآن کہتا ہے کہ ان میں تمہیں کیا چیز نظر آتی ہے۔ خوشگوار ہوائیں ہوتی ہیں لیکن اُسی کے اندر تم نے سنا ہوگا کہ فلاں جگہ اُس میں سے بجلی گری اور آدمی مر گئے۔ کہنے لگے کہ اختلاف کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ایک ہی چیز ہوتی ہے۔ اُس کے اندر منفعت بھی ایسی ہوتی ہے اور تخریب کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ اب تمہارے لیے یہ چیز ہے کہ منفعت کے پہلو سے فائدہ اٹھاؤ اور تخریب والی چیز سے محتاط رہو۔ یہ کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ (30:24) عقل و فکر سے کام لینے والے سمجھیں گے کہ بادلوں کے اندر یہ بجلی کیوں ہوتی ہے۔ اور ابھی تو ابتدا ہوئی ہے۔ ہم تو اس Electricity (بجلی) کو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ کیا ہوتی ہے۔ ہم تو Electric Object (برق بردار جسم) ہی جانتے ہیں: جن چیزوں میں بجلی ہوتی ہے۔ اُس تار کو چھونے سے موت واقع ہوتی ہے اُس تار کو باقاعدہ رکھنے سے پنکھا چلتا ہے۔ یہ جسے آپ Electricity (بجلی) کہتے ہیں وہ تو Pure Energy (خالص توانائی) ہوتی ہے اور ہم تو ابھی وہاں تک پہنچے ہی نہیں۔ جنہوں نے اس کو ذرا Capture (قبضہ) کیا ہے تو پوچھو نہیں کس طرح مرغ تک پہنچ رہے ہیں۔ کہتا ہے کہ اُس میں بھی ہماری آیتیں ہیں۔ لِقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ (30:24) لیکن ان کے

① اس کی تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ العنکبوت، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2008ء، ص 151 تا 262

② ادھر ایک کان سے بات آتی ہے تو ادھر دوسرے کان سے باہر نکل جاتی ہے۔

لیے ہیں جو اپنے Mind (دماغ) میں عقل و فکر بھی رکھتے ہیں، صرف بھیجا (مغز) ہی نہیں رکھتے۔ اب اگر اگلی آیت میں نے چھیڑ دی تو اُس میں وقت زیادہ لگے گا۔

کائنات کا حسن اسی تغیر کا ہی رہین منت ہے

میں سمجھتا ہوں کہ جب یہ تغیرات کی بات آئی ہے تو یہ جتنی مادی چیزیں (Material things) ہم نے کبھی ہیں اُن میں کچھ تھوڑا سا ذوقِ جمال یا حسِ لطیف کا بھی پہلو آ جانا چاہیے۔ مقطع کا بند ہے، اقبالؒ (1877-1938) کے حسین شعر ہیں، بات تو وہ تغیر کی کر رہا ہے لیکن شعریت اپنے انتہا پر پہنچی ہوئی ہے:

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تُو نے لازوال کیا
اس لیے کہ اس میں تغیر نہ ہو، یہ ہمیشہ ایک ہی جیسی چیز رہے۔

ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی، اختر سحر نے سنی

(بانگِ درا: حقیقتِ حسن)

”بیڑہ غرق ہووے ایناں امریکا والیاں دا، ایہڈی چن دی فوٹو دکھائی اے تے اووی بھیڑا لگن لگ پیا^① اے۔“ کیا شعر یاد آ گیا ہے:

کبھی آجاتے تھے ہنسنے کو مرے رونے پر
تم کو یہ عیش بھی اب میرا گوارا نہ رہا

کم بختو! ہمارے پاس تو ایک ہی چیز تھی کہ جس سے جی بہلاتے تھے اب اُس کی بھی تصویریں لے لیں۔ بہر حال

① ان امریکیوں کا بیڑا غرق ہو کہ انہوں نے جو چاند کی فوٹو دکھائی ہے تو اب وہ بھی بد شکل لگنے لگا ہے۔

کہیں قریب تھا یہ گفتگو قر نے سنی
 فلک پہ عام ہوئی اختر سحر نے سنی
 سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبِ نیم کو
 فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
 بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبِ نیم سے
 کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
 چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
 شباب سیر کو آیا تھا سو گوار گیا

(بانگِ درا: حقیقتِ حسن)

یہ ہے شعریت اس شخص کے اندر۔ عزیزانِ من! یہ تغیر اگر نہ ہو تو زندگی بور ہو کر رہ جاتی ہے۔ آپ تین چار دن کے لیے پلاؤ اور زردہ تک نہیں کھا سکتے۔ ”تیسرے چوتھے دن کہندے او کوئی دال دی ہیگی اے“^①۔ ”تنوع“ یعنی Change (تغیر) ضروری ہے۔ ایک جیسی چیز کے لیے تو اقبالؒ (1877-1938) کہتا ہے کہ یہ دنیا تو ایک طرف رہی

دلِ عاشقانِ بمرِ بہ بہشتِ جاودانے

اگر جنت کی نعمتیں بھی ایک ہی جیسی ہوئیں اور ان میں Change (تغیر) نہ ہوا ”تے کہند اے اوتے مر جان دامقام ہو گیا“^②۔ وہ بہشت کیا کہ جس میں.....

نہ نوائے درد مندے نہ غم نہ نغمسارے

وہ بہشت کیا کہ جس میں نہ کوئی غم ہو اور نہ کوئی نغمسار ہو۔ تو Change (تغیر) تو یہ ہوتا ہے۔ اب یہاں اگر میں ہیگل^③ کے فلسفے پہ آؤں تو بات اور طرف پھیل جائے گی۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الروم کی آیت 24 تک آگئے 25 ویں سے آئندہ لیں گے۔

① تیسرے چوتھے دن کہنے لگتے ہو کہ کیا کوئی دال بھی ہے۔

② کہتا ہے کہ وہ تو پھر مر جانے کا مقام ہو گیا۔

③ اس کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الفرقان؛ ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2007ء، ص 221 (فٹ نوٹ 2)

تیسرا باب : سورة الروم (آیات 25 تا 27)



عزیزان من! آج اگست 1979ء کی 21 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورة الروم کی آیت 25 سے ہو رہا

ہے: (25-30)

مذہب اپنے تباہ کن نتائج پر غور و فکر کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا

سب سے پہلے تو آپ احباب کو گزشتہ عید مبارک ہو۔ رمضان المبارک کا مہینہ گزر گیا ہے۔ دنیا میں قاعدہ ہے اور ہر شخص اس کو جانتا ہے کہ کوئی پروگرام ہو، اُس کی تکمیل کے بعد انسان کھڑا ہو کر دیکھتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ اور اُسی سے وہ فیصلہ کرتا ہے کہ جس مقصد کے لیے یہ کچھ کیا گیا تھا وہ پورا ہوا ہے یا نہیں لیکن مذہب کی دنیا ایسی ہے جہاں اس کی قطعاً ضرورت نہیں پڑتی۔ پروگرام کے اعتبار سے آپ دیکھیے تو یہ کتنا مشقت طلب پروگرام ہے! ایک دن دو دن یا دس دن کی بات نہیں بلکہ پورا مہینہ گرمی کا یہ موسم پندرہ پندرہ سولہ سولہ گھنٹے کا روزہ، اُس میں پھر ہر قسم کی مزدوری، محنت، مشقت ہوتی ہے۔ عام طور پہ اب تو غریب ہی زیادہ روزے رکھتے ہیں کہ جنہیں کوئی آسانیاں میسر نہیں ہوتیں اور محنت و مشقت بھی ساتھ ہی کرنا پڑتی ہے۔ افطاری کے بعد نماز، عشا کی نماز (سترہ رکعت)، پھر تراویح (بیس رکعت) اور وہ بھی اتنی لمبی کہ اُس میں قرآن کریم کا پارہ ختم کرنا ہوتا ہے۔ عام طور پہ اس میں بارہ بج جاتے ہیں اور تین بجے پھر سحری کے لیے اٹھنا۔ وہ ختم ہونے کے ساتھ ہی قریباً سات بجے اپنے اپنے کام پہ پہنچنا۔ اور یہ پورے کا پورا Routine (نظام الاوقات) ایک مہینے بھر تک جاری رکھنا کوئی چھوٹا مشقت طلب معاملہ نہیں ہے۔ پھر اُس کے بعد کھڑے ہو کر

دیکھنا چاہیے کہ اس کا نتیجہ کیا مرتب ہوا؟

ذہنی سکون تو ہر مذہب کا پیروکار اپنے اپنے طریق سے حاصل کر لیتا ہے

زیادہ سے زیادہ یہی چیز ہوتی ہے کہ جسے آپ اپنا اپنا ذہنی سکون یا اطمینان کہتے ہیں وہ مل جاتا ہے۔ کوئی Pragmatic (نتائجی و عملیتی) کوئی Objective (خارجی و معروضی) کوئی خارج میں نتیجہ تو آپ کے سامنے نہیں آتا۔ صرف ثواب ایک لفظ ہے اور وہ بھی ایک ذہنی سلفظ ہے۔ وہ بھی کوئی خارج میں محسوس شے نہیں ہوتا صرف یہ بات ذہنی طور پہ ہوتی ہے۔ اگر مقصد انفرادی طور پر ہر فرد کا اپنے اپنے ذہن کو ایک سکون یا تسکین دینا ہے تو معاف رکھیے اسے تو پھر ہر مذہب والا اپنے اپنے طریقے پہ حاصل کر لیتا ہے۔ ہندو کو اپنی پوجا پاٹ سے پرارتھنا سے بڑی شانتی حاصل ہوتی ہے سکون حاصل ہوتا ہے عیسائی اپنے طور طریقے پر گرجے میں سکون حاصل کر لیتا ہے یہودی اپنے اپنے صومعوں میں کر لیتا ہے آتش کدے کے اندر مجوسی کر لیتا ہے۔ ذہنی سکون تو ایسی چیز نہیں ہے جو آپ کے لیے معیار یا پیمانہ یا یہ ماپنے کے لیے ٹیسٹ بن سکے کہ جو کچھ کیا گیا ہے وہ فی الواقعہ صحیح ہے۔ یہ تو آپ کے اپنے ذہن کا ایک فیصلہ ہے۔ اور وہاں تو یہ بتایا گیا تھا کہ ٹیسٹ یہ ہے کہ **وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَمَا يَمَكُتُ فِي الْأَرْضِ** (13:17) بقا اس عمل کے لیے ہے جو نوع انسانی کی منفعت اور فائدے کے لیے کیا جائے۔ کیا بات ہے قرآن کی پروگرام کی اور شقوں کو تو چھوڑ ہی دیجیے!

قرآن حکیم دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جو بغیر سوچے سمجھے دن رات پڑھی جاتی ہے

یہ قرآن کریم اس طرح سے دہرایا جاتا ہے اتنی بار دہرایا جاتا ہے ساری دنیا میں دہرایا جاتا ہے۔ پہلے پورے مہینے میں 25-26 تاریخ تک دہرایا جاتا ہے پھر شبیئے ہوتے ہیں اور ایک ایک رات میں پورا قرآن دہرایا جاتا ہے۔ کبھی کسی نے کھڑے ہو کر غور کیا ہے کہ جو آگے قرآن پڑھ رہا ہے کیا وہ اس کا ایک لفظ بھی سمجھ رہا ہے اور جو پیچھے سن رہے ہیں کیا وہ بھی اس کا ایک لفظ سمجھ رہے ہیں؟ وہاں تو نہ پڑھنے والا سمجھتا ہے نہ سننے والے۔ دنیا میں کوئی کتاب بھی ایسی ہے جس کے متعلق آپ یہ کہیں کہ آپ اُس کو سمجھ نہ رہے ہوں اور پڑھتے جا رہے ہوں آپ اس کا ایک Sentence (جملہ) بھی اس طرح نہیں پڑھ سکتے۔ اُس زبان کا بالکل نہ سمجھنا تو ایک طرف رہا اگر وہ زبان آپ کے معیار سے زیادہ مشکل ہے تو آپ رکھ دیتے ہیں کہ نہیں صاحب! میری سمجھ میں نہیں آتی، زبان مشکل ہے لیکن یہ آپ کی ایک کتاب ہے جو آپ کے لیے راہنمائی دینے کے لیے ہے Life (زندگی) کی Direction (سمت و ہدایت) دینے کے لیے ہے۔ اُس کی کیفیت یہ ہے کہ آپ سینکڑوں ہزاروں لاکھوں مرتبہ اُس کتاب کے

الفاظ دہرائے چلے جاتے ہیں، سنتے چلے جاتے ہیں لیکن نہ دہرانے والا جانتا ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور نہ سننے والا سمجھتا ہے کہ میں کیا سن رہا ہوں۔ کیا یہ ہے جادو جس کی وجہ سے یہ کیا جاتا ہے؟ یہ وہی مذہب کا پیدا کردہ ایک عقیدہ ہے کہ اس سے ثواب ہوتا ہے۔

دین پر عمل پیرائی کا نتیجہ تو ہمیشہ محسوس شکل میں سامنے آتا ہے

ثواب کیا ہوتا ہے؟ ذہن میں آپ سمجھ لیں کہ اس سے ثواب ہوتا ہے تو جو اُسے ثواب نہ سمجھے اُسے نہیں ہوتا۔ لیکن وہ جو اُس نے معیار مقرر کیا تھا کہ **وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَمَا يَمُكِّتُ فِي الْأَرْضِ** (13:17) ہر عمل کے بعد دیکھیے کہ نوع انسانی کو اس سے فائدہ کیا پہنچا۔ وہ یہ بات نہیں کہ آپ اپنے ذہن میں سمجھ لیں کہ پہنچ گیا فائدہ تو پہنچ گیا، نہیں پہنچا تو نہیں پہنچا بلکہ وہ تو محسوس شے ہے۔ جیسا کہ اُس نے حج کے اجتماع میں دوسری جگہ کہا ہے کہ لوگوں کو دعوت دو وہ یہاں آئیں **لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ** (22:28) تاکہ اپنی آنکھوں سے وہ مشاہدہ کریں کہ ان کے فائدے کے لیے تم نے کیا کیا ہے۔ یہ ما یمنع الناس تو سارا پروگرام نوع انسانی کی منفعت کے لیے ہے۔ اور اُس کے بعد یہ ٹیسٹ ہو جاتا ہے کہ فائدہ ہوا ہے یا نہیں ہوا۔ یہ دین ہے جس نے یہ کہا ہے۔ وہ مذہب ہے جو عقیدے کا ایک سکون مہیا کر دیتا ہے۔ دوسروں کے ہاں سکون کے جو ذرائع وہ اختیار کرتے ہیں تو ہم اُس کے اوپر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بالکل باطل کی چیزیں ہیں۔ اور ہر ایک اپنے اپنے ہاں کے ذریعے کے مطابق کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے اور دوسرے کا باطل ہے۔ اگر یہ خارجی (Objective) معیار جو قرآن نے بتایا ہے سامنے رکھا جائے تو یہ بحث مباحثے کی بات ہی نہیں ہے۔ جس کے ذریعے سے نوع انسانی کو زیادہ منفعت پہنچتی ہے وہ ثواب کا کام ہے۔ یہ فرق ہوتا ہے مذہب میں اور دین میں جو میں نے عرض کیا ہے۔ یہ پورا پروگرام ہے اور ہر سال ہم اس پروگرام کو دہراتے ہیں یہ کس قدر مشقت طلب پروگرام ہے۔ پھر اُس کے بعد حج کا پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔ ساری دنیا سے دس لاکھ پندرہ لاکھ انسان اکٹھے ہوتے ہیں۔ ماہ حاصل کیا ہوتا ہے؟ یہاں بھی آپ کے ہاں ماہ رمضان کے بعد عید کے موقع پر دعائیں مانگی گئیں۔ وہاں بھی حج کے اجتماع میں عرفات کے میدان میں جہاں کہا جاتا ہے کہ وہاں ہر دعا قبول ہوتی ہے اور دعاؤں کو تو چھوڑ دیجیے پچیس سال سے تو آپ مستقل یہ دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ! اسرائیل کی مملکت کا بیڑہ غرق ہو لیکن وہ بڑھتی چلی جا رہی ہے:

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبط دوا ہے اور میں ہوں

دعا کے قبول ہونے کی عملی شکل

دعا کی قبولیت تو یہ ہے کہ دوسرا نیست و نابود ہو جائے۔ عزیزانِ من! دعائیں قبول ہوئی تھیں کہ پھر نہ ایران کی مملکت باقی رہی نہ بازنطینی باقی رہے نہ یہاں کے مشرک باقی رہے نہ وہاں کے مخالف باقی رہے۔ وہ اپنے ہر عمل کو اُس کے نتیجے سے پرکھتے تھے۔ اگر نتیجہ نہیں برآمد ہوتا تھا تو کھڑے ہو جاتے تھے کہ ہمارے اس پروگرام میں اُس کی تعمیل میں کہیں کوئی نقص واقع ہو گیا ہے۔ وہ تو دو اور دو چار کی بات کرتا ہے۔

قرآن کا انداز یہ ہے کہ کائنات کا جو محسوس نظام ہے وہ اُس کو اس بات کے ثبوت میں پیش کرتا ہے کہ اگر قانونِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کی جائے تو ایسے محسوس نتائج سامنے آ جاتے ہیں۔ صحیح زمین ہو، ٹھیک بیج ہو، وقت پہ ڈالا جائے، سارے قاعدے کے مطابق پانی دیا جائے، روشنی ہو، حرارت ہو تو اُس کے لیے کہہ دیا گیا ہے کہ اس میں سے فصل اگے گی اور ایک ایک دانے سے سات سات سودانے ملیں گے۔ وہ مثالیں ایسی دیتا ہے کہ جس میں آپ فریبِ نفس میں مبتلا نہ ہوں۔ کسان یہ نہیں کہتا کہ صاحب! وہ فصل اگی ہے یا نہیں لیکن کوئی بات نہیں مجھے ثواب تو ہو گیا ہے۔ وہ کہنے والا تو کہتا ہے کہ اُس میں سے سو سودانے نکلیں۔ آپ پچھلی آیات کو دیکھیے اور پھر قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ ان سب کو وہ آیات کہتا ہے۔ وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اٰخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَ طَمَعًا (24-22:30)۔ یہ پچھلی آیات چلی آ رہیں۔ اور ہماری انسانی زندگی کے متعلق جو اُس نے قانون دیا ہے تو اُسے بھی وہ آیات قرآنی کہتا ہے۔ وہ بھی آیات ہیں یہ بھی آیات ہیں۔ کیا ان دونوں آیات کے اندر یہ فرق ہوگا کہ وہ تو آیات ایسی ہیں جن کا محسوس نتیجہ سامنے آتا ہے اگر نہیں آتا تو ہم یہ سوچنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ وہ نتیجہ کیوں مرتب نہیں ہوا اُس نے جب آیت کہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ہونے والے نتیجے کی نشانی ہے علامت ہے یہ ہو کر رہے گا یہ ہونا چاہیے۔

کسان کی اگر فصل نہ اُگے تو پھر ثواب بھی نہیں ہوتا

کبھی کوئی کسان ایسا نہیں کرتا کہ ناقص بیج ڈالے اور اگر کچھ نہیں اُگا تو اگلے سال پھر وہی ناقص بیج ڈال دے، پھر اگر تو کچھ نہیں اُگا، تو وہی ناقص بیج ڈالتا چلا جائے۔ اگر کچھ نہیں اگتا تو وہ کہے کہ کوئی بات نہیں ثواب تو ہوگا۔ وہ کبھی ایسا نہیں کرتا۔ یہ جو کائناتی مظاہر ہیں جسے قرآن نے نظامِ فطرت کہا ہے وہ اُس کو بار بار آیات کہہ کر آپ کے سامنے لاتا ہے تو کوئی اس کا مقصد ہے۔ یہ Biology (حیاتیات) Zoology (حیوانیات) 'Histology' (نسیجیات) کی کتاب تو نہیں ہے۔ یہ تو انسانوں کی

راہنمائی کے لیے ہے ہدائی ہے اس میں کچھ Directives (ہدایات) دیئے ہوئے ہیں۔ تو ان Directives (ہدایات) والی کتاب کے اندر کائنات کے جتنے بھی مظاہر ہیں وہ ان کو بار بار آیات قرار دیتا ہے۔

قرآن حکیم کا تین چوتھائی حصہ مظاہر فطرت کی حقانیت پر مبنی ہے

قرآن کریم کا تین چوتھائی حصہ ان مظاہر فطرت کی حقانیت سے بھرا ہوا ہے۔ وہ یہ مثالیں یہ بتانے کے لیے پیش کرتا ہے کہ اس کے محسوس نتائج نکلتے ہیں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ جو نتائج وہ بتاتا ہے وہ نتائج نکلتے ہیں۔ اور اُس کے بعد وہ کہتا ہے کہ تمہارے لیے بھی اس قسم کے قوانین ہیں اور انہیں بھی وہ آیات ہی کہتا ہے۔ اور آگے وہ آیت آئے گی کہ یہی طریق جو یہاں ہم نے خارجی کائنات میں اپنی تخلیق کا اختیار کیا ہے وہی انسان کی صورت میں ہم نے اختیار کیا ہے۔ یہ کوئی ان میں سے الگ مخلوق نہیں ہے کہ اس کے لیے تو صورت یہ ہے کہ یہ کچھ کرتا چلا جائے چاہے کوئی نتیجہ نکلے یا نہ نکلے اور وہاں یہ صورت ہو کہ نتیجہ نہیں نکلتا تو اس کے معنی ہیں کہ پروگرام پہ عمل نہیں ہو رہا۔ وہ آیت ان آیات کے بعد آتی ہے وہ بڑی عظیم آیت ہے۔ یعنی وہ اُس میں یہ کہتا ہے کہ اسی طرح جس طرح خارجی کائنات کی تخلیق ہوئی ہے تو جو نظام اُس میں عمل پیرا ہے اُسی طرح انسانوں کی تخلیق ہوئی ہے اور وہی نظام ان کے اوپر کار فرما ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی سے یہ نہیں کرتے کہ جیسا جی چاہے بیج ڈال دیں وہ ہمارے قانون کی پابندی پر مجبور ہیں اُس کے مطابق کیے چلے جا رہے ہیں اور نتیجہ برآمد ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ کائنات ارب ہا ارب سالوں سے جو ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی چلی آ رہی ہے وہ اسی لیے ہے کہ لگے بندھے قوانین ہیں اور ان کی خلاف ورزی کرنے کا ان میں یارا نہیں ہے مجاز نہیں ہے۔ انسان کو بھی وہی قوانین دیئے ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ اس سے کہا گیا ہے کہ تمہارا اپنا جی چاہے تو اس کے مطابق تم کھیتی بوؤ اور اگر جی چاہے تو وہ غلط قسم کا بیج ڈالتے چلے جاؤ۔ قانون وہی ہے قاعدہ وہی ہے نظام وہی ہے نتائج پر کھنے کا معیار وہی ہے۔ بس ایک اختیار (Choice and Will) کی بات ہے اور اسی سے انسان انسان ہے۔ اختیار سلب کر دیا جائے تو کوئی انسان اس کو گوارا ہی نہیں کرتا اختیار ہی کا نام تو آزادی ہے۔ خدا اسے سلب نہیں کرتا لیکن معیار تو وہ ہے۔

قرآن حکیم کو پڑھنے کے سلسلہ میں حافظ اسلم جیرا چپوری کا ایک سبق آموز طریق

یہ آیات چلی آ رہی ہیں کہ وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمْ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُخْرِجُ بِهِ

الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ① (30:24)۔ یہ تمام نشانیاں ہیں ایک بات سمجھنے کے لیے۔ لیکن یہ آیات ان کے لیے ہیں جو عقل و فکر سے کام لے گا۔ اور جو کتاب کے الفاظ کے معنی ہی نہیں سمجھے گا تو وہ عقل و فکر سے کیا کام لے گا۔ یہ جو قرآن حفظ کیا ہوا ہوتا ہے یہ جو قرآن کے حافظ ہوتے ہیں، میں نے ان سے یہ کہا کہ آپ تو بڑی آسانی سے اپنی منزل دہرا لیتے ہوں گا، وہ روز دو منزل پڑھتے تھے۔ وہ میرے استاد علامہ حافظ اسلم حیراچپوری (1879-1955) تھے۔ میں نے دیکھا کہ انہیں علی الصبح اٹھ کر ایک منزل دہرائی پڑتی ہے تب وہ حفظ قائم رہتا ہے۔ انہوں نے میری بات کا جواب دیا کہ نہیں بھئی، دشواری ہوتی ہے کیونکہ میں جس وقت پڑھتا ہوں میری توجہ قرآن کے مفہوم کی طرف چلی جاتی ہے اور اگلی آیت ذہن سے نکل جاتی ہے۔ یہ جو اس طرح سے ایک ایک شپینے میں اتنا پڑھ جاتے ہیں وہ اس لیے ہے کہ وہ ایک لفظ نہیں سمجھتے بلکہ انہوں نے صرف لفظ ہی یاد کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ جو چیز ہے کہ وہ الفاظ کے مفہوم پہ نگاہ جائے تو وہ جس رفتار سے یہ پڑھ رہے ہوتے ہیں تو وہ گاڑی اُس میں اٹک جاتی ہے لیکن پڑھ جائیں یا نہ پڑھ جائیں بات تو سوچنے کی ہے کہ کیا دنیا میں کوئی کتاب بھی ایسی ہے جس کے ساتھ یہ کیا جاتا ہے؟ قرآن فہمی کے سلسلہ میں اہل مغرب کے سائنسدان ہم مسلمانوں کے بالمقابل زیادہ فعال ثابت ہوئے ہیں قرآن نے لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (30:24) کہا ہے۔ یہ تو کتاب ایسی ہے جس میں وہ يَتَفَكَّرُونَ، يَتَذَكَّرُونَ، يَشْعُرُونَ، يَعْلَمُونَ، يَعْقِلُونَ کہتا ہے۔ سارا قرآن اس سے بھرا ہوا ہے کہ تذکر، فکر، عقل، غور، بصیرت سے کام لو، علم سے کام لو۔ اگر آپ اس کتاب کے صرف الفاظ دہرائے چلے جائیں تو پہلی چیز تو الفاظ کے معنی کے سمجھنے کی ہوتی ہے اس کے بعد غور و فکر تو بعد کی بات ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ (30:25) ارض اور خارجی فضا میں بکھرے ہوئے جس قدر گزرے ہیں وہ تمام کے تمام تقوم بامرہ ہیں۔ اس کا عام ترجمہ تو یہ ہوگا کہ وہ خدا کے حکم سے قائم ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ جب قرآن نے یہ کہا ہے کہ جو غور و فکر کرنے والی قوم ہے وہ سمجھ سکے گی کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ تو ان چیزوں پہ غور و فکر تو ہمارے ہاں مغرب کے سائنسدانوں میں ہو رہا ہے۔ مذہب پرست مسلمانوں کی قوم کے اندر تو اکثریت ان کی ہے جو صرف

① اور اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ ایک ہی گھٹا میں بادل اور بجلی دونوں موجود ہوتی ہیں بجلیاں تمہارے لیے بوجھ بنتی ہیں اور بادل موجب مسرت (2:19)۔ اس لیے کہ بادل سے وہ مینہ برستا ہے جس سے زمین مردہ کو زندگی مل جاتی ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں ہمارے قانون حیات کی کارفرمائی کو سمجھنے کی بڑی نشانیاں ہیں (پرویز: مفہوم القرآن ص 934)۔

اس کے الفاظ دہراتے ہیں اور الفاظ کے بھی معنی نہیں سمجھتے۔ جو معنی کی طرف جاتے ہیں ان کی صورت یہ ہے کہ ہزار برس پیشتر کسی شخص نے جو معنی سمجھ لیا ہے آج اُسی کے اوپر یہ کھڑے ہوئے ہیں حالانکہ اس ہزار برس کے اندر انسانی علم کہیں کا کہیں جا پہنچا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہارے افس و آفاق میں قرآن کے سمجھنے کے لیے آیات ہیں۔ ”افس“ کو تو چھوڑیئے وہ یہ ”آفاق“ کیوں کہتا ہے یعنی خارجی کائنات کے اندر کیوں؟ اس کے لیے تو سائنٹفک طریقہ اختیار کرنا ہوگا اُس سے بات سمجھ میں آئے گی۔

ارض و سما کی وسعتوں کے پیش نظر اس کی ہیئت پر غور و فکر کی تاکید

وہ خود کہتا ہے کہ آفاق کے اندر تمہارے سمجھنے کے لیے آیات ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ کم از کم آفاق کی طرف تو دیکھیے۔ وہ جو آفاق کی طرف دیکھنے والے ہیں وہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ کیا کہا گیا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ تقوم (30:25) قائم ہیں ارض و سما اُس کے امر اور حکم کے لیے۔ تو سوال یہ ہے کہ قائم کیا چیز ہوتی ہے؟ قائم کیا چیز ہوتی ہے؟ یہ کھڑا ہونا ہے۔ اب اگر آپ کے پاؤں میں ذرا توازن بگڑ جائے اونچا نیچا ہو جائے ایک پاؤں اوپر ہو اور دوسرا ذرا سانشیب میں یا گڑھے میں اتر جائے یا کسی طرح بھی آپ کے دو پاؤں کا توازن بگڑ جائے تو آپ لڑکھڑا کر گر جاتے ہیں۔ کوئی چیز کھڑی نہیں رہ سکتی اگر اُس کا توازن بگڑ جائے۔ عربوں نے اپنے ہاں یہ لفظ قائم اسی لیے استعمال کیا تھا یعنی وہ توازن کے لیے اسے استعمال کرتے تھے۔ اس سے وہ جتنے بھی الفاظ بناتے تھے تو اُن کے اندر صحیح Proportion (تناسب) کا ہونا نہایت ضروری تھا۔ ”قوام“ تو آپ بھی جانتے ہیں۔ یہ وہ ہے جو شیرے کا بنا ہوتا ہے اور اسے پیا جاتا ہے۔ اس کے بنانے میں یہ ہوتا ہے کہ ایک تار میں ذرا سا بھی فرق آجائے تو سارا حلوہ بگڑ جاتا ہے۔ جسے وہ تقویم کہتے ہیں جسے قوام کہتے ہیں جسے قائم کہا جاتا ہے تو یہ کیا چیز ہے؟ یہ حسن توازن کا نام ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ ① (30:25)۔ اُنہوں نے اس کے اوپر غور کیا اُنہوں نے اس کے متعلق یہ بات کہی کہ کیا بات قرآن کہہ گیا ہے۔ یہ ارض و سما کھڑے تو نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں ترجمہ کیا گیا کہ یہ کھڑے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ کھڑے تو نہیں ہیں بلکہ یہ تو گردش کر رہے ہیں یہ تو معلق ہیں۔ تو اس کے اوپر تو یہ فوراً اعتراض آتا ہے کہ یہ ارض و سموات اور آسمانی کڑے جتنے بھی ہیں وہ کھڑے ہیں جبکہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ ان کے اندر ان کا باہمی توازن ایسا قائم ہے جس سے یہ معلق ہیں۔ اسے وہ کشش ثقل کہتے ہیں جس کا نام صحیح توازن کہا جاتا ہے۔ ان کا جو باہمی ربط ہے وہ اس توازن سے قائم رہتا ہے۔

① خدا کے کائناتی قوانین کی کارفرمائی یہ بھی ہے کہ اس قدر عظیم الجثہ اجرام فلکی (کڑے) فضا کی پہنائیوں میں معلق قائم ہیں۔ ان میں سے ایک گڑھ ارض (تمہاری زمین) بھی ہے جس پر تم اس وقت بستے ہو (پرویز: مفہوم القرآن ص 935)۔

ارہوں کی تعداد میں پائے جانے والے گڑوں کا باہمی ربط بڑے ہی غور و فکر کا متقاضی ہے
 کائنات کے اندر جتنے بھی گڑے ہیں قرآن نے ان کے لیے السماء کا لفظ استعمال کیا ہے اُس نے گنائے نہیں ہیں کہ یہ
 گڑے کتنے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں کروڑوں ارہوں کے بعد تو ہندسے ہی ہمارے ہاں ختم ہو جاتے ہیں اس کائنات کے متعلق ارہوں
 بھی کوئی شے نہیں ہے۔ یہ سارے جتنے بھی ہیں یہ ہے جو آج تک کی فلکیات کے متعلق ان کے انکشافات ہیں وہ اس پہ پہنچے ہیں کہ
 ان کا جو ربط باہمی ہے وہ جو ایک دوسرے کے ساتھ کشش ہے اُس میں ایک توازن ہے۔ اگر اُس میں ذرا سی بھی کمی آجائے تو یہ
 سارا سلسلہ تہس نہس ہو جائے کسی دو کا باہمی توازن بگڑے تو وہ دو تک ہی نہیں رہے گا۔ جیمز جینز¹ نے تو یہ لکھا ہے کہ ان میں ربط
 باہمی کی صورت یہ ہے کہ میں یہاں ایک انگلی ہلاتا ہوں تو کہکشاں بھی اُس سے متاثر ہوتی ہے۔ وہ جو ہمارے ہاں کے قرآنی مفسر²
 نے کہا کہ

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

یہ شاعری نہیں ہے یہ تو شاعری کرتا ہی نہیں ہے۔

آسمانی گڑوں کی طرح عربی زبان کا دامن بھی بڑا ہی وسیع ہے

تو یہ ہے ان آسمانی گڑوں کے ہاں کا باہمی ربط اور باہمی توازن۔ اس لیے تو یہ **أَنْ تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ**
 (30:25) ہے۔ اب ان الفاظ کے آگے سامرہ ہے امر کے متعلق تو آپ کو پہلے ہی معلوم ہوگا جو میں نے کئی دفعہ بتایا ہے بلکہ یہ
 چیز بھی حضرت علامہ² نے اپنے خطبات میں ایک فلاسفر³ کا قول نقل کر کے کہی ہے وہ بڑا اہم ہے۔ اُس نے کہا یہ ہے کہ یہ عربی
 زبان ہم سے بہت آگے ہے اور یہ لوگ بڑے خوش قسمت ہیں کہ ان کو ایسی زبان ملی ہے جس میں یہ کتاب (قرآن کریم) آئی
 ہے۔ اُس زبان میں Creation (تخلیق) کے لیے دو الفاظ ہیں: امر ہے اور خلق ہے۔ ہمارے ہاں صرف ایک ہی لفظ ہے جو
 Creation (تخلیق) کے لیے آتا ہے لیکن Creation (تخلیق) کی دو Stages (منازل) ہوتی ہیں۔ پہلی اسٹیج تو سب

① The Mysterious Universe: Jeans, Sir James ان کی اس کتاب کا نام ہے: (ہداسرار کائنات)

② یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔ ان کے خطبات کا نام The Reconstruction of Religious

Thought in Islam ہے۔

③ پرینگل جینی سن (Pringle-Pattison, Andrew Seth (1856-1931)۔ ان نکات اور اس کے اصلی الفاظ کے لیے دیکھیے:

پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2006ء ص 382 تا

383 (فٹ نوٹ 1)

سے اہم ہوتی ہے وہ اسٹیج نہ ہو تو کوئی چیز تخلیق میں آ ہی نہیں سکتی اور وہ امر کی اسٹیج ہے جس کے اندر ہمارے الفاظ میں کہیے خدا کے متعلق یہ الفاظ بھی نہیں کہے جاسکتے، کسی ڈیزائن کا ارادہ، عزم، تصور، ذہن کے اندر آنا یعنی ابھی وہ محسوس شکل میں سامنے نہیں آئی ہوتی۔ کسی آرکیٹیکٹ سے آپ پوچھیے کہ یہ کتنا اہم مرحلہ ہے، کسی پینٹر سے پوچھیے کہ یہ کتنا اہم مرحلہ ہے۔ یہ سارا کچھ تو اُس کے اندر ہوتا ہے۔ اور اُس کے بعد جب یہ چیز تکمیل تک پہنچتی ہے تو اُس میں پھر وہ شے ایک محسوس شکل اختیار کرتی ہے۔ وہ محسوس ایک لفظ Creation ہمارے ہاں ہے اور تو ہم کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ جب یہ محسوس شکل اختیار کرتی ہے تو اسے خلق کہا جاتا ہے۔ اور پھر یہ جو ”خلق“ کا لفظ ہے، خود ایک لفظ کے اندر بھی عربی زبان کے اعتبار سے اس کے معنی صحیح Proportion (تناسب) کے ہوتے ہیں۔ یہ جسے آپ اخلاق کہتے ہیں، تو وہ اسی مادے (Root) سے ہے۔ وہ جو صحیح توازن، صحیح تناسب، صحیح Proportion ہے وہ تو ہر جگہ قائم ہے۔ خدا نے اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا ہے یعنی تخلیق کرنے والوں میں حسین ترین تخلیق کرنے والا۔ خلق کے اندر خدا نے اپنے آپ کو ہی نہیں رکھا بلکہ وہ اُس سے نیچے کے درجے میں تخلیق کرنے والوں کو مانتا ہے اور یہ انسان ہے۔ حیوانات کی سطح تک جو زندگی ہے وہ تو انسان تخلیق نہیں کر سکتے۔

امیر المؤمنین اور امر کے لفظ کا قرآنی مفہوم

اب اس کی تخلیق میں بھی جتنا کوئی چیز زیادہ توازن، تناسب، Proportion تک پہنچتی چلی جائے گی، اتنی ہی وہ صحیح ہوتی چلی جائے گی۔ اُس^① نے کہا ہے کہ یہ قوم بڑی خوش قسمت ہے کہ ان کی زبان میں Creation (تخلیق) کے لیے دو الفاظ^② ہیں: ایک امر ہے اور دوسرا خلق ہے۔ اور یہ جسے ہم نے عالم امر کہا ہے، یہ ہے جو خدا کے لیے مختص ہے، اُس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ خود جو لفظ امر بھی ہے، اس کے معنی بھی حکم کے نہیں ہیں بلکہ اس کے معنی Direction (راہنمائی) کے ہیں۔ یہ جو لفظ امیر المؤمنین ہمارے ہاں ہے، عام طور پہ تو ہمارے ذہن میں یہی ہے کہ وہ ویسے تو ہیڈ آف دی اسٹیٹ ہوتا ہے، وہ حکم دینے والا ہوتا ہے۔ امر کے معنی حکم ہی ہمارے ہاں کیا جاتا ہے جبکہ اُس کے معنی ہیں راہنمائی کرنے والا۔ آپ کے ہاں کا جو ہیڈ آف دی اسٹیٹ ہوتا ہے وہ امت کی راہنمائی کرتا ہے، حکم نہیں دیتا۔ راہنمائی یہ کرتا ہے کہ خدا نے اس باب میں یہ کہا ہے اور اس کے مطابق ہمیں چلنا ہے۔ کہا ہے کہ یہ جو مختلف کُترے قائم ہیں، یہ اُس کے عالم امر سے قائم ہیں۔

① یہ اشارہ پرنیگل بیٹی سن (1856-1931) (Pringle-Pattison, Andrew Seth) کی طرف ہے جس کا اقتباس علامہ ڈاکٹر محمد

اقبالؒ (1877-1938) نے اپنے خطبات The Reconstruction of Religious Thought in Islam (تفکیک

جدید الہیات اسلامیہ) میں دیا ہے۔

② قرآن کریم میں دنیائے مشہود کے لیے ”خلق“ اور دنیائے نامشہود کے لیے ”امر“ کی اصطلاحات آئی ہیں۔

اب ایک اور چیز ہمارے سامنے آئی۔ ایک تو یہ تھا کہ یہ کُڑے جب ابھی اس طرح محسوس شکل میں تخلیق نہیں ہوئے تھے وجود میں نہیں آئے تھے تو ایک تو وہ عالم امر ہے۔ اُس میں ابھی خدا کا وہ ارادہ 'ذی اَنّ' تصور ہوتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ہمارے الفاظ یہی ہیں اور جب ہم خدا کے لیے الفاظ استعمال کریں گے تو فرق کرنا بڑا ضروری ہے لیکن کیا کریں الفاظ تو ہمارے پاس یہی ہیں۔ تو وہ ایک عالم امر ہے جو تخلیق سے پہلے وہاں کا ہوتا ہے۔ یہاں ایک بڑی اہم چیز سامنے آتی ہے کہ اب یہ تخلیق کا مرحلہ آ گیا، یہ ساری خارجی کائنات تخلیق میں آ گئی، وہ مخلوق ہو گئی، محسوس شکل میں آ گئی۔ یہاں یہ بات نہیں ہے کہ وہ جو خدا کا امر والا مرحلہ تھا، وہ ختم ہو گیا۔ یہ جواب اس طرح سے قائم ہیں یہ بامورہ ہے یعنی اُس کا یہ امر یہاں بھی کارفرما ہے۔

اس کائنات میں فطرت یا نیچر کے قوانین کسی انسان کے بنائے ہوئے ہیں ہی نہیں

خدا ایک شے کو تخلیق کرنے کے بعد پھر یہ نہیں ہے کہ بیکار ہو کر بیٹھ گیا کہ میرا کام تو ہو گیا: یہ نہیں ہے۔ اُس کا وہ امر جاری و ساری ہے اور یہ وہ امر ہے جسے ہم اپنے الفاظ میں سمجھنے کے لیے قانونِ فطرت کہتے ہیں 'Laws of Nature' کہتے ہیں۔ وہ کیا کریں بیچارے کہ ان کے پاس اور الفاظ ہی نہیں ہیں:

تیرا پتہ نہ پائیں تو لاچار کیا کریں

یہی الفاظ انہوں نے استعمال کرنے تھے۔ اس کا نام انہوں نے Nature (فطرت) رکھا۔ ہمارے پاس تو یہ لفظ بھی نہیں تھا، ہم نے اس کو قانونِ فطرت کہا۔ لیکن بہر حال ایک قانون ہے جس کے تابع یہ ساری کائنات جو خدا کی مخلوق ہے چل رہی ہے۔ تخلیق کے بعد اس کائنات کا جو نظام چل رہا ہے تو یہ ایک قانون کے تابع چل رہا ہے اور وہ قانون نہ تو ان چیزوں کا اپنا پیدا کردہ ہے کہ انہی میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے لیے کوئی قانون وضع کر لیا ہے اور اُس کے تابع چلتی ہیں اور نہ ان کے لیے یہ انسانوں کا پیدا کردہ ہے۔ یہ قانون ہم نے نہیں بنایا ہے کہ سورج اتنے بجے طلوع ہوگا یہ ہمارا قانون نہیں ہے کہ پانی نشیب کی طرف جائے گا۔ ہم تو ان قوانین کو صرف Discover (بے نقاب) کرتے ہیں ان پہ جو پردہ ہماری لاعلمی کی وجہ سے پڑا ہوتا ہے ہم صرف اُس پردے کو اٹھاتے ہیں حقیقتیں تو پہلے سے موجود ہوتی ہیں۔ ہم صرف Laws of Nature (قوانینِ فطرت) کو معلوم کر لیتے ہیں اُن کا انکشاف کر لیتے ہیں اُن سے پردہ اٹھاتے ہیں Discover (بے نقاب) کرتے ہیں۔ ایک بہت بڑا سائنسٹ ¹ ہے اُس نے کہا ہے کہ

① اس سائنسدان کا نام F.J. Sheen (شین) ہے اور اس کی اس کتاب کا نام Philosophy of Religion 1948 (فلسفہ مذہب) ہے۔ جو قارئین اس موضوع سے دل چسپی رکھتے ہیں وہ اس کتاب کا مطالعہ کریں اور اس سلسلے میں حدود و قیود سائنس کے لیے ریڈنگ یونیورسٹی کے طبیعیات کے پروفیسر ڈاکٹر جیمز آرغلڈز کو قرا کا The Great Design 1934 نامی کتاب میں چھپنے والے مضمون کا گہرا مطالعہ کریں۔ یہ کتاب Mason, Frances کے زیر ادارت طبع ہو کر منظر عام پر آئی۔

① We only read the Book of Nature we can't write it.

ہم کتاب فطرت کی تصنیف نہیں کرتے بلکہ اُس لکھی ہوئی کتاب کو صرف پڑھتے ہیں۔ اب ہم جو اپنی کتاب کو اس طرح پڑھتے ہیں کہ اس کا ایک لفظ نہیں سمجھتے اور پڑھتے چلے جاتے ہیں تو ہم نے فطرت ② کی کتاب کو کیا پڑھنا ہے۔ یہ ایک بڑی اہم چیز ہے جو یہاں آئی ہے۔

کائنات کا تو ذرہ ذرہ ہر آن خدا تعالیٰ کی نظر میں مصروفِ عمل ہے

خدا کا عالم امر تخلیق کے مرحلے سے پہلے تک ہی محدود نہیں ہے کہ وہاں تک اُس کا امر چلتا ہے اور اُس کے بعد پھر آگے امر نہیں چلتا۔ اُس کا جو امر ہے وہ کائنات کے ساتھ اس کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے، مسلسل متواتر اُسی طرح سے دوام کے ساتھ چلتا جا رہا ہے۔ ہم اپنے سمجھنے کے لیے اُسے قانون کہتے ہیں، اُس کے تابع یہ سارا نظام فطرت قائم ہے۔ اگر وہ خدا ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق سو جائے تو آپ سوچے تو سہی کہ کیا ہو؟ ایک سیکنڈ کے لیے آپ کا یہ بس ڈرائیور سو جاتا ہے تو پھر اُس کے بعد

نہ انجن رہے گا نہ انجینری

اور اس عظیم کائنات کو چلانے والا جس کا قانون کارفرما ہے، کہتا ہے کہ لَا تَأْخُذْهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ (2:255) نیند تو ایک طرف اُسے تو اونگھ بھی نہیں آتی۔ ”اوساڈا کنا دھیان رکھا اے!“ ③ یوں اُس کا امر کارفرما ہے۔ نہ وہ مغرب کے سائنسٹوں کی طرح سے کہ جنہوں نے گھڑی بنا دی، آٹھ دن کے بعد ایک دفعہ چابی دینی ہوتی ہے، پھر آپ موج کیجیے وہ اُس چابی کے زور پہ چلتی رہتی ہے۔ وہ یوں نہیں ہے، وہ تو جو امر والا ہے، جو قانون والا ہے تو اُس کی ہر وقت پرداخت پہ نگہ ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ خدائے زندہ ہے، الحی ہے، زندہ ہے اور اُس کو اونگھ نہیں آتی، بے خبر نہیں ہے، خیر ہے، سمجھ ہے، علیم ہے۔

قانون خداوندی کی محکمیت اور باخبری کے سلسلہ میں چاند پر جانے والوں کی مثال

خدا کی یہ ساری صفات اسی لیے ہیں کہ اُس نے اپنے امر کو اس طرح سے جاری رکھا ہوا ہے ورنہ ایک دفعہ ان چیزوں کو مشین

① ہم صحیفہ فطرت کو پڑھ سکتے ہیں، لکھ نہیں سکتے۔

② اس کتاب فطرت کے متعلق متداول انسانی نظریات کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر) مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج،

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2005ء، ص۔ 315 (فٹ نوٹ 1)

③ وہ ہمارا کس قدر دھیان رکھتا ہے!

کی طرح بنا کر پھینک دیتا اور فارغ ہو جاتا۔ یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ اور یہی چیز ہے کہ اُس نے انسانوں کی راہنمائی کے لیے وحی دی ہے تو اُس کا تعلق بھی عالمِ امر سے ہی ہے۔ اس وحی کے اندر انسانی زندگی کے لیے جو قوانین دیئے ہیں قرآن کے اندر ہمیں جو حکم بھی دیا ہے جو ہدایت بھی ہمارے لیے دی ہے ہر ایک کے ساتھ لکھا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ جس طرح سے کائنات کے اندر وہ نتیجے نکلتے ہیں وہ نتیجے از خود نہیں نکل رہے بلکہ وہ ایک قانون ہے جس کے تابع کائنات چلتی ہے۔ اور قانون کا ایک لفظ بھی ہم استعمال کر رہے ہیں وہ کوئی بھاپ تو نہیں ہے۔ قانون خود ذہن میں نہیں آ سکتا کہ قانون کیا شے ہے جو نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ وہ اتنا Powerful اتنی بڑی لامنتہی قوتوں کا مالک ہے کہ اس کی ایک مثال دیکھیے کہ زمین پہ بیٹھے ہوئے جو چاند میں پہنچے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ آپ کا رابطہ قائم ہے راستے میں کوئی چیز نہیں ہے نہ کوئی تار ہے یہاں سے وہاں تک کچھ نہیں ہے اور رابطہ اس انداز کا قائم ہے کہ یہاں والوں نے اُس نگران سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ جی وہ تو نہیں ہے میں ہوں تو انہوں نے کہا کہ ہمیں پتہ ہے تو اُس نے کہا کہ آپ کو کیسے پتہ ہے کہنے لگے کہ ہمیں نہ صرف یہی پتہ ہے کہ وہ اسٹیرنگ پر نہیں بیٹھا بلکہ یہ بھی پتہ ہے کہ وہ سو رہا ہے۔ اُس نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے پتہ ہے کہ وہ سو رہا ہے۔ کہنے لگے کہ جاگتے اور سوئے انسان کی جو Heart Beating (دھڑکنِ قلب) ہے اُس میں فرق ہوتا ہے۔ ہمارے پاس تم لوگوں کی Heart Beating (دھڑکنِ قلب) کے لیے بھی گراف موجود ہے کہ اتنے بجے کے بعد اُس کی جو Beating (دھڑکن) تھی وہ سست ہو گئی ہے اور اُس وقت سے وہ سویا ہوا ہے۔ یہ ہے امر۔ یہ ان کا بنایا ہوا قانون تو نہیں ہے کہ جس کی یہ کیفیت ہے: ذرے کا دل چیریں تو لہو خورشید کا ٹپکے۔ یہ اُس کا امر ہے۔

Cause And Effect (علت و معلول) کی بنیاد پر قانون کی اہمیت اور اس کو نافذ کرنے والی قوت کا وجود

انسانوں کی زندگی تو ایک طرف رہی خارجی کائنات میں بھی یوں اُس خدا کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ ایک قانون اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے ہر Cause (علت) ایک Effect (معلول) پیدا کرتا ہے تو یہ کوئی مکینکل چیز نہیں ہے۔ اُس کے پیچھے وہ قوت ہے جو ان قوانین سے یہ نتائج مرتب کراتی ہے۔ قانون کسی Physical یعنی طبعی مشینری کا نام نہیں ہے بلکہ جس قاعدے کے مطابق وہ مشین چلتی ہے اُس کا نام وہ قانون ہے اور وہ تو محسوس نہیں ہوتا۔ وہ قانون از خود بھی کیا کام کرے گا؟ قانون میں یہ قوت پیدا کرنے والی ایک ہستی ہونی چاہیے۔ اُس نے تو ہمارے سمجھانے کے لیے صرف یہ چیز کہدی ہے کہ ایک دانہ بوؤ گے تو سات سو دانے نکلیں گے۔ یہ کس طرح سے نکلتے ہیں یہ اُس کے قانون کے تابع نکلتے ہیں۔ وہ اپنے قانون کے اوپر گرفت رکھے ہوئے ہے کہ

وہ ایسا کر کے رہے گا۔

میں نے عرض کیا ہے کہ ہم اپنے ہی الفاظ میں باتیں کرتے ہیں ورنہ خدا کا جو نظام ہے وہ تو ان سے بہت اونچا ہے۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (23:91) اُس کے متعلق جو کچھ بھی تم کہتے ہو وہ اُس سے بہت ماورا ہے۔ یہ جو اس طرح سے اس کائنات میں اتنے عظیم کُڑے ہیں تو ان کی عظمت اور وسعت کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کتنے کتنے بڑے ہیں۔ یہ زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا تو ایک سورج ہی ہے اور یہ سورج اس نظام کے اندر کچھ شے ہی نہیں ہے۔ یہ جسے کہکشاں کہتے ہیں شاعروں نے کہکشاں کہا ہے گھاس کا گٹھالے کر کوئی خشک زمین کے اوپر چلے تو وہ پیچھے سے ایک راستہ سا بن جاتا ہے: ”کہ“ کے معنی گھاس اور ”کشاں“ کے معنی کھینچ کر لے گیا۔ ان خلا نوردوں نے اوپر دیکھا تو انہیں سمجھ ہی نہیں آیا کہ اسے کیا کہیں۔ انہوں نے کہا کہ کوئی گھاس کھینچ کر لے گیا۔ ان سے پوچھیے کہ جو عالم افلاک میں ماہر افلاکیات ہیں وہ اس کہکشاں کے ایک اتنے سے ذرے کے اندر بیٹھے ہوئے کیا کچھ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ یہ قائم بامورہ ہے تو گویا خدا کی یہ کیفیت نہیں ہے کہ اُس نے کائنات کو پیدا کر دیا تو اب اُس خدا کی ضرورت نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ تو سارا نظام اُس کے قانون کے تابع چلتا ہے اُسی کے مطابق نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ پھر وہ قانون بھی سرکش نہیں کہ اُس نے بنا دیا اور وہ اپنے نتائج صحیح صحیح نہ دے۔

زندگی کی مثال ایک جوئے رواں کی سی ہے جو موت سے آشنا نہیں

قرآن کریم نے کہا ہے کہ تُمْ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَا اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ (30:25)۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ”پھر جب خدا تمہیں اس زمین سے آواز دے کر پکارے گا تو تم اس سے نکل پڑو گے“۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ بھی یہی کیا جاتا ہے اور مفہوم بھی یہی سمجھتے چلے آ رہے ہیں۔ اُس سطح کے اوپر وہ مفہوم لے لینا بھی صحیح ہے۔ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ہمارے ہاں بنیادی ایمان کا درجہ رکھتی ہے زندگی یہاں ختم نہیں ہوتی، موت سے انسان کا خاتمہ نہیں ہو جاتا بلکہ زندگی آگے بھی چلتی ہے۔ اُس نے اسے سمجھانے کے لیے یہ کہا ہے۔ یہ عرب بھی مردوں کو دفن کرتے تھے تو چونکہ مُردے کو زمین میں گڑھا کھود کر دفن کیا جاتا ہے۔ تو سمجھانے کے لیے یہ بات تھی کہ جسے تم نے مُردہ کہہ کر یا سمجھ کر زمین میں دفن کر دیا تو وہ کبھی ان قبروں سے اٹھ کھڑے ہونگے، اس زمین سے اٹھ کھڑے ہونگے۔ یہ اس سطح پہ سمجھانے کی بات ہے۔

قبروں سے اُٹھ کھڑے ہونے کی حقیقت

ان عربوں کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ مُردہ اس قبر کے اندر ہے۔ جب اُس انسان کو زندہ کرنے کی بات ان کی سطح پہ کرنی تھی تو

وہ یہی کی جاسکتی تھی کہ ٹھیک ہے تم نے جس کو اس میں دفن کیا تھا وہ یہاں سے اٹھے گا اور حیاتِ تازہ اُس کو مل جائے گی۔ لیکن جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ اُس قوم کو سمجھانے کے لیے تھا جو اپنے مُردوں کو یوں دفن کرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہندوستان میں یہ قرآن نازل ہوتا اور ان سے اگر کہا جاتا کہ زمین سے یہ مردے اٹھیں گے تو وہ تو جلا کر راکھ بہا دیتے تھے تو ان کی سمجھ میں بات ہی نہ آتی، یہ محاورہ ہی سمجھ میں نہ آتا کہ زمین سے نکلنے کے کیا معنی ہیں کیونکہ وہ تو زمین میں دفن نہیں کرتے تھے۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے یہ بات بھی پیش نظر رکھیے کہ اُس زمانے کی جو مخاطب قوم تھی اُس قوم کے ہاں جو الفاظ مروج تھے وہ اور جو ان کے ہاں اس قسم کے محسوس تصورات تھے ان کی رو سے مثالیں دے کر قرآن نے بات سمجھائی ہے۔ یہ حقیقت میں نہیں ہے کہ وہ اسی مٹی سے اٹھیں گے۔ اگر انہوں نے ہی زندہ ہونا ہے انہی کا حشر ہونا ہے انہی کی قیامت ہونی ہے تو وہ تو پھر موج میں رہے جو یہیں جلا دیتے ہیں:

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

(غالب)

تو ان الفاظ کو ان کے اس طرح معنوں کے اوپر نہیں جانا چاہیے کہ سچ مچ قبر کے اندر سے پتلا اٹھے گا۔ زمین کے اندر سے مردے کے اٹھنے کا یہ جو تصور تھا تو اس کے ماتحت اس آیت کا یہ ترجمہ بھی کیا گیا اور یہ مفہوم بھی لیا گیا۔ پھر میں آیت پڑھتا ہوں کہ **ثُمَّ إِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْأَرْضِ إِذَا أَنْتُمْ تَخْرُجُونَ (30:25)** جب وہ ایک آواز دے گا تو تم پھر اس سے نکل پڑو گے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اگر اس کا مفہوم یہی ہے کہ پھر مرنے کے بعد زندہ ہو جاؤ گے تو اس پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن یہ جو اُس نے کہا تھا کہ آفاق کے اندر بھی ہماری نشانیاں ہیں اور جوں جوں یہ انسانی علم وسیع و بلند ہوتا جائے گا ان کے اوپر پڑے ہوئے پردے اٹھتے چلے جائیں گے اور جو حقیقتیں پوشیدہ ہیں وہ بے نقاب ہو جائیں گی تو اپنے دور میں جہاں تک علم انسانی پہنچا ہے اگر کوئی ایسی چیز ہمارے سامنے آئی ہے تو اُس کی روشنی میں ان آیتوں کو سمجھا جاتا ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ **مِنَ الْأَرْضِ إِذَا أَنْتُمْ تَخْرُجُونَ (30:25)** ایک تو یہ ہے کہ جیسے ہم زمین میں یہاں پاکستان سے لندن چلے گئے یا لندن سے امریکہ چلے جائیں تو یہ زمین سے خروج نہیں ہے۔ خروج تو کسی چیز کا کسی جگہ سے باہر جانا ہوتا ہے اُس میں سے نکل جانا ہوتا ہے۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے یہ ارض و سما کی بات ہو رہی ہے۔

خدا کی طرف سے آواز آنے کا مفہوم

دعا کے معنی خدا کی طرف سے آواز دینا ہے تو خدا کبھی آواز نہیں دیتا ہے، کبھی خدا کی آواز تو یوں نہیں آتی۔ وہ تو وہ ہے جسے ہم فطرت کے اشارے کہتے ہیں، اُس کے قانون کی بے نقابی کہتے ہیں۔ یہ ہے اُس کی جو دعوت ہوتی ہے یہ ہے اُس کی جو پکار ہوتی ہے۔ زمین سے خارج ہو جانا، نکل جانا، یہ انسانیت کی تاریخ میں پہلی دفعہ ہوا ہے کہ انسان اس زمین سے نکل کر اوپر گیا ہے یہ زمین سے خارج ہو گیا ہے۔ داخل کسی چیز کے اندر آنا ہوتا ہے، خارج اُس چیز سے باہر جانا ہوتا ہے۔ یہ ارض کے متعلق ہمیں کہا گیا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ باہر کے کُڑوں کے ساتھ بظاہر ہمارا تو کوئی تعلق نہیں، وہ وہاں ہیں ہم یہاں ہیں۔ اُس نے کہا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ جو دعا ہے وہ وہی فطرت کا اشارہ ہے۔ یہ چیز غالب ^① کے انداز میں ہے:

چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیے

بہار کے موسم کے سوا کسی اور موسم میں اپنے دامن کو چاک نہ کر۔ یہ بہار کیا ہے؟ یہ اوپر کا اشارہ ہے جسے قرآن نے دعا کم دَعْوَةً کہا ہے۔ یہ ہے کہ فطرت کے حقائق پہ پڑے ہوئے پردے جب اٹھیں تو وہ تو پھر آدمی کو آنکھ مارتے ہیں۔ یہ جو چیز ہے کہ اِذَا انْتُمْ تَخْرُجُونَ تو اس کے لیے میں نے عرض کیا ہے کہ ذہن اس طرف جاتا ہے کہ قرآن میں یہ چیزیں جب موجود ہیں تو پھر کیوں نہ ہم اس پہ کھڑے ہو کر غور کریں۔ اُس نے تو کہا ہے ہم انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں تمہیں دکھاتے چلے جائیں گے۔ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) تاکہ ایک ایک بات جو انکشافِ حقیقت کے بعد انسان کے سامنے آئے گی وہ اس امر کا ثبوت ہوگی کہ قرآن نے جو کہا ہے وہ حق ہے۔

ارض و سماوات قرآن حکیم کی دو اصطلاحات ہیں، ورنہ نہ کوئی چیز نیچے ہے اور نہ کوئی اوپر قرآن کے دعاوی کے حق ہونے کے ثبوت میں ایک یہ بھی چیز ہے کہ عالم آفاق کے اندر جو انکشافات ہونگے وہ قرآن کے کسی نہ کسی دعوے کے سچا ہونے کا ثبوت بن جائیں گے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ آفاق میں جو بھی نشانیاں ہمارے سامنے آئیں ان کی روشنی میں قرآن کی آیتوں پہ غور کیا جائے۔ کیوں نہ قرآن کی اس آیت کے اوپر غور کیا جائے۔ ایک بڑی اہم آیت ہے اور اس کا مفہوم بھی آج ہی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ

وَالْأَرْضِ (42:29) تخلیقِ ارض وسموات خدا کی نشانیوں میں سے ہے۔ میں پھر عرض کر دوں کہ یہ سموات یہی نہیں ہے جو یہ چاند سورج ہمیں نظر آتا ہے بلکہ یہ تو قرآن نے دو جامع الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ارض کے معنی ہوتا ہے کہ ”کسی چیز کے نیچے“ اور سما کے معنی ہوتے ہیں ”اُس چیز کے اوپر“۔ یہ جو ارض اور سما ہے یہ تو دونوں الفاظ ہیں یہ Terms (اصطلاحات) ہی Relative (اضافی) ہیں۔ یہ میرا ہاتھ (اشارہ کرتے ہوئے) اس ہاتھ سے اوپر ہے اور یہ اس کے نیچے ہے۔ میرا ہاتھ مستقل طور پر نہ اوپر ہے نہ نیچے ہے یہ (اشارہ کرتے ہوئے) اُس کی نسبت سے اوپر ہے اس کی نسبت سے نیچے ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! اُس نے کہا ہے کہ ہم نے یہ ارض بنائی اور ہر ارض کے مثل ایک سما ہوا۔ تو یہ ٹھیک ہے کہ ہم اوپر والے گزے کے ارض ہیں۔ اقبالؒ (1877-1938) نے یہ کہا ہے کہ یہ ہو سکتا ہے کہ نیچے والے گزے اگر ہیں تو تم اُس کے سما ہو۔ ”اوسا ہنوں آسمان کہن ڈیا اے“۔^① یہ جو قرآن کی چیزیں ہیں وہ اُس کے تو الفاظ عربی زبان کے ایسے ہیں اور پھر اُس کا انتخاب ہے۔ اُس نے چاند سورج وغیرہ کہے ہیں لیکن جہاں یہ چیزیں ہیں وہاں سارے قرآن میں ارض وسموات ہے تو یہ Relative Terms (اضافی اصطلاحات) ہیں۔

قدرت نے تو فضا کے اندر پھیلے ہوئے کڑوں میں بھی متنفس پھیلا رکھے ہیں

قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا مِنْ دَابَّةٍ (42:29) ان ارض وسموات کے اندر جاندار مخلوق ہے۔ یہیں سے یہ چیز نظر آگئی کہ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ جو فضا کے اندر آپ کے ہاں گزے ہیں تو ان میں بھی زندگی کا امکان ہے۔ ”دَابَّة“ ہر متنفس کو کہتے ہیں۔ صرف ارض میں ہی نہیں بلکہ سموات میں بھی ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے تو وہ تو اُس کے وجود کی شہادت دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ بَيْنَهُمَا (42:29) اُس نے ان سموات وارض دونوں کے اندر ذی حیات متنفس پھیلا دیئے ہیں۔

عزیزانِ من! آیت کا اگلا ٹکڑا یہ ہے کہ آج تو تمہیں یہ نظر آتا ہے کہ وہاں تک تمہارا تصور ہی جاسکتا ہے تم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔ کیسے پتہ چلے کہ ان میں سے کس میں جاندار مخلوق ہے اور کیسی ہے۔ کہا کہ وَهُوَ عَلَىٰ جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ (42:29) اُس کے قانون کے اندر یہ بھی ہے کہ جب اُس کی مشیت کا تقاضا ہوگا تو تم دونوں آپس میں مل بھی جاؤ گے۔ یہ بات چودہ سو سال پیشتر کہی جا رہی ہے۔ اُس نے یہ بھی اپنے قانون میں رکھ دیا ہے کہ اس کا بھی امکان ہے۔ جب اُس کے قانون کا تقاضا ہوگا اُس

① وہ ہمیں آسمان کہہ رہا ہے۔

کے مطابق تم یہ کچھ کرو گے، تو تم اکٹھے بھی ہو سکتے ہو۔ چاند تک جمع ہونے کی پہلی منزل تو بہر حال ہمارے سامنے آگئی، مرتخ تک کے انہوں نے نشانات دیدیئے اور زندگی کے امکانات بتادیئے۔

یاد رکھیے کہ جہاں کہیں نئی ہوگی وہاں زندگی کا امکان ہوگا۔ قرآن نے کہا ہے کہ **وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ** (21:30) زندگی کی نمود پانی سے ہوتی ہے۔ یہ سائنسدان بھی اسی ٹوہ میں ہیں، چاند پہ بھی گئے تھے تو انہوں نے نیچے تک ٹوہ لگائی تھی کہ نئی والی مٹی بھی کہیں ملتی ہے۔ مرتخ کے متعلق ان کا اندازہ ہے کہ اس کے اندر معاشرت ہے۔ یعنی میں نے عرض کیا ہے کہ ابھی ہم اُس اندازے کے متعلق بات کر رہے ہیں کہ جس طرف رخ جارہا ہے۔ اور یہ چیز تو ان کے ہاں کا ایک گروہ ہے جس نے کہا ہے کہ ان چیزوں کا جو Analysis (تجزیہ) کیا گیا ہے تو اُس سے نظر آتا ہے کہ اس میں زندگی کی نمود ہے۔ لیکن ابھی تو ابتدا ہے، ہم دو ہی کڑوں تک تو پہنچے ہیں۔ اس کی انتہا تو پوچھو ہی نہیں کہ کہاں تک جا کر ہوگی۔ لیکن بہر حال ان ارض و سماوات کے اندر ”دآبہ“ کے امکان کی شہادت قرآن کی اس آیت میں موجود ہے۔ اور آگے یہ بھی ہے کہ اُس کے قانون میں یہ بات بھی ہے کہ تم ایک دن آپس میں مل بھی جاؤ گے۔ مل جانے کی بات تو ابھی معلوم نہیں کہ کب ہو۔ بہر حال یہ تو وہی لوگ جو اُس لائن پہ چل رہے ہیں بتائیں گے۔ ہم تو آج بھی یہاں سے لندن والوں سے ملنا ہوتا ہے تو ان کے ہوائی جہاز کے محتاج ہوتے ہیں۔ ”جے اسی اپنے گڈے تے ای چلیے تے اگلے مگر نہیں پہنچا جاندا“۔^① یہ وہی جائیں گے۔

کائنات کو مسخر کرنے کے سلسلہ میں ہماری ذہنی پستی کی حالت زار اور قرآن حکیم کا ارشاد

قرآن نے بار بار کہا ہے کہ جو قوم فکر، تدبر، عقل سے کام لینے والی ہے وہ قرآن کے اوپر آئے گی، وہ لوگ قرآن کے اوپر آئیں گے ورنہ ہمارے ہاں تو آپ کو وہ لطیفہ معلوم ہی ہے اور پھر اسے کیوں نہ یہاں دہرا ہی دیں۔ جب پہلی دفعہ یہ بات ہوئی تھی کہ چاند پہ آدمی جا رہا ہے تو ہمارے ہاں یہاں کئی جلسوں میں یہ وعظ بڑے زور سے ہوئے تھے۔ وہ حسن اتفاق تھا کہ سوئے اتفاق وہ چاند رات کے دن تھے جب وہ پہلی دفعہ چاند کے اوپر گئے ہیں۔ مولوی صاحب نے یہ کہا کہ ٹھیک ہے آج تو وہاں چلے جائیں گے کہ چاند کھلا ہوا ہے اور پہنچ بھی جائیں گے لیکن چودھویں کے بعد جب وہ گھٹنا شروع ہوا تو پھر ٹھیک ہے کھسکتے ہوئے آگے آگے چلے جائیں گے اور اُس کے بعد کہا کہ ”بچے او! 29-30 نوں کتھے جاؤ گے؟“^②

① اگر ہم اپنی نیل گاڑی سے جائیں تو اگلے گاؤں تک بھی نہیں پہنچا جاتا۔

② بچے! 29-30 دیں تاریخوں میں کہاں جاؤ گے؟

جب ہماری حالت یہ ہے تو ہم نے مِنَ الْأَرْضِ إِذَا أَنْتُمْ تَخْرُجُونَ (30:25) کے معنی کیا سمجھتے تھے کہ اس ارض سے باہر بھی جایا جاسکتا ہے۔ باہر جانے کے متعلق اُس نے پھر کہا کہ یہ جو باہر کے گڑے ہیں، ان کے اندر زندگی کی نمود ہے، ان کے اندر بھی تنفس ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے یعنی ہمارے قانون میں یہ بات بھی ہے کہ تم ایک دن آپس میں اکٹھے بھی ہو جاؤ۔ یہ آیتیں تو وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں اور وہ اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ یہ جن کو امام بنایا گیا تھا وہ آج اس قدر ان سے پیچھے (Backward) ہیں، ان کے محتاج ہیں، ان کے رحم و کرم پر ہیں کہ گداگری کے ٹکڑے ان کے کھلول میں پڑ رہے ہیں، انہوں نے نوع انسان کی کیا امامت کرنی ہے۔ قرآن نے اس کو اَمَامًا لِلنَّاسِ کہا تھا۔ مومن کا تو یہ مقام تھا کہ الناس کی امامت، نوع انسانی کی امامت کرنا ہے۔ یہی میدان تھے جس میں انہوں نے امامتیں کرنا تھیں۔ اس انداز کی قرآن کریم میں بیشتر آیات ہیں کہ جو لوگ بھی فطرت کے قوانین ^① یعنی قوانین الہیہ جو فطرت میں کارفرما ہیں، ان پہ پڑے ہوئے پردوں کو انکشافات کے ذریعے اٹھاتے چلے جاتے ہیں، ان کے سامنے حقائق آ رہے ہیں، وہ ان کو دیکھنے کے بعد بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ واقعی ان کے بنانے والی ہستی انسان نہیں ہو سکتی، انسان سے بلند ہو سکتی ہے۔

اس قدر عظیم کارگہ کائنات کو پیدا کرنے اور اسے اس قدر خوبی سے چلانے کا مقصد کیا ہے؟
اس إِذَا أَنْتُمْ تَخْرُجُونَ ^② (30:25) سے آگے اور آیت آگئی۔ پھر اگلی چیز یہ ہے کہ ٹھیک ہے جی! یہ سلسلہ کائنات وجود میں آ گیا تو اب یہ مشین کی طرح چل رہا ہے، از خود چل رہا ہے، قانون کے ذریعے چل رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ یونہی ایک کھیل ہے جو کھیل جا رہا ہے یا از خود یہ کچھ اب یوں ہو رہا ہے یا اس کے پیچھے کوئی مقصد، کوئی نصب العین ہے؟ بات یہ ہے کہ اتنا عظیم کارگہ کائنات کو وجود ہی میں نہیں لایا گیا بلکہ اُس کے قوانین کے پیچھے ایک زندہ قوت ہے جو اس کو اس طرح سے چلائے جا رہی ہے۔ اگر اس کا آخری مقصد کچھ نہیں ہے تو پھر یہ کیا ہے؟ کیا یہ کھیل ہے؟ جن کے سامنے علم نہیں تھا اُس قوم نے تو کہا کہ مثلاً ہندوؤں کے ہاں تو ہے ہی یہ کہ یہ تو پریشور کی لیلار چائی ہوئی ہے، کھیل ہے، ناک ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں پریشور کا نام ہی نٹ راجن ہے۔ نٹ کے معنی ہوتے ہیں جو اسٹیج کے اوپر ایکٹر (ادا کار) ہوتا ہے۔ یعنی خدا کا نام نٹ راجن ہے کہ کھلاڑیوں کا بادشاہ۔ ان کے ہاں

① فطرت کے قوانین کے لیے انسانی متداول نظریات کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2005ء، ص۔ 315 (فٹ نوٹ 1)۔

② اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ تم مرنے کے بعد خدا کی آواز پر از سر نو زندہ ہو جاؤ۔ اور ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم اس زمین سے اٹھ کر کسی دوسرے کڑے کی طرف چل نکلو جیسا کہ آج کل نظر آ رہا ہے۔ اس صورت میں ”خدا کے بلاوے“ سے مراد علم الفطرت کے مزید انکشافات ہوں گے۔ فطرت کا ہر اشارہ خدا ہی کا بلاوہ ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔ 935 (فٹ نوٹ 1)۔

تصور یہ ہے۔ قرآن نے جہاں جہاں خدا کے متعلق یہ باتیں کی ہیں تو اُس نے کہا ہے کہ ہم نے اس سلسلہ کائنات کو لـعین^① (21:16; 44:38) پیدا نہیں کیا، کھیل کے طور پہ پیدا نہیں کیا ہے۔ جہاں یہ چیز کہی ہے کہ اس کے اندر Seriousness (سنجیدگی) ہے، ایک Purpose (مقصد) ہے، ایک Object (مدعا) ہے تو وہاں یہ باطل کے جو قصورات تھے ان کی تردید بھی وہ ساتھ کے ساتھ کرتا چلا گیا ہے۔ جہاں اُس نے کہا تھا کہ خدا کو نیند تو ایک طرف اونگھ بھی نہیں آتی، جہاں اس حقیقت کا بیان تھا تو وہاں ہندوؤں کے اس عقیدے کی بھی تردید کی جنہوں نے کہا تھا کہ خدا اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد سو گیا ہے۔ یہودیوں کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ چھ دن محنت کر کے اُس نے کام کیا، پھر تھک گیا اور ساتویں دن وہ سو گیا اور وہ چھٹی کا دن ہے، یہ Holiday ہے کہ جس دن خدا سو یا تھا۔ قرآن ان الفاظ میں ان سب کی تردید کرتا چلا جاتا ہے۔

آج کے دور میں تہذیب مغرب کی سوچ کا ماحصل

اب صورت یہ ہے کہ وہ تو واہم پرستی کا دور تھا جس میں انہوں نے کہا کہ کھیل کے طور پر ایک چیز پیدا کر دی ہے، اس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ اس دور کی یورپ کی جو تہذیب اٹھی ہے تو اُس نے خالصتاً اس کو^② Physical یا طبعی کائنات بتایا ہے۔ ان کا بھی تصور یہ ہے کہ

- ① وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لِعِبَادٍ (44:38) ہم نے اس عظیم القدر کارگہ کائنات کو یونہی ہنسی مذاق کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ یہ اس لیے سرگرم عمل ہے کہ ہر کام کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب ہو جائے (21:16; 45:22) (پرویز: مفہوم القرآن ص 1116)۔
- ② اس کائنات کو طبعیاتی دنیا (Physical Universe) کہتے ہیں۔ ”طبعیاتی“ کا مطلب عام فہم یوں سمجھیں کہ جو چیزیں انسان کے دائرہ حواس (Senses) میں آجائیں انہیں ”طبعیاتی“ (Physical) کہتے ہیں۔ انیسویں صدی تک سائنس یہیں تک پہنچی تھی۔ اب سائنس کے مزید انکشافات نے بتایا ہے کہ کائنات کوئی طبعیاتی ہے ہی نہیں ہر شے ماوراء الطبعیاتی (Super-Physical) ہے۔ یعنی جب کوئی ماوراء الطبعیاتی عنصر اتنا ہیولی (Mass) اکٹھا کر لے کہ وہ محسوس (Perceptible) ہو جائے تو اسے طبعیاتی (Physical) کہہ دیتے ہیں۔

When super-physical gathers so much mass that it becomes perceptible to our sensory organs, it is called physical.

لہذا محسوسات کی دنیا میں کسی شے کے وجود (Being or Existence) کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہیولی (Mass) اکٹھا کر لے اور پھر اسے یک جا (Integrate) رکھے۔

Physical existence means gathering of mass and keeping it integrate.

(حوالہ پرویز: سلیم کے نام (چودھواں خط) ادارہ طلوع اسلام لاہور ص 195 تا 196)

کاروان زندگی بے منزل است ❶

اس کاروان زندگی کا کوئی نصب العین، کوئی Object (مدعا) کوئی Purpose (مقصد)، کوئی Goal (منزل) نہیں ہے۔ بس یہ اسی طرح سے بن گئی۔ وہ جب تحقیق کرتے کرتے یہاں تک پہنچتے ہیں کہ یہ Nothing (عدم) سے Being (موجود) کیسے ہوگئی یعنی عدم سے کیسے وجود میں آئی تو ان کے ہاں اس کے لیے ایک ہی لفظ ہے کہ صاحب! یہ ایسا By Chance (اتفاقہ) ہو گیا۔ جب وہ تصور ہی یہ ہو کہ By Chance (اتفاقہ) ایسا ہو گیا اور یہ قوانین لگے بندھے ہیں، غیر متبدل ہیں، ان کے تابع یہ کچھ چل رہا ہے تو پوچھو کہ بھی! وہ قوانین کیسے کام کر رہے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ بس ٹھیک ہے، وہ کر رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ چلو قصہ ختم!!!

خدا جو اس کائنات کا خالق ہے اس نے اس کو بے سود پیدا نہیں کیا

اگلی آیت ہے کہ وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (30:26)۔ اس کا ترجمہ تو یہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ اُسی کی ملکیت ہیں لیکن بات ملکیت سے نہیں بنتی کیونکہ وہ تو خالق ہے اور ٹھیک ہے اُس کی ملکیت تو ہیں ہی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہے۔ یہ سارا سلسلہ کائنات جو سرگرم عمل ہے یہ خدا کے متعین کردہ پروگرام کے لیے سرگرم عمل ہے اور اس طرح سے سرگرم عمل ہے کہ كُلُّ لَهٗ قٰنِیْنُوْنَ (30:26) ہر شے اُس پروگرام کی تکمیل کے لیے قانتون ہے۔

عربی زبان کو اور قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق

اس لفظ قانتون کے عام معنی تو یہ ہیں: فرمانبردار، اطاعت گزار۔ ٹھیک ہے یہ مفہوم ہو سکتا ہے لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ عربی زبان میں ایک چیز کے لیے ہی نہیں، ایک تصور کے لیے بھی بہت سے الفاظ ہوتے ہیں۔ وہ جو ہمارے ہاں زبان میں مرادفات کا تصور ہے تو مرادف کے معنی لیا جاتا ہے کہ ایک ہی لفظ کے دو معنی۔ یہ زبان کا بڑا نقص ہوتا ہے۔ Exactly (ہو بہو) اگر وہی معنی لیے جائیں تو پھر دو لفظوں کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ شاعری کے لیے الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے کہ مصرعے میں ایک لفظ جو ہے وہ آتا ہے تو وزن پڑتا ہے تو اُس کی جگہ دوسرا لفظ لے آتے ہیں کہ وہ شعر درست رہے۔ یہ چیز جو ہے یہ فارسی زبان میں تو ہو سکتا

❶ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال (1877-1938ء) کا یہ مکمل شعریوں ہے:

درنگا ہش آدی آب درگل است کاروان زندگی بے منزل است
یہ شعر میکانیکی تصور حیات کی عکاسی کرتا ہے۔

ہے کہ وہاں شہد اور انگلیں دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ عربی زبان میں یہ نقص نہیں ہے۔ وہاں ایک چیز کے لیے سینکڑوں الفاظ ہیں لیکن کوئی دو لفظ ایسے نہیں ہیں جو Exactly (ہو یو) ایک ہی معنی دیتے ہوں اور یہی اُس زبان کی وسعت کا کمال ہے۔ وہ ایسے ہی نہیں کہ اُس نے کہا کہ ہم نے عربی مبین میں اس کو نازل کر دیا یہ اس کی آخری کتاب ہے، خدا کی مکمل کتاب ہے۔ اُس کے لیے وہ کیوں کہتا ہے کہ ہم نے اسے عربی مبین میں نازل کیا ہے۔

عزیزانِ من! یہی زبان تھی جو اس کی متحمل ہو سکتی تھی۔ اور پھر اس زبان کی یہ خوبی ہے کہ ایک چیز کے لیے اتنے الفاظ ہیں۔ میں نے سچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ وہ ^① اپنی کتاب Cosmic Consciousness کے اندر لکھتا ہے کہ ایک دور کے اندر Concepts (تصورات) کے لیے عربی زبان میں جتنے الفاظ ملتے ہیں دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتے۔ وہ اسلام کی بات نہیں کر رہا بلکہ عربی زبان کی بات کر رہا ہے۔ تو اتنے الفاظ جو ہیں ان میں سے خاص مقام پہ قرآن ایک خاص لفظ چنتا ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ یہاں ان تمام میں سے یہ لفظ کیوں چنا ہے۔ یہ شاعری تو ہے نہیں کہ وہ جو شعر کا وزن تھا اُس کے لیے یہی لفظ Fit in کرتا تھا۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ یہ شاعری نہیں ہے تو اُس کے معنی یہی ہیں کہ اس میں کوئی لفظ اس لیے نہیں لایا گیا کہ وزن درست رہے۔ ہر لفظ اپنی جگہ پہاڑ ہے، ہمالیہ ہے۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ قرآن میں ان اتنے الفاظ میں سے یہی لفظ کیوں لایا گیا ہے۔

لفظ قانت کے مفہوم کے تحت انسان کی عملی زندگی پر پڑنے والے لازوال اثرات

یہاں کہا ہے کہ كُلُّ لَّهُ قِيتُونَ (30:26)۔ اب تو ہمارے ہاں چھڑکاؤ کرنے کے لیے میوسپل کمیٹی کی گاڑیاں ہوتی ہیں ان کے پیچھے ایک نال ہوتی ہے۔ پانی بھرا ہوا ہوتا ہے جہاں ضرورت نہیں ہوتی وہ اُس کا ٹل بند کر دیتا ہے، گاڑی چلتی جاتی ہے پانی بھرا ہوا ہے اور ایک قطرہ نہیں ٹپکتا۔ جہاں اُس نے چھڑکاؤ کرنا ہوتا ہے وہاں وہ کھول دیتا ہے اور وہاں وہ پانی نکلتا شروع ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاں اس قسم کے مشینز ہوتے تھے جن کے منہ کی صورت یہ ہوتی تھی کہ جہاں ضرورت ہو، جتنی ضرورت ہو، اتنا اس میں سے وہ نکل آئے، جہاں ضرورت نہ ہو وہ اس طرح مہر بہ لب ہو جائے کہ اس میں سے پانی کا ایک قطرہ بھی ضائع نہ جائے۔ یعنی بے مقصد، بے مطلب، بے جا ایک قطرہ بھی اُس میں سے ضائع نہ جائے۔ اور جہاں اُس کی ضرورت ہے تو وہاں وہ اپنا منہ کھول دے، بخل بھی نہ کرے کہ وہاں وہ دے نہیں۔ یہ جو ان کے ہاں کا مشینز ہوتا تھا اور اس کی جو اس قسم کی صفت ہوتی تھی اُسے وہ ”قانت“ کہتے تھے۔ قنوت ان کے ہاں اس صفت کا نام تھا کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو اپنی توانائیوں کو، جہاں خدا کے پروگرام کا تقاضا ہو کہ

① اس مصنف کا نام رچرڈ مورس بک Richard Maurice Bucke ہے۔ اس کی اس کتاب کے صفحات 30 تا 31 ملاحظہ کیجیے۔

صرف کرے وہاں صرف کر دیتا تھا ہوا صرف کرے تو اتنا ہی صرف کرو اور جہاں اُس کی ضرورت نہ ہو وہاں اُس کو محفوظ رکھے اور بند کر لے۔ یہ کیفیت جب کسی توانائی کی ہو جائے گی تو اُسے قانون کہا جائے گا۔

کائنات کا ذرہ ذرہ قانت ہونے کے باعث اسی سنہری اصول پر کار بند ہے

قرآن کریم نے کہا ہے کہ **وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (30:26) تمام کائنات کی ہر شے اُس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہے اور وہ اس طرح سے کار فرما ہے کہ **كُلُّ لَهٗ قٰنُۢنٌ** (30:26) ہر شے اُس پروگرام کے تقاضے کے مطابق اپنی توانائی کو صرف کرتی ہے جہاں تقاضا نہیں ہوتا وہاں وہ اس کو سنبھال کر رکھ لیتی ہے ضائع نہیں کرتی۔ نہ اُس میں اسراف ہوتا ہے نہ تبذیر ہوتی ہے۔ یہ سارا کچھ جو بیان کرتا جا رہا ہے آخر میں آپ دیکھیں گے کہ وہ کہتا یہ ہے وہی جو میں پنجابی میں کہا کرتا ہوں کہ ”دھیے نی توں گل سن“ نوٹے نی توں کن کر۔^① یعنی وہ بات تو یوں بظاہر بیٹی سے کہہ رہی ہوتی ہے لیکن اُس نے وہ بات بہو کے کان میں ڈالنی ہوتی ہے۔ یہ سارا کچھ جو خارجی کائنات کے متعلق کہا جا رہا ہے اُس کے آخر میں جا کر وہ آیتیں ہیں کہ وہ انسانوں سے یہ کہہ رہا ہے کہ تم خود دیکھ رہے ہو کہ یہ کارگہ کائنات کس حسن و خوبی سے چل رہا ہے کیسے چل رہا ہے کیوں چل رہا ہے۔ وہ خود کہیں گے کہ قانون کی رو سے چل رہا ہے۔ اُس کے بعد وہ کہتا ہے کہ تم بھی اپنی زندگی کے اندر اپنے معاشرے کے اندر اُس قانون کی پابندی کرو تو وہ بھی اسی طرح حسن و خوبی سے چلنے لگ جائے گی جہاں اُس نے پہنچانا ہے۔ پھر یہ کہنا ہے کہ جس طرح یہ جو کائنات ہے بے مقصد و بے منزل نہیں ہے اسی طرح انسانوں کی زندگی بھی بے مقصد نہیں ہے۔

عزیزانِ من! اگر زندگی یہی طبعی زندگی ہے اور اُس کے بعد موت سے خاتمہ ہو جانا ہے تو یہ تو بے مقصد ہے۔ وہ ان تمام تصریحات و تفصیلات و تشریحات سے اس نتیجے پہ پہنچاتا ہے کہ جو کچھ کائناتی آیات کے تابع بیان کرتا چلا جاتا ہے یہ یوں نہیں ہے کہ یہ سائنس کی کتاب ہے اور وہ آپ کو پڑھا رہا ہے۔ اُس نے تو یہاں آپ کو پہنچانا ہے۔ قرآن کا مقصد انسان کو یہ بتانا ہے کہ تم بھی وہ قوانین جو امرِ الہی سے ملیں گے ان پر عمل کرو۔ اور وحی کے متعلق اُس نے کہا ہے کہ یہ امر ہے۔

وحی خداوندی کی روشنی میں انسانی معاشرے میں ایک ایسی بہارِ نو آئے گی کہ اس کا کونہ کونہ نغموں کی آواز سے گونج اٹھے گا اور پھر فرشتے تم پر درود بھیجیں گے

وہ جو ہمارے ہاں اس ایک آیت کا غلط مفہوم لیا جاتا ہے وہ ہے کہ **قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ** (17:85)۔ اس میں وہ ”روح“ کے معنی وہ روح (Soul) ہی لیتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ یہاں روح کے معنی وحی خداوندی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو

① اے بیٹی! تو بات سن اور اے بہو! تو دھیان دے۔

اگر خداوندی ہے کہ جب تم دیکھتے ہو کہ کس طرح خارجی کائنات کے اندر کارفرما ہے تو اسی امر کے مطابق تم اگر اپنی زندگی بسر کرو گے تو جیسے وہاں بہار آنے پہ عیش کر اٹھو گے تو تمہاری زندگی بھی ایسا نعمہ نو بہار بن جائے گی کہ کائنات عیش عیش کر اٹھے گی۔ خدا اور اُس کے فرشتے يُصَلُّی عَلَیْکُمْ (33:43) ہوں گے۔ یہ بھی شاید آپ کے لیے نئی بات ہو کیونکہ ہم تو نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہی یہ بات جانتے ہیں کہ إِنَّ اللّٰهَ وَ مَلَائِکَتَهُ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (33:56)۔ لیکن اُس کے ساتھ ہی یہ ہے کہ خدا اور اُس کے فرشتے يُصَلُّی عَلَیْکُمْ (33:43) تم پر بھی درود بھیجتے ہیں۔ حضور ﷺ اور ان کے صحابہ ﷺ مومنین سے کہ خدا اور اُس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں۔ ہم درود ہی کہیں گے۔

یہ درود عربی زبان کا لفظ ہی نہیں ہے۔ اسے یوں کہیے کہ شاباش، تحسین و آفریں کے پھول برساتے ہیں، کیا بات ہے تمہاری! واہ واہ!۔ یہ وجد آفریں الفاظ ہونگے۔ یہ اس طرح ہونگے کہ اُس کے قانون کے مطابق جب وہ المدثر اٹھے گا جس کے معنی یہ ہیں کہ کائنات کے خزاں دیدہ صحن میں بہار لانے والے اٹھ، تو جب وہ اٹھے گا تو پوری جماعت کو ساتھ لے کر اٹھے گا۔ یہ جو خزاں دیدہ شجر کائنات تھا، اُس پہ جب نئی بہاریں آئیں گی، شگوفے چھیں گے، رنگ اور خوشبو کے کارواں مہکیں گے، اس کو دیکھ کر یہ صورت ہوگی کہ خدا اور فرشتے یہ کہیں گے کہ کیا بات ہے تمہاری! خدا بھی فرشتوں کے سامنے سراٹھا کر بات کرے گا

معاف رکھیے! محاورے کے طور پہ کہو نگا کہ وہ وقت ہے کہ جب خدا بھی سراٹھا کر بات کرے گا، ورنہ بات تو وہ چلی تھی کہ جب آدم کو تمثیلی انداز میں خدا نے بیان کیا ہے کہ جب آدم کو پیدا کیا ہے تو ملائکہ نے کہا کہ کیا تم اُس کو پیدا کر رہے ہو جو زمین کے اندر مَنْ یُفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِکُ الدِّمَآءَ (2:30) فساد پیدا کرے گا، خونریزیاں پیدا کرے گا۔ اُس وقت تو اس کا جواب اس سے زیادہ کچھ نہیں دیا گیا کہ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (2:30) ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔ وہاں تو اتنی ہی بات کہی تھی اور وہ بھی خاموش ہو گئے۔ لیکن یہ جتنی بھی انسان کی تاریخ ہے اس میں چند لحظات کو چھوڑ کر باقی تو فرشتوں کا جو اعتراض ہے یہ اُسی کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے کہ مَنْ یُفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِکُ الدِّمَآءَ (2:30)۔ انسان کی ساری تاریخ فساد، خونریزی، شعلہ فرمائی سے بھری پڑی ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ سارا کچھ جب ہوتا ہو تو اُس وقت تو پھر میں محاورے کے طور پہ عرض کر رہا ہوں، فرشتے آپس میں سرگوشیاں کرتے ہونگے کہ ”دیکھو اسی جو کہیا سی“۔^① لیکن جب اسی کائنات کے اندر وہ جماعتیں جنہیں محمد رسول اللہ ﷺ

① دیکھا جو ہم نے کہا تھا (وہی ہوا)۔

والذین معہ کے نام سے پکاریں، کھڑی ہوگی تو پھر اُس وقت خدا ان سے سراٹھا کر کہے گا کہ میں نے جو کہا تھا کہ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (2:30) ٹھیک ہے یا نہیں جو میں نے کہا تھا۔ اسی لیے کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰئِکَتُهٗ یُصَلُّوْنَ (33:56) خدا نے تو شاباش دینی ہی تھی وہ فرشتے کہ جنہوں نے اعتراض کیا تھا کہ تم یہ پیدا کر رہے ہو وہ بھی اُس کے ساتھ کہیں گے کہ کیا بات ہے تمہارے اس شاہکار کی! واقعی یہ اس قابل تھا کہ اس کے اوپر ہم پھول نچھاور کرتے۔ لیکن یہ تو اُس وقت کریں گے جب آپ کائناتی قوتوں کو مسخر کر کے خدا کی Values (اقدار) کے مطابق صرف کریں اور صحنِ حمن کائنات میں ایک نئی بہار آئے۔ کہا کہ کُلُّ لَہٗ قِنْتُوْنَ ① (30:26)۔ یہ سارا کچھ جو ہو رہا ہے یہ نہیں تھا کہ ہم نے پہلی دفعہ یہ سارا کچھ یونہی گھڑ گھڑا کر یوں رکھ دیا۔ اس میں تو ہر شے خدا کے پروگرام کے لیے وقف ہے۔

تخلیق کے بالمقابل خدا کا عالم امر ارتقا کا رہن منت نہیں ہوتا

اب امر کے بعد کی زندگی یعنی دنیا آگئی۔ وہ جو اُس کا عالم امر تھا اُس کے اندر کسی ارتقا کی ضرورت نہیں تھی کہ آہستہ آہستہ پہلے خدا یہ سوچے پھر یہ سوچے۔ وہاں یہ بات نہیں تھی۔ خلق کے اندر کہا کہ ہمارا تخلیق کا طریقہ یہ نہیں کہ پہلے ہی دن ایک چیز ہم نے مکمل شکل کے اندر رکھ دی۔ کہا کہ هُوَ الَّذِیْ یَبْدُوْا الْخَلْقَ (30:27) پہلے وہ اُس کی ابتدا کرتا ہے۔

تخلیق کے مختلف مراحل

عربی زبان میں ایک لفظ فطر ہے۔ فطر کے معنی ہوتے ہیں کہ ”کسی شے کو پہلی بار عدم سے وجود میں لانا“۔ اب یہاں خلق کی ابتدا کہی گئی ہے۔ خلق کے لیے پہلا جو کسی قسم کا جرثومہ ہے وہ وجود میں آ گیا ہے۔ اُس کی ابتدا کرنے کے بعد یہ نہیں ہے کہ وہ پہلی ہی دفعہ مکمل شکل کے اندر بنا دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہے کہ ثُمَّ یُعِیْذُہُ (30:27) پھر وہ اُس کو گردشیں دیتا ہے۔ ”او مٹی دے تھو بے نوں چک تے چڑھوندا اے“ ②۔ پھر وہ کمہار مٹی کے تھوڑے سے کہیں وہ پیالہ بناتا ہے، کہیں وہ صراحی بناتا ہے۔ یہ سارا راز اُس گردش میں ہوتا ہے جو چاک پہ ہوتی ہے۔ یہاں یعیذہ ہے یعنی وہ زندگی کے پیکروں کو گردشیں دیتا ہوا آگے لے جاتا ہے۔ کمہار کو آپ نے کبھی دیکھا ہوگا کہ وہ کمہار جب مٹی کو چاک پر چڑھاتا ہے تو گردش کے وقت اُس میں جو فالتو مٹی ہوتی ہے وہ ساتھ کے ساتھ کاٹا چلا جاتا ہے۔ المصور ہے اُس کے ذہن میں ہے کہ آخر میں میں نے اس کو کیا بنانا ہے۔ اس کے لیے اس نے

① کائنات کی ہر شے اپنی تمام صلاحیتوں کو اُس کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے وقف کیے ہوئے ہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 935)۔

② وہ مٹی کے تودے کو چاک پہ چڑھاتا ہے۔

میٹرل (مواد) لیا ہے پھر یعدہ سے یعنی اُس نے چاک پہ چڑھایا۔ اب اُس کے بعد الباری ہے۔ الباری کے معنی ہیں ”حشو و زوائد کو الگ کرنے والا“۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰی (59:24)۔ ساری صفات ہی اُس کی بڑی حسین ہیں۔ یہ جو مٹی کو الگ کرنا ہے تو بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ وہ ضائع کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بھی اُس کے حسن کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ اس کو ضائع بھی کر دیا جائے۔ سارے پتے اگر جھڑ نہ جائیں تو نئی کوئلیں پھوٹی نہیں ہیں۔ کہا ہے کہ ثُمَّ يُعِيدُهُ (30:27) پھر وہ گردشیں دیتا ہوا ارتقائی منازل طے کراتا ہوا ان کو آگے لیے چلا جا رہا ہے۔ اور کہیں اُس نے بھی یہ کہا ہے کہ اب اُس گردش کی آخری منزل یہاں آگئی ہے جس کو ہم انسان کہتے ہیں۔

ذاتِ خداوندی کو اس عظیم، تحیر انگیز کارگہ کائنات کو بنانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی

یہاں یعدہ کہا ہے۔ اتنا عظیم، تحیر انگیز کارگہ کائنات اور اُس سب کو ایک ذرے سے شروع کر کے اس انتہا تک پہنچاتے چلے جانا بڑا ہی مشکل ہوگا۔ کہا کہ وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ (30:27) کچھ مشکل نہیں ہمارے لیے یہ بہت آسان تھا کچھ مشقت نہیں اٹھانی پڑی نہ ہی یہ چیز تھی کہ ہم تجربے کر رہے تھے کہ ایک تجربہ ناکام ہوا پھر دوسرا کیا پھر تیسرا کیا۔ سب کچھ پہلے سے ہمارے ڈیزائن کے اندر تھا اور یہ سب کچھ نہایت آسانی سے ہوتا آ رہا تھا۔ اور پھر جو بنا ہے کہ وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلٰی فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ (30:27) یہ جس طرح سے پیکر بنے ہیں یہ بڑے ہی اعلیٰ درجے کے پیکر ہیں۔ سورۃ النحل میں انسانوں کے متعلق بھی یہ کہا ہے کہ اگر تم خدا کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو گے تو الْمَثَلُ الْأَعْلٰی (30:27) ہو گے نہایت حسین قالب کے اندر تمہاری زندگی ڈھل جائے گی اور یہ نہ کرو گے تو تمہارے قالب میں ناہمواریاں پیدا ہو جائیں گی۔

قوت اور غلبے کے ساتھ حکمت کا ہونا بھی ضروری ہے

اُس نے وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلٰی (30:27) کہا ہے کیونکہ اُس نے اپنا قالب آپ نہیں ڈھالنا انہوں نے اپنے آپ کو خود اپنے وضع کردہ قالبوں میں نہیں ڈھالنا بلکہ اُس نے ان کے لیے جو قالب تیار کیے ہیں ان کے اندر انہوں نے اپنے آپ کو ڈھالنا ہے۔ اسی لیے کہا کہ وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلٰی فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ ① (30:27)۔ اب کہا کہ یہ کیسے ہوتا ہے؟ جواب دیا کہ وَ هُوَ الْعَزِيزُ

① اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے سب ڈھانچے قانونِ خداوندی کے قالب میں ڈھالے ہوئے ہیں اس لیے وہ نہایت اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ (اگر انسان بھی سیرت و کردار کو قوانینِ خداوندی کے قالب میں ڈھال لے تو اس میں بھی ایسا ہی حسن پیدا ہو جائے)۔ (پرویز: مفہوم القرآن)

الْحَكِيمُ (30:27)۔ اس کا غلبہ ہے، حکمت ہے۔ اُس مٹی کے تھوبے پہ کمہار کا غلبہ ہوتا ہے، وہ اُس کے تابع چلتا ہے، اُس کے انگوٹھے کے تابع چلتا ہے، وہ اُس کے تاگے کے تابع چلتا ہے۔ عزیز کے معنی ”غلبہ“ ہوتا ہے۔ کہا کہ دو چیزوں کی ضرورت ہے: غلبے کی ضرورت ہے اور قوت کی ضرورت ہے۔ اگر اُس کمہار کے اندر قوت ہی قوت ہو تو وہ ساری مٹی کو تہس نہس کر کے رکھ دے۔ کہا کہ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (30:27) غلبے اور قوت کے ساتھ حکمت کی بھی ضرورت ہے۔ غلبہ اُس کمہار کا اُس تھوبے پر اور حکمت اُس کی یہ کہ اس کو گھمانا ہے، اوپر لے جانا ہے یا نیچے۔ جہاں بھی قرآن کریم نے زندگی کی یا کائنات کی یہ ارتقائی منازل گنائی ہیں، وہاں عزیز و حکیم کہا ہے۔ اور یہی چیز انسانی زندگی کے اندر بھی ہے کہ قوت اور اُس کے ساتھ صحیح رائے۔ قوت کے Rationally (ہر حکمت) استعمال سے صحیح نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ علامہ^① کے الفاظ میں یہ ہے کہ

قوت بے رائے جہل است و جنوں

خالی قوت جس کے ساتھ رائے شامل نہیں ہے Reason (حکمت) شامل نہیں ہے، وہ جہالت ہے۔ اور آگے دو ہی آیات کے بعد قرآن فطر الناس اور فطرت اللہ کی بات کرتا ہے۔ علمی سطح پر دنیا بھر میں صدیوں سے فطرت انسانی کے متعلق پایا جانے والا تصور غلط ہے۔

عزیز ان من! ہم سورۃ الروم کی آیت 27 تک آگئے۔ 28 آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط

● ● ● ● ● ●

① یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

چوتھا باب: سورة الروم (آیت 30: انسانی فطرت)



عزیزانِ من! آج ستمبر 1979ء کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الروم کی آیت 28 سے ہونا چاہیے تھا لیکن جیسا کہ میں نے سابقہ درس کے آخر میں مختصر الفاظ میں کہا تھا اور مجھے بعد میں یہ افسوس ہوا کہ میں نے مختصر الفاظ میں کیوں کہا، مجھے ذرا وضاحت سے کہنا چاہیے تھا۔

علمی سطح پر صدیوں سے دنیا بھر میں فطرت کے متعلق پائے جانے والے غلط تصور کی وضاحت دو آیات (29-30) کے بعد ایک آیت آتی ہے، اُس کا موضوع اتنا اہم ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر پورے ایک درس میں بھی آجائے تو غنیمت ہے اور شاید اس سے بھی زیادہ وقت لگے۔ وہ آیت ہے کہ **فَطَرَتِ اللّٰهُ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا** (30:30)۔ اس سے مقصود انسانی فطرت لیا جاتا ہے۔ میں نے مناسب سمجھا ہے کہ درمیان کی دو آیات سرِ دست چھوڑ دوں، وہ بعد میں آجائیں گی اور درس کا آغاز تیسویں آیت سے کیا جائے بلکہ آج کے درس کو اُسی کے لیے مختص کر دیا جائے۔ ویسے تو ہر درس میں بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ قرآنِ کریم کے حقائق اور رموز آپ کے سامنے آتے ہیں اور میں دیکھتا ہوں کہ آپ احباب انہیں بڑی توجہ سے سنتے ہیں لیکن یہ موضوع کچھ تھوڑا مشکل سا ہے اس لیے میں خاص طور پر عرض کرونگا کہ اس کے ایک ایک ٹکڑے پر گہری توجہ کی ضرورت ہوگی۔

میں ابھی عرض کرونگا کہ وہ کیوں ضرورت ہے۔ انسانی فطرت یعنی Human Nature کے الفاظ یہی نہیں کہ آج کی دنیا میں ہر قوم میں ہر ملک میں اور پھر عام طبقے میں نہیں بلکہ بلند پایہ سائنٹسٹ، فلاسفرز، دانشوران جتنے بھی Intellectuals (دانشوران) ہیں ان سب کے ہاں یہ چیز ہے کہ Human Nature (انسانی فطرت) ہے اور ہمارے ہاں بھی انسانی فطرت

ہے۔ ہم اسی طرح سے دہرائے چلے آ رہے ہیں۔ اس چیز کے اوپر حیرت ہوتی ہے کہ اڑھائی ہزار سال سے یہ تصور مسلسل اور متواتر چلا آ رہا ہے۔ تاریخ میں یہ ہے کہ یونان کے فلاسفرز نے اس کی ابتدا کی، یونان کے فلاسفر نے Human Nature (انسانی فطرت) کا تصور دیا۔ اس سے غلط یا صحیح نتائج تو اخذ کیے چلے جا رہے ہیں لیکن اس کے متعلق کبھی دو آراء ہی نہیں ہوئیں، کبھی کسی نے یہ کہا ہی نہیں ہے کہ ذرا بیٹھ کر سوچ سمجھ کر دیکھیں تو سہی کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا یہ کوئی چیز ہے بھی یا نہیں؟ ہر ایک نے اس Presumption پہ اس مفروضے پہ بات کا آغاز کیا کہ یہ تو ہے اب اس سے آگے بات چلائیے۔ اب آپ سوچ لیجیے کہ اس کے بعد جب میں یہ کہوں کہ یہ کچھ ہے ہی نہیں تو کتنا اہم موضوع ہو گیا اور ان لوگوں کو تو چھوڑیے کہ انہوں نے تو فلسفے کے اعتبار سے یہ بات کہی ہوگی۔

نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کردہ ایک روایت کہ ہر بچہ فطرت پہ پیدا ہوتا ہے

ہمارے ہاں تو آپ نے یہ الفاظ بار بار سنے ہونگے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ کیا کبھی کسی نے آپ کو بتایا بھی ہے کہ اس کے معنی کیا ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے؟ پھر آگے وہ ایک روایت ہے جسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور یہی چیز وجہ تاسف ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ کسی ہمارے ہاں کے عام فلاسفر یا محقق یا محدث کے ذہن کی اختراع ہے تو کوئی بات نہیں، قابلِ عفو ہے لیکن اگر کہا جائے کہ یہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جو اس کائنات کے اندر عالم الناس تھے تو تاسف ہے۔ جو روایت آپ ﷺ کی طرف منسوب کی ہے وہ یہ ہے کہ ہر بچہ فطرت پہ پیدا ہوتا ہے اور فطرت اسلام ہے اس لیے ہر بچہ اسلام پہ پیدا ہوتا ہے اور یہ اُس کے ماں باپ ہیں جو اُسے یہودی نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہیں اگر اُسے اُس کی حالت پہ چھوڑ دیا جائے تو جو کچھ وہ کرے گا جو کچھ وہ بنے گا وہ اسلام ہوگا۔ یہ ایک حدیث بیان کی جاتی ہے۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ یہ اتنا عام ہے کہ ہر جگہ آپ یہ الفاظ سنتے ہونگے اور آج تک کبھی کسی نے یہ نہیں بتایا ہوگا کہ یہ درحقیقت ہے کیا اس کے معنی کیا ہیں اس کا مطلب کیا ہے؟ آئیے پہلے ہم دیکھیں کہ لوگ جسے فطرت کہتے ہیں وہ ہوتی کیا ہے؟

خارجی کائنات میں فطرت کا مفہوم بڑا واضح، ٹھوس اور غیر متبدل ہے

خارجی کائنات کے اندر اُسے کہا ہی فطرت کہا جاتا ہے وہاں کی اشیا کے اندر یہ چیز ہے۔ پانی کی فطرت ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہتا ہے یعنی اُس کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو وہ نشیب کی طرف بہتا ہے خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر بھاپ بن جاتا ہے نیچے کی طرف آئیے تو انجماد کے درجہ حرارت پہ وہ ٹھوس ہو جاتا ہے۔ پانی جہاں بھی ہے وہاں اُس کی یہ فطرت ہے۔ ہر مقام پہ جسے پانی

کہتے ہیں وہاں اُس کی یہ فطرت ہے۔ میں اُس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ اگر تھوڑا سا Height (بلندی) پہنچیں تو ڈگری میں فرق آتا ہے ورنہ یہ چیز پانی کی فطرت ہے جہاں کہیں بھی ہے۔ بکری کی فطرت ہے کہ وہ گھاس کھاتی ہے، وہ گوشت نہیں کھاتی۔ دس ہزار سال پہلے کی بکری کے متعلق بھی معلوم ہوا تو وہ یہی تھی ہمیشہ یہی رہی، آج بھی یہی ہے اور ہر بکری کی یہ کیفیت ہے۔ شیر کی فطرت ہے کہ وہ گوشت کھاتا ہے، سبزی نہیں کھاتا، پہلے زمانے کا شیر بھی یہی تھا، اس دوران میں ہر شیر کی یہی کیفیت ہے، آج بھی جہاں شیر ہے، اُس کی یہ کیفیت ہے۔ آگ کی فطرت ہے کہ وہ حرارت پہنچاتی ہے۔ ان چیزوں کے متعلق تو فطرت کا لفظ سمجھ میں آیا۔ یعنی اسے سمجھ لیجئے کہ فطرت کسی شے کی اُس خصوصیت کو کہتے ہیں جو غیر متبدل ہوتی ہے، اُس میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔ پانی کو تو چھوڑ دیجیے کہ آپ کہیں گے کہ ذی حیات نہیں ہے۔ بکری اور شیر وغیرہ کو تو لیجئے، وہ تو ذی حیات ہیں، وہ بھی اپنی فطرت کو نہیں بدل سکتے۔ فطرت اُس خصوصیت کا نام ہے جو غیر متبدل ہے اور جس کے بدلنے کا اختیار کسی شے کو نہیں ہوتا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ہر نوع کی ہر شے کی وہی فطرت ہے مثلاً ہر بکری کی ایک ہی خصوصیت ہے، اُس کے اندر یکسانیت ہے، الگ الگ نہیں ہے کہ اس بکری کی یہ فطرت ہے اور اُس بکری کی وہ فطرت ہے۔ جہاں تک اس کائنات کی چیزوں کا تعلق ہے ان خصوصیات کو ان کی فطرت کہا جاتا ہے۔

فطرت کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ کسی شکل میں بدلتی ہی نہیں

سوال یہ ہے کہ کیا انسان کی بھی کوئی اس قسم کی فطرت ہے؟ کہا جائے گا کہ انسان کے اوپر تو خارجی اثرات ہوتے ہیں اس لیے خارجی اثرات سے اُس کی فطرت بدل جاتی ہے۔ جو بدل جاتی ہے وہ فطرت کیسے ہوئی؟ فطرت تو بنیادی طور پہ وہ چیز ہے جو بدل ہی نہیں سکتی۔ پہلے ہی قدم کے اوپر ان کا جو مسلمہ تھا وہ ختم ہو جاتا ہے۔ پھر فطرت وہ ہے جو اُس نوع کے ہر فرد کے اندر یکساں ہے۔ یہاں دو انسان یکساں نہیں ہوتے۔ تو یہ انسانی فطرت پھر کیا ہوئی؟ وہ تو ہر انسان میں یکساں ہونی چاہیے۔ یہی نہیں ہے کہ انگوٹھے کے جو نشان ہیں کہ وہ دو افراد میں ایک جیسے نہیں ملتے اور آج تک تو انگوٹھے کے نشانوں سے ہی جرائم کی تحقیق و تفتیش ہوتی تھی، اس چیز کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اُس خالق فطرت کی حکمت کے متعلق عجیب شے ہے کہ اس ایک نکتے کے اوپر عقل و حیرت رہ جاتی ہے خواہ اُس کو دس ہزار سال یا پچاس ہزار سال ہوئے اُس وقت سے آج تک کوئی دو انسان ایسے نہیں ہیں جن کے انگوٹھے کی لکیریں ایک جیسی ہوں۔ یا اللہ! یہ کس قدر حیرت انگیز ہے!

عزیزانِ من! اس منظر سے تصور کا دائرہ بٹ جاتا ہے کہ اُس کے پاس اتنے ڈیزائن ہیں۔ اور آپ حیران ہو گئے کہ اب تو

تفتیش کی لائن اور طرف جارہی ہے۔ کہا یہ جارہا ہے کہ کوئی دو انسان ایسے نہیں کہ جن کی ناک ایک جیسی ہو۔ اور آگے پتہ نہیں کیا کیا چیزیں آئیں گی۔ لیکن یہ تو بہر حال اس کے طبعی اعضا وغیرہ ہیں جن کے متعلق بات ہو رہی ہے کہ دو کے ناک بھی ایک جیسے ہوتے ہی نہیں۔ کبھی کبھار اگر جڑواں بچوں کے ہوتے ہیں تو ماں کے لیے مصیبت آ جاتی ہے۔ وہ ایک کے گلے میں یہ کچھ ڈالتی ہے اور دوسرے کے گلے میں منکا ڈالتی ہے کہ پہچانے جائیں۔ آپ سوچیے کہ سارے انسان اسی قسم کے ہوتے کہ جن کے چہرے یکساں ہوتے تو انسانیت کے اوپر کیا بنتی۔ میں نے کہا ہے کہ یہ بہر حال انسان کی جو طبعی ہیئت ہے، میں اس کے متعلق ابھی یہ عرض کر رہا ہوں۔ فطرت طبعی ہیئت کو نہیں کہتے۔ کیا کوئی دو فرد ایسے ہیں جن کی خصوصیات بالکل یکساں ہوں: بکریوں کی طرح، شیروں کی طرح، پانی کی طرح؟ دو انسان بھی اس قسم کے یکساں نہیں ہوتے۔

وہ انسانی فطرت پھر کیا ہے؟ فطرت تو ہم نے پہلے دیکھا تھا کہ غیر متبدل خصوصیت کو کہتے ہیں اور پہلا ہی قدم یہ کہ خارجی اثرات اُس کی فطرت کو بدل دیتے ہیں تو یہ تو یہیں ختم ہو گئی۔ فطرت کی دوسری Definition (تعریف) یہ تھی کہ وہ اُس نوع کے ہر فرد میں یکساں ہوتی ہے، ہر بکری کے اندر دوسری بکری جیسی فطرت ہوتی ہے، ہمیں تو کوئی دو انسان بھی ایسے نظر نہیں آتے جن کے اندر کی خصوصیات، صلاحیتیں، ذہنیتیں، نفسیات ایک جیسی ہوں۔ انسانی فطرت کیا ہوئی؟ کہا کہ جی! اگر انسان کو پیدا ہوتے ہی چھوڑ دیا جائے اور خارجی اثرات اُس پہ نہ ہوں تو وہ فطرت پہ پلتا ہے۔

انسانی فطرت کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ایک تجربہ

پہلے تو معلوم نہیں کہ ایسا تجربہ ہوا تھا یا نہیں، اگرچہ تاریخ میں یہ ہے کہ اکبر (1542-1605ء) نے اس کا تجربہ کیا تھا لیکن ہمارے زمانے میں تو ہمارے سامنے یہ ہوا۔ یہ تقسیم پاک و ہند سے پہلے کی بات ہے اور آج بھی غالباً وہ لڑکا زندہ ہوگا۔ وہاں ہندوستان میں اس کا بڑا چچا ہوا تھا، یوپی (اوپر پردیش انڈیا) میں انہیں ایک لڑکا جنگل میں ملا تھا جسے شاید پہلے ہی دن بھیڑیے اٹھا کر لے گئے تھے۔ وہ عجیب چیز تھی کہ اُس بچے کو ان بھیڑیوں نے اپنے دودھ پر پالا۔ وہ بچہ ملا، وہ چھ سات سال کا تھا، وہاں کے بہت بڑے ڈاکٹر تھے انہوں نے اُسے لیا تو گویا یہ ایسا انسان تھا جس پہ انسانوں کے کوئی خارجی اثرات نہیں ہوئے تھے، اُسے انسانی فطرت پہ ہونا چاہیے تھا لیکن وہ بالکل بھیڑیا تھا۔ وہ ہاتھوں پاؤں پہ چلتا تھا جسے چاروں ٹانگوں پہ چلنا کہتے ہیں، بول نہیں سکتا تھا، ہاتھوں سے نہیں کھاتا تھا اُسی طرح سے منہ سے کچھ کھاتا تھا، وہی کچھ کھاتا تھا جو بھیڑیے کھاتے تھے۔ انسانی بچہ جس کے اوپر خارجی انسانوں کے اثرات نہیں ہوئے وہ یہ بن گیا۔ چنانچہ اُس کی وہاں بڑی تحقیق ہوئی، اُس زمانے میں انڈیا میں اس کے متعلق بڑا شہرہ

تھا آئے دن اُس کے متعلق اخبارات میں یہ خبریں چھپتی تھیں، اُس نے بڑا Interest (دل چسپی) پیدا کیا اور بات ہے بھی Interest (دل چسپی) کی کہ انسانی بچہ جس پہ انسانوں کے اثرات مرتب نہ ہوں اُس کی فطرت کیا ہوتی ہے۔ اُس نے دیکھا کہ وہ انسانی بچہ ہی نہیں رہتا۔ اُس کے متعلق مجھے بھی Interest (دل چسپی) تھا کیونکہ یہ میرا موضوع تھا تو اُس کے متعلق معلومات ہوتی رہتی تھیں۔

انسانی فطرت کا تصور پیدا کرنے میں فلاسفروں کا کردار

پہلے تو یہ لیجیے کہ یہ جو فطرت کا تصور تھا، یہ وہاں خطہ یونان کے فلاسفرز میں کیسے پیدا ہوا؟ اسے تو چھوڑ دیجیے کہ یہ کیسے پیدا ہوا، اسے دیکھیے کہ ارسطو (384 BC.-322 B.C.) کے ہاں یہ چیز ملتی ہے، وہ غلامی کے جواز میں کہا کرتا تھا کہ بعض انسان فطرتاً غلام پیدا ہوتے ہیں اس لیے ان کو اگر آزاد کر دیا جائے تو ان کی فطرت کے خلاف ہوتا ہے، وہ اسی طرح سے تکلیف میں رہتے ہیں جیسے ٹیڑھے پاؤں والے کو سیدھی جوتی پہنا دی جائے۔ اس لیے جس کی فطرت غلامی کی ہے اور اُسے آزاد انسان بنا دیا جائے تو وہ اُس میں خوش نہیں رہ سکتا جیسے مچھلی پانی کے باہر خوش نہیں رہ سکتی۔ اُس کے پاس بیس غلام تھے اور وہ بیس دلیلیں دیا کرتا تھا۔ اور وہ دلیلیں اُس پر تھیں کہ بعض انسانوں کی فطرت یہ ہوتی ہے۔ یعنی اُس نے بعض انسانوں کی فطرت کہہ کر گروہ بنا دیا۔ نظر آیا کہ جو استحصال کرنے والے لوگ تھے، جو مغلوب لوگ تھے، جو اپنا غلبہ چاہتے تھے، دوسروں کے اوپر اقتدار چاہتے تھے انہوں نے اپنے استبداد کے جواز کے لیے ایک دلیل پیدا کی کہ بابا! ہم نے انہیں غلام نہیں بنایا، یہ فطرتاً غلام ہیں۔ ان کو تو اگر غلام نہ رکھا جائے آزاد کر دیا جائے تو ان پہ ظلم ہوگا۔ یہ چیز تو تاریخ نہیں بتاتی کہ انہوں نے یہ تصور کیسے دیا لیکن جس مقصد کے لیے اس تصور کو استعمال کیا، اُس سے نظر آیا کہ وہی جذبہ جو انسان کا دوسرے انسان کو اپنا مفتوح، ماتحت محتاج رکھنے کا ہے، اُس کے لیے ایک فلسفیانہ دلیل دی گئی کہ ان کی تو فطرت ہی یہ ہے۔

ہندوستان میں انسانی فطرت کا یہ غلط تصور یونان سے آیا اور گہرے مضمرات رکھتا ہے

وہیں یونان سے یہ تصور ہندوستان میں آیا اور یہاں انہوں نے انسانوں کو ورنوں میں تقسیم کیا جسے یہ ذاتیں کہتے ہیں: شودر، ویش، کھشتری، برہمن۔ شودر کا کام ہی یہ ہے کہ باقی ورنوں کی خدمت سرانجام دے اور معاشرے میں جتنے ذلیل و پست درجے کے کام ہیں وہ انہیں سرانجام دے۔ ان کے اوپر جب کبھی اعتراض کیا گیا کہ صاحب! یہ تو ظلم ہے کہ تمہارے ہی جیسے انسان ہیں، برہمن جیسا انسان ہے، کھشتری جیسا انسان ہے اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اُس سڑک پہ نہیں چل سکتے جس سڑک کے اوپر یہ بڑے ورنوں والے چل سکتے ہیں۔

مدرس میں یہ شور زیادہ ہیں وہاں شور وہ چاول نہیں کھا سکتے جو برہمن کھاتے ہیں اُس کنویں سے پانی نہیں بھر کر پی سکتے جو بڑی اونچی ذات والوں کے لیے ہے۔ آپس میں شادی بیاہ کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ اب بھی انہوں نے اس کو آئینی طور پر جرم قرار دے رکھا ہے۔ اب بھی یہ کیفیت ہے کہ اخبارات اور ریڈیو میں ان کے ہاں خبریں آتی ہیں کہ فلاں گاؤں کے اندر کسی شور نے ان کے کنویں سے پانی پی لیا تو انہوں نے اُس کا پورا گھر جلا دیا، جھونپڑی بمعہ انسانوں کے جلا دی۔ ان سے جب پوچھا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ ہم نے نہیں کیا، دھرم کے اعتبار سے ان کو برہمن نے پیدا ہی اس طرح سے کیا ہے۔ یہ برہمن کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں، دیش، جن کو پیسے کہتے ہیں، اُس کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے، کھشتری اُس کے بازو سے پیدا ہوئے تھے اور برہمن اُس کے سر سے پیدا ہوئے تھے۔

آپ کو معلوم ہے کہ آج کل وہاں کی سیاست میں یہ مسئلہ ہے کہ جگ جیون رام کو وزیر اعظم بنا دیا جائے یا نہ بنایا جائے؟ اس بنا پر مخالفت ہو رہی ہے کہ یہ تو شور ہے اور شور کو حکومت کا اقتدار کیسے دیا جاسکتا ہے؟ یہ تو اُس کی فطرت کے خلاف ہے۔ سیاست میں جس کو جو بھی دلیل ملے اور پھر وہ مقدس دلیل ہو کہ وہ تو برہمن نے بنایا ہی خدمت کے لیے ہے تو معاشرے پر اس کے کس قدر گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔

انسانی فطرت کا تصور قرآن حکیم کی تعلیم ہی کے خلاف ہے

آپ نے دیکھا کہ فطرت کے نظریہ کا تصور اور بنیاد کس جذبے سے ہے؟ وہی انسانوں کا جذبہ کہ دوسرے انسانوں کو اپنا مغلوب اور محتاج رکھا جائے۔ اُس کے لیے دھرم کی بنا پہ ورنوں کا تصور آیا، فکری بنا پہ فطرت انسانی کا تصور آیا کہ ان کی فطرت یہ ہے۔ آپ سوچے کہ قرآن کریم جو انقلاب لے کر آیا تھا، کیا اُس کی رو سے وہ کبھی اس قسم کے تصور یا نظریے کو درست قرار دے سکتا ہے؟ سارے انسانوں کے متعلق تو اُس نے کہا کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (17:70) تمام انسانی بچے انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہیں۔ پہلی چیز تو یہ آگئی۔ اگلی چیز کہ فطرت بدلی نہیں جاسکتی، قرآن نے کہا کہ اَنَا هَدَيْتُهُ السَّبِيلَ اَمَّا شَاكِرًا وَاَمَّا كَفُورًا (76:3) ہم نے تو اس کو دونوں راستے دکھادیئے ہیں۔ اب یہ اس کی اپنی مرضی ہے اس کے اپنے اختیار و ارادے پہ ہے کہ وہ یہ راستہ اختیار کرے یا وہ راستہ اختیار کرے۔ اس کی اگر کوئی غیر متبدل فطرت ہے جو بدل ہی نہیں سکتی تو یہ دو میں سے ایک راستہ کیسے اختیار کرے گا۔ بکری کے سامنے اگر Two Possibilities (دو امکانات) رکھ دی جائیں یعنی ایک

❶ اس کی مکمل تشریح و توضیح کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل)، سورۃ الدھر، ادارہ طلوع

طرف گھاس رکھ دی جائے اور ایک طرف گوشت رکھ دیا جائے تو یہ نہیں ہے کہ اُس کا جی چاہے تو وہ گوشت کھالے اُس کا جی چاہے تو وہ گھاس کھالے۔ بکری کے لیے دو Possibilities (امکانات) نہیں ہیں۔

جہاں فطرت ہوتی ہے وہاں اختیار و ارادہ نہیں ہوتا

اس بات کو یاد رکھیے کہ جس کو اختیار کہتے ہیں اُس کے لیے دو Possibilities (امکانات) کا ہونا ضروری ہے۔ جس معاشرے میں جس سیاست کے اندر جس نظم کے اندر انسانوں کے سامنے دو Possibilities (امکانات) نہ رہیں ایک ہی رہے تو وہ استبداد ہے۔ انسان کے خالق نے کہا یہ ہے کہ اس کے اندر جو اختیار اور ارادہ (Choice and Will) رکھ دیا گیا ہے یہ خارجی کائنات میں کسی شے کو نہیں دیا گیا۔ وہاں فطرت ہے یہاں اختیار ہے۔ صاحب اختیار و ارادہ کی فطرت ہے ہی نہیں۔ فطرت تو مجبور کی ہوتی ہے جو بدلی ہی نہیں جاسکتی اور جو ہر ایک میں یکساں ہوتی ہے۔ اب یہاں وہ یہ کہہ رہا ہے کہ اسے ہم نے پیدا کیا ہے اس کے اندر کچھ صلاحیتیں رکھ دی ہیں اور وہ بڑی لامنتہی صلاحیتیں ہیں۔ لامنتہی اس دنیا کے اعتبار سے میں کہہ رہا ہوں آگے چل کر تو پتہ نہیں کیا صورت ہو۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَّا فِي الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَ بَاطِنَةً ① (31:20) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے اس کے تابعِ تسخیر کر دی گئی ہے۔ کہا کہ ہم نے اس کو صلاحیتیں دیں اور پھر اُس کے بعد یہ ہے کہ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (18:29) جس کا جی چاہے ان صلاحیتوں کو تخریبی طور پہ استعمال کرے اور جس کا جی چاہے تعمیری طور پہ ان کا استعمال کرے۔ یہ اس کے اختیار و ارادہ میں ہے کہ جیسے جی چاہے ان صلاحیتوں کو وہ استعمال کرے۔ فطرت تو یہ نہیں ہو سکتی۔

فطرت کی ایک اور چیز بھی ہے کہ فطرت ہر نوع کے ہر فرد کے اندر رکھی ہوئی ہوتی ہے وہ اُس کو باہر سے نہیں ملتی۔ وہ جو میں اکثر مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک مرغی کے نیچے بطخ کے اور مرغی کے انڈے سینے کے لیے اکٹھے رکھ دیئے جائیں اور جب بیس اکیس دن کے بعد اُن میں سے چوزے نکلیں گے تو بطخ کے چوزے انڈے سے باہر آنے کے ساتھ ہی پانی کی طرف دوڑیں گے اور مرغی کے چوزے پانی سے بھاگ کر خشکی کی طرف آئیں گے۔ یہ اُس انڈے کے اندر کونسا کالج تھا جو اُس کو بیس دن تک یہ سبق دیتا رہا۔ چیل

① خدا نے کائنات کی ہر شے کو تمہارے فائدے کے لیے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ کر مختلف کاموں میں لگا رکھا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ تمہاری نشوونما کے لیے جس قدر ساز و سامان کی ضرورت ہے خواہ وہ محسوس اور مرئی اشیاء ہوں یا کائنات کے پردوں میں چھپی ہوئی قوتیں اسے نہایت کشادگی اور فراوانی سے بہم پہنچائے اور اس طرح تمہاری نشوونما کی تکمیل ہو جائے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 950)۔

کبھی انہوں نے دیکھی نہیں ہوتی ہے لیکن اُس کا سایہ پڑتا ہے تو بھاگ کر مرغی کے نیچے آ جاتے ہیں۔ کس نے بطخ کے بچوں کو کہا کہ تم پانی کی طرف جاؤ، کس نے مرغی کے بچوں کو کہا کہ اُدھر نہ جانا اُدھر تمہارے لیے ہلاکت ہے، کس نے ان دونوں کو کہہ دیا کہ دیکھو! یہ جو تم پہ چیل کا سایہ پڑ رہا ہے یہ شکاری ہے، بلی کی میاؤں سننے کے ساتھ ہی وہ چوڑے کیسے بھاگتے ہیں۔

فطرت رکھنے والی کسی شے کی طرف کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا

جو فطرت کی شے کسی کے اندر ہوتی ہے تو اُس کے لیے کسی خارجی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ کسی بکریوں کے گروہ یا شیر کے گروہ کی طرف کوئی رسول نہیں آیا جو آ کر ان کو بتائے کہ یہ تمہارے لیے سیدھا راستہ ہے اور یہ غلط راستہ ہے۔ جو مجبور ہے اُس راستے پہ چلنے کے لیے کہ جو اُس کے لیے خالق فطرت نے متعین کر دیا ہے تو اُس کی طرف کسی نبوت اور وحی اور رسالت کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو صاحب اختیار کے اختیار کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی تعلیم ہے جس کے لیے کسی معلم کی ضرورت ہے۔ اور اس مقصد کے لیے جو تمام انسان ہیں ان کے لیے یکساں تعلیم ہوتا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے اختیار کو اُس طرح سے استعمال کریں۔ اس کے لیے وحی کی ضرورت پڑی۔ یوں انسانوں کے اندر وہ گروہ پیدا ہو جائے گا جو اس تعلیم کی بنیاد پر ہم آہنگ ہوگا اور وہ اپنے اختیارات کو اسی طرح سے صرف میں لائے گا جیسے اُس تعلیم میں دیئے ہیں۔ یہ ایک امت اور ایک جماعت بنے گی: ایک مقصد رکھنے والی ایک نصب العین رکھنے والی۔ مجبوراً نہیں بلکہ اپنی مرضی سے یہ کچھ کرے گی۔

انسانوں کو غلام بنانے کے تصور کے بعد نظام سرمایہ داری کا حربہ اور اس کے اثرات

آپ کسی کو مجبوراً مسلمان یا مومن نہیں بنا سکتے اور نہ ہی کوئی مسلمان یا مومن پیدا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں جو یہ Human Nature (انسانی فطرت) کا تصور تھا وہ غلامی کا جواز لیے ہوئے ورنوں کا جواز لیے ہوئے یونان سے چلا وہ ایک گروہ کا تصور تھا۔ ان کے ہاں آگے آئے تو کیپٹل ازم کا تصور یعنی سرمایہ داری کا نظام آیا۔ اب اُس سرمایہ داری کے نظام میں آپ دیکھتے ہیں کہ جو صاحب قوت ہے وہ چھینتا ہے، جھپٹتا ہے، لوٹتا ہے، کھسوتا ہے، استحصال کرتا ہے اور یہ چیز ذاتی ملکیت میں رکھتا ہے۔ یہ بڑی مذموم چیزیں ہیں، ان چیزوں کو جرائم ہونا چاہیے۔ ان سے تباہی اور فساد برپا ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ نظام سرمایہ داری کے لیے جواز یہ ہے کہ کسی چیز کو اپنی ملکیت میں رکھنا، یہ انسان کی فطرت ہے اور جب فطرت ہے تو فطرت کی تسکین کے لیے زیادہ سے زیادہ رکھ سکتا ہے، اس کو کوئی نہیں روک سکتا، اس کو روکنا ایسے ہی ہوگا کہ جیسے پانی کے آگے بند لگا دیتے ہیں تو سیلاب بن جاتا ہے۔ یہ نظام سرمایہ داری کے دلائل ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ فطرت کا جو تصور ہے وہ استحصال کرنے والوں کے لیے کیسا خوش آیا، انہیں کیسا سوٹ کیا! اور اسی بنا پہ سارے یورپ کے اندر وہ قومیں جو Capitalistic (سرمایہ دارانہ) تھیں انہوں نے اس کو اتنا پھیلا یا کہ صاحب! دوسرے کی چیز کو جھپٹ لینا چھین لینا یہ انسان کی فطرت ہے، تم دیکھتے نہیں ہو کہ شیر ہر ایک سے چھین لیتا ہے۔ کہا کہ یہ جو Self Possession (ذاتی ملکیت) ہے یعنی زیادہ سے زیادہ ذاتی ملکیت میں یہ چیزیں رکھنا، یہ انسان کی فطرت ہے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ کیا قرآن اس قسم کے نظریے کی تائید کرے گا کہ جو کسی شے پہ کسی کی ملکیت کو جائز ہی قرار نہیں دیتا۔ جو اس شخص کو جو محنت کی، کام کرنے کی استعداد رکھتے ہوئے کام نہیں کرتا، کہتا ہے کہ اُس کو روٹی بھی نہیں مل سکتی۔ اُسے لیس لالہ انسان الا ماسعی (53:39) ملے گا کہ جو کام سے کچھ پیدا کرے۔ اُس نے اس سرمایہ داری اور لوٹ کھسوٹ کے تصور کو ختم کر دیا۔ لیکن آپ کے ہاں کیا ہوا؟

آپ حیران ہونگے کہ قرآن کریم تو ایک طرف رہا، زمانہ نزول قرآن کی عربی زبان میں بھی فطرت کا لفظ ان معنی میں کہیں آیا ہی نہیں ہے۔ عرب اس قدر حریت پسند، آزاد منش قوم تھی۔ اب پتہ چلا کہ اسلام کے لیے، دین کے لیے، وہ قوم کیوں منتخب کی گئی تھی۔ وہ اپنی پوری تاریخ میں کبھی کسی کی محکوم ہی نہیں رہی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ آزاد منشی اگر کسی قاعدے قانون کے مطابق نہ ہو تو بعض اوقات سرکشی اختیار کر لیتی ہے، لیکن بہر حال اُس قوم کے اندر آزادی تھی۔ اور جس قوم نے اس قدر حریت اور آزادی کی فضا میں شروع سے آخر تک پرورش پائی ہو تو فطرت مجبوراً تصور اُس کے ہاں کیسے آ سکتا ہے۔ اُس زبان میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہی نہیں ہوتا تھا۔

لفظ ”فطر“ کا قرآنی مفہوم

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں قرآن کریم نے پیدائش کے لیے دو الفاظ استعمال کیے ہیں: ایک فطر ہے اور دوسرا خلق۔ فطر کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا یعنی وہ پہلے بالکل نہیں ہے Nothingness (عدم) سے Being (وجود) میں لے آنا، یہ ہے اصطلاح۔ یعنی جو شے کہیں بھی نہیں ہے اُس کو موجود کر دینا۔ اس کے لیے لفظ فطر آتا ہے۔ قرآن میں فاطر السموات والارض خدا کے لیے ہے کہ یہ سلسلہ کائنات یہ نہیں ہے کہ یہ شروع سے ایسا تھا بلکہ اس کو خدا عدم سے وجود میں لایا۔ اس کو فطر کہتے ہیں، اس کرنے والے کو فاطر کہتے ہیں۔ اور اس کے بعد جب وہ اشیا کو وجود میں لے آیا تو وہ اپنی ابتدائی شکل کے اندر تھیں پھر اُس Material (مواد) سے جو وجود میں وہ یوں لایا ہے، اُس میٹرل (مواد) میں مختلف نسبتیں

(Proportion) پیدا کرتے ہوئے نئی نئی چیزیں پیدا کرتے چلے جانا، اس کو تخلیق کہتے ہیں اور ایسا کرنے والے کو خالق کہتے ہیں۔ یہ اس زبان کی وسعتیں ہیں۔

انسانی کاوش کا تعلق ”فطر“ سے نہیں، خلق سے ہے

میں نے اگلی دفعہ عرض کیا تھا کہ عالم امر اور عالم خلق سے تو مغرب کا مفکر^① یہ کہتا ہے کہ یہ قوم کتنی خوش بخت ہے کہ جس کی زبان میں Creation (تخلیق) کے لیے دو الفاظ موجود ہیں۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ ہمارے ہاں ایک ہی لفظ ہے اور ہم امتیاز نہیں کر سکتے۔ قرآن نے یہ فطر اور خلق کا امتیاز کیا ہے کہ ”فطر“ کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا۔ کہا کہ انسان یہ نہیں کر سکتا۔ لیکن موجود اشیا میں مختلف Proportion (تناسب) پیدا کر کے، صحیح تناسب پیدا کر کے، اُس سے ایک نئی چیز بنالینا، یہ تخلیق ہے اور اس اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو خالق کہنے کے بعد اور خالقوں کے وجود کو تسلیم کیا۔

ذاتِ خداوندی نے خود کو احسن الخالقین تو کہا ہے لیکن احسن الفاطرین نہیں کہا۔ کیوں؟

ذاتِ خداوندی نے اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا، احسن الفاطرین نہیں کہا۔ موجود اشیا میں سے نئی نئی چیزیں پیدا کرنا جسے اُس نے تخلیق کہا ہے اس کے لیے کہا کہ اور بھی خالق ہیں۔ اور خالق، حیوان تو ہو ہی نہیں سکتے، یہ تو انسان ہیں۔ اس اعتبار سے انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ

تُو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایام آفریدم

(پیام مشرق: انسان)

تُو نے رات بنائی، میں نے اُس کو دیا بجشا۔ تُو نے مٹی بنائی، میں نے اُس سے کتنا خوبصورت پیالہ بنالیا۔ یہ ہے خالق۔ فطر کے معنی ہیں کہ یہ خدا کا عملِ تخلیق کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانے کے لیے ہے، فطرت کے معنی ہیں خدا کا یہ قانون جس کی رو سے کسی شے کو عدم (Nothingness) سے وجود (Being) میں لانا ہے۔ جس طرح فطرت کے معنی Nature کیا جاتا ہے اس

کے لیے یہ ذہن میں رکھیے کہ قرآن میں تو ایک طرف، عربی زبان میں بھی یہ لفظ اس طرح استعمال نہیں ہوا۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہمارے ہاں کیسے ہوا؟ عباسیوں کے زمانے (750-1258 AD) میں جب یونانی فلسفے کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا ہے تو ان کے ہاں تو Nature (نیچر) کا یہ لفظ عام چلا آ رہا تھا، ادھر ان عربوں کے ہاں یہ اُس معنی میں تھا نہیں۔ معلوم نہیں کس طرح سے اُس کا ترجمہ فطرت کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ لفظ ہمارے ہاں صرف ان کتابوں میں پہلی دفعہ ملتا ہے جو یونانی فلسفے کے عربی میں ترجمے پر آئی ہیں۔ انہوں نے اس کے لیے یہ لفظ استعمال کر لیا۔

انسانی فطرت کے مروجہ تصور سے قرآن حکیم کی ساری تعلیم بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے

جب یہاں اس یونانی فلسفے کے عربی میں ترجمے کا استعمال ہو گیا تو پھر اس کو مذہبی سند دیدی گئی۔ کسی نے کچھ نہ سمجھا کہ انسان کا یہ تصور جو خدا نے دیا ہے، وہ تو ان مفکرین (یونان) کے تصور کے بالکل خلاف ہے۔ اگر اس کے لیے ہم نے فطرت کا لفظ استعمال کیا تو قرآن کی بنیادی تعلیم ختم ہو جائے گی۔ لیکن سوچنا تو آپ کے لیے حرام قرار دیدیا گیا ہے۔ کہا کہ اسلام دین فطرت ہے، ہر انسان فطرت پہ پیدا ہوتا ہے اس لیے اسلام پہ پیدا ہوتا ہے، انسانی بچے پر اگر انسانی اثرات اثر انداز نہ ہوں تو وہ جس حالت میں ہوتا ہے وہ اسلام کی حالت ہوتی ہے۔ ابھی میں نے آپ کو اُس بھیڑیے والے بچے کے بارے میں بتایا ہے۔ یہاں کسی بچے کو اگر آپ ”قہر موس“ میں رکھ دیجیے کہ نہ اُس کو کوئی تعلیم ملے نہ کوئی تربیت ملے نہ گھر کی آواز اُس کے کان میں پڑے تو پھر دیکھیے کہ وہ کیا بنتا ہے۔ اُس کے متعلق یہ کہہ دیا کہ ہر بچہ اسلام پہ پیدا ہوا۔ کسی نے یہ ابتدا کی اور بات چل پڑی۔ ہم یونان اور یورپ کے مفکرین کو ہی دوش دیتے تھے کہ انہوں نے کھڑے ہو کر سوچا ہی نہیں ہے۔ اگر انہوں نے نہیں سوچا ہے تو بہر حال یہ انسانی فکر کی ایک غلطی ہے لیکن آپ کے ہاں یہ ہوا کہ آپ نے اس کو عین دین بنا دیا کہ چونکہ اسلام دین فطرت ہے اس لیے ہر بچہ فطرت پہ پیدا ہوتا ہے، اگر انسان کی فطرت کو غلطی حالہ رہنے دیا جائے تو جو کچھ وہ بچہ بنتا ہے وہ اسلام کی صحیح تصویر ہوگی، وہ بے آمیزش ہے اُس میں ملاوٹ نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں اس ہزار برس کے اندر یہ چیز مسلمہ کی حیثیت سے مانی جاتی ہے اور چلی آ رہی ہے۔ اتنی بات ہی نہیں بلکہ ایک قدم آگے بھی ہے۔ جب بنیاد میں ایک چیز پہلے سے کج رکھ دی جائے تو

تا ثریا می رود دیوار کج

آسمان تک وہ دیوار لے جائیں تو ٹیڑھی اٹھے گی کیونکہ خشتِ اول غلط رکھ دی گئی۔

انسان کی فطرت کے مطابق خدا کی فطرت کا تصور

اب یہ نشتِ اول غلط رکھی گئی یعنی اسلام کو دینِ فطرت کہا، انسان فطرت پہ پیدا ہوتا ہے کہا اور یہ کہا کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے تو ہوا یہ کہ خدا کی بھی فطرت ہوتی ہے کہ جو بن گیا سو بن گیا۔ ہم انسانوں سے بھی آگے بڑھے اور خدا کی بھی فطرت کہہ دیا اور کہا کہ خدا نے انسانوں کو اپنی فطرت پہ پیدا کیا ہے۔ یعنی انسان کو اگر ویسے ہی چھوڑ دیا جائے جیسا وہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اسلام پہ ہے اور جب اُسی طرح سے وہ بڑا ہو تو جو عادات، جو خصوصیات اُس سے آئیں گی وہ اللہ کی فطرت ہوگی یعنی اللہ دیا ہوگا۔

عزیزانِ من! ذرا اس چیز کو سوچیے کہ اس بات کو میں نے آدھا گھنٹہ پہلے سے ہی آپ کے سامنے شروع کیا ہے اور یہ بات آپ کے سامنے پہلی دفعہ ہی آئی ہے تو میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کے لبوں میں ایک تبسم زیرِ لبی ہے لیکن آپ اس کو کیا کہیں گے کہ ہزار برس سے آپ کے ہاں کے سارے فلاسفر، سارے محدث، تمام علماء اس کو پکارتے چلے آ رہے ہیں کہ اللہ کی فطرت کے اوپر انسان کو پیدا کیا۔

وحی کی تعلیم کے بغیر انسان کی حالتِ زار

یہودیوں نے کہا تھا کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل پہ پیدا کیا۔ انہوں نے یہ تو نہ کہا، انہوں نے کہا کہ اُس نے انسان کو اپنی فطرت پہ پیدا کیا، یہ تو اُس سے بھی آگے بڑھ گئے۔ آپ کو پتہ ہے کہ خدا نے کیا کہا۔ اُس نے کہا کہ اگر انسان کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو وہ کیا بنتا ہے یعنی اگر اُس کو وحی کی کوئی تعلیم نہ دی جائے تو وہ کیا بنے گا؟ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ (14:34) بڑا ہی ظالم، ہر شے کو دبا کر بیٹھ جانے والا، وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا (17:67) ناشکر گزار، هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ (16:4) جھگڑالو، بالکل واضح جھگڑالو۔ یعنی نظر آتا ہے کہ بات جو کہہ رہا ہے بڑی غیر معقول ہے۔ وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (18:54) اکثر چیزیں جو اس کے مفاد کے خلاف جاتی ہیں جھگڑا پیدا کر دیتا ہے وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا (17:11) بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے جلد بازی سے کچھ کرتا ہے اور اُس کے بعد پھر اُس کو ندامت ہوتی ہے۔ وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُورًا (17:100) خود غرض، بخیل، تنگ نظر۔ یہ ہوتی ہے اس کی کیفیت۔ إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ① (70:19) ایسا لالچی کہ اس کا پیٹ ہی نہیں

① ان نکات کی تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل) سورة المعارج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2006ء، ص

بھرتا ہر وقت بھوکا۔ یہ اُس کی کیفیت۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ (100:6) سب کچھ اپنے لیے لوٹ کر، سمیٹ کر اپنے خدا کا بھی ناشکر گزار ہوتا ^① ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (33:72) ظالم بھی ہے، جاہل بھی ہے۔ خدا انسان کے متعلق یہ کچھ بتا رہا ہے۔ اور اگر انسان خدا کی فطرت پہ پیدا ہوتا ہے تو خدا تو انسان کے متعلق یہ کہہ رہا ہے اور یہ ہمارا روز کا بھی مشاہدہ ہے۔ نہ بھی ہو وہ تو خود اس کے متعلق کہہ رہا ہے کہ وہ تو یہ ہے۔

اب آئیے اس عقیدے کے اوپر کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پہ پیدا کیا ہے جبکہ اُس کے متعلق وہ خود یہ بتا رہا ہے کہ اگر اُسے علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو یہ تو یہ کچھ بنے گا۔ عزیزانِ من! میرا خیال ہے کہ آپ کو ان چیزوں کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آ رہی لیکن دقت اس میں پیش آئے گی کہ ہزار برس سے یہ سارے جتنے بھی اتنے بڑے جن کے ناموں کے ساتھ کیا کیا الفاظ ہیں اور کیا کیا ہمارے ذہن میں تصورات ہیں، وہ یہ اتنی بات نہیں سمجھ سکے۔ تقلید تو سمجھنے سوچنے کے دیئے بجھا دیتی ہے۔ اُس نے انسانوں کے متعلق یہ کچھ کہا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اُس نے کہا کہ انسان میں 9/10 حصہ حیوان کا ہے، قرآن نے بتایا ہے کہ پہلے جرثومے سے لے کر آخری منزل سے ایک قدم پیچھے تک اس میں اور حیوانی بچے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ پھر رحمِ مادر ہی نہیں بلکہ اولیں جرثومہ، جولائف سیل بنا تھا، وہ فطر سے اللہ نے پیدا کیا تھا وہاں سے جن مراحل سے زندگی گزری ہے اُس میں سارے ذی حیات انہی مراحل میں سے گزرتے چلے آئے ہیں اور Evolution (ارتقا) سے آہستہ آہستہ خدا کی صفت الباری سے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا انسان یہاں تک پہنچا۔

آج انسانی زندگی نے اپنی ارتقائی منزل کے لیے اس مادی جسم کا سہارا حاصل کر رکھا ہے

وہ جو میں نے کہا تھا کہ جیسے وہ کمہار چاک کے اوپر مٹی کا تھوہہ رکھتا ہے اور اگر اُس میں سے اُس نے پیالہ بنانا ہوتا ہے تو جو زائد مٹی ہوتی ہے وہ اُس میں سے الگ کرتا چلا جاتا ہے۔ کہا کہ ارتقائی منازل میں سے جو زندگی گزری تو ہم نے ہر منزل کو کچھلی منزل کے مقابل میں زیادہ حسین یعنی زیادہ متناسب بنایا اور اس کے لیے جتنا کچھ زائد تھا وہ الگ کرتے گئے۔ ”باری“ اُس کو کہتے ہیں جو زائد چیزوں کو الگ کرتا چلا جائے۔ اور اُس کے بعد المصور ہے اس لیے کہ ہم نے ایک خاص شکل میں کسی چیز کو پیدا کرنا تھا۔ خاص شکل میں پیدا کرنے کے لیے، مصور تک آنے کے لیے الباری کی ضرورت ہوتی ہے اور ترتیب بھی یہ ہے کہ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ

② کنود کی تشریح و توضیح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (کمل) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2006ء، ص 525۔

الْبَارِئِ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى^① (59:24)۔ اُس نے کہا کہ یہ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا یہاں تک پہنچا، اس میں اور حیوان میں کوئی فرق نہیں، اس کی طبعی زندگی اور حیوان کی طبعی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔

انسان کے لیے خدا کی طرف سے ارادہ و اختیار کا عظیم تحفہ

یہاں اس منزل پہ پہنچنے کے بعد اُس نے کہا کہ ہم نے اپنی توانائی کا ایک شہ اس کے اندر پھونک دیا: وَ نَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ (32:9)۔ یہ جو الٰہیاتی توانائی تھی جسے خدا نے اپنی کہا ہے، یہ کیا چیز ہے؟ یہ اختیار و ارادہ ہے جو اس کائنات میں، اوپر خدا کو حاصل ہے، نیچے اُس کا دیا ہوا انسان کو حاصل ہے، کسی اور کو حاصل ہی نہیں ہے۔ ”روح“ کے معنی توانائی (Energy) ہوتی ہے۔ کسی اور شے کے متعلق نہیں کہا کہ ہم نے اُس کو یہ دیا۔ اور یہاں پہنچنے کے بعد کہا کہ یہ خَلْقِ جَدِيدِ (34:7) ہے۔ اب یہ باقی مخلوق سے الگ ہو گیا۔ اختیار اور ارادے کو صحیح طور پہ Exercise (مشتق) کرنے کے لیے اس کو Guidance (ہدایت) کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے کہ اگر باہر سے Guidance (ہدایت) نہ ملے تو وہ تو وہی حیوان کا حیوان ہے۔ اب قرآن نے یہ کہا کہ باہر کی Guidance (ہدایت) سے اس کو جو اقدار (Values) دی جاتی ہیں یہ ان کے مطابق زندگی بسر نہ کرے تو یہ حیوان کا حیوان ہوتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ حیوان کی قوتیں اُس کی وسعتیں اُس کا جو دائرہ ہے، وہ بڑا محدود ہوتا ہے۔ یعنی شیر جیسا اتنا بڑا قوی، اتنی تیزی سے بھاگ سکتا ہے لیکن اگر اُس کی حد سے ذرا اونچا بکرا کھڑا ہو اور یہ بھوکا مر رہا ہو تو یہ اُس تک نہیں پہنچ سکتا۔ اُس کی توانائی کو Exercise (نافذ) کرنے کے لیے ایک حد مقرر ہے۔ کائنات کی ہر شے کی صلاحیتوں کی ایک حد مقرر ہے۔ اُس حد سے وہ شے آگے نہیں جاسکتی اس لیے کہ وہ اوزار نہیں بنا سکتی۔

انسان کے بالمقابل کائنات کی ہر شے کی صلاحیت محدود ہے

یونان کے مفکروں نے انسان کی جو Definitions (حدود و قیود، بندیاں) دی ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ حیوانِ ناطق ہے، بولنے والا حیوان ہے اب یہ بھی غلط ہوئی کیونکہ طوطا بھی بولتا ہے، انہوں نے اس کو Cooking Animal (پکانے والا حیوان)

① وہ خدا ہر شے کا خالق ہے۔ اس کے عمل تخلیق کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ہر چیز کی پیدائش اس کے نقطہ آغاز سے کرتا ہے۔ پھر اسے مختلف ارتقائی مراحل سے اس طرح گزارتا ہے کہ غیر ضروری عناصر اس سے چھٹ کر الگ ہوتے جاتے ہیں تا آنکہ وہ ایک خاص صورت (Form) اختیار کر لیتی ہے جو اسے دیگر اشیاء سے متمیز کر دیتی ہے (اس مرحلہ پر تم کہتے ہو کہ وہ شے وجود میں آ گئی)۔ یہ چند ایک صفات ہیں ذاتِ خداوندی کی جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ورنہ تمام صفات اپنی حسین ترین اور مکمل ترین شکل میں اس کی ذات میں مجتمع ہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص 1301)۔

بھی کہا۔ ایک Definition (تعریف) یہ ہے کہ یہ Instruments (اوزار) بنا سکتا ہے۔ یہ بڑی خصوصیت ہے۔ بندر اوپر دیکھے کہ بڑا اچھا اخروٹ لگا ہوا ہے اگر وہ چھلانگ لگا کر اوپر نہیں پہنچ سکتا تو بیکار ہے۔ اگر انسان کا چھوٹا سا بچہ بھی اُس اخروٹ کو دیکھے ”تے او جھانگا اٹھا کے لے اوند اے۔ جے کتھے بندر نوں جھانگے بنزانے آ جانڈے تے پوچھو نہیں کہ تہانوں کتھے کتھے جنگ دیندا“۔^① یہ جو انسان کے اندر تخلیق کی قوت ہے یہ اُس کی ان صلاحیتوں کے استعمال کے دائرے کو بڑا لامنتہی بنا دیتی ہے کہ وہ چاند تک پہنچ گیا ہے۔ اور یہ جس قدر بھی Instruments (اوزار) ہیں اور یہ جسے آپ اسلحہ کہہ لیجیے یہ سارے کا سارا یہی بنا سکتا ہے۔ آپ سوچیے کہ حیوان ہو اور حیوانیت کی جو اُس کے اندر صلاحیتیں ہیں وہ لامنتہا ہو جائیں تو پھر ظہر الفساد فی البرّ و البحر (30:41) خشکی اور تری سب میں فساد ہی فساد رونما ہو جائے گا۔ وہ تو باہر کی مخلوق میں اس لیے فساد نہیں ہوتا کہ ان کا دائرہ محدود ہے وہ اُس سے آگے نہیں جاسکتے۔

وحی کی روشنی کے بغیر انسانی صلاحیتوں کا استعمال سراپا جہنم کو جنم دیتا ہے
عزیزانِ من! سوچیے کہ صلاحیتیں وہ دی ہوئی ہوں اور ہو حیوانی سطح کے اوپر اور وسعتیں اتنی زیادہ لا انتہا ہو چکی ہوئی ہوں تو پھر وہ کیا ہوتا ہے؟ وہ مولانا رومی (1207-1273AD) نے ٹھیک کہا تھا:

حرکت از ما کمتر از فرعون نیست

ہم میں سے کوئی بھی فرعون سے کم نہیں ہے لیکن

لیک اورا عون مارا عون نیست

اُس کے پاس ساز و سامان تھا اور ہمارے پاس ساز و سامان نہیں ہوتا، ورنہ ہم میں سے ہر ایک فرعون ہوتا۔ ہم میں سے ہر ایک حیوان ہو اور حیوانات کی وسعتیں اتنی زیادہ ہوں کہ شیر کیا چیر پھاڑ کرے گا جو آپ کا ایک ایٹم بم کرتا ہے۔

انسان کے اندر حیوانی جبلتوں کی تفصیل اور ان کے اثرات

قرآن نے کہا کہ وہ جو حیوانات کی جبلتیں (Instincts) ہیں ان کی طبعی زندگی کے اندر وہ ساری موجود ہیں۔ یہ جو مفکرین ہیں یا جو سائیکولوجسٹ ہیں انہوں نے بھی انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: (1) Self Preservation یعنی تحفظ خویش اپنے آپ کو محفوظ رکھنا؛ (2) Self Aggression یعنی دوسرے پر غالب آ جانے کا جذبہ یہ اصل میں پہلے ہی جذبے کے لیے ہے

① وہ (درختوں سے پتے اور پھل وغیرہ) جھاڑنے والا ایک ڈنڈا اٹھا کر لے آتا ہے۔ اگر بندر کو بھی کہیں یہ جھاڑنے والے ڈنڈے بنانے آ جاتے تو پوچھو نہیں کہ وہ کہاں کہاں آپ کو لٹکا دیتا۔

اور (3) Self Procreation یعنی اپنی نسل بڑھانے کا جذبہ۔ یہ تین Basic Instincts (بنیادی جبلتیں) ہیں جو حیوانات کے اندر ہوتی ہیں۔ ہر حیوان میں یہ ہوتی ہیں۔ وہ جو مرغی کا چوزہ ماں کے نیچے پناہ لینے کو بھاگتا ہے تو وہ Self Preservation^① ہے۔ وہ جو بلی چوزے کے اوپر جھپٹتی ہے تو وہ Self Aggression^② ہے۔ اور Self Procreation^③ تو پھر سارے حیوانات کے اندر ہے۔

انسان کے لیے حیوانی جبلتوں کو کنٹرول کرنے کی خاطر وحی کے کنٹرول کی ضرورت

قرآن نے کہا کہ انسان کی جو طبعی زندگی ہے وہ حیوان کی زندگی ہے۔ اس کے اندر بھی یہ Instincts (جبلتیں) ہیں لیکن اس کی کیونکہ قوتیں لامنتہا ہیں اس لیے اس کو اگر علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو پھر یہ جس قسم کا حیوان بنتا ہے وہ تو تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ جس قسم کا یہ درندہ بنتا ہے شیر کیا بنتا ہوگا، جس قسم کا یہ اڑدھا بنتا ہے اڑدھا کیا بنے گا۔ اُس نے کہا کہ اس لیے ضرورت تھی کہ اس کے اوپر کوئی حد باندھ دی جائے اس کی کوئی Limit (حد) مقرر کر دی جائے تاکہ اس حد سے آگے اس کو Exercise (نافذ) نہ کرے یا اس حد کے مخالف کچھ Exercise (نافذ) نہ کرے۔ یہ ہے جس کو وحی کہتے ہیں جس کو آپ Values (اقدار) کہتے ہیں۔ اس لیے انسانوں کی طرف وحی کی ضرورت پڑی کیونکہ یہ اقدار اس کے اندر فطرت کی صورت میں داخل نہیں ہیں۔ حیوان تھا Exercise (مشتق) کرنے کی قوتیں لامحدود تھیں۔ اس لیے اگر یہ اپنے آپ کو وحی کی اقدار کا پابند نہ بنائے تو انسان یہ کچھ کرے گا جو ابھی میں نے بتایا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے؟ یہ تصور کہ انسانی فطرت ہے یہ تصور کہ اسلام دین فطرت ہے یہ تصور کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت پہ پیدا کیا ہے یہ بالکل باطل ہے اور اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے لیکن پھر بھی یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے۔

نوع انسانی کے متعلق خدا کی مشیت

فطرت کا تقاضا تو یہ بھی ہے کہ ہر نوع ایک جیسی ہوتی ہے مثلاً بکری ایک نوع ہے اور انسان بھی ایک نوع ہے۔ انسان کے متعلق تو قرآن نے کہہ دیا کہ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ (11:118) ہماری مشیت ہوتی تو ہم انسانوں کے اندر بھی فطرت رکھ دیتے کہ وہ ساری نوع بکریوں کی طرح ایک جیسی ہوتی۔ کہا کہ اگر ہماری

① تحفظ خویش

② تغلب خویش

③ تولید خویش

مشیت ہوتی تو ہمارے لیے ایسا کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ حیوانات کی زنجیر چلی آ رہی تھی، وہ ارتقائی منزل سے یہاں تک پہنچا تھا تو یہ بیچ میں ہم نہ لیتے اور اسی طرح سے اس کو پیدا کر دیتے تو یہ ایک نوع اسی طرح سے ہوتی جیسے یہ بھیڑیے یا بکریاں یا شیر وغیرہ ہوتے ہیں لیکن ہماری مشیت یہ نہیں تھی۔ اسی لیے اور تو اور نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ تم جو زبردستی ان کو ایک جیسا بنانا چاہتے ہو، کہا کہ یہ ایک جیسے اگر بنیں تو اپنی رضا مندی سے۔ اختیار و ارادہ کا جذبہ جو اندر ہے اُس کی تسکین بھی ہو جائے اور ایک جیسے بھی بن جائیں۔ یہ تو ایک ہے کہ یہ سارے کے سارے ایک نصب العین سامنے رکھیں، ہم نے جو Values (اقدار) دی ہیں ان کے مطابق زندگی بسر کریں تو یہ امت واحدہ بن جائیں گے۔ لیکن اگر آپ چاہیں کہ ان کو مار مار کر مسلمان بنایا جائے تو رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے کہ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلَّهُمْ جَمِيعًا (10:99) ہماری مشیت ہوتی تو انسان کو ہم پیدا ہی ایسا کرتے جسے تم مسلمان کہتے ہو۔ أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (10:99) تو وہ تو سارے مومن نہیں ہیں تو کیا تو ڈنڈے کے زور پہ ان کو مومن بنانا چاہتا ہے؟ اگر ایسا زبردستی کرنا ہوتا تو زبردستی تو ہمارے جیسی کوئی بھی نہ کر سکتا اور ہم ان کو پیدا ہی ایسا کرتے۔ خواہ آپ اس کو مومن ہی کیوں نہ کہہ لیں لیکن وہ حیوان کے درجے پہ ہوتے، انسان نہیں ہوتے، ہر حیوان مومن ہوتا ہے ان میں کوئی کافر نہیں ہوتا لیکن خدا نے ان کو کیوں مومن نہیں کہا؟ اس لیے کہ وہ اپنی مرضی سے ایمان نہیں لائے ہوئے ہوتے، وہ ایمان کے اوپر مجبور ہوتے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے انسان کے اندر فطرت نہیں رکھی، اسے خود ہی مومن یا کافر بننا ہوتا ہے

عزیزانِ من! قرآن ہے اور خدا بول رہا ہے، رسول سے کہا جا رہا ہے۔ مومن وہ ہے کہ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ^① (18:29)۔ مومن تو ایک طرف، وہ کہتے ہیں کہ کافر بھی کوئی نہیں ہوتا جب تک اپنی مرضی سے کافر نہ بنے۔ پیدائش کے اعتبار سے نہ تو کوئی مومن پیدا ہوتا ہے نہ کافر پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی انسانیت کی خصوصیت ہوگئی جو حیوان کو حاصل نہیں ہے۔ اور یہیں سے یہ وحی کا ارشاد خداوندی کا، رشد و ہدایت کا، غلط اور صحیح کا، کفر اور ایمان کا سارا سلسلہ ہے۔ یہ دو راستے ہیں: هَذَيْنِ السَّبِيلَيْنِ (90:10) ہم نے دونوں راستے دکھا دیئے ہیں۔ دکھانے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ اس کو اختیار تھا کہ جس طرح جی چاہے یہ حیوانی Instinct (جبلت) کو استعمال کرے۔ اختیار کو زبردستی دیا یا نہیں جاسکتا کہ اس کو مجبور کر دیا جائے کہ اسی راستے کے اوپر چلو۔ ایسا ہوتا تو پھر یہ حیوان کے درجے پر ہوتا، یہ مومن نہ ہوتا۔ اس کو حیوان کی سطح کے اوپر پیدا کیا، اور صلاحیتوں کے استعمال

① جس کا جی چاہے اس (الحق: ضابطہ حق و صداقت) پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے (پرویز: مفہوم القرآن ص-665)۔

کا دائرہ بے حد وسیع قرار دیا۔ اس سے فساد کا اندیشہ تھا اسی لیے کہ انسان خود اپنے طور پر صحیح اور غلط راستے تجویز نہیں کر سکتا، یہ اپنے طور پر تو حیوانی سطح پر ہوتا ہے اور وہ جو حیوانات کی جبلتیں ہیں وہ ساری اس کے اندر ہوتی ہیں اور انہی کو وہ Exercise (نافذ) کرتا ہے یعنی Self Preservation (تحفظِ خویش) ہوتا ہے افراد میں جو زیادہ طاقت والا ہوتا ہے وہ دوسرے کا گلا گھونٹتا ہے، یہ Self Aggression (جذبہ تغلب) ہے۔ قوموں کے اندر یہ جتنی بھی بڑی بڑی جنگیں ہو رہی ہیں، یہ تحفظِ خویش ہے۔ یہ چیونٹی کو بھی ہوتی ہے اُس کے سامنے ذرا سا تنکا رکھیے تو آپ دیکھیے کہ وہ اس سے کیا کچھ جنگ کرتی ہے اور راستہ موڑ کر چلی جاتی ہے۔ وحی نے آ کر بتایا کہ اگرچہ تحفظِ خویش بڑا ضروری ہے، لیکن جو شخص کسی ایک جان کو بھی ناجائز طور پر ہلاک کر دے گا تو یوں سمجھو کہ جیسے اس نے ساری نوعِ انسانی کو ہلاک کر دیا۔

انسان کے لیے شرفِ انسانیت کا معیار

اسی انسان کو کہا کہ جب انسانیت کا تحفظ خطرے میں پڑ جائے تو اپنی جان اور زندگی کو محفوظ رکھنا شرفِ انسانیت نہیں ہے بلکہ انسانیت کے تحفظ کے لیے جو جان دیدینا ہے، یہ حیاتِ جاوید عطا کر دیتا ہے اور اسے شہید کہتے ہیں۔ یہ شہادت کسی حیوان کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ اُسے شہادت کیا نصیب ہوگی حیوان تو خود کشی بھی نہیں کر سکتا، اسے تحفظِ خویش کے خلاف جانے کا اختیار ہی نہیں ہے۔ لیکن انسان کو اختیار ہے۔ یہ جذبہ تحفظِ خویش پورا ہوتا چلا جاتا ہے جب تک یہ انسانیت کے نقصان میں نہ رہے۔ اور جب یہ مرحلہ آجائے تو اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

قرآن کہتا ہے کہ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ (2:154) جو ان مقاصد کے لیے اپنی جان دیدیتے ہیں ان کو مردہ مت کہو۔ مردہ تو وہ ہوتا ہے جو طبعی طور پر مر جاتا ہے۔ یہ ایک مقصد کے حصول کی خاطر اختیار و ارادہ سے اپنی جان دے رہا ہے اس کو مردہ نہیں کہتے۔ مردہ تو بلا اختیار مر جانے والے کو کہتے ہیں آخری سانس تک وہ بھی اور اُس کے لواحقین بھی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کسی طرح زندہ رہے۔ یہ جو Struggle for Life (جدوجہد برائے زندگی) ہو رہی ہے وہ بھی ٹھیک ہے لیکن یہ تو حیوانیت کا مقام ہے۔ انسانیت کا مقام یہ ہے کہ جب غلط اور صحیح کے اندر Tie (تصادم) پڑ جائے تو وہ غلط اور صحیح کا معیار ہی وہ قرار دے جو قرآن نے دیا ہے کہ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَمَا بَالُ الْأَرْضِ (13:17) بقا اُس عمل کے لیے ہے جو نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہو۔ اپنا تحفظ تو ہر ایک چاہتا ہے، اپنے گروہ کا تحفظ بھی ہر

ایک چاہتا ہے، اپنی قوم کا تحفظ بھی ہر ایک چاہتا ہے۔ اُس نے کہا کہ اگر یہ تحفظات ہونے ہیں تو تم میں ٹکراؤ ہو جائے گا۔ کوئی حیوان اس مقصد کے لیے اپنی توانائی، اپنی خصوصیت، اپنی Instinct (جبلت) کو استعمال نہیں کرتا۔ اگر انسان کو بھی جیسا کہ اُس نے کہا ہے، اسی کے حال پہ چھوڑ دیا جائے تو اس کی بھی یہی کیفیت ہے کہ شیر کی طرح ہر ایک کو چیر پھاڑتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ جب شیر کی بھوک مٹ جاتی ہے تو وہ باقی چھوڑ دیتا ہے اور وہ دوسرے بھوکے کھا لیتے ہیں لیکن اس کو ہلوعاً (70:19) کہا ہے کہ اس کجخت کا پیٹ بھرتا ہی نہیں ہے۔

انسانوں کی دنیا میں جنگ و جدل کی وجہ جواز

دنیا میں یہ قیامت کیوں برپا ہے؟ یہ اس قدر جہنم کیوں برپا ہے؟ اس لیے کہ انسان نما حیوانوں کو ان کے Instinct (جبلت) کے اوپر ان کی فطرت کی اوپر چھوڑ دیا گیا ہے اور ان کی جو وسعتیں ہیں وہ لامنتہا ہو چکی ہوئی ہیں۔ جیسا میں نے عرض کیا کہ حیوان کے اوپر پھر بھی وہ کچھ پابندیاں عائد ہوئی ہوتی ہیں کہ جب پیٹ بھر جاتا ہے تو باقی چھوڑ دیتا ہے۔ ہمارے ہاں کے جو بیل ہوتے ہیں وہ چارہ کتنا ہی کیوں نہ ہو لیکن کھانے کے بعد جب ان کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ سارا وہیں پڑا ہوا ہوتا ہے اور وہ بیل بیٹھ جاتا ہے اور بڑے مزے سے جگالی کرتا ہے، اُسے اس کی فکر ہی نہیں ہوتی کہ وہ چارہ کوئی دوسرا کھا رہا ہے۔ یہ انسان ہے کہ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَدَهُ (104:2) ضرورت پوری ہوتی ہے تو پھر جمع کرنا شروع کر دیتا ہے پھر نانوے کے پھیر میں پڑتا ہے، بینک بیلنس گنتا ہے اور اس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہوتی۔ ہر حیوان کو پتہ ہے کہ میرے لیے کیا مفید ہے اور کیا نقصان دہ ہے۔ بطخ کے چوزوں کو معلوم ہے کہ میرے لیے پانی حلال ہے اور مرغی کے چوزوں کو پتہ ہے کہ ہمارے لیے خشکی پہ رہنا حلال ہے۔ ان کے اندر خیر و شر کی تمیز رکھ دی گئی ہے۔

خیر و شر کے تصور کی حقیقت اور انسان کے نزدیک اس کا مختلف تصور

جب آپ یہ تصور کر لیں کہ انسان کی بھی ایک فطرت ہے اور فطرت بھی وہ جو خدا کی خصوصیت ہے تو اس کا اگلا قدم تو لازمی یہ ہو گیا کہ پھر خیر اور شر کی تمیز تو ان کے اندر ہونی چاہیے۔ ہمارے ہاں یہ بھی عقیدہ ہے کہ خیر اور شر کی تمیز انسان کے اندر ہے، یہ خیر اور شر کو فطرتاً پہچانتا ہے۔ ان کو تو چھوڑ دیجیے جو خیر کو مانتے ہی نہیں ہیں، جو دنیا میں خیر (Good) کو ماننے والے ہیں، ذرا دیکھیے تو سہی کہ ان کا خیر کا وہ تصور کیا ہے، وہ کیا ہے جسے Good & Evil (خیر و شر) کہتے ہیں۔ اگر یہ تصور انسان کے اندر ہے اور کوئی شے

Absolute (مطلق) خیر (Good) ہے تو ہر انسان کا وہی تصور ہونا چاہیے لیکن ایک انسان وہ ہے جو کیڑے مکوڑے کو مارنا بھی شر سمجھتا ہے، مسلمان کا بچہ اتنا سا ہی ہوتا ہے اور مزہ لے لے کر ہڈی کو چباتا ہے۔ اگر خیر اور شر کی تمیز اس کے اندر ہے تو دونوں جگہ ایک ہی چیز خیر ہونی چاہیے۔ یوں نہ کرنا خیر ہے تو ہر انسانی بچے میں یہ خیر ہونا چاہیے، اگر یہ شر ہے تو ہر ایک کو شر سمجھنا چاہیے۔ ٹھگوں کے ہاں جب تک ان کا جوان بیٹا کسی کو مار کر نہیں آتا تھا اُس کی شادی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اُس کو خیر سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کے ہاں جو کالی دیوی تھی، وہ جس کے گلے میں انسانی کھوپڑیوں کا ہار پڑا ہوا ہوتا ہے، ہاتھوں میں بھالے نیزے اور یہ کچھ پکڑا ہوا ہوتا ہے، وہ اُس دیوی کی پرستش کرتے تھے کہ ہمیں اس جیسا بننا ہے۔ یہ ان کے ہاں خیر کا مجسمہ ہوتا ہے^①۔ انسان تو خیر اور شر کے اندر تمیز ہی نہیں کر سکتا۔ یہ اضافی (Relative) ہوتا ہے۔ ان کے ہاں یہ خیر، ان کے ہاں کے اُس خیر سے مختلف ہوتا ہے۔ تو یہ جسے آپ مطلق خیر کہتے ہیں کہ خیر ہی ہو، وہ کسی جگہ بھی شر نہ ہو، بلکہ ہر جگہ خیر ہی ہو، تو انسان کا خود وضع کردہ تو ایک طرف، وہ اُسے پہچان بھی نہیں سکتا۔ اس کے ہاں تو وہ Relative (اضافی) ہوتا ہے جیسے کہ My Country, right or wrong جذبہ حب الوطنی کے ماتحت ان کے ہاں یہ خالص خیر (Absolute Good) ہے۔ اور یہ اتنا شر پیدا کرتا ہے کہ جب My Country, right or wrong ہو جائے تو پھر دوسری Country (ملک) کے خلاف جو کچھ کیا جائے وہ خیر ہو جائے گا۔

انسانی جذبات کی مختلف شاخیں

قرآن یہ کہتا ہے کہ تمہاری تو اپنی کیفیت یہ ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز درحقیقت شر (Evil) ہوتی ہے لیکن تم اُس کو خیر (Good) سمجھ کر اُس کے پیچھے لپکتے چلے جاتے ہو، نقصان اٹھاتے ہو تو پھر مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہو۔ ایک چیز واقعی خیر (Absolute Good) ہوتی ہے لیکن تم اُس کو دھتکار کر الگ ہو جاتے ہو۔ اندر کی پہچان تو ایک طرف، وہ تو کہتا ہے کہ انسان کی کیفیت یہ ہے کہ جو جذبات اس کے اوپر غالب آتے ہیں تو اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے۔ لہذا اُس نے کہا یہ ہے کہ جو انسانی جذبات ہیں وہ دراصل حیوانی زندگی کی جو جبلتیں ہیں انہیں انسانی جذبات کہا جاتا ہے مثلاً

① جو قارئین ان نکات کی مزید معلومات سے دل چسپی رکھتے ہیں ان کے لیے درج ذیل تین کتب بڑی ہی پرازمعلومات ہیں

(i) Rashdall, Hastings: The Theory of Good and Evil Vol.1 (1907)

(ii) Benedict, Ruth: Patterns of Culture (1935).

(iii) پرویز: انسان نے کیا سوچا؟ (زندگی کے اہم حقائق کے متعلق انسانی فکر کی کاوشیں) (1956)۔ باب سوم: اخلاقیات۔

جذبہ تحفظِ خویش، جذبہ تغلبِ خویش، جذبہ افزائشِ نسل۔ ان کی شاخیں بہت سی ہوں گی لیکن بنیادی طور پہ یہی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہی ہیں انسانی جذبات۔

تصوف کی دنیا میں انسانی جذبات کی تحقیر

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ ہمارے ہاں یہ جو تصوف سے تصور آیا کہ ساری برائیوں کی جو جڑ ہے وہ انسانی جذبات ہوتے ہیں، ان کو فنا کر دیا جائے تو یہ حقیقی مقصد ٹھہرا۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ فنا ہو ہی نہیں سکتے، وہ جو اتنے متوکل علی اللہ بن کر بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ہم میں ^① Preservation of Self کا جذبہ ہی نہیں ہے۔ فرق اتنا ہوتا ہے کہ وہ خود کما کر نہیں کھاتے ”دودن مرید نہ لان تے میاں صاحب نوں پتہ لگ جائے، جیہڑا بیٹھا ہوا کہندار ہندا اے کہ سانوں خدا کھلانا ہیگا“۔ ^② یہ اس طرح سے آپ کی طبعی زندگی ہے کہ آپ سانس لیتے ہیں، پانی پیتے ہیں۔ آپ ان تقاضوں کو ختم ہی نہیں کر سکتے، البتہ مرنے کے بعد پھر اس کی ضرورت نہیں رہتی۔ جب تک زندگی ہے آپ ان جذبات کو مار نہیں سکتے۔ لہذا وہ جو روحانیت کی طرف لے جانے والے اتنے دلکش تصورات ہیں وہ حقیقت میں سارے باطل ہیں۔

دوسری چیز سیکولر ازم کی آگئی کہ یہ اقدار اور حدود (Limits) کچھ ہیں ہی نہیں، انسان کے جو جذبات ہیں ان کی تسکین مقصدِ انسانی ہے، جس طرح سے جی چاہے تسکین کرتے چلے جائیں، جس طرح سے جی چاہے لوٹو، کھسوٹو، مارو۔ تغلبِ خویش ہے: بڑے بڑے ایٹم بم بنالو۔ یہ افزائشِ نسل جنسی تسکین کا ایک ذریعہ ہے جس طرح سے جی چاہے اس کو پورا کر لو۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ سب باطل ہے۔ **بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَهْوَاءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (30:29)** یہ جو فساد برپا ہوتا ہے وہ اس لیے ہوتا ہے کہ ہر انسان اپنے جذبات کو اپنی مرضی، اپنے مفاد، اپنی خواہش کے مطابق Satisfy (تسکین) کرنا چاہتا ہے، اس سے ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔ اُس نے یہ نہیں کہا کہ یہ اہو آءِ بڑی خراب چیز ہیں، یہ جذبات بڑی بُری چیز ہیں اور ان کو مار دو یا فنا کر دو بلکہ اُس نے کہا کہ **بِغَيْرِ عِلْمٍ (30:29)** اللہ کی طرف سے آئے ہوئے علم کے بغیر اگر ان کی تسکین کرتا ہے تو فساد ہوتا ہے، اُس کے مطابق کرتا ہے تو نفع ہی نفع ہوتا ہے۔ جذبات کی تسکین بھی ہوئی اور فساد بھی نہ پیدا ہوا۔

① تحفظِ خویش

② جو بیٹھا رہے یا یہ کہتا رہے کہ ہمیں خدا کھلاتا ہے، اگر ان میاں صاحب کو ان کے مرید دودن بھی نہ لاکر دیں تو انہیں آٹے دال کے بھاؤ کا پتہ چل جائے۔

عزیزانِ من! یہ ہے قرآن ورنہ آپ کسی روحانیت والے سے پوچھیے وہاں یہی چیز آپ کو ملے گی کہ سب سے پہلے نفس کشی ہو۔ یہ مرنے سے پہلے مرنے والی بات ہے۔ قرآن نہ تو ان جذبات کو بیباک سمجھ لیتا ہے اور نہ نفس کشی کی تعلیم دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ان کی تسکین ضروری ہے لیکن بِغَيْرِ عِلْمٍ نہ ہو۔ ان انسانی Instincts (جہتوں) کو ہدایتِ خداوندی کے تابع رکھو اور اس طرح سے پورا کرو تو اس سے فساد برپا نہیں ہوتا اور مقاصدِ حیات پورے ہوتے چلے جائیں گے۔

اب عزیزانِ من! اس تمہید کے بعد فُطِرَتِ اللّٰهُ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (30:30) آیت آئے گی لیکن میں نے عرض کیا تھا کہ ایک درس میں بات نہیں ہو سکتی۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



پانچواں باب: سورة الروم (آیات 28 تا 32)



عزیزانِ من! آج ستمبر 1979ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز یوں کیجیے کہ سورة الروم کی آیت 28 سے ہو رہا ہے: (30:28)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے درس میں ایک بنیادی نکتے کی تشریح کی گئی تھی اور وہ تھا اسی سورة کی آیت 30 کے حوالے سے جس میں کہا گیا ہے کہ فَطَرَتِ اللّٰهُ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (30:30)۔ جو کچھ کہا گیا تھا اُس کا لُحْص یہ تھا کہ جو تصورات اور نظریات ہمارے ہاں رائج ہیں وہ یہ ہیں کہ انسان کی فطرت ہے یا Human Nature ہے اور پھر اس سے آگے یہ کہ انسان کو اللہ نے اپنی فطرت پہ پیدا کیا اور اس سے اگلا قدم یہ کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور پھر آگے یہ کہ اگر انسانی بچے کو اس کے حال پہ چھوڑ دیا جائے تو جیسا کچھ وہ بنے گا وہ اسلام کا مجسمہ ہوگا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تمام تصورات انسانی ذہن کی تخلیق ہیں اور اسلام میں یہ دوسروں سے مستعار لیے گئے ہیں یہ قرآن کی تعلیم کے بنیادی طور پر خلاف ہیں۔ یہ بات پچھلے درس میں آچکی تھی اور میرا خیال ہے کہ آپ نے جس جذب و انہماک سے اسے سنا تھا اس سے یہ آپ کے ذہن میں محفوظ ہونا چاہیے۔ آج بات اسی سے آگے چلتی

ہے۔ اصل میں اس آیت تک پہنچنے کے لیے یہ تمہید ضروری تھی۔ اُس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ فَاقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ط فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ط لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ط ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ① (30:30)۔ یہ سارا کچھ وہی ہے جو پہلے کہا گیا ہے کہ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ: یہ ہے دینِ قیَمِ یہ ہے نظامِ زندگی۔

لفظ 'قائم' کا قرآنی مفہوم: اس طرح کھڑے ہو جانا کہ اس میں کسی قسم کی لڑکھڑاہٹ پیدا نہ ہو

اب لفظ قَيِّمُ آیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ان عربوں کی خصوصیت کبرِیٰ یہ ہے کہ ان کی زبان کا تو پوچھو نہیں کہ وہ شہنشاہِ واقع ہوئے تھے۔ قام کے ویسے تو معنی کھڑے ہونا ہیں لیکن ان کی نگاہ دیکھیے کہاں جاتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہی چیز کھڑی رہ سکتی ہے جس کا توازن برقرار رہے۔ اگر ذرا سا توازن بگڑے تو کوئی شے تو رہی ایک طرف انسان بھی کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اس لیے انہوں نے اس کے اندر یہ چیز رکھی کہ جس چیز کا صحیح توازن ہو اُسے قیَمِ یا قائم کہا جاسکتا ہے: متوازن، متناسب، معتدل، صحیح Proportion کو لیے ہوئے اس طرح کا صحیح Proportion (تناسب) کہ وہ اُس کو کھڑا کر دے۔ اب یہیں سے آگے وہ بڑھے تو میں نے کہا ہے کہ ان کے ہاں زبان میں ”باب“ ہیں۔ اب اُس میں خدا کے لیے قیوم کا لفظ ہے۔ اب اس ”باب“ کے اوپر جو لفظ آئے گا تو اس میں اس ”باب“ کی خصوصیات آئیں گی۔ اس ”باب“ کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ ”وہ جو اپنی ذات میں کھڑا ہو، قائم ہو اور کسی کا محتاج نہ ہو اور ہر شے اُس کی وجہ سے قائم رہ سکے“۔ اب اس ایک لفظ میں دونوں چیزیں آگئیں۔ قیَمِ کے معنی متوازن، متناسب، اپنے آپ میں قائم رہنے والا لیکن خدا کے سہارے کے ساتھ: ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (30:30) یہ ہے دینِ قیَمِ۔ اب قیَمِ کے تو معنی آپ سمجھ گئے۔ اب اسی مادے سے قَائِمُ ہے کہ نہایت اعتدال کے ساتھ جم کر کھڑے ہو جاؤ، لغزش نہ ہو آپ کے اندر لڑکھڑاہٹ نہ پیدا ہو۔ فَاقِمْ وَجْهَكَ (30:30) اپنی تمام توجہات کو مرکوز رکھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ توجہات کو مرکوز رکھنا تو کھڑے ہونے کے لیے ضروری ہے، ذرا سا دھیان آپ کا بٹے تو آپ لڑکھڑا جاتے ہیں: ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (30:30) یہ ہے دینِ قیَمِ۔ وہ دین کیا ہے جس کے متعلق یہاں یہ کہا؟ یہ وہ ہے جو پیچھے سے چلا آ رہا تھا۔ بھجلی آٹھ دس پندرہ آیات سے یہ بات چلی آ رہی تھی۔ کہا یہ جارہا تھا کہ وَمِنْ آيَاتِهِ اُس کی آیات میں سے یہ چیزیں نشانیاں ہیں۔ کسی حقیقت تک پہنچنے کے لیے جو علامات Symbols یا نشانیاں ہوتی ہیں انہیں آیات کہا جاتا ہے۔ یہ نشانیاں ہیں، یہ Symbols ہیں، سب مل ہیں، نشانیاں راہ ہیں۔ کیا بات ہے لفظِ آیات کی!

① صحیح روشِ زندگی یہ ہے کہ تُو ان تمام غلط راہوں سے منہ موڑ کر اپنی تمام توجہات کو اُس نظامِ زندگی پر مرکوز کر دے جو خدا کے تخلیقی قانون کا تقاضا ہے۔..... یہی وہ نظامِ زندگی ہے جو نہایت محکم اور تمام نوعِ انسان میں صحیح توازن قائم رکھنے کا موجب ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 37-936)۔

کائنات کے اندر قدم قدم پر بکھری ہوئی نشانیاں دعوتِ غور و فکر دیتی ہیں

وہ سبگ میل کیا ہیں اور کس چیز تک پہنچنے کے لیے ہیں؟ کہا کہ وہ الدین القیم تک پہنچنے کے لیے ہیں۔ وہ نشانیاں تسخیرِ ارض و سما، نکو پرشس و قمر، اختلافِ لیل و نہار، تصریفِ خزاں و بہار ہیں۔ یہ سب کچھ ایک محکمِ قیم نظام تک پہنچنے کے لیے نشانیاں ہیں۔ ان میں ایک ہی چیز قدر مشترک ہے کہ یہ سب قوانین کے تابع زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ یونہی وجود میں نہیں آگئے یا یونہی یہ کارگر کائنات نہیں چل رہا۔ نہ تو یہ بائی چانس وجود میں آیا ہے اور نہ ہی یہ یونہی الہی چل رہا ہے۔ یہ ایک نظم کے تابع ہے ایک قاعدے قانون کے تابع ہے۔ یہ جو کائنات میں اس قدر نظم و نسق دیکھ رہے ہو تو یہ قانون کے اتباع کا نتیجہ ہے۔ پہلی چیز تو یہ بتائی گئی کہ جسے ہم نے کائنات کا نظام کہا ہے اس میں ایک حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں۔ پہلی چیز اُس میں یہ ہے کہ ہر شے قانون کے تابع زندگی بسر کر رہی ہے کسی میں مجالِ انکار نہیں، یا رہ سرکشی نہیں۔ اور اسی سے یہ سارا سلسلہ کائنات اس حسن و خوبی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ دوسری چیز اُس نے یہ بھی کہی تھی کہ **هُوَ الَّذِي يَبْدُؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ** (30:27)۔ یہ کوئی جامد شے نہیں ہے کہ ایک دفعہ وجود میں آگئی اور پھر وہ وہیں ٹکی ہوئی ہے۔ کائنات میں Evolution یعنی ارتقا کا سلسلہ جاری ہے۔ ابتدا میں کوئی شے بھی ہو اُس کا جوابدائی ہیوٹی ہوتا ہے وہ غیر نشوونما یافتہ شکل میں ہوتا ہے ابتدائی فارم میں ہوتا ہے پھر وہ گردشیں دلاتا ہوا، اُسے ارتقا کی منازل سے گزارتا ہوا، حشو و زوائد کو الگ کرتا ہوا، ایک فارم میں لاتا ہوا، اُس شکل تک لے آتا ہے۔ اس دینِ قیم کی دوسری چیز یہ بتائی کہ یہ کائنات قانون کے تابع ہے اور ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔

یہ ارض و سما قانونِ خداوندی کے تابع ایک پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہیں

اگلی بات اُس نے یہ بھی کہ **لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط كُلُّ لَّهُ قٰنُنُوْنَ** (30:26)۔ یہ بڑی چیز ہے۔ یہ اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے سب ڈھانچے جو کچھ کر رہے ہیں، جس طرح سے یہ چل رہے ہیں، یہ اپنے کسی مقصد کی تکمیل یا حصول کے لیے نہیں کر رہے بلکہ یہ خدا کے متعین فرمودہ پروگرام کی تکمیل کے لیے ایسا کر رہے ہیں۔ یہ قانتون ہیں یعنی یہ اپنی توانائیاں بے جا صرف نہیں کرتے، سنبھال کر رکھتے ہیں، Preserve (محفوظ) رکھتے ہیں، جہاں کہا جاتا ہے وہاں صرف کرتے

① خدا اپنے قانون کی رو سے ہر شے کی تخلیق (پیدائش) کی ابتدا کرتا ہے۔ پھر اسے مختلف گردشیں دیتا ہوا، اس منزل کی طرف لے جاتا ہے جو اس کے لیے مقرر کر دی گئی ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 935)۔

ہیں، جتنا صرف کرنے کو کہتے ہیں اتنی ہی صرف کرتے ہیں، باقی یہ سنبھال کر رکھ لیتے ہیں۔ یہ تیسری چیز آگئی۔ ذہن میں رکھیے گا کہ یہ ہے دینِ قیم۔

اب درمیان میں ایک آیت جو ہم نے چھوڑ دی تھی، میں اُسے لیتا ہوں۔ کہا کہ ضَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِّنْ أَنْفُسِكُمْ ط هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَاءَ فِيْ مَا رَزَقْنَكُمْ فَأَنْتُمْ فِيْهِ سَوَاءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيفَتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ ط كَذَلِكَ نَفْصِلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ① (30:28)۔ یہ ابتدائی دور کے تصورات کہ کائنات کے یہ جو عناصر ہیں، بجلی ہے، بادل ہیں، دریا ہیں، پہاڑ ہیں، سمندر ہیں، درخت ہیں، یہ دیوی دیوتا ہیں، یہ بڑی بڑی قوتوں کے مالک ہیں، ان کے سامنے جھکنا چاہیے، انہیں معبود بنالینا چاہیے، یعنی یہ کائنات کہ جس کو تمہارے لیے مسخو لکم مسخر کر رکھا ہے اُس کے متعلق یہ تصور کہ ہم ان کے سامنے جھکنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں یہ ہمارے معبود ہیں۔ قرآن نے کہا کہ بنیادی طور پر یہ تصور غلط ہے۔ یہ خدا کی دی ہوئی طاقتیں ہیں۔

دورِ جہالت میں انسانی سوچ کی کیفیت

اُس زمانے میں تو ان لوگوں نے جہالت کی بنا پر ان چیزوں کے متعلق کہا تھا، وہ اپنے دیوی دیوتاؤں کے متعلق یہ نہیں کہتے تھے کہ یہ خود خدا ہیں، کہتے یہ تھے کہ خدا نے اپنے اقتدارات اور اختیارات کو انہیں سونپ رکھا ہے، انہیں تفویض کر رکھا ہے، Delegate (تفویض) کر رکھا ہے۔ آج کے دور کا انسان جو بڑا خدا پرست کہلاتا ہے، اسلامی مملکت بنانے کے دعوے کر رہا ہے اور اُس کا جو منشور ہے، اُس کا جو آئین ہے اُس کے اندر یہ لکھا ہوا ہے کہ خدا نے جو Powers (اختیارات) ہمیں Delegate (تفویض) کی ہیں، ہم ان کو Exercise (استعمال) کرتے ہیں۔ Delegate (تفویض) کا یہ لفظ تو انگریزی جاننے والے جانتے ہی ہیں کہ کوئی Powers (اختیارات) جو کوئی افسر، کسی دوسرے کو Delegate (تفویض) کر دیتا ہے تو وہ اُس وقت کے لیے اُس کے پاس تو نہیں رہتیں۔ وہ افسر اپنے آپ کو ان Powers (اختیارات) سے مبرا کر لیتا ہے، دوسرے کو دیدیتا

① ہم اس کے لیے خود تمہاری اپنی مثال پیش کرتے ہیں۔ تمہارے ہاں وہ لوگ بھی ہیں جو تمہارے ماتحت کام کرتے ہیں۔ تمہارے ملازم وغیرہ۔ کیا تم ایسا کرتے ہو کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے انہیں اس طرح شریک کر لو کہ وہ اور تم ہر طرح سے برابر برابر ہو جاؤ اور پھر تم ان سے اس طرح ڈرنے لگ جاؤ جس طرح تم اپنے برابر کے لوگوں سے ڈرتے ہو۔ (سو جب یہ لوگ تمہارے زیر فرمان کام کرتے ہیں، تمہارے جیسے انسان ہونے کے باوجود تمہارے ہمسر نہیں ہو سکتے اور تم ان سے کبھی خائف نہیں ہوتے تو کائنات کی مخلوق خواہ وہ کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو، اس خدا کے برابر کس طرح ہو سکتی ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور وہ اس کے قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے)۔ ہم اس طرح اپنے قوانین و حقائق کھول کر بیان کرتے ہیں اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو عقل و فکر سے کام لیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص 936)۔

ہے۔ یہ کیا چیز ہے کہ یہ Powers Delegated (تفویض کردہ اختیارات) کا تصور آگیا؟

مذہبی پیشوائیت کی سیاست و ملوکیت کے ساتھ گٹھ جوڑ کی داستان روزِ اول سے چلی آرہی ہے عزیزانِ من! یہ چیزیں بڑے گہرے تسلسل کی محتاج ہوتی ہیں کہ یہ بات چلی کہاں سے تھی؟ وہ جو انگلیٹنڈ کا چرچ تھا اس نے اپنا بادشاہ بنایا، وہ تو مذہبی پیشوائیت کا اور سیاست و ملوکیت کا گٹھ جوڑ ہوتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت نے یہ کہا کہ یہ بادشاہ جو کچھ کرتے ہیں، جو احکام نافذ کرتے ہیں، کسی کو قتل کرتے ہیں، تو یہ خود نہیں کرتے بلکہ خدا نے اپنے جو Divine Rights (خدائی اختیارات) ان کو دے رکھے ہیں، یہ تو صرف ان اختیارات کو نافذ کرتے ہیں۔ آپ کے ہاں السلطان ظل اللہ علی الارض کا تصور آیا کہ سلطان اس زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ زمانے کی گردشوں نے ان تصورات کو مٹایا۔ یورپ نے ان کے خلاف کروٹ لی تو چونکہ جو Extreme (انتہا) ہے وہ تشدد ہوتی ہے، اس کا ردِ عمل بھی تشدد ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ خدا کے اختیارات ہیں۔ ہم تو خدا کے وجود کو ہی نہیں مانتے۔ یعنی جو کمشنر کو نہیں مانتا تو ڈپٹی کمشنر کو کیا مانے گا۔ یہ جو یورپ کی سیکولر ازم ہے یہ وہ چیز ہے۔ یہ اُس کے خلاف ردِ عمل ہے۔ وہ جو السلطان ظل اللہ علی الارض والی بات تھی تو انہوں نے کہا کہ اس سے بھی کچھ شرم سی آتی ہے۔ انہوں نے الفاظ بدل دیئے۔ اِنْ هِيَ اِلَّا اَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَاٰبَاؤُكُمْ^① (53:23) کچھ الفاظ ہیں جو تم بدل دیتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ یہ The Powers Delegated by God.^② ہے۔ یہ Divine Rights (خدائی اختیارات) نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ جو خدا کا سایہ کہا تھا تو چلو یہ تھا کہ خدا تو موجود ہے، یہ اُس کا سایہ ہیں لیکن انہوں نے کہا کہ یہ تو بغیر اختیارات کے بیٹھا ہے، سارے اختیارات تو اُس نے ہمیں Delegate (تفویض) کر دیئے ہیں۔ تو یہ اس موجودہ دورِ مہذب میں آپ کے ہاں وہی تصور چلا آتا ہے:

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدمِ جواں ہیں لات و منات

(اقبال: ضربِ کلیم)

کبھی کسی کا ذہن اس طرف نہیں گیا۔

① یاد رکھو! ان دیوی دیوتاؤں اور بتوں کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اسلاف نے رکھ چھوڑے ہیں (7:71)

(پرویز: مفہوم القرآن، ص-1241)۔

② یہ خدا کے تفویض کردہ اختیارات ہیں۔

مملکت اسلامیہ کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کی ایک گہری سازش

عزیزانِ من! میں کبھی ”میں“ درمیان میں نہیں لایا کرتا لیکن بعض اوقات ناگزیر ہو جاتا ہے۔ آپ طلوع اسلام اٹھا کر دیکھیے۔ پہلی دفعہ جب انہوں نے یہاں یہ آئین بنایا ہے اُس کے اندر ان لوگوں نے خدائی اختیارات کے تفویض کرنے کا یہ تصور داخل کیا ہے اور میں جانتا تھا کہ یہ کون کر رہا ہے۔ آگے یہ بات آتی تھی کہ صاحب! اسلام ان لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے جنہیں آپ حاکم بنا رہے ہیں، یہ تو ہم ہیں جو اسلام کو جانتے ہیں۔ یہ ہے مذہبی پیشوائیت۔ یعنی انہوں نے یہاں پہنچنا تھا کہ یہ خدائی اختیارات ہیں جو اس مملکت کو حاصل ہیں اور مملکت اسلام کے لیے بنائی گئی ہے اور اسلام کے اجارہ دار مدعی دین ہم ہیں اس لیے یہ ہمیں دیجیے۔ یہ اپنے قوانین کو خدا کے قوانین بنا کر نافذ کرنا تھا۔ تو وہیں بات چلی گئی۔ بڑی دور رس سازشیں ہوتی ہیں۔ جونہی انہوں نے آئین کا پہلا ڈرافٹ کیا اور اُس میں یہ چیز آئی تو آپ اُس دور کا پہلا یا دوسرا طلوع اسلام اٹھا کر دیکھ ^① لیجیے۔ میں نے اس کی بھرپور مخالفت کی اور ان سے کہا کہ یہ سارے مشرکانہ اور کافرانہ تصورات ہیں جو آپ کے ہاں آئے ہوئے ہیں۔ خدا اپنے کسی اختیار کو کسی کو Delegate (تفویض) نہیں کرتا اس لیے کہ هو الحی (2:255) وہ خدائے زندہ ہے۔

خدا تعالیٰ کی ذات قادر بھی ہے اور قدیر بھی

خدا تعالیٰ وہ قادر ہی نہیں، قدیر بھی ہے۔ عزیزانِ من! قادر تو ہوتا ہے کہ کسی ایک وقت میں کسی چیز پہ قدرت رکھنے والا۔ وہی لفظ ہے لیکن جب ”باب“ ^② بدلتا ہے تو اُس ”باب“ میں لفظ قدیر آئے گا۔ اُس کے معنی ہوتا ہے ”مستقل طور پر ہمیشہ یہ کچھ کرنے والا“۔ اگر وہ اپنی قدرت یا اقتدار کو کسی وقت میں تفویض کر دے تو وہ پھر قدیر نہیں رہتا۔ کم از کم اتنے وقت کے لیے تو نہیں رہتا۔ تو یہ سارا کچھ کیا ہی غنیمت ہے کہ Delegate والی وہ بات ختم ہوئی، اُس نے کوئی اور رنگ اختیار کیا۔ یہ آیت ہے۔ کہا کہ تم یہ تصور کر رہے ہو کہ ہم اپنی Powers (اختیارات) کو دوسروں کو Delegate (تفویض) کر دیتے ہیں یا اُس میں دوسروں کو شریک کر لیتے ہیں۔ (تم) ہماری بات تو چھوڑو، ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے کاروبار میں، کچھ تمہارے ماتحت ہوتے ہیں، تو کیا تم کبھی ایسا

① نیز پرویز: مسودہ آئین پاکستان اور علماء کرام، طلوع اسلام مارچ 1973ء ص 16 تا 9

② مادہ (Root) اوزان افعال، اشتقاقیات اور ابواب کے ان نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الانبیاء ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2005ء ص 20 تا 21 مع انہی 2 صفحات کے فٹ نوٹ۔

کرتے ہو کہ اُس کاروبار کا سرمایہ بھی آدھا ان کو دیدو اور اپنے اختیارات بھی آدھے ان کو دیدو اور اُس کے بعد ان کو کہو کہ ہماری ماتحتی کرو تو کیا وہ کبھی تمہاری ماتحتی کریں گے؟ وہ تو تمہارے برابر بیٹھیں گے، برابر کے شیئر ہولڈر ہوں گے، نظم و نسق میں برابر کے حصہ دار بنیں گے۔ کہا کہ اس برابری سے تو تم خائف ہو گے۔ سوچو تو سہی کہ تم جب اپنے اس محدود سے کاروبار میں اسے برداشت نہیں کرتے، ڈرتے ہو کہ وہ تمہارے برابر بیٹھ جائیں گے اور تمہاری پوری قوت نہیں رہے گی تو کیا خیال ہے آپ کا کہ ہم میں تمہارے جتنی بھی سمجھ نہیں ہے۔ کہنے لگے کہ تم اپنی چھوٹی سی دنیا کے اندر یہ نہیں کرتے تو ہم اتنی بڑی کائنات کے اندر یہ کریں گے کہ اپنی Powers Delegate (انتقال اختیارات) کریں۔

صرف خدا کی ذات ہی اقتدار کا سرچشمہ ہے لہذا کوئی اور ظل اللہ علی الارض نہیں ہے

اب دینِ قیم میں تیسری چیز یہ ہوئی کہ اس میں کسی شے کو خدائی اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ عزیزانِ من! کتنے سال سے جھگڑا ہے کہ نظامِ مصطفیٰ کیا ہے؟ نظامِ خداوندی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ذَلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (30:30)۔ کیا بات ہے؟ ذلک کے لفظ کی! یہ دینِ قیم ہے۔ یہ تیسری شق آگئی۔ گویا اقتدار و اختیار کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے اور اُس نے اپنے اقتدار و اختیار کو کسی کو تفویض نہیں کیا بلکہ اُسی کے پاس ہیں، کوئی ظل اللہ علی الارض نہیں ہے، اختیارات کسی کو تفویض نہیں کیے گئے۔ جس طرح سے یہ کائنات کا سلسلہ ہے کہ ہر شے اُس کے اوپر کاربند ہے، اُس کے مطابق چل رہی ہے تو تمہارے لیے بھی ہم نے اسی قسم کے قوانین بنائے ہیں۔ ہم نے تمہیں پاور (اقتدار) Delegate (تفویض) نہیں کردی کہ جس طرح سے تم جی چاہے ان کو Exercise (استعمال) کرو، وہ پاور (اقتدار) ہمارے ہی پاس ہے۔ قوانین دیئے ہیں کہ جس طرح سے نظامِ کائنات چل رہا ہے اسی طرح سے تم بھی چلو۔

اب اگلی بات ایک اور آگئی۔ یہ باہر کی جتنی بھی اشیائے کائنات گنائی گئی ہیں میں نے بتایا تھا کہ فرق یہ ہے کہ ان میں اختیار و ارادہ نہیں ہے، Choice (انتخاب) نہیں ہے، Two Possibilities (دو امکانات) نہیں ہیں، دو امکانات یا دو راستے نہیں ہیں۔ ہر نوع کے سامنے ایک ہی راستہ ہے، یہ نہیں ہے کہ بکری دو راہ ہے پہ کھڑی ہے اور اس سے کہا گیا ہے کہ یہ راستہ گھاس کھانے کا ہے، جی چاہے تو اسے اختیار کر لو اور یہ گوشت کھانے کا ہے، جی چاہے تو یہ اختیار کر لو۔ بکری تو بیچاری پھر بھی کمزور سی ہوتی ہے وہ شیر جو اتنی قوتوں کا مالک ہے وہ بھی اُس کے قانون کی اطاعت پہ مجبور ہوتا ہے، اسے اختیار نہیں، ارادہ نہیں، Choice (اختیار و انتخاب) نہیں، دو Possibilities (امکانات) نہیں۔ صرف انسان کے معاملے میں آ کر اس کو چیز دی گئی ہے کہ تم

حیوان سے اونچے چلے گئے' یہ ارتقا کی اگلی منزل آگئی کہ تمہیں یہ Choice (انتخاب) دی گئی ہے' دو راستے بتائے گئے ہیں۔
وَهَذَيْنِهُ النَّجْدَيْنِ (90:10) دو راستے ہم نے بتادیئے ہیں۔ تمہارا جی چاہے یہ اختیار کرو تمہارا جی چاہے وہ اختیار کرو۔
بس اتنی سی بات ہے۔

ارتقا کے مرحلہ میں انسانیت کی دنیا کا ایک جہانِ نو کی طرف سفر کا آغاز

یہاں ارتقا کی اس منزل پہ پہنچنے کے بعد ایک بالکل نئی چیز آئی۔ یہ ہے خَلْقًا آخَرَ (23:14) یہ جدید قسم کی مخلوق جو
حیوانات سے یکسر مختلف ہے انسان ہے۔ اسے ارتقائی مراحل طے کر کے اگلی دنیا میں جانا ہے۔ زندگی کے اس حصے کو خَلْقِ جَدِيدِ
(32:10) کہا ہے۔ یہ جو انسان کی تخلیق کا پچھلا حصہ ہے اس میں یہ اور حیوانی بچہ دونوں برابر ہوتے ہیں وہ انہی منزلوں میں سے
گزرتے چلے آئے ہیں۔ عزیزانِ من! کیا عرض کروں! میں نے کہا ہے کہ یہ نظام کی باتیں ہیں! کلاس روم میں کرنے کی باتیں ہیں!
انسان کی موجودہ ہیئت کروڑ در کروڑ ارب در ارب سال کی رہیں منت ہے

اس تحقیق پہ آپ حیران ہونگے کہ لائف کا جو اولیں جرثومہ ہے جسے لائف کا پہلا سیل کہتے ہیں جو نظر بھی نہیں آتا وہاں سے
لے کر انسان کی ہیئت تک یہ لائف یا زندگی جن منازل سے گزری ہے وہ کروڑ در کروڑ ارب در ارب سال بنتے ہیں ان کا حساب ہی
نہیں کیا جاسکتا۔ اتنے دور و دراز راستوں سے گزر کر لائف (زندگی) اس شکلِ انسانی میں آئی ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ رحمِ مادر
کے اندر پہلا جرثومہ جب آتا ہے تو نو مہینے کے عرصے میں یہ ساری کروڑوں منزلیں پوری کر لیتا ہے۔ قرآن نے یہ اُس زمانے میں
شہادت دی تھی جب اولیں جرثومے کو دیکھنے کے لیے مائیکروسکوپ (خوردین) بھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآن میں یہ جو جنین کی
مختلف منازل دی ہیں اُس زمانے کے اندر جنین کو تو دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ بتایا ہے کہ یہ جاندار مخلوق جن راستوں سے جو بن کر
گزری ہے وہ کچھ قرآن نے گنایا ہے اور آج گائنا کولوجی کی تحقیق بتا رہی ہے کہ وہ اولیں جرثومے سے لے کر انسان کے بچے کی
شکل بننے تک زندگی جن راہوں سے گزری ہے وہ رحمِ مادر میں ان تمام سے گزر کر جاتی ہے لیکن یہاں پہنچ کر ایک فرق پڑتا ہے کہ
حیوان کا بچہ اپنی جبلت پہ پیدا ہوتا ہے اس کو Choice (اختیار) نہیں ہوتی۔ انسان کا یہ بچہ جو پیدا ہوتا ہے تو پیدا ہوتے ہی
عجیب مصیبت شروع ہو جاتی ہے کہ یہ سنکھیے کی ڈلی بھی اسی طرح سے منہ میں ڈال لیتا ہے جیسا کہ مصری کی ڈلی ڈال لیتا ہے
آگ میں بھی ہاتھ اُسی طرح ڈال دیتا ہے جیسے ماں کے کندھے پہ ہاتھ رکھتا ہے۔ مرغی کا چوزہ کبھی یہ کچھ نہیں کرتا! بکری کا بچہ کبھی
یہ کچھ نہیں کرتا۔

زندگی بھر کے لیے بچے کی تربیت کا ایک اہم سنہری اصول: اس کے سامنے متبادل راستہ کھلا رکھو
 میں ضمناً ایک بات کہہ دوں کہ یہ جو بچے ہیں اگر ان کو کسی چیز سے روکنا ہو تو صرف روکو نہیں، وہ Choice (انتخاب) چاہتا
 ہے، اسے وہ Choice (انتخاب) دو۔ اس کے انسان ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس کے سامنے دو راستے کھلے ہوں اور وہ اپنے
 اختیار سے ایک راستہ اختیار کرے۔ جسے آپ تربیت کہتے ہیں وہ تربیت نہیں ہوتی وہ Repression (ضبط) ہوتی ہے، اُس کے
 اندر کا تقاضا ہوتا ہے، اُس کے سامنے متبادل راستہ کھلا ہونا چاہیے۔ غلط بات سے روکتے ہیں تو اُس کو سامنے دوسری چیز دیجیے۔ ایک
 کھلونا اگر اس کے لیے مضر ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ وہ نہ دیں تو آپ اُس کو دوسرا کھلونا دیجیے جو صحت مند ہو۔ اگر آپ نے وہ
 کھلونا چھین لیا اور دوسرا نہ دیا تو وہ دوسرا اپنی مرضی سے خود تخلیق کر لے گا۔

بچہ ہو یا کوئی قوم، یہ اس وقت سرکش ہوتی ہے جب اس کے سامنے کوئی متبادل راستہ نہیں ہوتا
 عزیزانِ من! بچے کی بات ہی نہیں ہے بلکہ انسان کی انسانیت کو برقرار رکھنا ہے تو اُس کے سامنے بندگلی (Cul de sac)
 نہ لائیے کہ آگے اُس کو راستہ نظر نہ آئے ورنہ وہ سرکشی اختیار کر لے گا۔ اُس کے تو انسان ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اُس کے سامنے دو
 راستے کھلے ہوں اور اپنے Choice (انتخاب) سے وہ ایک راستہ اختیار کرے۔ بس یہ بتا دو کہ بھئی! اس میں یہ نقصان ہوگا، یہ
 تباہی ہوگی، اس میں خیریت رہے گی۔ تو میں جب سرکشی پہ اترتی ہیں جس طرح میں نے بچے کے متعلق کہا ہے تو وہ اُس وقت اترتی
 ہیں جب ان کے سامنے کوئی Choice (انتخاب) نہیں رہتی، اسی کو استبداد کہتے ہیں۔ اب Healthy Choice (صحت
 مند انتخاب) کی بات کرنے کی رہ گئی۔ ایسی تعلیم و تربیت کیجیے کہ وہ چُنے تو اپنی مرضی سے خیر کا راستہ چُنے۔ یہ بڑی بنیادی چیز ہے۔
 میں اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے پھر کہوں گا کہ بچوں کی تربیت کے لیے اس کو ذہن میں رکھیے گا اور کبھی بھی ان میں ڈرنہ ڈالیے گا۔ یہ جو
 اندرونی چیز ہے وہ یہ ہے یا تو پھر جو Choice (انتخاب) کی بات ہے آپ اُس کو مار ہی دیں گے، ختم کر کے رکھ دیں گے تو
 وہ انسانیت کی سطح سے گر جائے گا۔ اور اگر وہ چیز زندہ رہی ہے اور آپ نے اُس کو خیر کا متبادل راستہ نہیں بتایا تو پھر اُس کے جو جی
 میں آئے گا وہ راستہ اختیار کر لے گا۔ یہ جتنے شر کے راستے اختیار کیے ہوئے آپ کو نظر آتے ہیں تو اس کو سائیکولوجی میں آپ
 دیکھیے تو نظر آجائے گا کہ بچپن میں ان کے سامنے خیر کے متبادل راستے نہیں رکھے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ کتنی اہم بات آئی۔
 ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (30:30) - سنیے اس کے متعلق! کہا کہ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔ وہی جو حیوانی جبلتیں ہیں،
 Instincts ہیں وہ اس کے اندر ہیں۔ ان Instincts (جبلتوں) کو استعمال کرنے کے Exercise (استعمال) کرنے

کے دوراستے ہیں۔ حیوان کے سامنے ایک ہی راستہ ہوتا ہے۔ انسان کے سامنے دوراستے ہیں، انہی کو جذبات کہتے ہیں۔

لفظ ھویٰ کا قرآنی مفہوم

ان عربوں کے ہاں عجیب بات ہے کہ اس کے لیے انہوں نے جو لفظ چنا ہے وہ ھویٰ کا لفظ ہے جس کی جمع اھوآء ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ پہاڑ کی چوٹی پہ پتھر کو آپ تھامیں رکھیں تو وہاں وہ قائم^① رہتا ہے اور اگر اُس کو چھوڑ دیا جائے تو وہ جس تیزی سے نیچے گرتا^② ہے اس کو ھوآء کہتے ہیں۔ وہ انسانی جذبات کہ جن کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے عرب اسے وہ پتھر کہتے تھے جو پہاڑ کی چوٹی سے چھوڑ دیا جائے۔ وہ پتھر جتنی تیزی سے آتا ہے اور جو کچھ اپنے ساتھ بھی اور جو سامنے آتا ہے ان کے ساتھ بھی کرتا ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ یہ ہے جس کو آپ جذبات کہتے ہیں اور وہ عرب اسے اھوآء کہتے تھے اور قرآن نے بھی ان کو اھوآء کہا ہے۔ وہ جو میں نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں جو مستعار لیا ہوا تصوف کا تصور ہے اُس میں تو آپ کے ہاں نفس کشی ہے:

ساز سامان سفر دا کرے
مرنے توں پھر پہلاں مرے
عالم کی فضا پوچھو محروم تمنا سے
بیٹھا ہوا دنیا میں اٹھ جائے جو دنیا سے

وحی انسانی جذبات کے استعمال کا طریق وضع کرتی ہے

عزیزانِ من! یہ بڑے غلط راستے ہیں جو آپ کے ہاں آئے ہوئے ہیں اور اس کا نام تقرب بارگاہِ الہی ہے، روحانیت کا بلند ترین مقام ہے۔ یعنی خدا نے یہ جذبات دیئے تو عدا یہ کہنا ہے کہ تم نے جذبات بنائے تھے تو لو ہم نے فنا کر کے رکھ دیئے ہیں۔ یہ خدا کو چیلنج ہے۔ وہ کہتا ہے بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَهْوَاءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ^③ (30:29)۔ ظلم کے معنی ہیں ”جس شے کو جس جگہ ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو کسی اور جگہ ہو“۔ قرآن کہتا ہے کہ جو جذبات ہیں یہ نہ تو مارے جاسکتے ہیں اور نہ مر سکتے ہیں، یہ تو رہتے

① طبیعیات کی اصطلاح میں کہتے ہیں کہ اس میں Potential Energy (مخفی توانائی) بھر جاتی ہے۔

② اس میں وہ Potential (مخفی) توانائی Kinetic (حرکی) توانائی میں بدل جاتی ہے۔

③ ان واضح حقائق کے بعد ان لوگوں کی حالت پہ غور کرو جو وحی (علم) کی روشنی کے بغیر اپنے جذبات کے تابع چلنا چاہتے ہیں (اور اس طرح اپنے جذبات ہی کو اپنا خدا بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ صحیح روش یہ ہے کہ انسانی جذبات کو وحی خداوندی کے تابع رکھا جائے (28:50) ان کی اس غلط روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان پر سعادتوں اور کامرانیوں کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص-936)۔

ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان کو غلط جگہ رکھتے ہو تو یہ تخریب پیدا کرتے ہیں۔ غلط جگہ کے معنی یہ ہیں کہ ان کو اگر تم اپنی ہی مرضی سے اپنے ہی مفاد کی خاطر استعمال کرو تو یہ تخریب پیدا کرتے ہیں۔ جذبات کو خدا کی وحی کے بغیر جو استعمال کرنا ہے، یہ ظلم ہے۔ جذبات کا استعمال ظلم نہیں ہے بلکہ بغیر علم ان کا استعمال ظلم ہے دوسری جگہ بغیر ہدئی (28:50) کہا ہے۔ اور اس علم کو دوسری جگہ العلم کہا ہے کہ وہ علم جو خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ یعنی انسانی جذبات کو اپنے Choice (اختیار) سے ہماری طرف سے دی ہوئی ہدایت کے مطابق استعمال کرو تو جذبات کی تسکین بھی ہو جائے گی، تخریب بھی نہیں ہوگی۔ وہاں حیوانات میں Choice (انتخاب و اختیار) نہیں تھا، وہ خدا کے قانون کے مطابق صرف کرنے کے لیے مجبور تھے۔ یہاں انسانی دنیا میں Choice (اختیار) دینے کے بعد کہا کہ یہ ہے ہمارا قانون۔ اس کے مطابق صرف کرو گے تو تم پستیوں کی طرف نہیں جاؤ گے، یہ دیکھیے ہوئی کا لفظ ہے۔ اور اگر تم نے انہیں تخریب کے لیے اپنی ہی منشا کے مطابق صرف کیا تو یہ اھو آء ہو جائیں گے، وہ پتھر ہو جائے گا جو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرا کرتا ہے۔ تو اگلی چیز یہ آئی کہ اپنے جذبات کو وحی کے تابع رکھ کر اُس کی دی ہوئی Directions (ہدایات) کے مطابق صرف میں لاؤ۔ آئیے ایک نظر پھر دہرائیں کیونکہ ہم پھر دینِ قیم کی طرف آگئے ہیں۔

خدا کی ذات اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتی

کائنات کی ہر شے خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق چل رہی ہے، وہ اپنی کسی قوت کو اپنے کسی منشا کے مطابق نہیں صرف کر رہی بلکہ خدا کے بتائے ہوئے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے صرف میں لا رہی ہے، خدا نے اپنے اختیار و اقتدار کو کسی کو Delegate (تفویض) نہیں کیا یا سونپا نہیں ہے، اقتدار کا سرچشمہ صرف خدا کی ذات ہی ہے، اس میں اُس نے کسی کو شریک نہیں کیا، وہ جذبات جو انسان کو دیئے گئے ہیں ان کو صرف وحی کے تابع صرف کرنا چاہیے۔ یہ عناصر گنائے اور اب آگے کہا ہے کہ ذَلِكَ الَّذِيْنَ الْقَيِّمُ (30:30) دیکھا آپ نے کہ وہ نظام خداوندی ہے کیا؟ فَاقْمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا (30:30) اپنی تمام توجہات کو مرکوز کرو، قائم کرو، اُس میں کسی قسم کی جھول نہ پیدا ہو، لڑکھاہٹ نہ پیدا ہو، لرزشِ خفی تک نہ پیدا ہو کیونکہ توازن برقرار رکھنے کا نتیجہ یہ فاقم ہوگا۔ یہ وہی قائم کا لفظ ہے: جم کر کھڑے ہو جاؤ، توازن برقرار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو مرکوز کرو اس دین کی طرف۔ حنیفًا کے معنی ہوتا ہے کہ ہر طرف سے اپنی توجہات کو ہٹا کر، اسے ہی توحید کہتے ہیں۔ ادھر ادھر دیکھنے کی بات نہیں ہے۔ کائنات کی کوئی شے کسی دوسری طرف نہیں دیکھتی، اُس کے لیے جو منزل مقرر ہے وہ اُس کے اوپر چلی جاتی ہے۔ کسی دوسری طرف نگاہ نہ اٹھے، صرف اُس کی طرف دیکھو، اپنے آپ کو مرکوز کرو۔ اب یہاں آئی وہ آیت۔ فَطَرَتِ اللّٰهُ اَلَّتِيْ فَطَرَ

النَّاسَ عَلَيْهَا (30:30) یہ سارے دینِ قیم کے اجزاء بتائے تھے۔

فطرت اللہ کا اور دینِ قیم کا مفہوم

میں نے عرض کیا تھا کہ عربی زبان میں اور قرآن کریم میں فطر کے معنی ہیں کہ کسی چیز کو پہلی دفعہ پیدا کرنا۔ فطرت اللہ کے معنی اللہ کی فطرت نہیں، Nature of God نہیں، خدا کی فطرت کا تو تصور ہی باطل ہے۔ فطرت اللہ کے معنی ہیں خدا کا قانونِ تخلیق۔ کہا کہ خدا کا قانونِ تخلیق جو اس ساری کائنات میں کارفرما ہے فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (30:30) انسانوں کو بھی اسی کے مطابق ہم نے پیدا کیا ہے، یہ کوئی الگ مخلوق نہیں ہے کہ اس کے لیے کچھ اور قوانین ہیں بلکہ اُسی قانون کے مطابق ان کو پیدا کیا ہے۔ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ (30:30) اس کے لیے ہم نے اپنے قانونِ تخلیق کے اندر تبدیلی نہیں کی کہ اس کے لیے کوئی الگ نظام ہو بلکہ وہی نظام ہے جو باقی کائنات کے لیے ہے۔ عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ فَطَرَتِ اللَّهُ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (30:30) کا مفہوم کیا نکلا۔ اور ہمارے ہاں اس کا مفہوم یہ لیا گیا کہ اللہ کی فطرت جس کے مطابق انسان کی فطرت بنائی اور اسلام دینِ فطرت ہے۔ یہ سارا کچھ ہے۔ فطرت کے یہ معنی نہ عربی زبان میں ہیں نہ قرآن کریم میں ہیں۔ بات اوپر سے چلی آ رہی ہے کہ اس ساری کائنات کو ہم نے ان قوانین کے تابع، اس نظام کے تابع پیدا کیا ہوا ہے اور یہ ہے فَطَرَتِ اللَّهُ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (30:30) انسانوں کے لیے بھی یہی قانونِ تخلیق ہے۔ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ (30:30) اس کے لیے کوئی الگ قانون نہیں ہے۔ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (30:30) یہ ہے دینِ قیم۔

عزیزانِ من! اب آپ کو بھی معلوم ہو گیا، جب دیکھنا ہو کہ نظامِ خداوندی یا دینِ خداوندی کیا ہے یا اسلام کیا ہے تو یہ ہیں دس آیات اس سورۃ الروم کی ان کو دیکھیے۔ اور جہاں بھی الدین آئے گا آپ دیکھیں گے کہ وہ انہی عناصر کا مجموعہ ہوگا یا ان میں سے ہی کوئی نہ کوئی عنصر ہوگا۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ کہیں وہ ایک چیز بیان کرتا ہے کہیں دوسری چیز بیان کرتا ہے، کہیں جامع طور پہ ان کو لے آتا ہے۔ وہ بکھری ہوئی پٹیاں ہوتی ہیں، یہ اُس کا گلدستہ ہوتا ہے۔ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (30:30) یہ ہے دینِ قیم۔

دینِ قیم کے برعکس ہمارے ہاں تقلید پرستی کا مروجہ اسلام جو صدیوں سے رائج ہے

مُلاً کہتا ہے کہ سینے پر ہاتھ باندھنا اسلام ہے، دوسرا کہتا ہے ہاتھ کانوں تک اٹھانا اسلام ہے، تیسرا کہتا ہے ہاتھ زیرِ ناف باندھنا اسلام ہے، یہ ہمارے ہاں چلا ہوا ہے۔ آپ اندازہ لگائیے۔ قرآن کہتا ہے کہ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (30:30) وہ تو الدین ہے، دو ہو ہی نہیں سکتے۔ فطرت میں کہیں ایک نوع کے لیے دو نظام رکھ دیجیے تو پھر دیکھیے کہ کیا فساد برپا ہوتا ہے۔ ذَلِكَ الدِّينُ

الْقِيمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (30:30) یہ علم کی بات ہے، تقلید اور جہالت کی بات نہیں ہے۔ انسانوں کی اکثریت ابھی تک آنکھیں بند کیے ہوئے تقلید کی روش کے اوپر چلے جاتی ہے اور یہ جو بات ہم کہہ رہے ہیں یہ تو علم کی بات ہے۔ علم کے بغیر تو ایمان آ ہی نہیں سکتا۔ الدین سمجھ میں ہی نہیں آ سکتا جب تک کہ علم کی بارگاہ سے اس کی سند نہ لی جائے۔ اور پھر علم بھی انسانی علم جو علم ہی کہلائے گا لیکن وہ العلم ہوگا جو وحی خداوندی نے عطا کیا ہے۔ لَا يَعْلَمُونَ (30:30) میں دونوں علم آ جاتے ہیں۔

اب اگلی آیت میں کہا کہ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ (30:31)۔ یہاں (30:30) میں حنیف کہا تھا کہ ہر طرف سے توجہ ہٹا دو، تو یہ تو پھر Negative Aspect (منفی پہلو) ہوا کہ ہر طرف سے توجہ ہٹا لی۔ Positive (مثبت) بھی تو کوئی چیز ہونی چاہیے۔ اس کے لیے کہا کہ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ (30:31) اور توجہ کو اُس کے بتائے ہوئے نصب العین کی طرف مرکوز کر دینا، یہ الٰہی اللہ ہے۔ پہلی چیز تو لا الہ ہے کہ یہ بھی نہیں، یہ بھی نہیں، یہ حنیف کی منزلیں ہیں۔ اِنِّیْ وَجْهْتُ وَجْهَیْ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ① (6:79) یہ تھا اعلانِ ابراہیمؑ۔ یہ حنیف ہے کہ ہر چیز کو کاٹتا ہوا چلا جاتا ہے کہ یہ بھی نہیں، یہ بھی نہیں۔ پھر اس کے بعد جو مُنِيبِينَ إِلَيْهِ ہے، وہ الٰہی اللہ ہے کہ جو نصب العین، جو منزل، جو راستہ اُس نے مقرر کیا ہے کہ جو الدین ہے اُس کی طرف، خالص اُس کی طرف، توجہ دو۔

دینِ قیم پر پوری اترنے والی قوم کی نظریں ہمیشہ اپنے آشیانہ پر ہوتی ہیں: امتِ مسلمہ کا مقام اقبالؒ کی نظر میں

ٹھیک ہے تمہارے لیے کائنات کے اندر Choices (انتخابات) ہیں، زندگی کے مختلف راستے، مختلف گوشے ہیں، سب میں جاؤ لیکن تمہاری نگاہوں سے وہ منزل نہ اوجھل ہو جائے، وہ نصب العین نہ اوجھل ہو جائے، جو وحی خداوندی نے متعین و مقرر کیا ہے۔ تمہاری نگاہ ہمیشہ اس آشیانہ پر رہے۔

کیا بات ہے اقبالؒ (1877-1938) کی! وہ امت کے متعلق کہتا ہے:

① میں اپنی تمام توجہات کا مرکز صرف اس ذات بے ہمتا کو سمجھتا ہوں جو تمام کائنات کو عدم سے وجود میں لائی (اور جس کا قانون یہاں اس طرح نافذ العمل ہے کہ اس سے نہ ستاروں کو مفر ہے نہ چاند اور سورج کو مجالِ سرتابی) اس لیے میں اس کے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔ یہ میرا دونوک فیصلہ ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 305)۔

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ ①

اس فضائے سماوی کے اندر یہ امت اڑتی رہتی ہے۔ ”یگانہ“ بڑی چیز ہے۔ قرآن نے اس امت کے متعلق کہا ہے کہ اَنْتُمْ الْاَغْلَوْنَ (3:139) تمہارا ہمسر کوئی نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اقبالؒ نے مومن کے متعلق کہا:

مومن بالائے ہر بالا ترے

جتنی بلندی پہ کوئی ہے یہ اُس سے بھی بالا ہے۔ اور آگے اقبالؒ کہتا ہے کہ

غیرتِ اُو برنتابد ہمسرے

یہ کہ کوئی اُس سے اونچا نکل جائے اس کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے اس کی غیرت تو اسے بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اور انسان اس کے متوازی و ہمروش بھی چلے کیونکہ یہ اعلیٰ (3:139) ہے۔

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ

وہ وسعتِ گردوں کے اندر سینکڑوں ہزاروں میل پھرتا ہے لیکن

نگاہِ اُو بہ شاخِ آشیانہ

اس کی اپنی نگاہِ آشیانہ کی شاخ پہ ہمیشہ رہتی ہے۔ یہ ہے مُنِیْبِنِ الْاِیْہ (30:31)۔ یہ نظام کیا ہے؟ یہ کہ سفرِ زندگی میں تمہارا ہر قدم اُس منزل کی طرف اُٹھے جو خدا نے تمہارے لیے تجویز کیا ہے۔

عزیزانِ من! ایک تشبیہ ہمارے ہاں کے پرانے شاعر نے بھی دی ہے۔ وہ ایسی تو جامع نہیں ہے جیسی اقبالؒ (1877-1938)

① پرد در وسعتِ گردوں یگانہ نگاہِ اُو بہ شاخِ آشیانہ

(وہ کائنات کی پہنائیوں میں آزادانہ بال کشا ہوتی ہے اور اس کی تنگ و تاز اور تلاش و جستجو میں کوئی اور قوم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن اس پر دواز میں اس کی نگاہ ہمیشہ ”شاخِ آشیانہ“ پر رہتی ہے۔ وہ اپنے تصورات کے نقطہٴ ماسکہ (وحی۔ توحید) اور اپنے مرکزِ ملت کو ایک ثانیہ کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ اقبالؒ نے ان دو مصرعوں میں اسلام اور مسلمان کی زندگی کا صحیح نقشہ پیش کیا ہے۔ مسلمان کی زندگی یہ ہے کہ غیر متبدل قوانینِ خداوندی (مستقل اقدارِ حیات) کا پابند رہے اور ان حدود کے اندر زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے معاملات کا حل خود دریافت کرتا جائے۔ جو قوم مستقل اقدار کی پابند نہیں رہتی وہ جہانِ فکر و عمل میں (اقوامِ یورپ کی طرح) یکسر آوارہ ہو جاتی ہے اور جو قوم زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اپنے احوال و کوائف میں تبدیلی نہیں کرتی وہ (مسلمانوں کی طرح) پابندِ قفس پرندے کی طرح نشوونما سے محروم رہ جاتی ہے۔ حقیقی زندگی ثبات و تغیر (Permanence and Change) کے صحیح امتزاج میں ہے (پرویز: مجلس اقبال، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور)

1996ء، ص 254 نیز 140)

کی تشبیہ ہے:

ہم چوں پرکار ایم پائے در شریعت مستقیم
ہماری مثال تو پرکار (Compass) کی ہے کہ ایک قدم تو ہم نقطے پہ (شریعت پہ) جم کے رکھتے ہیں
پائے دیگر سیر ہفتاد و دو ملت کردہ ایم

اور پرکار کا جو دوسرا پاؤں ہے اُس سے ہم افتاد و دولت کی سیر کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تشبیہ ناقص ہے۔ پرکار کا جو دوسرا پاؤں بھی ہوتا ہے وہ محدود دائرے کے اندر رہتا ہے۔ اقبالؒ کی یہ تشبیہ زیادہ موزوں ہے کہ اس کائنات کے اندر جدھر جی چاہے نکل جائے لیکن شرط ایک ہی ہے کہ ”نگاہ او بشاخ آشیانہ“^①۔ اس لیے کہ کہ مُنِیْبِیْنِ اِلَیْہِ وَ اَتَّقُوْہُ (30:31) اس بات کی نگہداشت رکھو کہ جہاں جی چاہے چلو پھرو لیکن یہ شاخ آشیانہ یہ نصب العین تمہاری نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔

وہی صلوٰۃ جو ہماری اجتماعیت کا نشان تھا آج فرقہ پرستی کا نشان بن چکا ہے

عزیزانِ من! اس کے فوراً بعد کہا کہ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ^② (30:31)۔ اب صلوٰۃ ہمارے ہاں نماز بن گئی حالانکہ یہ ایک نصب العین ہے اور کہا ہے کہ اُس کی طرف نگاہ رکھو کسی دوسری طرف نہیں دیکھنا، کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں، کوئی تفرقہ نہیں۔ اس کے لیے صلوٰۃ کہا۔ اور آپ کے ہاں جب یہ نماز بنی تو ایک جگہ دس ہزار آدمی کا مجمع بیٹھا ہوا، مقرر تقریر کر رہا ہو، سب نہایت جذب و انتہاک سے سن رہے ہوں اور ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ جونہی مؤذن کی اذان کی آواز کان میں پڑی تو ایک ٹولہ ادھر، ایک ٹولہ ادھر، کچھ وہی پنڈال کے اندر نماز پڑھتے ہیں۔ اُس نے الصلوٰۃ کہا تھا کہ تمہارا تفرقہ نہ رہے، حنیفًا ہو۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ جب وہ صلوٰۃ نماز بنی ہے تو ویسے کاروبار کے اندر یا جلسے کے اندر کوئی اختلاف کا پتہ نہیں چلتا لیکن جونہی صلوٰۃ کی آواز کان میں پڑی تو ماتھے پہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ وہابی ہے، یہ حنفی ہے، یہ شیعہ ہے، یہ سُنی ہے، یہ بریلوی ہے۔ اور پھر سب الدین القیم کے مدعی ہیں۔

① پرواز میں اس کی نگاہ ہمیشہ ”شاخ آشیانہ“ پر رہتی ہے۔ وہ اپنے تصورات کے نقطہٴ ماسکہ (وحی۔ توحید) اور اپنے مرکزِ ملت کو ایک ثانیہ کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی (پرویژ: مجلس اقبال، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، 1996ء، ص 254)۔

② اس کے لیے نظامِ صلوٰۃ قائم کرو جس میں ہر فرد بطیب خاطر قوامینِ خداوندی کا اتباع کیے چلا جاتا ہے (پرویژ: مفہوم القرآن، ص 937)۔

نظامِ صلوٰۃ کے لیے سَبَّح کا قرآنی مفہوم ایک بنیادی حیثیت کا حامل ہے

قرآن کریم نے اَقِمْوُ الصَّلٰوةَ کہا ہے۔ یہ جو یکسو ہونا ہے، یعنی یک نگاہ ہونا، ایک نصب العین کی طرف جانا، ایک منزل کی طرف چلنا، اس کو ایک لفظ سے سمجھا دیا۔ بات تشبیہ کے اعتبار سے اقبال کے الفاظ میں، پرندوں کی چلی آ رہی تھی، بات کائنات کی اشیا کی چلی آ رہی تھی اور اُس کے بعد اُس نے یہ کہا کہ یہ اَقِمْوُ الصَّلٰوةَ ہے یعنی ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیْمُ کو سمجھاتا چلا آ رہا ہے اور سمجھاتے سمجھاتے درمیان میں اَقِمْوُ الصَّلٰوةَ لے آیا ہے۔ اس سے پہلے جتنی مثالیں اُس نے دی ہیں، وہ کائنات کی اشیا کی دی ہیں۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صَفَّی (24:41)۔ سبّح کے معنی ہوتا ہے کہ ”اپنی منزل یا متعین پروگرام کی طرف پوری توانائی کے ساتھ بھاگ کر جانا جیسے گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہے یا جیسے وہ تیراکی (Swimming) جو پورا ہاتھ یوں کر کے کی جاتی ہے“۔ اُسے عربی زبان میں تسبیح کہتے ہیں۔ کہا کہ کائنات کی ہر شے اُس منزل تک پہنچنے کے لیے جو اس کے لیے متعین ہے، پوری توانائیاں صرف کرتی ہے اور اُس میں جذب رہتی ہے۔ (کل) کائنات کی ہر شے (قد علم) جانتی ہے، اچھی طرح سے (صلوٰۃ) اپنی صلوٰۃ کو جانتی ہے۔ اب بات سمجھ میں آئی کہ پیچھے سے یہ مُنِیْبِیْنَ اِلَیْہِ وَاتَّقُوْہُ بیان کرنے کے بعد وَ اَقِمْوُ الصَّلٰوةَ کہا تھا۔ اُس نے کہا کہ کائنات کی باتیں ہم کر رہے تھے، دینِ اَقِیم کی ساری باتیں اس کی مثالوں سے ہم نے سمجھائی ہیں اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ کُلُّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ (24:41) ان میں سے ہر شے اپنی صلوٰۃ کو جانتی ہے۔ صلوٰۃ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ”کسی کے پیچھے اس طرح سے چلنا کہ اُس میں اور اس کے درمیان میں فاصلہ نہ رہے لیکن یہ اُس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اتباع اس قسم کا کہ درمیان میں فصل نہ رہے، احتیاج یہ کہ اُس سے آگے نہ نکلے“۔ اسے عربی زبان میں صلوٰۃ کہتے ہیں اور اس طرح سے ریس کورس میں جو گھوڑا دوسرے نمبر پر جا رہا ہوتا ہے اُسے مصلی کہتے ہیں۔ یہ ملتان اور جھنگ کے لوگ مصلی ”چوہڑے“ (بھنگی) کو کہتے ہیں۔ یہاں قرآن نے کہا ہے کہ وَ اتَّقُوْہُ وَ اَقِمْوُ الصَّلٰوةَ (30:31) وہ الدینِ اَقِیم جو کائنات کی پہنائیوں میں کارفرما ہے، وہ الصلوٰۃ کی بنیادوں کے اوپر استوار ہے۔ اور اگلے ہی لفظ میں تشریح کر دی کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (30:31) مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ قوم نے گھر کے اس کا ترجمہ بت پرست کیا تو بت پرستی تو ہم کرتے نہیں۔ اگرچہ جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ وہ تو پھر بھی کسی بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے بت کی پرستش کرتے تھے لیکن ہم تو لیٹے ہوؤں یعنی مردوں کی بت پرستی کرتے ہیں۔ انہوں نے تو پھر بھی سامنے کوئی شکل وغیرہ بنائی ہوئی ہوتی تھی لیکن یہاں تو چوہڑے مٹی کی قبریں ہی ہیں جن کی ہم پرستش کرتے ہیں۔

کائنات کی کوئی شے بھی خدا کے قانون سے سرتابی اختیار نہیں کرتی یعنی وہ مشرک نہیں

قرآن کریم کہتا ہے کہ **وَاقِمْوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ** ^① (30:31)۔ عزیزانِ من! کائنات میں کوئی شے مشرک نہیں ہے۔ وہاں ایک ہی قانون ہے اور اُسی کا اتباع ہے اور اس طرح اتباع ہے کہ حقیقاً ہے کہ نظرِ ادھر ادھر نہ اٹھے۔ اور اُس کے بعد یہ ہے کہ اُس میں اور اس میں کوئی فاصلہ نہ ہو اُسی راستے کے اوپر چلتا ہوا چلا جائے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ شرک کہتے کس کو ہے؟ یہ ایک مملکت ہے اس مملکت کا ایک قانون ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اگر کبھی اُس قانون کی خلاف ورزی ہو جائے اُسے جرم کہتے ہیں اُس کی ایک سزا ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ یہاں یہ کہیں کہ میں اس مملکت میں رہتے ہوئے آپ کے قانون کا اتباع نہیں کروں گا مثلاً میں افغانستان کے قانون کا اتباع کروں گا تو آج کی اصطلاح میں اسے بغاوت کہتے ہیں قرآن کی اصطلاح میں اسے شرک کہتے ہیں۔ کائنات کی کوئی شے مشرک نہیں ہے وہ نہ اپنے بنائے ہوئے کسی قانون کے تابع چلتی ہے نہ اُس کے ہاں یہ ہے کہ خدا کے قانون کو چھوڑ کر کسی اور خدا کے قانون کے اوپر وہ چلنا شروع کر دے۔ وہ واحد ہے وہ توحید ہے۔ آپ دیکھ لیجئے کہ کائنات کی مثالوں سے **ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ** کہاں لیے آ رہا ہے اور اس میں یہ ہے کہ **وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ** (30:31) اس اتباع و اطاعت میں کسی دور کے قانون اور فیصلے کو شریک نہ کرو۔ وہ تو خدائے علیم ہے ہمارے سینے کے رازوں کا واقف ہے۔ ہمارے سے مراد قیامت تک آنے والے انسانوں کے ہیں۔ اُسے پتہ تھا کہ انہوں نے اس طرح سے فریبِ نفس میں مبتلا ہو جانا ہے کہ مشرک کے معنی انہوں نے بت پرست کر لینا ہے۔

مشرک وہ ہیں جو امتِ واحدہ کے تصور کے برعکس فرقہ واریت کے پیروکار بن جائیں

کہا کہ بتائیں تمہیں کہ مشرکین کون ہوتے ہیں؟ یہ کہ **مِنَ الدِّیْنِ فِرْقًاوًا دِیْنُهُمْ وَكَانُوا شِیْعًا** (30:32) یعنی امتِ واحدہ جو ہے یہ دینِ قیم ہے اس میں فرقے نہ پیدا کر لینا۔ یعنی ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے فرقے پیدا کر لیے۔ فرقے پیدا کر لیے اور **كَانُوا شِیْعًا** ان میں سے ایک خود بھی بن گئے۔ ساری امتِ فرقوں میں بنی ہوئی ہے۔ یہ **مِنَ الدِّیْنِ فِرْقًاوًا** قرآن نے کہا ہے۔ یہ آیت انہوں نے کبھی آپ کے سامنے نہیں پڑھی پڑھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جی یہ دوسروں کے متعلق ہے۔ او تمہارے متعلق

① نظامِ صلوة قائم کرو جس میں ہر فرد بطیبِ خاطر قوانینِ خداوندی کا اتباع کیے چلا جاتا ہے۔ اس اتباع و اطاعت میں کسی اور کے قانون اور فیصلے کو شریک نہ کرو۔ اس سے پہلے خود تمہارے اندر وحدتِ فکر عمل پیدا ہو جائے گی اور اس کے بعد پوری نوعِ انسانی اپنے اختلافات کو چھوڑ کر امتِ واحدہ بن جائے گی (2:213)۔ یہی دین کا مقصود ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص-937)۔

کیا ہے؟ ”جی او جنت دے وعدے ساڈے متعلق نیں“۔^①

دنیا کے تمام جانور اپنی اپنی نوع میں امت واحدہ ہیں

قرآن مجید کہتا ہے کہ **مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا** ^② (30:32)۔ کائنات میں کوئی فرقہ نہیں ہوتے: بکریوں میں کوئی فرقہ نہیں ہے کہ ایک فرقہ گھاس کھائے اور دوسرا گوشت کھائے، مرغی کے بچوں میں کوئی فرقہ نہیں ہوتا کہ چند ایک پانی میں چلے جائیں اور چند خشکی کی طرف چلے جائیں، شیروں جتنی قوت رکھنے والوں میں بھی فرقہ نہیں ہوتا، وہ امت واحدہ ہوتے ہیں اس لیے کہ وہ ایک کے قانون پہ چلتے ہیں۔

فروقوں کا وجود مختلف فقہوں کا رہین منت ہے

یہ جسے آپ فرقہ کہتے ہیں ان میں سے کسی فرقے کے کسی عقیدے یا مسلک کو لے لیجیے اور اُس کی سند پوچھیے تو کسی نہ کسی شخصیت کے اوپر جا کر وہ رک جائے گی۔ یہ جو باقی فرقے ہیں وہ تو بہر حال فقہ کے اوپر ہوتے ہیں۔ فقہ تو ہوتی ہی انسانوں کی بنائی ہوئی ہے۔ وہ تو کہتے ہی ہیں کہ امام ابوحنیفہ^③ کی فقہ، امام مالک^④ کی فقہ، امام احمد بن حنبل^⑤ کی فقہ ہے، امام شافعی^⑥ کی فقہ ہے۔ یہ جو اپنے آپ کو کہتے ہیں کہ ہم سنت رسول اللہ ﷺ کے متبع ہیں وہ بھی امام بخاری^⑦ کی فقہ ہے، یہ بھی اُس سے آگے نہیں جاتے۔ کوئی اپنے کسی عقیدے اور کسی مسلک کے لیے قرآن کی سند نہیں لاتا۔ جو نبی آپ نے قرآن کی سند دی تو آپ منکر حدیث ہو گئے، کافر ہو گئے، دائرہ اسلام سے خارج ہو گئے۔ قرآن کا نام لینا آج کفر ہے، اس لیے کہ یہ شرک کو مٹاتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ **مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا** (30:32)۔ عزیزانِ من! سوچئے تو سہی کہ یہ جو **ذَلِكَ الَّذِينَ الْقِيمَ** تھا تو کیا کوئی بھی آپ کو آج اس پر ملتا ہے؟ یہ جو خدا کے دین کے مدعی ہونے کے بعد انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے اوپر

① جی وہ جنت کے وعدے ہمارے متعلق ہیں۔

② تم بڑی احتیاط برتنا کہ اس طرح توحید کے پیرو بن کر پھر سے مشرک نہ ہو جاؤ، یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین کو کھڑے کھڑے کر دیا اور اس طرح امت واحدہ رہنے کے بجائے مختلف فرقوں میں بٹ گئے (پرویز: مفہوم القرآن ص-937)۔

③ امام اعظم (کوئی) (80-150ھ)

④ امام مالک (مینی مدنی) (93-179ھ)

⑤ امام احمد بن حنبل (بغدادی) (164-241ھ)

⑥ امام شافعی (عسقلانی، مکی) (150-204ھ)

⑦ امام محمد اسلمیل بخاری (بخارا) (194-254/260ھ)

چلتے ہیں تو کیا یہ کبھی دینِ قیم ہو سکتا ہے؟ امتِ واحدہ میں فرقے کیوں ہیں؟ وہ اس لیے کہ مختلف انسانوں کے قوانین پہ چل رہے ہیں۔

یہ فقہ بندی مملکتِ خداوندی میں بغاوت کے مترادف ہے

عزیزانِ من! یہ مملکتِ خداوندی میں بغاوت ہے، یہ خدا کی مملکت میں خدا کے علی الرغم انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع عمل کر رہے ہیں۔ شرک کا لفظ تو چھوڑ دیجیے، یہ خدا کے خلاف بغاوت ہے کہ ہم تمہیں حاکم مطلق نہیں مانتے بلکہ فلاں امام کو مانتے ہیں۔ یہ بغاوت ہے۔ شرک کے معنی ہی بغاوت کے ہیں۔ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا (30:32) انہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود بھی پھر ایک گروہ بن گئے۔

آخر فرقہ واریت کے اس شرک کو مٹانے کا کیوں خیال پیدا نہیں ہوتا؟

کہا کہ پھر یہ کیسے ہوتا ہے؟ مختلف عقائد، مختلف مسالک کے بارے میں کیوں تجسس پیدا نہیں ہوتا کہ پرکھ کر دیکھ لیں کہ کونسا ٹھیک ہے اور کونسا غلط ہے؟ اس کے لیے کہا کہ انسان کی نفسیاتی کیفیت ایسی ہے کہ جب یہ کسی ایک مسلک کو عقیدے کو اختیار کر لیتا ہے تو پھر کُلِّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (30:32) ہر ایک اس میں مگن ہو جاتا ہے کہ ہم جس مسلک کے اوپر ہیں، یہی ایک سچا ہے اور باقی جھوٹے ہیں۔

فرقہ واریت کی اس مہلک بیماری سے نجات حاصل کرنے کا طریق

یہ جو بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ہے، یہ ہے بنیادِ فرقوں کے مستحکم رہنے کی کہ یہ ٹوٹنے نہیں پاتے۔ اگر کبھی یہ تجسس پیدا ہو جائے کہ بھئی! اس پہ تو سر دست میں پابند رہتا ہوں لیکن کچھ دیکھ تو لوں، تحقیق تو کر لوں کہ یہ ٹھیک ہے یا کوئی دوسرا بھی ٹھیک ہے۔ کبھی یہ تجسس پیدا ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ انسان کسی دوسرے کو بھی دیکھ لے کہ وہ زیادہ سچا ہے یا ہم۔ تو پھر ہو سکتا ہے کہ اس پہ انسان پہنچ جائے کہ صاحب! بغیر فرقوں کے دینِ قیم کی زندگی بسر کرنا اسلام ہے۔ پھر میں ”میں“ کو بیچ میں لے آؤں گا۔ یہ جو فقیر آپ کے سامنے ^① کھڑا ہے، یہ اسی راستے سے یہاں پہنچا ہوا ہے۔ میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں ہے، میرا اپنا کوئی فرقہ نہیں ہے لیکن چونکہ ان کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی اس لیے آپ نے ان کی زبانوں سے ایک فرقہ پرویزی بھی سنا ہوگا۔ فرقہ پرویزی کا تو کوئی وجود نہیں البتہ فرقہ پروازی ہے، کوئی ہوائی سی بات ہے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ جس شخص کی عمر یہ کہتے ہوئے گزر گئی کہ دین میں تفرقہ شرک ہے کیا وہ فرقہ پیدا کر لے گا؟ نہیں، قطعاً نہیں۔

① یہ اشارہ پرویز کا اپنی طرف ہے۔

فرقہ پیدا کرنا خدا کے ساتھ بغاوت ہے

عزیزانِ من! یہ کچکا دینے والی بات ہے کہ یہ جو فرقے کی طرف نسبت ہے، یہ خدا کے ساتھ بغاوت ہے۔ آپ میں یا مجھ میں یہ توفیق تو نہیں کہ ہم ایسا معاشرہ یا ایسی مملکت قائم کر لیں کہ جس میں فرقے کا وجود نہ ہو، دین حنیف ہو، منہجین الیہ ہو، و اتقوا ہو، الصلوٰۃ ہو اور امت واحدہ ہو لیکن کم از کم اتنا تو ہو کہ اپنی ذات تک تو یہ کرے کہ میں اس شرک سے مبرا ہوں۔ عزیزانِ من! اتنا تو کر لیجیے۔ سوال تو یہاں یہ ہوتا ہے کہ آپ کون ہیں؟ جی میں مسلمان ہوں۔ ”کیہڑے مسلمان ہو؟“^① جی سنی مسلمان ہوں۔ ”کیہڑا سنی مسلمان؟“^② جی وہ اہل فقہ مسلمان ہوں۔ ”کیہڑی فقہ دا مسلمان؟“^③ جی وہ فقہ حنفی کا مسلمان۔ ”فقہ حنفی وی تے دوہیکے نیں دیوبندی ہو یا بریلوی؟“^④

شرک تو کسی ایک جگہ رہتا ہی نہیں

عزیزانِ من! انسان رکتا ہے تو توحید کے اوپر کہ دوسرا نام آتا ہے تو شرک ہوتا ہے اور جب آپ شرک میں آجائیں تو آپ کے ہزاروں معبود ہوتے ہیں، پھر آدمی کسی جگہ پہ نہیں رکتا۔ جب شرک ہی اختیار کر لیا تو پھر چل سوچل والی بات ہو گئی۔ قرآن کہتا ہے کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ^⑤ (30:32) یہ ہے اس کا حال کہ تجسس، تحقیق، تنقید کا مادہ نہیں رہا۔

بنالہ شہر میں مذہبی مناظراتی ماحول اور ذاتی تحقیق و تجسس کا نتیجہ: پرویز

عزیزانِ من! زندگی کے آخری دن ہیں، یہ چیزیں جو اپنے ذاتی تجربے کی کہدینے کی ہیں، کہدوں۔ صرف یہ ایک تحقیق اور تجسس کی بات میرے اندر تھی جو مجھے اس مقام تک لے آئی ہے ورنہ ایک ٹھیٹھ قدامت پرست گھرانے کے اندر پیدا ہوا تھا۔ تصوف میں ڈوبا ہوا گھرانہ، میرے دادا کی آغوش میں میری تربیت ہوئی اور میری عمر کا آدھا حصہ اس طرح سے گزرا۔ بنالہ میرا شہر تھا اور وہاں ہر فرقہ تھا۔ وہ عجیب قسم کا شہر تھا اور قادیانیوں کے لیے تو کہا کرتے تھے کہ یہ جدہ ہے۔ وہ جدہ اس لیے تھا کہ اُس

① کونے مسلمان؟

② کونسا سنی مسلمان؟

③ کس فقہ کا مسلمان؟

④ فقہ حنفی بھی تو دو ہیں۔ دیوبندی ہو یا بریلوی؟

⑤ فرقوں میں بٹ جانے کے بعد حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ جس طریق پر ہم چل رہے ہیں وہی حق و صداقت کی راہ ہے اس لیے وہ اپنے آپ میں گن ہو کر بیٹھ جاتا ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص-937)۔

زمانے میں ریل قادیان نہیں جایا کرتی تھی بلکہ بٹالہ تک ہی رہتی تھی۔ اور ہماری کیفیت یہ تھی کہ اسکول سے چھٹی ملی ہم نے بستے وغیرہ ادھر رکھے اور اسٹیشن پہنچ گئے۔ اسٹیشن پہ ایک ہی گاڑی آیا کرتی تھی اور ہمیں پتہ تھا کہ کب آتی تھی۔ یہ جب بھی اُس میں سے اترے اور ہم کراماً کاتبین کی طرح دائیں بائیں ہولیتے تھے۔ وہاں سے قادیان کے لیے جوتا نگہ ملتا تھا اُس کا ایک میل کا فاصلہ تھا اور مجبوراً ان کو پیدل چلنا پڑتا تھا۔ وہ چل رہے ہیں اور ہم ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ مناظرے کی کیفیت یہ تھی۔ ہم قادیان میں جا کر جلسے کیا کرتے تھے، ہم نے یونین بنائی تھی جو قادیان میں جا کر جلسے کیا کرتی تھی۔ پھر شیعوں کے ساتھ مناظرہ، وہابیوں کے ساتھ مناظرہ، دوسرے مسلک کے ساتھ مناظرہ۔ اس طرح سے جو شخص مذہب پرستی کے تقدس کے اندر ڈوبا ہوا ہو تو اُس میں سے نکل آنا کس قدر مشکل تھا۔ مجھ میں صرف ایک چیز تھی کہ تنقید کا مادہ تھا کہ جب تک میں خود مطمئن نہ ہو جاؤں، میں اُسے تسلیم نہیں کرتا تھا۔ جو ابتدائی دور تھا، اُس میں تو دادا وغیرہ کا، سب کا، سایہ سر پہ تھا اس لیے زبان پہ نہیں لاتا تھا لیکن اندر یہ ایک خلش کی سی چیز تھی۔

انسانی سوچ کی نشوونما کے لیے غور و فکر کی آبیاری کرنا ضروری ہے

یاد رکھیے، ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے تنقید کا مادہ، تجسس کا مادہ۔ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس چیز سے نوازا ہے تو اسے مرنے نہ دیجیے، اسے زندہ رکھیے، اجاگر کیجیے اور آگے بڑھائیے۔ لیکن پھر آگے چل کر تنقید و تجسس کی اس کشتی کے لیے کوئی ایک لنگر ہونا چاہیے۔ اُس نے کہا ہے کہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (30:32) جو بھی اُن کے پاس ہے وہ اُس پہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ معلوم کیسے ہو کہ ان میں سے کوئی چیز سچی ہے اور کوئی غلط ہے۔ ہر ایک تو اپنے آپ کو سچا کہتا ہے۔ مناظروں سے یہ بات ہزار برس سے طے نہیں ہو سکی۔ عزیزانِ من! مناظروں سے یہ طے نہیں ہو سکا کہ رمضان میں آٹھ تراویح پڑھنی ہیں یا بیس پڑھنی ہیں۔ وہ اس لیے نہیں طے ہو سکا کہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ بھی ہے ہر ایک اُس پہ مگن ہے۔ عزیزانِ من! پہلی شرط یہ ہے کہ اُس میں مگن نہ رہے۔ قرآن ساری دنیا کو چیلنج دیتا ہے کہ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (2:111) اگر اپنے دعوے میں سچے ہو تو دلیل لاؤ، میں بھی دلیل پیش کروں گا۔ عزیزانِ من! بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ سے نکلنے کے بعد وہ کوئی چیز ہے جس کو آپ دلیل کہیں گے۔ یعنی اس کے لیے انسانوں کے پاس جو کچھ ہے وہ تو معیار ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تو ہر انسان اپنے آپ کو کہتا ہے کہ میں سچا ہوں۔ انسانوں سے باہر کوئی چیز ہونی چاہیے Objective Standard (خارجی معیار) ہونا چاہیے کہ جس پہ سارے جا کر اپنے اپنے مسلک پہ پہنچیں۔ بازار میں دوکانداروں کے جو یہ باٹ ہوتے ہیں، وہ جو انسپکٹر آتا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے، یہ جھوٹا ہے تو وہ کیسے ثابت کرتا ہے؟

جھوٹے اور سچے کو پرکھنے کے لیے ایک معیار کا ہونا ضروری ہے

اُس کے پاس ایک Standard Weight (معیاری وزن/باٹ) ہوتا ہے، وہ دوکانداروں کے باٹوں میں سے نہیں ہوتا بلکہ خارج میں ہوتا ہے وہ اُس کے ساتھ تول کر ایک ایک باٹ کو بتا دیتا ہے کہ یہ ٹھیک یا غلط ہے۔ وحی کی ضرورت اس لیے ہے کہ انسانی فکر کی پیدا کی ہوئی جو شے ہوگی وہ جو اُس فکر کا خالق ہوگا، جو اُسے مانے گا وہ اسی کو سچا مانے اور وہ جذباتی چیز ہوگی، وہ تنقید نہیں کرے گا۔ ایک خارجی اسٹینڈرڈ (معیار) ہونا چاہیے، یہ وحی Objective Standard (معروضی معیار) ہے۔

قرآن حکیم کو اپنا امام تسلیم کیے بغیر فرقے ختم نہیں ہو سکتے

وحی کی خصوصیت یہ ہے کہ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ (53:3) یہ رسول کی اپنی فکر کی تخلیق نہیں ہے بلکہ یہ منزل من اللہ ہے۔ یہ ہے ایک اسٹینڈرڈ، فرقے مٹنے کا طریقہ، یہ ایک اسٹینڈرڈ ہے۔ سچ اور جھوٹ کے پرکھنے کا جو معیار ہے، وہ اپنا اپنا مسلک نہ رکھا جائے بلکہ قرآن کو رکھا جائے۔ جو اس کے مطابق صحیح نکلتا ہے اُس کو سچا مانا جائے، جو اس کے خلاف جاتا ہے اُس کو غلط قرار دے دیا جائے۔ اور چونکہ اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مجھ میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے اس لیے یہ دو متضاد چیزوں کو سچا قرار نہیں دے سکتا۔ جسے یہ سچا قرار دے گا وہ واحد ہوگی اور جو اُس کے پیروکار ہو جائیں گے وہ امت واحدہ بن جائیں گے۔ لیکن جب تک ہم مشرکین میں سے رہیں گے تو اس طرف آ ہی نہیں سکتے۔

عزیزانِ من! ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ یعنی ایک امت جس میں کوئی تفرقہ نہیں، ایک نظریہ زندگی جس میں کوئی تفریق اور اختلاف نہیں، کوئی فرقہ نہیں، کوئی الگ الگ قوانین نہیں، ایک مملکت خداوندی اور اُس کے اندر ایک ہی خدا کا قانون ہے جو جاری و ساری ہے۔ تمام وہاں کے رہنے والے وہ ہیں جنہوں نے اُس مملکت کو تسلیم کیا ہے۔ اُس قانون کے ماننے والے، اتباع کرنے والے ایک امت امت واحدہ ہیں۔ یہ ہے ذلک الدین القیم۔

خدائے رحمن کی تخلیق کردہ کائنات میں اختلاف تو کیا اس میں تو کہیں دراڑ نہیں، درز بھی نہیں

عزیزانِ من! خدائے رحمن کی تخلیق کردہ کائنات اور اس کے کائناتی قانون کے اندر اختلاف نہیں ہے۔ بڑی چیز جو قرآن نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ تَبَرَّكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ^① (67:1)۔ پھر اگلی ہی آیات میں کہا

① وہ ذات جس کے قبضہ قدرت میں تمام کائنات کا اقتدار ہے کس قدر فراوانیوں اور خوشگوار یوں کی مالک اور ثبات و استحکام اور نشو و نما عطا کرنے کی ضامن ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہر شے کے اندازے اور پیمانے (قوانین) مقرر کر رکھے ہیں جن پر اسے پورا پورا کنٹرول ہے (پروریز: مفہوم القرآن، ص 1338)

کہ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَوَاتٍ طِبَاقًا ط مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِن تَفَوتٍ (67:3) خدا کی جو تخلیق ہے اس میں خدا کا قانون کارفرما ہے جاؤ اور اُس میں دیکھو۔ اختلاف تو ایک طرف اس میں تفاوت بھی تمہیں کہیں نظر نہیں آئے گا۔ اختلاف تو بڑی چیز ہوتی ہے وہ تو بین نظر آتا ہے۔ تفاوت ہوتا ہے کہ ملتی جلتی ہوئی چیز ہوتی ہے اُس میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ اس کے لیے کہا کہ مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِن تَفَوتٍ ① (67:3)۔ یہ بات نہیں کہ ہم نے کہہ دیا اور تم نے مان لیا۔

انسان کی نگاہ اس کا رخانہ قدرت میں کہیں کوئی کمزوری یا کمی محسوس نہیں کر سکے گی

اس کا طریقہ یہ ہے کہ فَارْجِعِ الْبَصَرَ لَا هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ (67:3) اپنی نگاہ کے پرندے کو کاشانہ چشم سے باہر نکال کر اس فضا میں پھینکو؛ نگاہ سے کہو کہ ایک ایک چیز کو جاؤ دیکھو بھالو پڑھو؛ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ (67:3) اور اس سے پوچھو کہ کہیں تمہیں اس کے اندر کوئی سلوٹ بھی نظر آئی ہے۔ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ (67:4) پھر اس کو بھیجو کہ شاید پہلے غلطی لگ گئی ہو۔ دیکھا کہ سچے کی جرات کتنی ہوتی ہے کہ پھر اس کو بھیجو۔ يَنْقَلِبُ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ (67:4) بار بار بھیجو ہزار بار بھیجو؛ نگاہ تھک جائے گی لیکن کائنات میں کوئی اختلاف نظر نہیں آئے گا۔ داماندہ و در ماندہ نگاہ واپس آ جائے گی لیکن اس میں کوئی اختلاف نظر نہیں آئے گا۔ ② یہ ہے ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (30:30) - عزیزانِ من! یہ ہے دینِ قیم جو قرآن نے دیا ہے۔ یہ ہے تو آپ اُسے اسلام کہیں گے۔ اگر یہ نہیں ہے تفرقہ ہے اختلاف ہے تفاوت ہے تو اسلام نہیں ہے شرک ہے۔ سورۃ الروم کی آیت 32 تک ہم آگئے 33 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط

.....

① تم یہاں سے وہاں تک دیکھ جاؤ۔ تمہیں خدائے رحمان کی تخلیق کردہ کائنات میں کہیں بے ترتیبی یا عدم تناسب نظر نہیں آئے گا (پرویز: مفہوم القرآن ص-1339)۔

② ان آیات کی مکمل تشریح و توضیح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2006 ص-33 تا 43۔

چھٹا باب : سورة الروم (آیات 33 تا 39)



عزیزانِ من! آج ستمبر 1979ء کی 21 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الروم کی آیت 33 سے ہو رہا ہے:

(30:33)

نوعِ انسانی کے لیے دینِ خداوندی خارجی کائنات کی مانند متوازن و متناسب بھی ہے اور محکم بھی موضوعِ مسلسل چلا آ رہا ہے۔ تجدیدِ یادداشت کے لیے یہ عرض کر دوں کہ قرآن نے یہ کہا تھا کہ ذَلِكَ الَّذِي الْقِيَمُ (30:30) یہ ہے انسانوں کے لیے محکمِ نظامِ زندگی جسے الدین کہا گیا ہے۔ وہ الدین کیا تھا جسے کہا گیا ہے کہ وہ خود قائم ہے اور تمہیں قائم رکھنے کا ذریعہ ہے متوازن ہے متناسب ہے اُس میں اعتدال ہے لغزش نہیں لرزش نہیں لڑکھڑاہٹ نہیں۔ بات یہاں سے شروع ہوئی۔ کہا کہ اس خارجی کائنات میں دیکھیے۔ سامیں تیرنے والے یہ بڑے عظیم الشان گڑے ہیں یہ اختلافِ لیل و نہار ہے یہ ٹکونرِ شمس و قمر ہے یہ خزاں اور بہار کے موسم ہیں اس تمام کائنات کا ایک ایک ذرہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ سب

قانون کے تابع زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اسی لیے اس میں کوئی اختلاف نہیں، تفاوت نہیں، جھول نہیں، سلوٹ نہیں کیونکہ یہ قانون کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں، قانون کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ الدین القیم میں پہلی بات تو یہ آگئی کہ یہ قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے۔ اگلی بات یہ کہی کہ یہ قوانین ان کے اپنے بنائے ہوئے نہیں ہیں بلکہ منزل من اللہ ہیں، خدا کی طرف سے دیئے گئے ہیں۔ تم دیکھو کہ اس کائنات کا سلسلہ کس حسن و خوبی اور نظم و نسق سے چل رہا ہے۔

مادی کائنات کا ایک ایک ذرہ انسانی زندگی کی ارتقائی منزل کی شہادت ہے

پھر اگلی چیز یہ ہے کہ اس کائنات کے اندر سلسلہ ارتقا جاری ہے۔ ہر شے پہلے دن سے بنی بنائی ہوئی، تکمیل تک پہنچی ہوئی نہیں ہوتی، ایک لائف سیل جو Naked Eye (صرف خالی آنکھ) سے نظر بھی نہیں آتا، وہ کروڑ در کروڑ ارب در ارب سالوں سے ارتقائی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے اور بالآخر جا کر ان شکلوں پہ آ جاتا ہے جس کو انسان کہتے ہیں۔ یہ ہے الدین القیم۔ پھر اگلی آیت میں یہ کہا تھا کہ خدا نے اپنے اختیارات کسی کو تفویض (Delegate) نہیں کیے، انہیں سونپ نہیں دیئے کہ لو بھی! تم اب ان قوانین کو چلاؤ، ہم آرام سے بیٹھتے ہیں۔ الدین القیم کو دیکھتے چلے جائیے۔ اور اُس کے بعد کہا کہ انسان بھی اُسی طریقہ تخلیق کے مطابق پیدا کیا گیا ہے جس کے مطابق کائنات کی تمام اشیا ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ کائنات کی اشیا کو اختیار اور ارادہ نہیں دیا گیا، ان کے سامنے Two Possibilities (دو ممکنات) نہیں ہوتیں، ایک ہی قانون ہوتا ہے اور اُس پہ چلنے کے لیے وہ مجبور ہوتے ہیں، اُس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے کو ان کی فطرت کہتے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے انسان کو فطرت کی قید سے آزاد کرتے ہوئے اختیار و ارادہ کی نعمت سے نوازا ہے

انسان کی کوئی فطرت نہیں ہے، اسے اختیار دیا گیا ہے، دو راستے دکھا دیئے گئے ہیں۔ یاد رکھیے! جب بھی Two Possibilities (دو ممکنات) سامنے آئیں گی تو وہ انسان ہوگا۔ اس کے نظام کے اندر بھی جب اس کے سامنے کوئی Possibility (امکان) نہیں رہے گی ایک ہی بات اس سے منوائی جائے گی تو یہ حیوان کی سطح کے اوپر آ جائے گا۔ لیکن کہا کہ یہ چوائس (اختیار) ہی کی تو بات ہے کہ جس سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر اپنے جذبات، اپنی مفاد پرستی، اپنی اغراض کے مطابق یہ اپنا چوائس (اختیار) Exercise (اختیار) کرے گا تو تباہی ہے۔ اور اگر ہر فرد، ہر گروہ، ہر ملک یہ کرنے لگ جائے تو تباہی ہے، ٹکراؤ ہے، بربادی ہے۔ اس کا علاج کیا ہے؟ اس کا علاج وہی ہے جو کائنات میں ہے کہ خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع اپنے اختیار کے ماتحت زندگی بسر کرنا۔ اور یوں فرق آ گیا۔ اس راستے کو خود انتخاب کرنا کہ خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع

میں زندگی بسر کرونگا۔ یہ ہے الدین القیم۔

خارجی کائنات نے اپنے ہاں خود ساختہ فقہی نظام سے آزادی حاصل کر رکھی ہے

اگلی چیز نظام کائنات میں یہ ہے کہ یہ نہیں ہے کہ اُن میں کسی نے کسی ایک کا قانون اختیار کیا ہو، دوسرے نے کسی دوسرے کا اختیار کیا ہو، یہ فقہ حنفی پہ چل رہا ہو اور وہ فقہ مالکی پہ چل رہا ہو۔ وہاں تو تمہیں یہ چیز نظر نہیں آئے گی، وہاں تو تمہیں صرف قوانین خداوندی نظر آئیں گے۔ کہا کہ دیکھنا اگر تم نے اپنے لیے یہ طے کیا ہے کہ ہم نے ان قوانین کے تابع چلنا ہے تو پھر کسی دوسرے کے قانون کو اس کے ساتھ شریک نہیں کرنا۔ جو نبی تم نے یہ شرک کیا تو ٹکراؤ پیدا ہوگا اور فساد ہی فساد برپا ہوگا: وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ (30:31-32)۔ عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ دینِ قیم کس طرح سے بیان کیا جا رہا ہے۔ نظامِ مصطفیٰ، دینِ خداوندی، شریعتِ الہیہ تو یہ اَسْمَاءُ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَأَبَاؤُكُمْ (53:23) یہ کچھ نام ہیں، کچھ اصطلاحات ہیں جو تم نے اور تمہارے بڑوں نے وضع کر رکھی ہیں۔ یہ نہیں بلکہ الدین القیم یہ ہے جو اس نے بتایا ہے۔ کہتا ہے کہ اس کو اختیار کرنا ہے تو پھر یہ بھی یاد رکھو۔ جو ارتقا کا نظریہ ہے اور اب تو نظریہ نہیں ہے بلکہ حقیقت کے طور پہ سامنے آ گیا ہے اُس کی ایک بنیادی چیز Struggle for Existence ہے جہد لبقا یعنی زندہ رہنے کے لیے جدوجہد ہے۔

لفظ ”ابتلا“ کا قرآنی مفہوم

قرآن اس کے لیے ایک عجیب لفظ استعمال کرتا ہے جسے ابتلاء کہا جاتا ہے اور ہم نے اُس کا ترجمہ آزمائش کیا اور اُس کے بعد پھر اُسی راستے کے اوپر پڑ گئے۔ دین مذہب میں بدلا اور ہم نے کہا کہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے۔ یعنی وہ دیکھتا ہے کہ تم کیسے ہو۔ یعنی اُسے پتہ نہیں ہے۔ ابتلاء یہ نہیں ہے بلکہ ابتلاء کے معنی ہوتے ہیں ”اپنے آپ کو ٹیسٹ کرنے کے لیے مواقع بہم پہنچانا“۔ بیماری اس بات کے لیے ہوتی ہے کہ ٹیسٹ کیا جائے کہ اس مریض کے اندر قوتِ مدافعت کتنی ہے، یہ اُس کی قوتِ مدافعت کا ٹیسٹ ہوتا ہے۔

خواہ کوئی قوم ہو یا کوئی Species (انواع) ہوں آگے وہی بڑھتی ہے جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو یہ ابتلاء مقابلے میں ٹکراؤ میں اپنے آپ کو ٹیسٹ کرنا ہے، یہ آزمائش خدا نہیں کرتا بلکہ وہ تمہیں موقع بہم پہنچاتا ہے کہ تم اپنی آزمائش کر کے دیکھ لو کہ تمہارے اندر قوتِ مدافعت کتنی ہے۔ جو بھی راستے میں رکاوٹ آئے گی اگر اُس ٹکراؤ میں غالب آنے کی بات ہے تو زندہ بھی رہو گے اور آگے بھی بڑھو گے۔ یہ قانون ہے، یہ دینِ قیم ہے۔ فطرت میں یہ چیزیں جو آج نظر آ رہی ہیں یہ

وہی ہیں جو مختلف مراحل پر جب ٹکراؤ آیا تو اُس ٹکراؤ میں ان کی اپنی قوتِ مدافعت غالب آگئی، وہ جو راستے کی رکاوٹ تھی وہ ہٹ گئی، وہ زندہ رہا اور اُس کے بعد ایک قدم آگے بڑھا۔ یوں بڑھتے ہوئے یہ جو اشیا آج نظر آتی ہیں یہ اس طرح سے ہیں۔ اس دوران میں اس راستے میں لاکھوں کروڑوں اربوں ایسی Species (انواع) تھیں جن کا آج پتہ بھی نہیں چلتا۔ وہ جو ان کے پنجر اور ڈھانچے ملتے ہیں تو وہ نشان دیتے ہیں کہ یہ بھی کبھی Exist (زندہ رہا) کرتی تھیں۔ یہ لکڑی چیزیں تھیں؟ یہ وہ تھیں جو ٹکراؤ میں پوری نہ اتریں۔ کہا کہ انسانوں کی بھی یہ کیفیت ہے کہ یہ کبھی کبھی ہمارے قوانین کے اوپر آتے جاتے ہیں لیکن کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا آذَقَهُمْ مِنْهُ رَحْمَةً إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ① (30:33) جب ان کے اوپر کوئی کسی قسم کی نامساعد چیز آتی ہے مصیبت آتی ہے تو اُس وقت تو ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ خدا یاد آتا ہے:

جب کیا تنگ بتوں نے تو خدا یاد آیا

انسانی سوچ کی کم ظرفی

جب اُس کی طرف سے کوئی آسائش مل جاتی ہیں تو پھر وہ کہتے ہیں کہ جناب! میں نے یہ کیا، میں ان کے پاس گیا اور انہوں نے میری مدد کی۔ یعنی اب جو سارا کریڈٹ ہے یا تو خود لیے چلا جا رہا ہے یا وہ جو ساتھ والے ہیں ان کو دیئے چلا جا رہا ہے۔ وہ جو قانون کی بات تھی وہ ختم ہوگئی۔ وہ یہ کیوں کرتا ہے؟ یہ کیوں نہیں کہتا کہ بِمَا آتَيْنَاهُمْ (30:34) ہم نے انہیں دیا تھا۔ یہ ہے اصل میں اس کیوں کا جواب۔ ہم نے جو کچھ دیا تھا بجائے اس کے کہ یہ کہے کہ یہ بات ٹھیک ہے کہ یہ خدا کا دیا ہوا ہے اُس کے قانون کے مطابق میسر آیا ہے۔ یہاں کہا کہ اگر وہ کہے کہ خدا نے دیا ہے تو پھر خدا کے کہنے کے مطابق اُسے صرف کرنا پڑے گا۔ اب قرآن کریم کہتا ہے کہ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ② (30:34)۔ کفر کے معنی ہوتا ہے کہ ”کسی چیز کو چھپا کے رکھنا“۔ کفرانِ نعمت کرنا جس کا ترجمہ ہم نے ناشکری کر دیا تو اس سے بات ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ کہا کہ اُس وقت کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ (30:34) جب ہماری طرف سے ملتا ہے اُس کو چھپا کر رکھ رہا ہے۔ کہا کہ کوئی بات نہیں۔ فَتَمَتَّعُوا (30:34)

① جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنی تمام توجہات کو خدا کی طرف مرکوز کر کے اُس سے دعائیں مانگتے ہیں اور جب اس کی طرف سے سامانِ کشائش مل جاتا ہے تو ان میں سے ایک گروہ اپنے نشوونما دینے والے (خدا) کے اقتدار و اختیار میں دوسروں کو بھی شریک کرنے لگ جاتا ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 937 تا 938)۔

② اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اسے دبا اور ڈھانپ کر اپنے لیے مختص کر لیں اور اس طرح کفرانِ نعمت کریں (پرویز: مفہوم القرآن، ص 938)۔

ٹھیک ہے چھپا کر رکھو! اپنی ذات کے لیے رکھو! اپنے آپ کے لیے رکھو! اپنے اوپر خرچ کرو اور یہ سمجھو ہی نہیں کہ اس میں کسی اور کا حق بھی ہے۔ اُس نے تو یہ اس طرح سے صرف کرنے کے لیے دیا تھا۔ یہ تو یوں سمجھو کہ میں تو پوسٹ مین تھا جو منی آرڈر کے روپے لے کر وہاں سے چلا تھا کہ ہر ایک کو اُس منی آرڈر کے مطابق بانٹنا چلا جاؤں! میرا حصہ تو اُس میں وہ تنخواہ ہے جو اُس نے مقرر کی تھی۔ یہ ہے قانون۔ اب تم نے یہ نہیں کیا اس لیے ایسے لوگوں سے کہہ دو کہ تم اس سال سامانِ زندگی سے کچھ وقت کے لیے فائدہ اٹھا لو فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ^① (30:34)۔ یہ بات نہیں ہے کہ کوئی اوپر چپک کرنے والا نہیں ہے۔ یہاں سوف کا لفظ آیا ہے۔ مثلاً کے نزدیک تو سوف آتا ہی نہیں ہے! ان کے ہاں عربی زبان میں ہی نہیں ہے۔ سَوْفَ تَعْلَمُونَ (30:34) کے معنی ہوتا ہے کہ ابھی معلوم ہو جائے گا! جلدی معلوم ہو جائے گا! ابھی یہ بات سامنے آجائے گی! بات یہیں سامنے آجائے گی۔ بس تم فتمتعوا (30:34) ٹھیک ہے چار دن کے لیے عیش اڑاؤ! پھر دیکھو کہ بات کیسے سامنے آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ (30:34) ہمارا جو دیا ہوا ہے یہ اُس کو چھپا چھپا کر رکھتا ہے۔

انسان ضرورت سے زیادہ جو کچھ چھپاتا ہے اس کی سند قرآن حکیم میں نہیں ملتی

یاد رکھو! جو لوگ ہمارے قانون اور اقتدار میں دوسروں کو بھی شریک سمجھتے ہیں! وہ یہ کچھ اپنے خود ساختہ تصورات کے مطابق کرتے ہیں! ان سے صرف یہ پوچھو کہ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُمْ يَنْتَكِبُوْنَ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ (30:35) یہ جو تمہاری روش ہے کہ جسے ہم نے ربوبیتِ عالمینی کے لیے دیا تھا! اُسے جو تم سمیٹ کر اپنے لیے رکھتے ہو! اور پھر اُس کو ڈھانپتے ہو! چھپاتے ہو! تو کیا اس کے لیے ہماری طرف سے تمہارے پاس کوئی سند ہے؟ اُس کی طرف سے سند ہونی چاہیے! فقہ کے قوانین نہیں ہونے چاہئیں! وہ تو تمہارے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔ دینِ قیم میں پہلی چیز ہم نے یہ دیکھی ہے کہ کائنات کی کسی شے نے خود وہ قانون نہیں بنائے جن کے اوپر وہ چل رہی ہے۔ جو نبی خود ساختہ قوانین کی بات آگئی تو وہ جو نظام اور دینِ قیم ہے وہ ختم ہو گیا۔ اب اُس تقلید کے لیے جو جی میں آئے نام رکھ لیجیے۔ یہ تو بس اَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَاَبَاؤُكُمْ^② (53:23) ہے۔ کائنات میں ہمارا نظام اور قانونِ فطرت ہے۔ کائنات کی کسی چیز سے پوچھو کہ کیا یہ قانون تم نے خود بنایا ہے جس کے اوپر چل رہے ہو؟ کہا کہ ان سے پوچھو تو سہی کہ یہ جو روش یوں اختیار کر رہے ہو کیا اس کے لیے تمہارے پاس ہماری طرف سے دی ہوئی کوئی سند ہے؟

① اس کے بعد تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری اس غلط روش کا انجام کیا ہوتا ہے! (پرویز: مفہوم القرآن ص۔ 938)۔

② یاد رکھو!..... (یہ) اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اسلاف نے رکھ چھوڑے ہیں (7:71) (پرویز: مفہوم القرآن ص۔ 1241)۔

آخر میں قولِ فیصل یہ ہوا کہ جس چیز کو اب دین کے نام سے پیش کرتے ہیں اُس کے لیے خدا کی سند ہونی چاہیے۔ وہ ایک سائنسٹ^① ہے اُس کا بڑا عمدہ فقرہ ہے:

We only read the Book of Nature, we can't write it.

”ہم صحیفہٴ فطرت کو تصنیف نہیں کرتے بلکہ ہم تو صرف اُسے پڑھ سکتے ہیں۔“

قرآن تو ہمارا تصنیف کردہ نہیں ہے، ہم صرف اسے پڑھتے ہیں۔ اور جو نبی ہم نے کچھ اپنے جو تخلیق کردہ قوانین ہیں ان کو خدا کے قوانین بنا کر نافذ کرنے کی کوشش کی، تو یہ شرک ہو گیا۔

خدا تعالیٰ اپنے احکام خود ہی تحریر کرتا ہے، کوئی انسان اسے تحریر نہیں کر کے دیتا

انسان کیا کرتا ہے؟ کہتا ہے کہ ہم نے اس کتاب کو لکھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ چیز قرآن نے کہی ہے کہ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِاٰيٰدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (2:79) یہ خود قوانین وضع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔ کہا کہ اتمہارا استیلا ناس ہو، تمہیں اتنی جرأت ہو گئی ہے کہ خود لکھتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ قوانین جو آپ کے ہاں ”حدود“ کے نام سے نافذ ہوئے ہیں اور ”حافظ صاحب“ رو رہے ہیں کہ چل ہی نہیں رہے تو یہ انسانوں کے کسی دور کے بنائے ہوئے قوانین ہیں، نافذ کیے تھے تو ”صوفی صاحب“ کی طرف سے اعلان ہوا تھا کہ یہ جو مملکت کے عام قوانین بنتے تھے تو ان کی خلاف ورزی کرنے سے تو صرف مملکت کی سزا ملے گی لیکن یہ جو قوانین نافذ کیے گئے ہیں، یہ خدا اور رسول کے قوانین ہیں، ان کی یہاں بھی سزا ملے گی اور جہنم میں بھی جاؤ گے۔ اب اگلی چیز یہ آئی

نظامِ ربوبیت کے خدو خال اور اس کا عملی طریق تو پھر یہ بھوک کیوں؟

حقیقت یہ ہے کہ جب لوگ وحی کا دامن چھوڑ دیں تو ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وَ اِذَا اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۭۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ① (30:36) جب ہماری طرف سے یہ آسائشیں سامانِ رزق اور ربوبیت کی ساری نعمتیں جو کائنات میں بکھری ہوئی ہیں، ملتی ہیں تو وہ ان پر اتراتے ہیں۔ یہ جسے آپ فضا کہتے ہیں

① اس سائنسدان کا نام F.J. Sheen (شین) ہے اور اس کی اس کتاب کا نام Philosophy of Religion (1948) (فلسفہ مذہب) ہے۔

② جب انہیں سامانِ زندگی کی کسود حاصل ہوتی ہے تو وہ پھولے نہیں ساتے۔ اس پر اتراتے ہیں۔ لیکن جب انہیں خود اُن کے اپنے اعمال کی بدولت کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو خود زندگی کی طرف سے ہی مایوس ہو جاتے ہیں (یعنی ان کی طبیعت میں توازن اور اعتدال رہتا ہی نہیں)۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص-938)۔

یہ آپ کا سب سے بڑا ذریعہ رزق ہے۔ آپ زمین میں سے خدا کے قانون کے مطابق کھود کھود کر خزانے نکالتے ہیں۔ زندگی کے لیے جتنی چیزیں لایفک ہیں 'Indispensable' (ناگزیر) ہیں وہ اُس نے از خود دی ہوئی ہیں مفت دی ہوئی ہیں۔ یہ روشنی، یہ ہوا، یہ پانی، یہ حرارت، یہ زمین سے سارا رزق، یہ حیوانات، ان کے گوشت، ان کا دودھ، یہ نہریں، یہ سارا کچھ جتنا بھی ہے، یہ سب آپ لوگوں نے کہاں سے خریدا ہے؟ کس نے یہ پیدا کر کے دیا ہے؟ کاہے کے لیے یہ دیا ہے؟ قرآن حکیم نے بتایا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (1:1) یہ ربوبیتِ عالمینی کے لیے ہے پوری نوعِ انسانی کی نشوونما کے لیے ہے۔ کہا کہ یہ چیز ہماری دی ہوئی ہے۔ اس پہ اعتراض آجاتا ہے کہ صاحب! پھر یہ لوگ بھوکے کیوں مرتے ہیں اور آج تو WHO¹ بتا رہی ہے کہ دنیا کی کم از کم آدھی آبادی رات کو بھوکا سوتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر ربوبیتِ عالمینی کی یہ ذمہ داری اُس نے لے رکھی ہے تو اُس کی یہ آدھی مخلوق بھوکی کیوں سوتی ہے؟

تمام مصائب انسان کے اپنے پیدا کردہ ہیں، خدا کی طرف سے تو شر نہیں آیا

عزیزانِ من! یہ بڑا ہی اہم مقام آیا ہے۔ کہا ہے کہ یہ تو ہمارا دیا ہوا ہے جو کائنات میں بکھرا ہوا ہے اور یہ جو تمہارے ہاں اس قسم کی مصیبتیں آجاتی ہیں تو یاد رکھو! کہ وَاِنْ تُصِیْبُہُمْ سَیِّئَةٌۭۢ بِمَا قَدَّمْتُ اَیْدِیْہُمْ (30:36) ہر مصیبت جو تمہیں آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! وہ مسئلہ خیر و شر (Good & Evil) جو یونان کے حکما سے لے کر آج تک تین ہزار سال سے اربابِ فکر و نظر اور ساری دنیا کے لیے وجہ پریشانی بنا آ رہا ہے، حتیٰ کہ ایران میں مجوسیوں نے تو خیر اور شر کے لیے دو الگ الگ خدا بنا دیئے، ان کی سمجھ میں بات ہی نہیں آئی، قرآن نے آ کر پہلی بار اس کو حل کیا ہے۔ کہا ہے کہ بَیْدَکَ الْخَیْرُ (3:26) خدا کی طرف سے شر نہیں آیا، تخریب اُس کی طرف سے نہیں آئی، مصائب اُس کی طرف سے نہیں آئے بلکہ بَیْدَکَ الْخَیْرُ (3:26) خدا تو ہے ہی خیر بھیجے والا۔ یہ جو شر ہے اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ بِمَا قَدَّمْتُ اَیْدِیْہُمْ (30:36) یہ انسانوں کا اپنا لایا ہوا ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کا نظامِ حیاتِ اجتماعیت کی شکل میں نافذ ہوتا ہے

اب اس اپنے لائے ہوئے نظام میں ایک چیز ہے جہاں انسان پریشان ہوتا ہے۔ ایک فرد یہ سوچتا ہے کہ میں نے تو کچھ نہیں کیا

تھا، مجھ پہ کیوں مصیبت آپڑی ہے۔ قرآن فرد کی بات نہیں کر رہا بلکہ وہ اُس نظام کی بات کر رہا ہے جس کے اندر یہ فرد زندگی بسر کرتا ہے۔ کہا کہ تم نے اپنے ہاں غلط نظام قائم کیا ہوا ہے، وہ نظام قائم کیا ہے جس میں لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ (30:34) ہے۔ یعنی جو کچھ ہم نے ربوبیتِ عالمینی کے لیے دیا تھا تو جن کے پاس اقتدار ہے اور قوت ہے، وہ اسے سمیٹ لیتے ہیں، چھپا لیتے ہیں اور دبا لیتے ہیں، دوسروں کو نہیں دیتے۔ وہ دوسرا اس لیے بھوکا مر رہا ہوتا ہے۔ یہ اُس نظام کا قصور ہے۔ اور انسان نے تو معاشرے کے اندر زندگی بسر کرنا ہے۔ اگر نظام بہتر ہے تو اُس میں بھی ہر فرد کو آسائش ملتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایک فرد وہ سب کچھ کرے کہ جس کی وجہ سے اُسے یہ کچھ مل رہا ہے۔ یہ نظام کی برکات ہوتی ہیں۔

عزیزانِ من! الدین کی بات ہو رہی ہے۔ الدین تم قائم کرو جیسا کہ کائنات میں ہمارے قوانین کے تابع ہے تو خیر ہی خیر ہے۔ اور اگر تم اپنا وضع کردہ نظام قائم کرو تو اُس کے اندر تو یہ طبقات ہونگے، تفاوت ہونگے، فرد اور فرد میں، قوم اور قوم میں، ملک اور ملک میں، یہ سب کچھ ہوگا:

ہر گُرگ کو ہے بَرّہ معصوم کی تلاش! ^①

وہاں یہ کیفیت ہوگی۔

جب خدا کے نظام میں ناہمواری کے لیے انسان کا ہاتھ دخل انداز ہوتا ہے تو.....

اگر وہاں افراد پہ یہ مصیبتیں آتی ہیں تو یہ بات نہیں ہے کہ اُس کے بعد وہ وہاں بیٹھ کر رونے لگ جائے کہ او خدا نے یہ کیا کر دیا، بڑا ظلم ہو گیا۔ ارے خدا نے تو یہ نہیں کیا، یہ تو تم نے جو اپنے ہاتھوں سے نظام بنایا ہے، اُس کی وجہ سے یہ کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ یہ کتنا بڑا بنیادی اصول ہے کہ سَيِّئَةٌۭۢ بِمَا قَدَّمْتُ اَيُّدِيْهِمْ (30:36) ہر ناہمواری جو پیدا ہوتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں سے لائی ہوئی ہوتی ہے۔ جب ہم تک معاملہ ہوتا ہے جس میں ابھی یہ نظام نہیں آتا تو ہم تو بچے کو اُس کی پیدائش سے پہلے رحمِ مادر کے اندر سامانِ ربوبیت دیتے چلے جاتے ہیں۔ یہ نظام تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ وہ بچہ جو باہر آتا ہے تو ہوا پہلے سے موجود ہے جس میں وہ سانس لیتا ہے۔ زندگی کے سارے لوازمات ہمارے پہلے سے تیار کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور اُس کے بعد جب اُسے بھوک لگتی ہے تو ماں کی چھاتی میں ایک دن پہلے تک ایک قطرہ نہیں ہوتا لیکن بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی اُس میں دودھ اتر آتا

① غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش

ہر گُرگ کو ہے بَرّہ معصوم کی تلاش

(اقبال: ضربِ کلیم: ابی سینا)

ہے۔ کہا کہ جب تم اس کے اندر دخل اندازی کرتے ہو تو پھر وہ بھوکا مرنے لگ جاتا ہے۔ اس طرح سَیِّئَةً بِمَا قَدَّمْتُمْ إِلَيْهِمْ (30:36) ہے۔ ہرناہمواری جو اس نظام کے اندر لائی ہوئی ہوتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں سے لائی ہوئی ہوتی ہے۔ بَیْسِدْكَ الْخَيْرُ (3:26) ہمارے ہاتھ سے تو خیر ہی خیر ہے، ہم خدائے شریف نہیں ہیں۔

شروع شروع میں خرابیوں کی وجوہات اکثر نظروں سے اوجھل رہتی ہیں

اس میں ایک اور بڑی چیز ہے۔ نمایاں طور پر اسے بتانے کی ضرورت کیا تھی؟ خرابیاں، تخریبات ہوتی ہیں لیکن انسان متعین نہیں کر سکتا کہ یہ کس وجہ سے آئی ہیں۔ ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ان کی اپنی کارستانیوں ہیں، ان کی اپنی کثوت ہیں۔ یہ مقام جب آتا ہے تو پھر یہ جو کارستانیوں والے ہوتے ہیں وہ معاشرے کے اندر نگے اور برہنہ ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں اس سے پیشتر بھی معاشرے کے اندر بڑی خرابیاں تھیں لیکن متعین طور پر نہیں بتایا جاتا تھا کہ کن کی وجہ سے آئی ہیں۔ چند مہینوں کے لیے یہ لوگ اقتدار میں آئے اور جو کچھ انہوں نے کیا، اُس کے بعد باہر نکلے تو ایک ایک شخص کہہ رہا ہے کہ صاحب! یہ چور ہیں، انہوں نے یہ کیا، انہوں نے یوں بانٹا، انہوں نے یہ غلط کیا۔ یہ ہے بِمَا قَدَّمْتُمْ إِلَيْهِمْ (30:36)۔ بات نکھر کر سامنے آ گئی ہے: پہلے یہ چیز متعین نہیں ہوتی۔

برائی کے ذرائع کو فوری طور پر متعین شکل میں سامنے لانے کی ضرورت ہوتی ہے

ایسے مواقع آتے ہیں جس میں بِمَا قَدَّمْتُمْ إِلَيْهِمْ (30:36) سامنے آتا ہے اور جب متعین طور پر آتا ہے تو پھر کہتے ہیں کہ انہوں نے یہ کچھ کیا ہے اور پھر ان کے خلاف معاشرے میں نفرت پیدا ہوتی ہے۔ معاشرے میں اصلاح پیدا کرنے کی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ جس کے ہاتھوں سے تخریب یا ناہمواری کی کوئی چیز پیدا ہو اُس کے متعلق معاشرے میں متعین ہو جائے کہ یہ اس کی وجہ سے ہوا ہے، ورنہ ہر شخص اپنے آپ کو فریب میں رکھتا ہے کہ صاحب! یہ اللہ کی طرف سے دی ہوئی ہے، قسمت کا لکھا تھا۔ یعنی اُس کے اندر خود ذمہ داری نہیں لی، بہر حال دوسروں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں کہ معاشرہ ہی ایسا ہے۔ یعنی وہ معاشرہ جیسے کہیں باہر سے آیا ہوا ہوتا ہے اور یہ اُس کے فرد نہیں ہیں۔ ان کو پتہ نہیں ہے۔ معاشرہ تو عشر سے ہے۔ وہ جب تک ایک ہوتا ہے عشر یا دس کہلاتا ہی نہیں ہے، جو نبی اُس کے ساتھ آپ نے کچھ اور ملایا، وہ بنتا ہے عشر اور وہاں سے معاشرہ بنتا ہے۔ ہم معاشرے کو کوستے چلے جاتے ہیں۔ نہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس معاشرے میں ہم ایک ہیں یا ہم وہ زیرو ہیں تو ہمارے اوپر بھی تو ذمہ داری ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ بِمَا قَدَّمْتُمْ إِلَيْهِمْ (30:36)۔ جب بھی کوئی ناہمواری اور ناسازگار بات آئے تو کھڑے ہو کر یہ سوچو کہ ہمارے

ہاتھوں نے اس میں کیا کیا، ہم خود اس کے کس حد تک ذمہ دار ہیں۔ اور اس کے لیے تو بڑی جرأت کی ضرورت ہے اس کا اعتراف کرنے کی کہ ہم ذمہ دار ہیں۔

قصہ ابلیس و آدم کو ایک تمثیلی انداز میں بیان کرنے کا مقصد اور مدعا

درس میں کئی دفعہ یہ بات آچکی ہے کہ یہ جو قصہ آدم ہے وہ بات کیا ہے۔ ایک تصور ہے ایک نظریہ ہے جسے آدم کہہ کر پکارا ہے۔ اُس کے مقابل میں ایک اور ہے جسے ابلیس یا شیطان کہہ کر پکارا ہے۔ بات اتنی سی تھی کہ معصیت (قانون کی خلاف ورزی) آدم سے بھی ہوئی، معصیت شیطان یا ابلیس سے بھی ہوئی۔ یہ کوئی فرد نہیں ہے نہ آدم کوئی پتلا ہے نہ ابلیس کوئی بندہ کھلوتا اے ❶۔ یہ بتائی ہوئی بات اتنی ہے کہ قانون کی خلاف ورزی آدم سے ہوئی تو اُس سے پوچھا کہ تم نے یہ کیوں کیا۔ اُس نے کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا (7:23) میں ذمہ دار ہوں مجھ سے بھول ہوئی، سہو ہو گئی، غلطی ہو گئی۔ کہا کہ ٹھیک ہے تم نے ذمہ داری قبول ہے اس لیے تمہاری اصلاح کا امکان ہے، لویہ ایک ہدایت نامہ ہے یہ ایک قانون ہے اس کے مطابق زندگی بسر کرو گے تو یہ جو نقصان ہے اس کی تلافی بھی ہو جائے گی اور اس سے زیادہ بھی مل جائے گا۔ ابلیس کو جب کہا کہ تم نے یہ معصیت کیوں کی۔ کہنے لگا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں کون ہوں کرنے والا سب کچھ تو کرانے والا ہے تیرے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہلتا۔ کہنے لگے کہ اے کجبت! خود کرتا ہے اور ذمہ داری قبول نہیں کرتا اس لیے قیامت تک تیری اصلاح نہیں ہو سکتی۔ عزیزانِ من! یہ ہے قصہ آدم و ابلیس۔

اگر آپ ذمہ داری قبول نہیں کرتے تو کبھی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ کہا ہے کہ بِمَا قَدَّمْتُمْ آيٰدِيْهِمْ (30:36)۔ یہ ناہمواریاں اُن کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس پر کہا ہے کہ كَيْفِيَّتْ پھر یہ ہو جاتی ہے کہ اِذَا هُمْ يَفْقَطُوْنَ (30:36) خود زندگی کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ یہ جس کو مایوسی کہتے ہیں میں پھر اس چیز کو دہرا دوں، درس کہتے ہی اُس کو ہیں جس میں بار بار دہرانا پڑتا ہے۔ میں ہر بار یہ کہتا ہوں کہ یہ قرآن جو عربی زبان کے اندر ہے تو اس زبان میں بڑی خصوصیت ہے۔ جب یہ گہوں پک جاتا ہے کاٹ لیتے ہیں۔ اب تو یہ ٹریکٹر آ گئے ہیں ورنہ پہلے بیلوں کو اس کے اوپر سارا دن چلاتے رہتے تھے تاکہ وہ جو خوشوں کے اندر دانے تھے اُن میں سے چھلکا الگ ہو جائے اور دانے الگ ہو جائیں۔ یہ جو پردیس تھا یہ چھلکوں میں سے دانوں کو الگ کرنے کا جو طریق تھا اُس کے لیے یہ سارا دن بار بار اس پکے ہوئے گہوں پر پھرتے رہنا تھا۔ اسے عربی زبان میں درس کہتے ہیں۔ تو یہ جو چیز ہے کہ اس طرح سے چھلکوں میں سے دانہ الگ ہوتا ہے تو قرآن کا طریق ہی یہ ہے۔ یہ شیطان اور ابلیس آپ

قرآن میں دیکھیں گے کہ وہ شرکی ایک ہی قوت ہے، یہ دوا لگ الگ نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں لیکن ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں۔ ابلیس عربی زبان کے اعتبار سے مایوس کو کہتے ہیں اور شیطان سرکش کو کہتے ہیں۔

آج کی سائیکولوجی کے تحت قصہ ابلیس و آدم کو دیکھنا نہایت ہی ضروری ہے

یہ بات شاید بارہ سو سال تک سمجھ نہ آتی اگر آج کی سائیکولوجی (علم نفسیات) یہ نہ کہتی۔ آج کی سائیکولوجی (علم نفسیات) یہ بات کہتی ہے کہ جب کوئی انتہائی طور پہ مایوس ہو جاتا ہے تو مایوسی کا اگلا ردِ عمل سرکشی ہوتا ہے Aggression (جارحانہ رویہ) ہوتا ہے۔ وہ Aggression (جارحانہ رویہ) ہو جاتا ہے کہ جب اُس کے اوپر سارے راستے بند ہو جائیں۔ ملی کو کمرے کے اندر بند کر دیں اگر تھوڑی سی کھڑکی کھلی ہے تو وہ بھاگنے کا راستہ ڈھونڈتی ہے لیکن اگر وہ کھڑکی بھی بند ہو جائے تو اُس کے بعد پھر Aggressive (جارح) ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ باہر نکلنے کی طرف سے مایوس ہو گئی ہے اور Aggression (حملہ) پہ اتر آئی ہے اس کو شیطان کہتے ہیں۔

مایوسی کا نتیجہ ہمیشہ سرکشی کی شکل میں نکلتا ① ہے

کہا کہ جسے یہ یَقْنَطُونَ کہتے ہیں یہ مایوسی ہے۔ مایوسی اُس وقت ہوتی ہے جب کوئی راستہ نظر نہ آئے۔ قرآن کہتا ہے کہ راستہ ہو چاہے غلط ہی ہو تو انسان مایوس نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ چلنے دو تھوڑی دور جانے کے بعد خود ہی اس کو احتمال ہو جائے گا کہ یہ وہ راہ نہیں ہے جس پہ مجھے جانا ہے لیکن جب Blind Valley (بند وادی) میں آدمی پہنچتا ہے کہ سامنے راستہ ہی کوئی نہ ہو تو سوائے اس کے کہ وہ لکڑ مارے وہ کیا کرے گا۔ پھر وہ راستہ بنانے کے لیے توڑ پھوڑ کرے گا۔ پھر یہ ابلیس شیطان بنے گا۔ آدمی کے اندر کبھی یہ کیفیت پیدا نہیں ہونے دینی چاہیے کہ کسی کو کوئی راستہ ہی نہیں ملے۔ راستے بند کر دیئے جائیں تو پھر وہ اپنے لیے توڑ پھوڑ کر کے راستہ بناتا ہے۔ یَقْنَطُونَ مایوس ہوا۔ کس کی طرف سے ہوا؟ بِمَا قَدَّمْتُ أَيْدِيَهُمْ (30:36)۔ کیا تو اپنے ہاتھوں نے تھا لیکن مایوس یوں ہو گیا کہ یہ جو آپ قانون لیے پھرتے ہیں یہ خدا وغیرہ لیے پھرتے ہیں یہ کچھ نہیں ہے اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہمارا آج کا نوجوان یہاں پہنچا ہوا ہے۔ راستہ بند ہوا تو مایوس ہوا۔

① جو قارئین اس موضوع سے دل چسپی رکھتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب بڑی ہی پرازمعلومات ہے:

Shaffer, Lorraine Frederic and Shoben, Edward Joseph, Jr: The Psychology of Adjustment, Houghton Mifflin company Boston, 1956, pp.98-154.

نوجوان نسل کے مایوس ہونے کی وجہ

بہر حال یہ چیز چلی آ رہی تھی کہ مسلمان گھرانے میں تو پیدا ہوا تھا، یہ آوازیں کان میں آ رہی تھیں کہ اسلام میں ہر مشکل کا حل موجود ہوتا ہے، وہ بڑا صحیح ترین نظام ہے اور اس میں کبھی مایوسی نہیں آتی۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ اسلام کا اتنا چرچا ہے اتنا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا، آج تک سنتے چلے آ رہے تھے، جب ان سے پوچھتے تھے کہ پھر وہ اپنے نتائج کیوں نہیں برپا کرتا، تو کہا جاتا تھا کہ اُس کے نفاذ کی کوئی شکل ہی نہیں ہے۔ وہ عملاً نافذ نہیں ہو رہا، اس وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ یعنی فطرت کا یہ عجیب طریق ہے۔ متعین طور پہ نتیجہ پہ پہنچانے کے لیے اُس نے حالات ایسے پیدا کر دیئے کہ ان کو اسلام نافذ کرنے کے لیے مواقع میسر آ گئے اور انہوں نے اسلام نافذ بھی کر دیا۔ ڈھنڈورا پیٹ دیا، شرعی قوانین نافذ ہوئے۔ اُس نافذ ہونے کے بعد جو نتائج نکلے اس سے یہ نوجوان اسلام کی طرف سے مایوس ہوا ہے کہ یہ تھا اسلام

واعظ! نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب ٹھہور کی

(غالب)

اسلامی نظام کے نفاذ پر 11 فروری 1979ء کو صدر ضیاء الحق کا انٹرویو

عزیزانِ من! پاکستان میں قوانین نافذ ہو رہے ہیں^①، یہ 9 فروری 1979ء کو نافذ ہوئے تھے 11 فروری 1979ء کو صدر محترم^② نے امریکہ کے ٹی وی کو جو انٹرویو دیا تھا، وہ آیا تھا۔ انٹرویو کرنے والے نے اعتراض کیا تھا کہ آپ نے یہ جو سزائیں اس دور کے اندر نافذ کی ہیں یہ سزائیں ناممکن العمل ہیں آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ تو انہوں نے اسے جواب میں کہا تھا کہ تم خواخوہ ان سزاؤں کو دیکھ کر ڈر گئے ہو، تم نے وہ شرائط نہیں دیکھیں جو عائد کی گئی ہیں، ان کی رو سے تو ایک ہزار میں سے شاید کسی ایک کو بھی سزا نہ ملے۔ یعنی اس انٹرویو میں اعتراض ہوا تھا کہ یہ ناممکن العمل ہیں۔ یعنی وہ اسلام جو نافذ ہوا وہ خدا کا اسلام نہیں ہے۔

یہ چیز ہے کہ نوجوان طبقہ کچھ مایوس ہو کر میرے پاس آ جاتا ہے۔ ان پہ اسلام کی طرف سے مایوسی طاری ہوئی تھی کہ یہی تھا وہ اسلام حتیٰ کہ وہ یہاں تک آ گئے کہ چیخنے لگے اور یہ سوال پوچھنے لگے کہ کیا یہ مملکت تم نے اس کے لیے بنائی تھی؟ کیا اس کے لیے

① یاد رہے کہ بات ستمبر 1979ء کی 21 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

② جنرل ضیاء الحق (AD 1924-1988)

علحدگی اختیار کی تھی؟ کیا اس کے لیے ملک تقسیم کیا تھا؟ کیا اس کے لیے لاکھوں جانیں گنوائی تھیں؟ یہ مایوس اس لیے ہیں کہ انہیں کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا۔ ہم نے اُس نسل کو بتایا ہی نہیں ہے کہ بابا! یہ خدا کا اسلام نہیں ہے، یہ خدا کے قانون نہیں ہیں جو نافذ ہو رہے ہیں بلکہ یہ تو انسانوں کے بنائے ہوئے قانون ہیں۔ کسی دور میں ٹھیک ہے انہوں نے بنائے تھے اور اپنے دور کے مطابق بنائے ہونگے۔ ٹھیک ہے دس سال کا بچہ تھا اُس کو جوتا بنوا کر دیا ہے اب وہ بیس سال کا ہو گیا ہے تو کیا اُس کو زبردستی وہی جوتا پہننا پڑے گا؟ نہیں، قطعاً نہیں۔

سب سے بڑی مایوسی یہ ہے کہ انسان قانونِ خداوندی سے ہی مایوس ہو جائے

یہ بات تو اس نوجوان کی سمجھ میں تب آئے جب ہم اسے بتائیں کہ یہ جو نافذ کیا جا رہا ہے یہ دینِ خداوندی نہیں ہے مگر دشواری یہ ہے کہ یہاں دینِ خداوندی بتانے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے کیونکہ ان لوگوں نے اس بات کا انتظام کر رکھا ہے کہ دینِ خداوندی سامنے ہی نہ آنے پائے۔ اگر دینِ خداوندی بتا دیا تو پھر اُس تفاوت سے 'Comparison' (تقابل) سے نظر آ جائے گا کہ یہ جو نافذ کیا جا رہا ہے یہ انسانوں کا بنایا ہوا ہے۔ خدا نے یہ کہا تھا کہ تم کائنات میں نگاہ دوڑا کر دیکھ لو کہ کیا کہیں اس کائنات میں ان کا اپنا بنایا ہوا قانون یا تمہارا بنایا ہوا قانون کارفرما ہے؟ اگر دینِ خداوندی کا نفاذ ہوتا تو ہماری وہ نوجوان نسل کبھی مایوس نہیں ہوتی۔ یاد رکھیے! انسان پر حوادث آتے ہیں، مصائب آتے ہیں، ٹکراؤ ہوتا ہے، مشکلات ہوتی ہیں، پریشانیاں ہوتی ہیں، مایوسی ہوتی ہے۔ ایک تو مایوسی ہوتی ہے کہ اس بات میں مجھ سے یہ غلطی ہوئی یا فلاں نے میرے ساتھ یہ کیا تو میں یہاں تک پہنچا لیکن مایوسی میں اگر انسان یہ کہے کہ صاحب! یہ نظام ہی غلط ہے یہ قانون ہی باطل ہے تو یہ ہے جسے قرآن یقنطون (سخت مایوس ہونا) کہتا ہے۔ کیا ہوا؟ یہ اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا ہوتا ہے جب اُس کے نتائج سامنے آتے ہیں تو پھر وہ قانونِ خداوندی کی محکمیت کی طرف سے مایوس ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ ادھر سے مایوس ہوا تو پھر تو اس کی اصلاح کی شکل ہی کوئی نہیں ہے۔ کیا بات ہے اقبالؒ (1877-1938) کی وہ کس طرح سے بات سمجھاتا ہے کہ ناموافق حالات کا پیدا ہو جانا اور بات ہے ان حالات کی بنا پر قانون کی محکمیت سے انکار کر دینا یا مایوس ہو جانا یہ دوسری بات ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔

سو چنا یہی چاہیے کہ اس میں میری غلطی کیا ہے۔ یہ ہے بِمَا قَدَّمْتُ أَيْدِيهِمْ (30:36) کیسے عجیب انداز میں قرآن نے یہ بتایا ہے کہ کھڑے ہو کر سوچو کہ ہماری کونسی غلطی تھی جس کی وجہ سے یہ ہوا۔ اس "ہماری" میں اکیلا وہ فرد نہیں ہے اُسے وہ نظام اجتماعی دیکھنا ہوگا، وہ معاشرتی نظام دیکھنا ہوگا جس کے ایک جزو کی حیثیت سے یہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ اپنے معاشرے کے احوال

کے تابع ہے، اُس سے نکل نہیں سکتا۔ اسی لیے اُس نے یہ کہا ہے کہ ایسے مقام پہ جہاں ایک فرد یہ دیکھے کہ حالات اس قدر مایوس کن ہو گئے ہیں تو اُسے کھڑے ہو کر یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کی ذمہ داری کس پہ عائد ہوتی ہے، میں کس قدر ذمہ دار ہوں، معاشرہ کس قدر ذمہ دار ہے، غلط نظام کس قدر ذمہ دار ہے؟ اُسے خدا کے قانون کی طرف سے مایوسی نہیں ہونی چاہیے اس لیے کہ وہ تو خیر ہے اُس کا نتیجہ تو شر نکل ہی نہیں سکتا۔

جو قانون اپنے اندر سدا بہار پھولوں کی مہک لیے ہوئے ہو، اس سے مایوسی کیسی اور کیوں؟

اس سلسلے میں اقبالؒ (1877-1938) کی تشبیہ بڑی خوبصورت ہے:

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ

خزاں تو آتی ہے لیکن اگر خزاں میں یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ اس درخت کے ساتھ جو اس ڈالی کی پوئگی ہے، پھر اس کے لیے جو قانون نشوونما ہمیں بتایا گیا، یہ سب غلط ہے؟ کیا ہوگا؟ کہا کہ

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ

ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے

جب انسان قانون خداوندی کی طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو پھر دنیا میں کوئی اور قانون ایسا نہیں ہے جو اس کی خزاں کو بہار میں تبدیل کر دے۔ کہتا ہے کہ یہ جو ڈالی ٹوٹ گئی، مایوس ہو گئی:

ہے لازوال عہد خزاں اُس کے واسطے

یہ اُس کے واسطے جو لازوال ہے، یہ ہے مایوسی۔ وہ ابدی طور پہ سمجھ لیتا ہے کہ صاحب! ان قوانین کے اندر مجھے سرسبز کرنے کی یہ صلاحیت ہی نہیں ہے:

ہے لازوال عہد خزاں اُس کے واسطے

کچھ واسطہ نہیں ہے اُسے برگ و بار سے

انسان کی بربادی کی اصل وجہ اپنی ذات کا انکار ہے

سب سے پہلے انسان اپنی طرف سے مایوس ہوتا ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ جو سب سے پہلی چیز ہے تو یہ کفر بالذات، اپنی ذات سے انکار ہے۔ اگلی چیز جو اُس کے بعد ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسروں کے سامنے اس کا اعتراف نہیں کرتا کہ میں ذمہ دار ہوں،

پھر وہ دوسروں کے اوپر ذمہ داری عائد کرتا ہے: کبھی گرد و نواح کی طرف، کبھی کسی دوست کی طرف، کبھی حالات و معاشرے کی طرف۔ یہ جو چیز ہے اس کے متعلق جو اقبالؒ نے کہا ہے کہ

شاخِ نہالِ سدرہٴ خار و خِص چمن مشو!

تیرا مقام تو انسان ہونے کی حیثیت سے بہت اونچا ہے، یہ باغ کے اندر جو جھاڑ جھنکار ہیں تو یہ مقام کیوں حاصل کرتا ہے۔

منکرِ او اگر شدی منکرِ خوشن مشو ①

تو اگر خدا کا منکر ہو گیا تو کوئی بات نہیں لیکن اپنے آپ سے انکار نہ کر، اپنی ذات کی صلاحیتوں سے، ممکنات سے، Potentialities سے انکار نہ کر۔ اپنے آپ سے مایوس ہونے والا وہ ہے جو حقیقت میں مایوس ہے۔ خزاں میں اُس درخت سے یہ کہہ کر رشتہ نہ توڑ کہ یہ قانون، قانون سے وابستگی، یہ سب کوئی شے ہی نہیں ہے۔

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ ②

رزق کے معاملے میں قرآن حکیم کی آیات کا غلط ترجمہ اور تفاسیر

قرآن حکیم نے يَقْنَطُونَ (30:36) کہا ہے۔ یعنی خود زندگی کی طرف سے ہی مایوس ہو جاتے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ وہ ہیں جنہیں خود اپنے اعمال کی بدولت لائی ہوئی تکلیف پہنچتی ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ تمہاری یہ تکلیف تمہارے اپنے ہاتھوں سے لائی ہوئی ہے۔ اگلی ہی آیت میں کہا کہ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَنْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ③ (30:37)۔ ایک قوم وہ ہے جس نے قرآن کی طرف سے مایوسی اختیار کی، ایک وہ ہیں جنہیں قانون کی حکمت کے اوپر یقین کامل ہے۔ یہ ایک ہی آیت نہیں بلکہ قرآن میں متعدد آیات آتی ہیں۔ یہ ہمارے خلاف سازش ہوئی ہے کہ قرآن کریم کی ان آیات کا غلط ترجمہ اور غلط مفہوم کیا گیا۔ اس آیت کا ترجمہ کہیں سے آپ دیکھ لیجیے تو وہ یہ کہے گا کہ تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کا رزق چاہے کشادہ کر دیتا ہے، جس کا رزق چاہے تنگ کر دیتا ہے جبکہ قرآن اس سے پہلی آیت میں کہتا ہے کہ بِمَا قَدْ مَتَّ اَيْدِيَهُمْ (30:36) یہ تمہارا اپنا کیا ہوا ہے۔ ساتھ ہی آیت ہے جس کا یہ غلط ترجمہ کر دیا تو پھر سوال یہ ہے کہ یہ

① اقبالؒ: زبورِ عجم

② اقبالؒ (1996)۔ بانگ درا۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ص 259۔

③ کیا یہ لوگ کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ رزق کی کشائش اور تنگی خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ جو اپنے لیے جس قسم کی راہ اختیار کرتا ہے اسے اسی قسم کا نتیجہ مل جاتا ہے۔ اس حقیقت میں ان لوگوں کے لیے جو قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، صحیح توازن بدوش راستے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص 938)۔

بِمَا قَدَّمْتُمْ لِأَيْدِيهِمْ کون کرتا ہے؟ عزیزانِ من! قرآن نے تو کہا تھا کہ اس کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں اختلاف نہیں ہے۔ اب یہاں پہلی آیت میں بِمَا قَدَّمْتُمْ لِأَيْدِيهِمْ (30:36) آیا ہے کہ یہ تمہارا اپنے ہاتھ سے کیا ہوا ہے۔ اور ساتھ ہی دوسری آیت کا غلط ترجمہ کر کے کہا کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے یعنی غریبی آئی ہے، مفلسی آئی ہے، تو اللہ کی طرف سے مر رہے ہو تو گویا ہم مار رہے ہیں۔ آپ کوئی ترجمہ اٹھا کر دیکھیے، کوئی تفسیر اٹھا کر دیکھیے، یہی کچھ آپ کو ملے گا۔

خدا کی طرف سے عطا کردہ نظامِ ربوبیت کے خدوخال

قرآن تو ایمان، قانون کی حکمت کے اوپر بتا رہا ہے اور وہ قانون کی حکمت یہ ہے کہ وہ سب کے لیے ربوبیت کا انتظام کر رہا ہے۔ اس پہ ایمان ہونا چاہیے اس لیے کہا کہ قانون کی حکمت پہ ایمان رکھو۔ قرآن نے جو اس آیت کو بیان کیا ہے تو اُس کے صحیح مفہوم سے بات صاف ہو جاتی ہے۔ اس آیت کے الفاظ میں لِمَنْ يَشَاءُ (30:37) آیا ہے یعنی جو قوم جو معاشرہ جو نظام چاہتا ہے کہ رزق کی فراوانیاں ہوں تو ان کو ہمارے قانون کے مطابق رزق کی فراوانیاں ملتی ہیں۔ جو یہ چاہتا ہی نہیں ہے اور کہتا ہے کہ ہم پہ تنگی آنی شروع ہو جائے اور ہمارے قانون سے سرکشی برتنا ہے تو تنگی آ جاتی ہے۔ یہ تنگی تمہارے اوپر آ گئی کیونکہ تم نے ہمارے قانون سے انحراف برتا۔ خوشحالی کا طریق یہ ہے کہ اُس قانون کے مطابق تم اپنا نظام قائم کرو۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ (30:37) اگر تمہیں اُس قانون کی حکمت پہ اب بھی ایمان باقی ہے تو پھر یاد رکھو! ہم جو کہہ رہے ہیں یہ ہو کر رہے گا۔ اٹھو اور یہ کرو کرو اس کی ابتدا۔

نظامِ ربوبیت کے تمام پہلو انسان کی نفسیاتی تبدیلی پر اثر انداز ہوتے ہیں

قرآن جو نظام دیتا ہے وہ بتدریج اپنی تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ بتدریج آہستہ آہستہ پھیلاتا ہے۔ پہلی چیز یہ لِمَنْ يَشَاءُ ہے کہ وہ یہ نظام چاہتا ہے۔ رزق کی کشائش اور تنگی کا قانون یہ ہے کہ جس معاشرہ میں رزق کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ اس سے ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری ہوتی رہے اس معاشرہ میں رزق کی فراوانی رہے گی اور جہاں اس کے خلاف ہوگا وہاں رزق کی تنگی ہوگی۔ اس لیے کہا کہ فَاتِذَا الْقُرْبٰى حَقُّهُ (30:38) پہلے جہاں تم ہو اپنے گرد و نواح سے بات شروع کرو اُس میں یہ دیکھو کہ کوئی رات کو بھوکا تو نہیں سو رہا۔ یہ جو تمہارے پاس فالٹو پڑا ہوا ہے یہ اُس کا حق ہے جس کے پاس نہیں ہے۔ غلط نظام میں جسے مذہب کہتے ہیں اگر کسی کو دیا بھی جاتا ہے تو خیرات کے طور پہ دیا جاتا ہے۔ جسے خیرات کہتے ہیں اُس سے دینے والے کے اندر ایک Complex (گرہ احساس) پیدا ہوتا ہے جو غرور و فخر کا ہوتا ہے لینے والے میں ذلت کا Complex (گرہ احساس) پیدا ہوتا ہے۔ قرآن

حقہ‘ کہتا ہے وہ جس کی اپنی محنت سے اُس کا پورا نہیں ہوا تو یہ جو تمہارے پاس تمہاری ضرورت سے زائد ہے‘ یہ اُس کا حق ہے‘ جاؤ جا کر اُسے اُس کا حق پہنچاؤ۔ حقہ کہہ کر قرآن حکیم شرفِ انسانیت کو کہاں لے گیا ہے۔ اس میں وہ بھوکا لیتا ہوا نہ شرماتا ہے‘ نہ یہ دینے والا اس پر فخر اور غرور کرتا ہے۔ قرآن حکیم نے یہ تمام جذبات کاٹ کر رکھ دیئے۔ یہ حقہ ہے‘ یہ اس کا حق ہے۔

مسکین کا قرآنی مفہوم

کہا ہے کہ اس سے آگے بڑھو دیکھو کہ وَالْمُسْكِينِ (30:38) کس کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہے۔ مسکین اُس کو کہتے ہیں جس کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو پھر کہا کہ دیکھو کہ وَابْنِ السَّبِيلِ (30:38) تمہارے ملک کے اندر اگر باہر سے بھی کوئی آ گیا ہے اور اُس پہ کوئی افتاد آ پڑی ہے تو اُس کا بھی تمہارے اوپر حق ہے۔ کہا کہ اس نظام کی ابتدا یہاں سے کرو اور پھر دیکھو کہ کَشَادُ فضیلت کس طرح سے نہیں ہوتی۔ لِمَنْ يَشَاءُ کے معنی ہیں کہ جو چاہتا ہے کہ اُس کے معاشرے کے اندر یہ کیفیت پیدا نہ ہو کہ کوئی کفر کرے‘ چھپا کر رکھے اور دوسرے بھوکے مریں‘ تو جو چاہتا ہے کہ ایسا نہ ہو تو وہ ہمارے قانون کی طرف آ جائے۔ جو اپنی ضرورت سے زائد ہے وہ ان کا حق ہے‘ جا کر ان کو پہنچائے۔ وہ As of right (بطور حق) ڈیمانڈ کر سکتے ہیں اور تمہیں دینا پڑتا ہے۔ کہا کہ یہ شروع کرو پھر دیکھو تو سہی کہ یہ ناہمواریاں کس طرح سے ختم ہو جاتی ہیں۔ پھر کہا کہ ذَلِكْ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ ① (30:38) یہ ہے خیر۔ دیکھا آپ نے کہ شر کے مقابلے میں خیر کیسے آیا۔ ابھی ابھی تم کہہ رہے تھے کہ اللہ نے بڑا ظلم کیا تھا‘ بھوک آ گئی‘ تنگی آ گئی‘ مصیبت آ رہی ہے۔ یہ سارا کچھ خدا کی طرف منسوب کیے چلے جا رہے تھے اور اُسے مجسمہ شربنا رہے تھے جبکہ اُس نے تو کہا تھا کہ بِدِكْ الْخَيْرِ (3:25) ہمارا نظام تو خیر ہی خیر ہوتا ہے۔ اب یہاں کہا ہے کہ ذَلِكْ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ (30:38) جو لوگ بھی یہ کچھ کرتے ہیں‘ کوئی اور جذبہ نہیں رکھتے‘ صرف یہ جذبہ رکھتے ہیں کہ ہم نے قانونِ خداوندی کی اطاعت کرنی ہے‘ اُن کے لیے خیر ہی خیر ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کے معاشی نظام کی ابتدا‘ اس کی انتہا کا پیش خیمہ ہے

کائنات کی کسی شے کے اندر کوئی اور جذبہ نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ اُس نے اُس قانون کی پیروی کرنی ہے۔ یہ ہے يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ (30:38)۔ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اس کی ”وجہ“ یہ ہے جو یہ ایسا کرتے ہیں۔ یہ ہے جیسے

① یہ روش ان لوگوں کے لیے بہترین نتائج کی حامل ہوگی جو اس راستے پر چلنا چاہتے ہیں جو انہیں خدا کی مقرر کردہ منزل کی طرف لے جائے (پرویز: مفہوم القرآن‘ ص 939)۔

ہم عام لفظوں میں کہتے ہیں۔ اور ”وجہ“ اُس طریق کو کہتے ہیں جو کسی منزل تک پہنچائے۔ کہا کہ اگر تم نے نظام خداوندی کی منزل تک پہنچنا ہے تو اُس کا یہ راستہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ یہاں سے ابتدا کرو، انتہا خود ہو جائے گی کہ کائنات میں کوئی انسان بھوکا سوئے گا ہی نہیں۔

قرآن حکیم کے اصولوں کی پیروی کی مثال کھیتی کی مانند ہے

کہا کہ **أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (33:38)** یہ ہیں وہ لوگ جن کی کھیتیاں پکتی ہیں۔ یعنی یہ جو انہوں نے ترجمہ کیا کہ ہم جسے چاہتے ہیں کشاد سے رزق دیتے ہیں، قرآن کریم نے کھیتی کا لفظ کہہ کر ساری بات واضح کر دی کہ وہ کیسے ہوتا ہے۔ زمین میں پہلے اگانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے، اُس کے بعد زراعت کا قانون دیا کہ اچھا بیج تلاش کر کے لاؤ، زمین کو اس قابل بناؤ کہ اُس میں بیج بویا جائے، پھر وقت کے اوپر پانی دو، پھر اُس کی حفاظت کرو، حرارت اور روشنی وغیرہ پہنچنے کے انتظامات کرو۔ یہ سارا کچھ تو تم نے کرنا ہے لیکن اس قانون کی محکمیت پہ کرنا ہے کہ ایک دانہ جو بویا ہے یہ خاک میں مل کر ضائع نہیں ہوا بلکہ سات سات سو بنا، یہ گنتی نہیں ہے بلکہ عربی زبان کا محاورہ ہے کہ اس ایک دانے میں سے سات سات سو دانے نکلیں گے۔ کہا کہ پھر تم نے دیکھا کہ اُس کے مطابق تم چلے تو کس طرح سے تمہاری کھیتی پکی۔

عزیزانِ من! مفلحون کہہ کر ساری بات کہہ دی۔ خدا تمہیں ان چیزوں کا صرف قانون دیتا ہے اور کرتے تم خود ہو۔ اگر زمین بھی موجود ہے، دانہ بھی رکھا ہوا ہے لیکن وہ کسان گھر میں بیٹھا ہوا حقہ پیتا رہتا ہے تو اُس کی کھیتی تو نہیں پنپ سکتی، پک ہی نہیں سکتی۔ قرآن کریم نے جہاں بھی ایمان اور مومنین کا ذکر کیا ہے ان کو مفلحون کہا ہے، مثال ہی کھیتی سے دی ہے۔ اس ایک مثال سے پتہ چل جاتا ہے کہ خدا اس میں کتنا کرتا ہے اور انسان نے کتنا کرنا ہوتا ہے۔ اُسی کسان کی کھیتی پکتی ہے جو محنت کر کے کھیتی اگاتا ہے۔ اگانے کی صلاحیتیں خدا کی دی ہوئی ہوتی ہیں۔

نظام ربوبیت کا ایک اہم جز

ارشاد خداوندی کی ایک تو یہ چیز ہے کہ تمہارے پاس جو فاضلہ ہے، وہ انہیں دید و جن کو اس کی احتیاج ہے۔ **يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ط قُلِ الْعَفْوَ (2:219)** اے رسول! یہ تم سے پوچھتے ہیں کہ اس نظام میں ہمارے پاس جتنا کچھ ہے اُس میں سے ہم کتنا دیں؟ کہا کہ تمہیں تو اپنی ضرورت کے لیے چاہیے اور وہ ضرورت تمہاری پوری ہوگئی تو یہ جو باقی بچا ہوا ہے، یہ رکھتے کا ہے کے لیے ہو، یہ ان کے لیے دید و جن کی ضرورت پوری نہیں ہو رہی ہے۔ یہ نظام تھا جس کی ابتدا اُس نے کی تھی کہ **ذَا الْقُرْبَىٰ (30:38)** قریب بسنے والوں یا رشتے داروں سے شروع کرو۔ یعنی یہ **ذَا الْقُرْبَىٰ** رشتے دار کی بات نہیں ہے کہ اپنے رشتے داروں

کو دو۔ بات یہ ہے جو بھی تمہارے قریب ہیں، اُس میں رشتے دار تو آ ہی جاتے ہیں اگر وہ قریب ہیں۔ ابتدا جو اُس نظام کی کرو تو جو تمہارے گرد و نواح میں ہیں، قریب ہیں، وہاں سے یہ شروع کرو اور پھر اس کو پھیلاتے چلے جاؤ۔

دو لفظوں میں قرآن حکیم کا معاشی نظام: ”نہ ضرورت سے زیادہ، نہ ضرورت سے کم“

یہ ہیں وہ لوگ جن کی کھیتیاں پکتی ہیں۔ سارے قرآن میں مومنین کے متعلق یہی ہے کہ **أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ** (30:38)۔ آپ نے دیکھا کہ وہ جو اوپر آیت تھی اس کا یہ ترجمہ غلط کیا کہ جس کا ہم چاہتے ہیں رزق تک کر دیتے ہیں، جس کا چاہتے ہیں کشادہ کر دیتے ہیں۔ پہلے **بِمَا قَدَّمْتُ أَيْدِيهِمْ** (30:36) کہا کہ یہ کچھ تمہارے اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا ہے۔ اُس کے بعد یہ چیز کہی کہ **الْمُفْلِحُونَ** (30:38) ہمارا کھیتی باڑی کا قانون ہے۔ تو من یشاء کا ترجمہ تو خود یہ آیات کر رہی ہیں لیکن وہاں جب خدا کے قانون کی جگہ انسانوں کے یہ قوانین آئے تو پہلا نظریہ یہ آیا کہ یہ جو بھوکے مر رہے ہیں، مہنگائی ہو رہی ہے، اس کے متعلق کوئی شکایت نہ کرو، ملکیت، شہنشاہیت کی طرف نگاہ نہ دو، اور کہ ان کی ذمہ داری تھی جس کے وجہ سے یہ کچھ ہوا بلکہ یہ تو خدا کی طرف سے ہے۔ اور جو خدا کا فیصلہ ہو اُس کے خلاف لپ شکایت واکرنا خدا کے خلاف چیلنج ہے۔ لوگوں کو یہ تھکیاں دے کر سلا دیا کہ غلط نظام کی طرف تمہاری نگاہ ہی نہ اٹھنے پائے، صرف یہی ہو کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے۔ وہ جو ابلیس نے کہا تھا کہ میں کہاں ذمہ دار ہوں، تیرے حکم کے بغیر تو پتہ بھی نہیں بل سکتا، اس لیے یہ جو اتنے بھوکے مر رہے ہیں تو اس میں کوئی انسان ذمہ دار ہو ہی نہیں سکتا، یہ تو تیری منشا اور مشیت کے مطابق سب کچھ ہو رہا ہے، یہ وہی ابلیسیت ہے:

مست رکھو ذکر و فکرِ صُحبا ہی میں اسے

مُخَنِّتِ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

(اقبال: ارمغانِ حجاز)

زکوٰۃ کا اڑھائی فی صد کا تصور قرآن فی تعلیم قل العفو کے بالکل برعکس ہے

ظالم کی طرف نگاہ اٹھنے ہی نہ پائے اور کہیں کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہو رہا ہے۔ اور جب ان سے کہا کہ اُس نے کچھ دینے کے لیے کہا ہے تو کہنے لگے کہ ہاں ٹھیک ہے، یہ اڑھائی فیصد ہے۔ ”اڑھائی روپے دی تے پایا دال نہیں اوندی“۔^① کہنے لگے

① اڑھائی روپے کی تو ایک پاؤ دال بھی نہیں ملتی۔

کہ اس کی ذمہ داری ہم نے تھوڑی لی ہے جب خدا نے کہا اڑھائی فیصد ہے تو پھر اور کوئی کیا کر سکتا ہے جبکہ خدا قُلِ الْعَفْوَ (2:219) کہتا ہے کہ تمہاری ضرورت سے زائد جتنا بھی ہے تم دوسروں کو دیدو۔ یہ کہتے ہیں کہ صرف اڑھائی فیصد دیدو اور باقی جتنی دولت ہے وہ رکھ لو۔ وہ جو دولت بچتی ہے وہ خواہ آپ لاکر (Locker) میں رکھیے یا اکاؤنٹ میں رکھیے یا اپنے گھر میں رکھیے بہر حال کہیں بھی رکھیے تو وہ بچے نہیں دیتی۔ ہزار روپیہ آپ نے کسی بھی جگہ محفوظ رکھا ہے تو سال کے بعد نکالے تو وہ ہزار ہی ہوگا۔ یہ ہوا کہ یہ تو ہزار کا ہزار ہی ہے اس کے اوپر کچھ زیادہ ملنا چاہیے۔ یہاں سے ہمارے سامنے رہنما کا سوال آ گیا جسے سود (Interest) کہا گیا۔ اور آج کل تو اس کے اوپر مسائل کے مسائل چل رہے ہیں۔ ان مسائل کے چلنے میں ہماری آپ کی کسی کوشش کا دخل نہیں ہے یہ تو زمانے کے تقاضے ہیں جن کے تحت کیپٹل ازم یا نظام سرمایہ داری کے خلاف ردِ عمل ابھرا۔ اور وہ نظام سرمایہ داری تو سارا سود پر چلتا ہے۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ سرمایہ دار اگر اپنا سرمایہ کسی جگہ بھی بند کر کے رکھ دے تو وہ سو سال کے بعد بھی نکالے گا تو اتنے کا اتنا ہی ہوگا۔ وہ چلتا اس لیے ہے کہ یہ جو اُس کے پاس زائد ہے یہ بچے دے یعنی اس میں بڑھتی ہو۔

رہو نظام سرمایہ داری کا حصہ ہی نہیں بلکہ اس کی بنیاد ہے

عزیزانِ من! اندازہ لگائیے اور جھوم جائیے قرآن پہ! کہا کہ وَمَا آتَيْتُمْ مِّن رَّبَّائِلٍ بُرُؤًا فِيْ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرُبُّوْا عِنْدَ اللّٰهِ (30:39) ایک تو یہ دینا تھا کہ ضرورت مند تھا اُس کی ضرورت پوری ہونی چاہیے اور ایک دینا وہ ہے کہ دوسرے کو اس لیے دو کہ یہ اُس کے مال میں مل کر اس سے زیادہ مجھے واپس ملے۔ اب رہو کی بات آگئی۔ پہلے تو یہ کہا کہ یہ جو کہتا ہے کہ یہ ایک ذہنیت ہے کہ اس لیے دوں کہ جتنا دیا ہے اس سے زائد ملے۔ وَمَا آتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرَبِّدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (30:39)۔ اس آیت کا ترجمہ یہ کر دیا کہ جو تم زکوٰۃ دیدیتے ہو وہ یہ ہے ہمارا اصل مقصد۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (30:39) ان کا مال بڑھتا ہے۔ پوچھا کہ صاحب! وہ تم نے اڑھائی پرسنٹ دیدیا تو تمہارا مال تو بڑھا نہیں وہ تو ویسے کا ویسا ہی ہے۔ زکوٰۃ کا ترجمہ اڑھائی پرسنٹ کیا۔

قرآنِ حکیم اور فقہ کے معاشی نظام کی پیدا کردہ ذہنوں میں بنیادی فرق کا ظہور

عزیزانِ من! نہ ہی عربی زبان میں زکوٰۃ کے یہ معنی ہیں اور نہ قرآن میں اس کے یہ معنی ہیں۔ اس کے معنی ہیں ”سامانِ نشوونما بہم پہنچانا“۔ ایک ذہنیت تو یہ ہے کہ ضرورت مند کو کچھ دے کر اپنا ہی واپس نہیں لینا بلکہ اُس کی محنت کا جو حاصل ہے اُس میں سے بھی کچھ لے لینا۔ ایک ذہنیت یہ ہے کہ جس کی کوئی کمی ہے اُس کی کمی کو اپنے حاصل میں سے جو زائد ہے اُس کو دیدینا کہ اُس کی

نشوونما ہو۔ یہ دو متضاد ذہنیتیں ہیں، ایک دوسرے کے بالکل برعکس ذہنیتیں ہیں۔ جو نظام خداوندی ہے وہ ربوبیت یا زکوٰۃ کے اوپر مبنی ہے یعنی نوع انسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔ ربو جس کو کہا گیا ہے وہ ان کے بالکل برعکس ہے کہ دوسرے کے احتیاج اور ضرورت سے فائدہ اٹھا کر Exploit (لوٹ کھسوٹ) کرنا، زائد لینا ہے یہ اپنا بھی لے لینا اور اُس کا بھی لے لینا ہے۔ یہ اصل میں ربو سود وغیرہ کی بات نہیں ہے۔ یہ دو معاشی نظام ہیں جو ایک دوسرے کے بالکل برعکس ہیں۔

ربو جیسے بغاوتی معاشی نظام کے خلاف خدا، رسول کا اعلانِ جنگ

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے کسی قانون شکنی کو خدا اور رسول کے خلاف جنگ قرار نہیں دیا لیکن ربو کے متعلق کہا ہے کہ ان سے کہو کہ اگر یہ اس سے باز نہیں آتے تو خدا اور رسول ان کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہے۔ گویا یہ اتنی بڑی چیز تھی۔ اگر یہ ایک قانون شکنی ہی ہوتی تو جرم ہوتا اور جرم کی سزا ہوتی۔ یہ جرم والی بات نہیں بلکہ یہ بغاوت ہے۔ ایک پورا نظام ہے: نظامِ ربوبیت اور نظامِ زکوٰۃ، دوسروں کی نشوونما کے لیے دینا ہے۔ ایک اس کے بالکل برعکس دوسرا معاشی نظام ہے کہ دوسروں کی محنت میں سے لینا ہے، یہ نظام خداوندی کے خلاف ایک باغیانہ نظام ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس نظام کے خلاف خدا اور رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ یہ سودی کاروبار کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک معاشی نظام ہے۔ اور اس سے آپ دیکھ لیجیے گا کہ قرآن کی رو سے معاش کی کتنی اہمیت ہے۔ وہ کفار کے خلاف بھی جب تک کہ وہ مملکت کے خلاف سرکشی نہ برتیں اعلانِ جنگ نہیں کرتا۔ وہ ان میں سے جو نظامِ ربو قائم کرتے ہیں یعنی دوسروں کی محنت کا حاصل خود لے جاتے ہیں تو وہ ان کے خلاف اعلانِ جنگ کہتا ہے اور اسے بغاوت قرار دیتا ہے۔

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ربو کے مفہوم کو الجھا دینے کی ایک فریب انگیز کوشش

میں نے کہا ہے کہ اس دور میں چونکہ نظامِ سرمایہ داری کے خلاف یہ بات عام چلی ہے کہ اُس کا سارا دار و مدار سود پہ ہے تو ہمارے ہاں بھی یہ بحثیں چلیں کہ جی! قرآن نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ اب بات آگے چلی کہ جی سود سے مطلب کیا ہے جو حرام قرار دیا ہے۔

مری قرآن دانی پہ خفا کیوں ہو گئے صاحب!

مجھے تفسیر بھی آتی ہے، اپنا مدعا کہیے

”گل کر چاہندا کی ایس؟ جی چاہندا اے کہ دیواں کسے ضرورت مندوں چار پیسے کہ سودیواں تے ڈیڑھ سولواں تے گناہ وی

نہ ہووے۔ کہن لگے ٹھیک ہے اسی دسنے آں۔^① بحیث چلیں کہ سود حرام ہے۔

تجھ پہ قابو نہیں، دل پہ تو ہے قابو اپنا

قرآن کے ان الفاظ پہ ہمارا قابو نہیں لیکن سود کی Definition (حدود و قیود کو متعین) کرنا تو ہمارے بس کی بات ہے۔ اب بات چلی کہ بینک کا سود حلال ہے یا حرام؟ سود کے سلسلے میں جو آپ کے فقہ کے یہ قوانین چلے آ رہے ہیں تو پہلے ہی سے ان کے ہاں یہ چیز کر رکھی تھی۔ ایک کاشتکار آتا ہے اور کہتا ہے کہ میاں صاحب! ایک ٹکڑا زمین کا مجھے مل رہا ہے اور وہ ہزار روپیہ مانگ رہا ہے لیکن میرے پاس پیسے نہیں ہیں، اگر مجھے زمین کا وہ ٹکڑا مل جائے تو میرے بچے پل جائیں گے، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی، میں دو سال کے اندر اندر اپنی فصل سے ادا کر دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ تمہیں یہ مصیبت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے کہ تم اس سے زمین خریدتے پھر دو اور پھر ادا کرتے پھر دو۔ یہ کچھ نہ کرو بلکہ وہ زمین ہم تمہیں خرید دیتے ہیں اور جو پیداوار ہو وہ آدھی تمہاری آدھی ہماری۔ وہ ہزار روپیہ تو تمہارے ذمہ رہے گا کیونکہ وہ ہم نے خرید کر دی ہے لیکن پیداوار میں سے آدھا ہمارا آدھا تمہارا۔ اگر یہ اُس کاشتکار کو دیتا تو شاید اس کے اوپر پانچ دس روپے ہی زائد آتے۔ لیکن اس حساب سے آدھی بٹائی ان کی ہوئی اور اسے مزارعت کا نام دیا۔ کہا کہ جی، یہ سود نہیں ہے یہ مزارعت ہے اور یہ حلال و طیب ہے۔ آج کل کے دور میں بزنس آیا۔ اُس نے کہا کہ میں کاروبار تو کرتا ہوں لیکن کچھ سرمائے کی ضرورت پڑتی ہے بینک سے لیتے ہیں تو وہاں سود دینا پڑتا ہے اور سود دینا تو عذاب ہے۔ کہنے لگے کہ آپ ہمارے سرمائے کے اندر روپیہ انوسٹ (لگا) کر دیجیے تو آدھا منافع آپ کا۔ یہ سود نہیں منافع ہے اور یہ حلال و طیب ہے۔

سود کے متعلق قرآن میں کی واضح Definition (تعریف)

آپ ذرا قرآن کے الفاظ دیکھیے۔ کہا کہ وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رَبٍّ لَّيْرُبُوا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ (30:39) اس خیال سے روپیہ دوسرے کو دینا کہ دوسرے کے مال میں پہنچ کر یہ مجھے زیادہ دے گا، قرآن کریم نے دو الفاظ کہہ کر ساری بات صاف کر دی۔ وہ جو قرآنی نظام ہے اُس میں کسی ضرورت مند کو قرض لینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی بلکہ یہ نظام ہر ایک کی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ جب تک یہ نظام قائم نہیں ہوتا یہ چیزیں اُس دور میں انفرادی طور پر ہوتی ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ قرآن نے یہ Definition (تعریف) کس طرح سے دی ہے کہ کیا چیز دبو ہے اور کیا چیز دبو نہیں ہوتی۔ دبو کے متعلق کہا کہ تم نے لوگوں کو

① بات کرو کہ کیا چاہتے ہو؟ جی، یہ چاہتا ہے کہ کسی ضرورت مند کو چار پیسے دوں کہ مثلاً سو روپے دوں تو سو سو اس طرح واپس لوں کہ گناہ بھی نہ ہو۔ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے ہم بتاتے ہیں۔

قرض دیا ہوا ہے اور اپنے اصل سے زائد ان سے لیتے ہو۔ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ (2:279) اگر تم اس سے باز نہیں آتے تو ہماری طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ وَإِنْ تُبْتُمْ (2:279) اور اگر تم اس سے باز آ جاؤ۔ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ (2:279) تم صرف اپنا Capital Money (راس المال) لے سکتے ہو۔ اس کی اس لیے اجازت دی کہ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (2:279) اگر تمہارا اصل بھی ہم نہ کہتے تو تم پہ زیادتی ہوتی اور اگر اس سے زائد ایک پیسہ بھی لو گے تو اُس پہ ظلم ہوگا۔

ہم نے جو کہا ہے کہ اصل تم لے سکتے ہو زائد نہیں لے سکتے تو یہ نہ تم پہ ظلم ہے اور نہ اُس پہ ظلم ہے۔ اپنے اصل کے اوپر ایک پائی بھی جو زائد لینا ہے وہ دبو ہے خواہ اس کی کوئی شکل ہو: مضاربت ہو، مزارعت ہو، بینک کا سود ہو، یا ایسے انوسٹمنٹ ہو۔ سوال یہ ہے کہ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ (2:279) تم صرف اپنے اصل زر کے حقدار ہو، وہی تمہیں ملے گا۔ دبو کے معنی ہی زائد کے ہیں۔ اس سے زائد کا نام کچھ رکھو وہ قرآن کی رو سے حرام ہے۔ قرآن نے اتنی صاف اور کھلی ہوئی بات کی ہے کہ سرمایہ داری کا نظام ختم ہو گیا۔ اس زائد کا نام سود رکھو یا کچھ رکھو جب یہ ختم ہو جاتا ہے تو نظام سرمایہ داری ہی قائم نہیں رہتا۔ ضرورت سے زائد جو تمہارے پاس ہے وہ ضرورت مندوں کا حصہ ہے۔ زائد از ضرورت کسی کے پاس رہتا ہی نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم نے کاہے کے لیے رکھا ہوا ہے؟ جاؤ اور نظام کو دو کہ سب کی ضروریات پوری کرے۔ کہا کہ جی کل کو مجھے ضرورت پڑے گی تو کیا کروں گا؟ کہا کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (6:151) ہم تمہارے اور ان کی اولاد کے رزق کے ذمہ دار ہیں۔ اسلامی مملکت یہ کہتی ہے۔ جب یہ چیز ہو جائے وہ ذمہ دار ہو جائے تو پھر تم نے یہ زائد از ضرورت یا فاضلہ کاہے کے لیے رکھنا ہے۔ اب یہ جو آپ کے ہاں موجودہ مذہب کا نظام بنا ہے یہ ملکیت کے زمانے کا بنا ہوا ہے۔ اس سرمایہ داری کے نظام میں نہ زمین کی ملکیت پہ کوئی حد ہے نہ دولت کے جمع کرنے کے اوپر کوئی حد ہے اس میں زمین کو بٹائی پہ دینا ہے، انوسٹ کر دینا ہے۔ اس میں پہلی چیز تو جو بلا سود بینکاری کا مسئلہ تھا یہ چلا۔

بلا سود بینکاری کے سلسلہ میں مودودیؒ کا جاری کردہ فتویٰ

میں عرض کروں کہ اکناکس (معاشیات) ایک مشکل اور پیچیدہ فن ہے۔ دنیا میں بہت کم لوگ ہیں جو اس کو سمجھ پاتے ہیں۔ ”تے ساڈے اتھے بھاری ایناں دی نہ پتہ ہووے کہ روپیے دے پیسے کنے ہوندے ہیگے“^① لیکن معاشیات کے اوپر ایک مستند حیثیت سے فتویٰ جاری کر دیتے ہیں۔ بلا سود بینکاری کے سلسلے میں مودودیؒ صاحب نے فتویٰ دے کر یہ تدبیر بتائی ہے یہ ان کے

① ہمارے ہاں تو اتنا بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ایک روپے میں کتنے پیسے ہوتے ہیں۔

② مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979)۔

اخبار ایشیاء کے اندر ہے کہ بنکوں میں روپیہ جمع کراؤ اور روپیہ جمع کرانے والوں کو بینک سود دینے کی بجائے ایسے اقتصادی منصوبے تیار کرے جن کے منافع میں روپیہ جمع کرانے والے برابر کے حصہ دار ہوں۔

سود کے عذاب سے بچنے کے لیے کتاب الحیل ملاحظہ فرمائیں

یہ تو وہ ہوا جو بنکوں میں ہوتا ہے اور یہ جو افراد سے لیتے ہیں وہی زیادہ ضرورت مند ہیں کہ ضرورت میں مرتا کیا نہ کرتا۔ اب بات یہ ہے کہ یہ سود حرام ہے، خدا کے ہاں باز پرس ہوگی، کہنے لگے اوبھولے بادشاہو! اس میں ڈرنے کی بات ہی کوئی نہیں ہے۔ آپ حضرات کو شاید معلوم نہیں کہ فقہ کی جتنی کتابیں ہوتی ہیں ان میں شروع میں تو احکام دیئے ہوئے ہوتے ہیں، آخر میں ایک باب ہوتا ہے اُسے کتاب الحیل کہتے ہیں، حیل حیلہ کی جمع ہے۔ اُس کتاب الحیل میں لکھا ہوتا ہے کہ یہ جو قانون ہم نے دیئے ہیں، ان نے بچ نکلنے کی تدبیر کیا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ آپ لوگوں کے لیے انہوں نے کتنی محنت جانفشانی کی ہے کہ کہیں آپ کو نہ ڈھونڈنا پڑے، تلاش نہ کرنا پڑے۔ میرے سامنے ایک کتاب ہے ”معاشیات نظام مصطفیٰ“۔ مفتی محمد ابوسعید غلام سرور قادری صاحب اس کے مصنف ہیں۔ بات سود کے اوپر یا رُلو کے اوپر پہلے چلی ہوئی ہے، کتنے ہی صفحات میں پہلے یہ بتایا ہے کہ یہ کتنا سنگین جرم ہے اور قرآن نے کس قدر حرام قرار دیا ہے، یہ خدا اور رسول کے خلاف بغاوت ہے۔ اُس کے بعد جہاں وہ ختم ہوتا ہے کہا ہے کہ ہمارے ہاں کے تو فقہائے کرام نے امت کی حالت کے اوپر شفقت رکھتے ہوئے ایسی تدابیر بتائی ہیں کہ جن سے آپ کو یہ ملتا بھی جائے اور آپ گنہگار بھی نہ ہوں۔ اس میں انہوں نے اپنے فقہائے کرام کے حوالے دیئے ہیں جنہوں نے آپ کی اس حالت کے اوپر یہ کرم کیا ہے، آپ کو بچالیا ہے۔

کتاب الحیل کی چند ایک مثالیں

پہلی تدبیر: ایک شخص کسی کو دس روپے قرض دے کر اُس سے دو روپے زائد لینا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ دو روپے سود ہونگے لیکن اس جرم اور گناہ سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ قرض دینے والا قرض لینے والے کی کوئی چیز دس روپے میں نقد خرید لے اور اُس قرض لینے والے کے ہاتھ مدت معینہ کے لیے بارہ روپے میں ادھار بیچ دے۔ مدت معینہ کے بعد وہ آپ کو بارہ روپے دے گا تو کہا کہ یہ دبو نہیں ہے جس کا خدا کے ہاں مواخذہ ہوتا ہے بلکہ یہ تو اُس چیز کی تجارت کا منافع ہے۔

دوسری تدبیر: قرض دینے والا اپنی کوئی چیز 110 روپے میں قرض لینے والے کے ہاتھ ادھار بیچ دے، قرض لینے والا وہی چیز 100 روپے میں قرض دینے والے کے ہاتھ ادھار بیچ دے۔ اس طرح وہ چیز بھی اس کو واپس مل گئی اور منافع بھی مل گیا۔

تیسری تدبیر: قرض دینے والا قرض لینے والے کے ہاتھ ایک چیز 200 روپے میں ادھار بیچ دے پھر اُس سے وہی چیز 100 روپے میں نقد خرید لے۔ قرض لینے والا اُس شے کی وہ قیمت جو اُس نے 200 روپے ادھار لی تھی وہ اس چیز کی قیمت ادا کر دے۔ یہ سود نہیں ہے یہ اُس چیز کی تجارت ہے۔

چوتھی تدبیر: قرض دینے والا کوئی چیز ایک مدت معینہ کے لیے 20 روپے میں ادھار دے۔ قرض لینے والا کسی اور کے پاس 15 روپے میں اُسے نقد بیچ دے۔ مدت معینہ کے بعد قرض لینے والا اُسے 20 روپے ادا کرے گا۔ اس طرح

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

اس کتاب میں یہ لکھا ہے کہ امام ابو یوسفؒ ایسے کاروبار کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس سے منافع بھی ہوگا اور ثواب بھی ملے گا۔ کہا حضور! یہ ثواب کس چیز کا ملے گا؟ کہا کہ اس لیے ملے گا کہ اسے اُس نے سود کے حرام سے بچنے کے لیے اختیار کیا تھا تو حرام سے بچنے کے لیے کوئی چیز اختیار کرے تو اُس کا ثواب ملتا ہے۔ یہ اُس نے بحوالہ فتاویٰ قاضی خان مع عالمگیری جلد دوم وغیرہ میں لکھا ہے۔ ان تدابیر کو درج کرنے کے بعد اس کتاب کے مصنف فرماتے ہیں کہ ان تدابیر کی رو سے منافع بھی ملتا ہے اور سود کا گناہ بھی نہیں ہوتا لیکن افسوس کہ مسلمان دین فطرت کی ایسی تدابیر سے غافل رہ کر سود جیسی لعنت میں مبتلا رہے آگے شعر بھی ہے:

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بناؤ

دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات

عزیزانِ من! اب آپ نے یہ سوچ لیا کہ جب ان کے سامنے قرآن لایا جاتا ہے تو یہ قرآن سے کیوں ڈر کر بھاگتے ہیں جیسے گدھا شیر سے بھاگتا ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں کتاب الحیل نہیں ہے۔ یہ ایک کتاب میں نے کہا ہے ان کے ہاں تو کئی کتابیں ایسی ہیں اور ان میں تو ایسے ایسے حیلے ہیں کہ آپ پہ کوئی جرم ہی صادر نہیں ہوتا۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الروم کی آیت 39 تک آگئے 40 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



ساتواں باب : سورة الروم (آیات 40 تا 47)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزانِ من! آج ستمبر 1979ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الروم کی آیت 40 سے ہو رہا ہے: (30:40)

رہو کی بنیاد پر قائم کردہ معاشی نظام، قرآنی نظام کے خلاف اعلانِ جنگ متصور ہوگا
سابقہ درس کی آخری آیت رہو کے متعلق تھی جس کا ترجمہ سود کیا جاتا ہے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے وہ بحث کچھ تشنہ رہ گئی تھی۔
اصل یہ ہے کہ جسے رہو کہا جاتا ہے یہ کوئی الگ مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ تو ان کے ہاں یہ ہیں کہ کوا حلال ہے یا حرام، پاؤں دھونے
چاہئیں یا مسح کرنا چاہیے؟ رہو کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ اگر تم اس سے باز نہ آئے، مثلاً شراب پینے والے کے متعلق کہا کہ

اگر تم باز نہ آئے تو تمہیں اس کی سزا ملے گی، گناہ ہوگا، مگر سارے قرآن میں رُلو ایک ایسی چیز ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ اگر تم اس سے باز نہ آئے تو خدا اور رسول یعنی اسلامی نظام کی طرف سے اسے اعلانِ جنگ سمجھو۔ یعنی یہ کوئی مسئلہ نہیں رہا ہے، یہ کوئی جرم نہیں ہے کہ جس کی سزا ملے گی، یہ کوئی معصیت نہیں ہے کہ جس سے گناہ ہوگا، یہ کوئی ایسی چیز ہے جو اسلامی نظام کے خلاف بغاوت ہے اور بغاوت پہ ہی اعلانِ جنگ ہوتا ہے۔ بغاوت سے کم درجے کی جتنی بھی قانون شکنیاں ہوتی ہیں، جنہیں معصیت کہا جاتا ہے، اُن کی سزا مقرر ہوتی ہے۔ البتہ اگر کوئی ملک کے اندر سیاسی طور پہ بغاوت کرے تو ٹھیک ہے اُس کے خلاف اعلانِ جنگ ہوتا ہے۔ یہاں یہ صورت ہے۔

عزیزانِ من! جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ کسی مسئلے کی، کسی حکم کی، کسی قانون کی بات نہیں ہے۔ اور یہیں سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ قرآن کی رو سے معاشی نظام کی اہمیت کیا ہے۔ عام طور پہ تو جو سیاسی نظام اس ملک کے نظام کے علی الرغم قائم کیا جائے تو اسے ہی بغاوت کہتے ہیں لیکن آپ دیکھیے کہ قرآن کی رو سے معاشی نظام کی اہمیت اس قدر ہے کہ اُس نے کہا ہے کہ اسلام یا قرآن کے معاشی نظام کے علی الرغم اگر آپ کوئی دوسرا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں تو یہ بغاوت ہے اور مملکت کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جی یہ روٹی کا مسئلہ لیے پھرتے ہیں، روٹی کا مسئلہ ہے۔ جہاں کسی نے کہا کہ بھوکے کی روٹی کا مسئلہ حل کرو تو انہوں نے کہہ دیا کہ کمیونسٹ ہو گیا۔ عزیزانِ من! قرآن کے یہ مقامات قابلِ غور ہیں کہ سارے قرآن میں اس کے خلاف اعلانِ جنگ ہے تو اس کو اتنی بڑی اہمیت ہے۔

ہم راکٹ کا پرزہ سائیکل کے اندر لگانے کی بے سود کوشش میں مصروف ہیں

اب یہاں سے آگے بات چلائی۔ ہمارے ہاں معاشی نظام تو سارا غیر قرآنی ہے اور اُس میں بحث لیے پھرتے ہیں کہ جو رُلو ہے یہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔

دہن کا ذکر کیا یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

غیر قرآنی معاشی نظام کے اندر ایک مسئلے کو لے کر دھن رہے ہیں۔ ”ویلی جی اوں ویلے“۔ غیر قرآنی معاشی نظام میں ایک معیشت کا مسئلہ لے کر اب بحث ہو رہی ہے کہ یہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ ڈیزل آئل پہ چلنے والے انجن کے متعلق بحث ہو رہی ہے کہ اس میں AC کرنٹ دی جائے یا DC کرنٹ دی جائے، وہ تو انجن ہی کسی اور ٹائپ کا ہے۔ اُسے پہلے بجلی سے چلنے والا انجن بناؤ تو پھر اگلی بحث بھی چلے گی۔ لیکن یہاں ہے کہ وہ بحث چل رہی ہے۔

فقہہ کے بیان کردہ فارمولے کے مطابق اس حرام سودی کاروبار کو حلال کرنے کا طریق

رہو کے متعلق کہا ہے کہ یہ سود ہے۔ سود کا لفظ چونکہ بہت قابل نفرت ہو گیا تھا اس لیے کہا کہ یہ منافع ہے۔ یعنی رام داس کا نام عبدالرحمن رکھا اور کہا کہ الحمد للہ مسلمان ہے۔ پچھلی دفعہ میں نے بتایا تھا کہ انہوں نے کہا تھا کہ صاحب! اگر سود بھی ہے تو سود ہی رہنے دو اس سے بچنے کی کئی تدبیریں ہیں۔ وہی فقہ کی کتابیں جس میں سود کو حرام قرار دیا ہے جہاں وہ بحثیں ختم ہوتی ہیں اُس کے آخر^① میں لکھا ہوا تھا کہ اس سے بچنے کی شرعی تدابیر کیا ہیں۔ تو آپ کو یاد ہے کہ اُس مصنف^② نے کتاب میں لکھا تھا کہ دیکھیے یہ جو مسلمان ہے یہ خواخوہ کے لیے حرام کھاتا چلا جا رہا ہے ان تدبیروں کی رو سے اُسی کو کھاؤ تو حلال ہو جاتا ہے اور حلال ہی نہیں بلکہ ان کے بڑے میاں^③ نے کہا تھا کہ اس سے ثواب ہوتا ہے۔ آج بھی یہی بحثیں ہو رہی ہیں۔

ہم نے اسلام کو دنیا بھر کی نظروں میں مذاق بنا دیا ہے

عزیزانِ من! غیر قرآنی نظام سیاسی ہو، معاشی ہو، معاشرتی ہو اُس میں اُس کے کسی جز کے متعلق یہ کہنا کہ یہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی بے معنی ہی نہیں بلکہ دنیا میں اسلام کا مذاق اڑانا ہے۔ آپ نے وہ چار قانون^④ رائج کر دیئے ساری دنیا میں آپ کا مذاق اڑ رہا ہے آپ کی قوم میں مذاق اڑ رہا ہے، چیخ رہے ہیں کہ ان کے مطابق سزا نہیں دی جاسکتی یہ ناممکن العمل ہیں۔ ان کو کسی کے سامنے جب پیش کیا جاتا ہے تو حیا سے آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ اور پھر ایک اور دلچسپ چیز ہے کہ جسے آج اسلامی کہا جا رہا ہے یہ ڈکٹیٹر شپ کا نظام ہے۔ اُس کے خلاف تحریکیں اٹھائی جاتی ہیں کہ قوم کو قانون سازی کی جو آزادی ملتی ہے یہ نظام اُس کو سلب کرتا ہے کہ وہ جمہوریت نہیں ہوتی، پارلیمان نہیں ہوتی۔ قوم، ملت، امت اپنی مرضی سے قانون نہیں بنا سکتی۔ یہ نظام قوم کے اس اختیار یا آزادی کو سلب کرتا ہے اور پھر اُس کے خلاف بڑی بڑی تحریکیں اٹھتی ہیں۔ ہزار سال پہلے ہمارے ہی جیسے کچھ آدمیوں نے کچھ قانون بنائے اور آج ان قوانین کو لاگو کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ تم ان کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتے۔

① یعنی مفتی محمد ابوسعید غلام سرور قادری کی کتاب: ”معاشیات نظامِ مصطفیٰ“ میں۔

② مفتی محمد ابوسعید غلام سرور قادری کی کتاب: معاشیات نظامِ مصطفیٰ کا آخری باب کتاب الحیل میں یہ تدابیر درج ہیں۔

③ یہ اشارہ فتاویٰ قاضی خاں مح عالمگیری جلد دوم کی طرف ہے۔

④ یہ صدر ضیاء الحق (1924-1988) کے دورِ حکومت میں رائج کیے جانے والے قوانینِ حدود کی طرف اشارہ ہے جو 9 فروری 1979 کو نافذ ہوئے تھے۔

خدا کی ذات کے علاوہ قانون سازی کا حق تو کسی نبی کو بھی حاصل نہیں

عزیزانِ من! ہمارے ہی جیسے انسانوں کو کیا حق پہنچتا ہے کہ آج وہ ہماری آزادی سلب کریں۔ یہ حق صرف خدا کو پہنچتا ہے جس پر ہم ایمان لائے ہیں کہ ہم تیرے ہر قانون کی اطاعت کریں گے۔ اور خدا کی بھی اُسی صورت میں اطاعت ہوتی ہے کہ پہلے ہم اُس کو اپنا حاکم مانیں۔ خدا نے تو یہ کہہ دیا تھا کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے خواہ اُسے قانون سازی کے اختیارات ملیں، ایگزیکٹو کے ملیں، خواہ نبی بھی کیوں نہ ہو اُس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ انسانوں سے کہے کہ تم میرے محکوم ہو جاؤ بلکہ اُس کو کہنا چاہیے کہ تم خدا کی کتاب کے محکوم ہو جاؤ۔ وہ تو نبی کو بھی یہ حق نہیں دیتا چہ جائیکہ ہم جیسے انسان، خواہ علم میں کیسے ہی کیوں نہ ہوں قانون سازیاں کریں۔ وہ تو کہتا ہے کہ ان کو یہ حق کس نے دے دیا کہ وہ ہزار سال پہلے کوئی قانون بنائیں اور ہمارے اوپر وہ قانون اس طرح سے لاگو ہو کہ اُس کے خلاف ایک لفظ نہ کہہ سکیں؟ یہ کس طرح سے اسلامی قانون ہو سکتا ہے؟ آج کے ڈکٹیٹر کا بنایا ہوا قانون حتیٰ کہ آج کے نظام پارلیمنٹ کا بھی بنایا ہوا قانون ہو اُس کو تو آپ کہیں نہ کہیں چیلنج کر سکتے ہیں لیکن ان شرعی قوانین کو چیلنج بھی نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن حکیم کی تعلیم قرآنی معاشرت کے لیے ہوتی ہیں

عزیزانِ من! یہ ٹھیک ہے کہ آج میری آواز اتنی مؤثر نہیں ہے مجھے اُس کی پرواہ بھی نہیں ہے۔ میں یہ چیزیں اس لیے کہہ دیتا ہوں کہ غنیمت ہے کہ اس قسم کی ایجادات ہو گئی ہیں، یہ میرے سامنے رکھی ہیں جن میں یہ چیزیں محفوظ ہو جائیں گی۔ یہ دور اب لدرہا ہے خواہ وہ مذہبی پیشوائیت ہو، ملوکیت ہو، انسانوں کے قانون سازی کے اختیارات کا دور ہو، وہ اب لدرہا ہے۔ اس کے بعد دور آئے گا کہ اُس میں اس زمانے کی جب تاریخ سامنے آئے گی تو کم از کم کسی نے بھی یہ آواز سن لی تو وہ تو یہ چیز ہوگی کہ اس دور میں کوئی ایک تو ایسا تھا جو یہ آواز بلند کرتا تھا کہ غیر اسلامی نظام کے اندر اسلام کی بات کرنا بے معنی ہے۔ اُس نظام کو پہلے قرآن کی بنیادوں پہ استوار کیجیے پھر اُس کے اجزاء کے متعلق گفتگو کیجیے جو اُس کے اندر فٹ ان ہوتا ہے وہ اسلامی ہے اور جو اُس میں فٹ ان نہیں ہوتا، وہ غیر اسلامی ہے۔ خواہ وہ ہمارا بنایا ہوا ہو یا ہزار سال پہلے کا بنایا ہوا ہو۔ پہلے اُس انجن کو تو لاؤ جو بجلی سے چلنے والا ہے۔

عزیزانِ من! جو بنیادی چیز ہے وہ ہے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ: کسی کو اس کا اختیار حاصل نہیں ہے کہ انسانوں کے لیے وہ قانون بنا کر اُن کی آزادی اور پابندی کی حدود قائم کرے۔ وہ تو اس گورنر^① نے صرف اپنے مقام کے باہر ڈیوٹی بنادی تھی کہ جس میں فریادی آ کر انتظار کریں، اُس کے متعلق خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ (581-644/45AD) نے کہہ دیا تھا کہ تمہیں کس نے یہ اختیار دیا

① حضرت عمرو بن العاص بن سہمی۔

جبکہ خدا نے انہیں آزاد پیدا کیا تھا تو تم ان کو غلام بنا کر بٹھا رہے ہو۔

انسان کی سب سے زیادہ ذلت اور رسوائی معیشت کی بنا پر ہی ہوتی ہے

عزیزانِ من! قرآن کی بنیادی تعلیم احترامِ انسانیت ہے، شرفِ آدمیت ہے۔ کوئی کسی قسم کا ایکشن جس میں کسی انسان کی عزتِ نفس پر حرف آتا ہو تو اُس کی آزادی سلب ہوگی جو خدا نے اس کو دی ہے۔ یاد رکھیے! یہ یکسر غیر اسلامی ہے خواہ اس کا کچھ بھی نام کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ اُس کے نزدیک نظام، قانون، حکم صرف وہ اسلامی ہے جس سے انسانیت کے شرف اور احترام میں اضافہ ہوتا ہو یا کم از کم برقرار رہتا ہو۔ یہ معاشی نظام کے متعلق اُس نے اتنی اہمیت سے کیوں کہہ دیا؟ اس لیے کہ یہ روٹی کی احتیاج ہے جس کی رو سے انسان سب سے زیادہ ذلیل ہوتا ہے۔ پھر اُس کے بعد جو جی میں آئے اس سے کراتے چلے جائیے۔ یہ اتنا بڑا اہم مسئلہ ہے۔ قرآن نے اس بنیاد کو لیا ہے کہ روٹی کے معاملے میں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہ ہوتا، وہ کسی دوسرے کا محکوم نہ ہو اور روٹی اس طرح سے ملے کہ اُس کے عزتِ نفس کے اوپر کوئی حرف نہ آئے۔

انسان کی انسانیت قرآنِ حکیم کے معاشی نظام سے ہی وابستہ ہے

یہ نظام جس میں ہر فرد کو اُس کی ضرورت کے مطابق اس طرح روٹی ملتی ہے کہ اُس کے احترامِ انسانیت پہ زندہ نہیں پڑتی تو وہ قرآن کا معاشی نظام ہے۔ اور باقی جتنے بھی نظام ہیں اُن میں آپ دیکھیے کہ انسان انسان کی حیثیت سے باقی نہیں رہتا۔ یہ غیر قرآنی نظام کیا ہے؟ معاشرے میں ایک بڑھئی آپ کے ہاں صبح سے آتا ہے، وہ دن بھر کام کرتا ہے، شام کو آپ اُس کا مقرر کیا ہوا اُس کو دیتے ہیں۔ اُس نے آپ کے لیے کچھ کر کے دیا ہے، اُس کے بدلے میں آپ اُسے کچھ دیتے ہیں۔ سبزی والا دودھ بیچنے والے کو سبزی دیتا ہے اور اُس سے دودھ لیتا ہے، اسے تعاون کہا جاتا ہے، یہ ایک دوسرے سے Cooperation (تعاون) ہے، معاشرے میں اس کی ضرورت ہے۔

مذہبی سوچ نے دین اور دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے

یہ روپیہ جو کسی کو قرض کے اوپر دیتا ہے، وہ سال بھر کے بعد سو روپیہ جو دیا تھا وہ سو کا سو تو واپس لیتا ہے لیکن اُس کے اوپر دس اور لیتا ہے۔ یعنی سودیئے تھے، وہ سو واپس لے لیے تو پہلی چیز یہ کہ کچھ دیتا نہیں ہے، اور اگلی چیز یہ ہے کہ بغیر کچھ دیئے ہوئے لیتا ہے جیسے اس سو کے قرض دینے میں 110 لیے یعنی 10 روپے 100 روپے کے اوپر لیے۔ عزیزانِ من! جو بغیر کچھ دیئے ہوئے لیتا ہے یہی ربا ہے۔ اسلامی نظام کے استوار کرنے والوں نے تو یہ کہہ دیا تھا اور کر بھی دکھایا تھا۔ سنیے! ایک بوڑھا ٹریڈری آفس کی طرف جا رہا

تھا۔ بائی دی وے ہماری حالت یہ ہوگئی ہے کہ ہم نہ دین سے واقف ہیں نہ اس کی اصطلاحوں کا پتہ ہے۔ ٹریڈری آفس کا ترجمہ بیت المال ہی ہے اور ہمارا بیت المال اسلامی ہے اور ٹریڈری آفس سیکولر ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ بوڑھا جا رہا تھا، کہا¹ کہ کدھر جا رہے ہو؟ بوڑھے نے کہا کہ میں بیت المال کا کچھ Due (واجب الادا) ادا کرنے جا رہا ہوں۔ کہا کہ ہم نے تو تمہیں پہلے نہیں دیکھا، ابھی دیکھ رہے ہیں۔ بوڑھے نے کہا کہ جی میں غیر مسلم تھا، دوسری جگہ سے مسلمان ہو کر یہاں مدینے میں آیا ہوں۔ کہا کہ کب آئے ہوئے؟ بوڑھے نے کہا کہ ابھی دو مہینے ہوئے ہیں۔ کہنے لگے کہ حکومت نے دو مہینے میں تمہارے لیے کیا کیا ہے؟ بوڑھے نے کہا کہ ابھی تو میں آیا ہوں۔ کہنے لگے کہ جب اُس نے تمہارے لیے کچھ کیا نہیں ہے تو تم اس کے لیے Due (واجب الادا) کیسے دے رہے ہو، انتظار کرو جب وہ تمہارے لیے کچھ کر دے تو اُس کے بعد Due (واجب الادا) دینا۔ جو حکومت نے تمہیں دیا ہے اُس کے بدلے میں تم سے کچھ لینا ہے ورنہ یہ رٹا ہو جائے گا۔

دین خداوندی کی عطا کردہ بنیادوں کے بغیر مذہبی سوچ کا محل کھرا کرنے کی ناکام کوشش

ہمارے ہاں بحش چل رہی ہیں کہ جی، بنک کا سود حلال ہے یا نہیں؟ ڈیپازٹ کی ہوئی Money (رقم) حلال ہے یا نہیں؟ Provident Fund کے اوپر جو ہم لیس گے وہ حلال ہے یا نہیں؟ یہ وہی ہے کہ کو حلال ہے یا حرام۔ عزیزانِ من! یہ بحش اسلامی نہیں ہیں۔ غیر اسلامی نظام کے اندر اسلامی بحثوں کا دخل کیا ہے۔ قرآن نے یہاں یہ کہا کہ وَمَا آتَيْتُم مِّن رَّبٍّ لَّيْرُبُوا فِيْ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ (30:39) تم جو اس طرح سے کسی کو کچھ دیتے ہو اور اُس کے بعد اُس میں سے زیادہ لیتے ہو تو سمجھتے ہو کہ یہ سو کا سو اسو ہو گیا، یہ دولت بڑھ گئی۔ کہا کہ تمہارے تصور کے مطابق یہ بڑھ گئی ہے لیکن خدا اور رسول کے نظام کے مطابق یہ بڑھا نہیں ہے بلکہ یہ گھٹ گیا ہے۔

محنت کے بغیر حاصل کردہ دولت خدا داد انسانی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی ہے

اُس نے کہا یہ تھا کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (53:39) معاوضہ ہر فرد کا محنت کا ہے۔ یہ جتنے افراد کسی کو کچھ دے کر آرام سے بیٹھ جاتے ہیں اور خود کچھ محنت نہیں کرتے بلکہ دوسرے کی محنت کا استحصال کر کے کچھ لیتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ قوم میں ایسے افراد موجود ہو جائیں جو محنت کچھ نہ کریں اور زیادہ سے زیادہ کمائیں تو اس سے قومی دولت کم ہو جاتی ہے۔ قومی دولت اُس صورت میں بڑھتی ہے کہ جو کام کرنے والے افراد ہیں ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کی جائے، ان کی پرورش کی جائے، ان کو اچھی غذائی

1 یہ حضرت عمر فاروقؓ (AD 581-644/45) کا واقعہ ہے۔

جائے ان کے لیے اچھے حالات پیدا کیے جائیں۔ اسلامی نظام کی بنیاد یہ ہے۔ اب ایک تو یہ ہے کہ کوئی فرد ایسا نہ ہو جو محنت کرنے کے قابل ہو اور محنت نہ کرے۔ یہاں اصول لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى ﴿53:39﴾ کا ہے۔ ان کو تو روٹی بھی نہیں مل سکتی جو محنت کرنے کے قابل ہوں اور محنت نہ کریں۔ جب اُس نے ہر فرد کو محنت کرنے والا بنایا ہے تو اگر اُس نظام کے اندر یا اُس مملکت میں ایسے لوگ ہونگے جو محنت نہیں کریں گے اور کھائیں گے تو اُس سے دولت کم ہو جائے گی۔ یعنی لائے کچھ نہیں اور اُس دولت میں سے کچھ کھا جائے تو اس سے دولت کم ہوگی۔

Investors ہوں یا Business Men یا Industrialists اگر ان کی جیب خالی کر دی جائے تو یہ ایک وقت کی روٹی کمانے سے عاجز دکھائی دیں گے

عزیزانِ من! جتنا بھی روپیہ Invest (لگا کر) کر کے اُس انوسٹمنٹ سے کچھ حاصل کیا جاتا ہے یہ رہا ہے۔ یہ جتنے بڑے بڑے Business Men (کاروباری حضرات) Industrialists (صنعت کار) جاگیردار ہیں یہ سرمائے کے اوپر کچھ لینے والے ہیں۔ اگر آج ان کے سرمائے Freeze (منجمد) ہو جائیں ”تاں ایناں نوں ایک ٹائم دی روٹی کمان دا ول نہیں اوند“۔^② آپ دیکھیے کہ ملک کے اندر ایک طبقہ ہے جو ملک کی دولت میں کمائی کر کے تو کوئی اضافہ نہیں کرتا بلکہ کمائی کرنے والوں نے جو دولت ملک میں پیدا کی ہے اُس کو بیٹھا ہوا کھاتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح دولت کم ہوگی۔ عزیزانِ من! قرآن کریم کے دو الفاظ ہیں، کیا بات ہے قرآن کریم کی! کہا کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْا الرِّبَا (3:130) اے جماعتِ مومنین! رُؤْمَت كُرُوْا آگے ہے کہ اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً (3:130)۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس کا ترجمہ کیا کیا جاتا ہے؟ کوئی ترجمہ کوئی تفسیر اٹھا کر دیکھ لیجیے آپ کو یہی ملے گا کہ سود در سود نہ کھاؤ۔ یہ بحثیں ہیں کہ قرآن نے سود در سود سے منع کیا ہے، سادہ سود سے منع نہیں کیا۔ میں نے کہا ہے کہ جب ایک دفعہ گاڑی دوسری پٹری پہ جا پڑے تو جتنی تیزی سے چلتی جائے گی اپنی منزل سے دور ہوتی چلی جائے گی۔

-
- ① انسان کو وہی نتائج مل سکیں گے جن کے لیے اس نے محنت اور کوشش کی ہوگی۔ جیسی جدوجہد اسی قسم کے اس کے نتائج۔ خدائی پیمانے کے مطابق معاوضہ صرف محنت کا ہوگا (پرویز: مفہوم القرآن، ص-244)۔
- ② انہیں تو ایک وقت کی روٹی کمانے کا ڈھب بھی نہیں آتا۔

ریا کے نظام کا حاصل ہمیشہ دولت اور صلاحیتوں کی کمی کی شکل میں ظاہر ہوا ہے

یہ اَضْعَافًا مُّضْعَفَةً (3:130) ہے۔ عربی زبان جانے والے جھوم جائیں۔ کہا ہے کہ تمہارے ذہن میں یہ ہے کہ اس ربا سے دولت بڑھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے دولت بھی گھٹتی ہے اور کمانے کی صلاحیتیں بھی ماند پڑ جاتی ہیں۔ وہ کہنا ہی یہ چاہتا ہے کہ تم فریب نفس میں مبتلا ہو کہ اس سے دولت بڑھ جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ اُس فرد کی کمانے کی صلاحیتیں مضحل ہو جاتی ہیں اور قوم کی دولت کم ہو جاتی ہے۔ کہا کہ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (3:130) ڈرو اس کے انجام سے۔ اب دیکھیے قرآن ربا کے مقابلے میں کیا لفظ لاتا ہے۔ وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رَبِّ لَئِيْزُبُوْا فِيْ اَمْوَالِ النَّاسِ (30:39) خدا کے معیار اصول اور نظام کے مطابق یہ دولت ربا سے بڑھتی نہیں ہے۔ وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ زَكٰوةٍ تَرْيَدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (30:39) دولت زکوٰۃ سے بڑھتی ہے۔ تو ربا کے برعکس وہ جو لفظ لایا ہے وہ زکوٰۃ کا لفظ ہے۔

مرجہ تراجم نے قرآن کے معاشی نظام کی اصطلاحات کو بدل کر رکھ دیا

انہوں نے ربا کا ترجمہ سود کیا، پھر سود کی بجائے منافع کیا اور اُسی کے اندر پہلے مزارعت لائے یعنی اگر آپ کسی مزارع کو زمین خرید کر دیدیتے ہیں تو اُس سے آدھی بٹائی تمہاری ہے۔ Sleeping Partner (غیر کار گزار پتی دار) کی حیثیت سے گویا اگر آپ کسی بزنس (کاروبار) میں Invest (سرمایہ لگا) کر دیتے ہیں تو اُس کے منافع میں جو کچھ مقرر کر دہ شیر مادر کی طرح حلال ہے۔ انہوں نے بہر حال ربا کو یہ کیا۔ اس سے تو پوچھو نہیں کہ کتنی دولت آتی ہے۔ اب اُس کے بعد کہا کہ ربا حرام ہے۔ اس کے مقابلے میں کہا کہ تم زکوٰۃ دیدو تو جتنا روپیہ تم جمع کرو گے وہ سارے کا سارا شیر مادر کی طرح حلال ہو جائے گا۔ اور زکوٰۃ کے متعلق یہ قانون بنا لیا کہ اس میں 2.5% دیدیا جائے تو وہ زکوٰۃ ہوتی ہے۔

اگر ربا کا کتابانی میں ہی رہے تو زکوٰۃ کے اڑھائی ڈول نکالنے کا کیا مقصد؟

اس سارے مال میں سے جو اس طرح سے جمع کیا ہے کہ جو اپنی محنت سے نہیں لیا گیا خواہ وہ مزارعت سے ہو، مزارعت سے ہو، بینک کے منافع سے ہو، تو فتویٰ یہ ہے کہ اس دولت کی حد بندی نہیں کی جاسکتی اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کس حد تک تم یہ دولت جمع کر سکتے ہو۔ اس سارے کے سارے کو حلال کرنے کے لیے اس میں اڑھائی پرسنٹ دیدیا جائے تو باقی سارا حلال و طیب ہو جاتا ہے۔ یہ سراسر ربا کے نظام سے اکٹھی کی ہوئی دولت ہے اور اُس میں سے اڑھائی پرسنٹ دیدیا جائے تو ان کے نزدیک حلال و طیب ہو جاتا ہے۔ جا کر مولوی صاحب سے مسئلہ پوچھا کہ پانی میں کتا گر گیا ہے اب کیا کریں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اُس میں سے

پچاس ڈول نکال دو تو وہ حلال ہو جائے گا۔ انہوں نے اُس میں سے وہ پچاس ڈول نکال دیئے۔ اُس کے باوجود پانی کو دیکھا تو پتہ چلا کہ اتنے میں کتنا پھول کر پھٹ بھی گیا تھا، اُس میں بو بھی آتی تھی اور کچھ ذرے بھی نکلے تھے۔ اب کسی ہیلانہ آفیسر نے اس پانی کے متعلق پوچھا کہ اس میں کتنا گر گیا تھا تو تم نے کیا کیا؟ کہنے لگے کہ مولوی صاحب سے فتویٰ پوچھا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ پچاس ڈول نکال دو تو حلال و طیب ہو جائے گا۔ آفیسر نے کہا کہ پچاس ڈول تو نکال دیئے ”وچوں کتاوی کڈیا کے نہیں“ کہندے کہ اے تے مولوی صاحب نے کہا ای نہیں سی ہیگا۔“^① اڑھائی فیصد کے حساب سے ڈول نکال دو اور روٹا کے نظام کا کتا اُسی طرح رہنے دو۔

مذہب کے معاشی نظام کو قرآن کا معاشی نظام سمجھتے ہوئے اہل مغرب کی تنقید

عزیزانِ من! میں کچھ خوش ہو کر یہ باتیں نہیں کہتا۔ زندگی کا آخری دور ہے، میرے دل کی چیخیں ہیں جو نکل رہی ہیں۔ مجھے نہ ان لوگوں کے فقہ سے کوئی واسطہ ہے نہ ان سے واسطہ ہے، مجھے واسطہ اس سے ہے کہ اسلام دنیا میں بدنام ہو رہا ہے۔ میری تو بدبختی یہ ہے کہ میں ان مغرب والوں کے خیالات پڑھتا ہوں۔ وہ جو آپ کے اکنا مک سسٹم کے اوپر تنقید کرتے ہیں تو میری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں کہ وہ اسلام کے متعلق یہ سب کچھ کہتے ہیں۔ اور اس سارے معاشرے کے مجرم یہ لوگ ہیں جو اس کو اسلام کہہ کر دنیا میں پھیلا رہے ہیں۔ کہا کہ اُولَئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ (30:39) اس سے اضافہ نہیں ہوتا بلکہ اضافہ زکوٰۃ سے ہوتا ہے۔

ہر فرد کی معاشی ذمہ داری مملکت کو پوری کرنا ہوگی

زکوٰۃ کے لفظی معنی بھی قرآن سے یہ ہیں کہ کام کرنے والوں کو سامانِ نشوونما مہیا کرو۔ روٹی کی فکر دور کر دو، یہ پریشانی نہ رہے، ان کو اس کی فکر ہی نہ ہو کہ شام کو گھر جاؤں گا تو بچے بلک رہے ہوں گے۔ یہ اپنے ذمے لو، قرآن کے نظام کی رو سے ہر فرد اور اس کے بچوں کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ یہ نظام کی بنیاد ہے۔ زکوٰۃ کے یہ معنی ہیں کہ ان سب کی نشوونما کرو۔ ایسا جامع لفظ زکوٰۃ قرآن نے کہا ہے، نہ روٹی کہا ہے نہ کپڑا کہا ہے نہ مکان کہا ہے نہ میڈیکل ایڈ کہا ہے بلکہ ایک جامع لفظ ہے زکوٰۃ کہ سامانِ نشوونما اور یہ نشوونما بھی صرف Physical (جسمانی) نہیں ہے کہ اُسے پہلوان بنا دو بلکہ نشوونما میں ذہنی صلاحیتیں بھی ہیں، قلبی صلاحیتیں بھی ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی اہل جنت کو سامانِ نشوونما ملتا جائے گا۔ وہاں تو یہ روٹی والی بات نہیں ہے۔ وہاں سامانِ نشوونما کیا ہے؟ وہاں انسان کی اور صلاحیتیں ہیں جنہوں نے آگے بڑھنا ہے۔ تو اس چیز کے لیے زکوٰۃ جامع لفظ ہے کہ ان کو سامانِ نشوونما دیتے چلے جاؤ۔ یہ دیتے چلے جاؤ گے تو پھر تم دیکھو گے کہ کس طرح سے قوم کی دولت بڑھتی ہے۔

① پچاس ڈول پانی تو نکال دیا، یہ بتاؤ کہ اس میں سے کتنا بھی نکالا تھا یا نہیں؟ کہنے لگے کہ مولوی صاحب نے یہ تو کہا ہی نہیں تھا۔

قوموں کے اندر کمانے کی استطاعت کیونکر کمزور پڑتی ہے

دو سو سال پہلے کی بات ہے کہ اُس^① نے "Wealth of Nations" کتاب لکھی تھی وہ آج بھی بڑی اسٹینڈرڈ کی کتاب مانی جاتی ہے۔ اُس میں مسئلہ یہ ہے کہ فرد کی اکم کا سوال نہیں ہوتا بلکہ قوم کی دولت کا سوال ہوتا ہے۔ قرآن وہ طریق بتاتا ہے جس سے قومی دولت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ وہ ہوتی اس طرح سے ہے کہ جو افراد کمانے والے ہیں وہ کماتے نہیں ہیں تو ان کی محنت کرنے کی صلاحیتیں اور استطاعت دن بدن مضحل ہوتی چلی جاتی ہیں وہ کسی کام کے قابل نہیں رہتے۔ اور دوسری طرف جو محنت کرتے ہیں تو ان کی محنت کی کمائی کا ایک حصہ ان کمائی نہ کرنے والوں کے لیے چلا جاتا ہے۔ یہ محنت کرنے والے بھوکے مر جاتے ہیں اور وہ محنت نہ کرنے کی وجہ سے سہل انگار ہو جاتے ہیں۔ قومی دولت میں اسی وجہ سے کمی واقع ہوتی ہے۔

بھوک کا خوف ختم ہونے پر انسانی صلاحیتیں کہیں زیادہ نشوونما پاتی ہیں

کہا کہ سوال یہ ہے کہ کسی کی کمائی میں سے کوئی شخص کچھ نہیں لے سکتا اور ہر فرد کی نشوونما کی ضروریات کی ذمہ داری مملکت کے پاس ہوتی ہے۔ اب نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت ہوتی ہے نہ خواغہ کسی کی مت ماری ہوئی ہے کہ روپیہ جمع کر کے رکھے اور رکھے تو اُس کو کیا کرے کیونکہ کوئی مکان نہیں بنا سکتا کہ جس کو کرائے پہ دے، کوئی زمین نہیں لے سکتا کہ جس کو پٹے پہ دے، انوسٹ نہیں کر سکتا کہ جہاں سے منافع لے۔ قرآن نے کہا کہ ہر فرد کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری لیتے چلے جاؤ، خود لو اور اُس کو اُس کام کے لیے فارغ کر دو جو کام اُس کے سپرد ہے پھر دیکھو کہ وہ کتنا کام کرتا ہے۔ رزق بہم پہنچاؤ۔ عربی میں رزق کے معنی سامان زندگی تو ہے لیکن اُس میں عربوں کے ہاں شرط ہے کہ سامان زندگی جو بروقت دیا جائے اُسے رزق کہتے ہیں۔ وہ رزق دیتا ہے تو بروقت دیتا ہے۔

جو قوم اپنا رشتہ قرآنی نظام سے وابستہ رکھے تو اس کی خزاؤں میں بھی بہار کا عنصر پوشیدہ ہوتا ہے کہا کہ یہ ہے زکوٰۃ جو ہم نے کہا ہے کہ ”سامان نشوونما کی ذمہ داری لو“۔ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ (30:39)۔ پہلے سے سارا نظام کائنات یہ لیے چلا آ رہا تھا جس سے یہ نتائج اخذ کر کے آگے اُس نے بہم پہنچائے تھے کہ دیکھتے ہو کائنات کی ہر شے خدا کے قوانین کے تابع چلتی ہے۔ خزاں بھی آتی ہے تو درخت روتا نہیں ہے کیونکہ اُسے پتہ ہوتا ہے کہ اُس کی ٹہنیوں کے اندر

① اس کتاب کے مصنف کا نام آدم سمیٹھ (Adam Smith: 1723-1790 AD) ہے۔

بہار پوشیدہ ہے لیکن جو بھنی درخت سے ٹوٹ کر گر گئی پھر اُس کے نصیب میں بہار نہیں ہوتی کیونکہ اُس نے قانونِ خداوندی سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔ یہ بات پیچھے سے چلی آرہی تھی۔ یہاں تک قرآن لایا کہ سامانِ رزق دیتے چلے آؤ۔ اب کہا کہ آؤ ہمارے نظام کی طرف دیکھو تو سہی کہ اللہ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ① (30:40)۔ دیکھتے ہو ہمارا نظامِ معیشت۔ پیدا ہونے سے پہلے کی بات تو تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے لیکن ہوتا یہی ہے۔

رحمِ مادر میں ایک جرثومے سے انسانی جسم کی تکمیل اور اس کی پرورش کا حیرت انگیز کرشمہ

عزیزانِ من! آج تک یہ بڑے بڑے سائنسٹ محو حیرت ہیں کہ رحمِ مادر میں ایک ذرا سا جرثومہ جو Naked Eye (خالی آنکھ) سے دیکھا بھی نہیں جاسکتا، کس طرح سے ایک پورا انسانی بچہ بن جاتا ہے۔ گوشت پوست اندر کے اعضاء، دماغ، ہڈیاں، قلب ان سب چیزوں کی کہاں سے پرورش ہوتی ہے، کیسے پرورش ہوتی ہے۔ یعنی سینکڑوں کی تعداد میں یہ عناصر ہوتے ہیں جن سے کہیں یہ خون بنتا ہے یا انسان کا جسم بنتا ہے۔ کہا کہ یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ بچے کی پیدائش سے دس منٹ بھی پہلے یہ رزق کے جو چشمے تھے وہ رواں نہیں تھے، جونہی وہ اس دنیا میں آیا تو اُس کا پہلے نظام سے رشتہ منقطع ہوا۔ یہاں آنے کے بعد اگر ایک سانس کے لیے بھی ہوا نہ ہو تو بچہ مر جاتا ہے۔ کہا کہ اُس کے پیدا ہونے سے پہلے ہم نے ہوا بنائی، روشنی بنائی، حرارت بنا دی اور اُس کے ساتھ ہی رزق کے چشمے رواں کر دیئے۔ وہاں انہیں رواں کیا ہے اور اس بچے کے اندر جس کو اس سے پیشتر پتہ نہیں تھا کہ میں نے ماں کے تھنوں سے دودھ پینا ہے تو یہ چیز اس کو کس نے سکھائی؟ اندر رحمِ مادر میں تو یہ بات نہیں جانتا تھا، اندر تو نہ یہ تھن تھے اور نہ یہ دودھ پیتا تھا۔ باہر آتے ہی کون سے استاد نے یہ بات کہی کہ اب وہ بلک کر چھاتیوں کی طرف جاتا ہے۔ رزق مل رہا ہے، بروقت مل رہا ہے۔ یہ نظامِ قدرت ہے۔ گوالا جو دودھ لاتا ہے تو گھر والے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ تُو نے اس میں پانی ڈالا ہے، وہ کہتا ہے کہ حرام ہے جو ایک قطرہ بھی پانی ڈالا ہو، اصل میں وہ بھینس نئی بچہ والی ہے اس لیے اس کا دودھ پتلا ہے۔ یہ جو بچہ پیدا ہوا ہے تو اُس میں ابھی ہضم کرنے کی قوت بڑی کم ہوتی ہے تو یہ جو شروع میں پہلے دودھ آتا ہے تو اُس میں پانچ فیصد غذا ہوتی ہے اور پچانوے فیصد پانی ہوتا ہے۔ اور آپ حیران ہو گئے کہ جوں جوں اس کے معدے کی قوتِ ہاضمہ بڑھتی چلی جاتی ہے تو اندر ایک مشینری از خود لگی ہوئی ہے وہ پانی کم کرتی چلی جاتی ہے اور دودھ گاڑھا کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ کون کرتا ہے؟ عزیزانِ من! رزق

① یہ قانون اس خدا کا ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا اور سب کے لیے رزق (سامانِ زیست) مہیا کیا۔ (لہذا جب رزق سب کے لیے ہے تو اس کی تقسیم بھی اس طرح ہونی چاہیے کہ اس سے سب کی نشوونما ہو جائے)۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 939)۔

مناسب نشوونما، وہ بروقت دے رہا ہے۔ یہ جو آپ کے ہاں Powder (پاؤڈر) دودھ کے ڈبے بنے ہوئے ہیں تو ان کے باہر جو چارٹ لگا ہوا ہوتا ہے کہ پہلے مہینے میں دودھ کی اتنی چچیاں اور اتنے چچ پانی کے، تو جوں جوں بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے وہ دودھ کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں اور پانی گھٹاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ انہوں نے جو چارٹ بنایا ہے تو یہ ماں کے دودھ کا Analysis (تجزیہ) کر کے بنایا ہے۔

پیدائش سے پہلے رحم مادر میں کوئی بچہ بھوک سے نہیں مرتا

کہا کہ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ (30:40)۔ او کم بختو! اپنے ہاں یہ نظام رائج کرو۔ جتنی دیر تک یہ بچہ ہمارے کائناتی قانون کے اوپر ہے تو ہم حیوان کے بچے کو اور انسان کے بچے کو اس طرح سے رزق دیتے چلے جاتے ہیں۔ اُس کے بعد حیوان کا بچہ انہی کے ساتھ آزادی سے کھاتا پیتا ہے، وہاں کسی نے لکیریں نہیں کھینچی ہوئیں۔ اب جو انسانی بچہ تمہارے بس میں پڑ گیا تو دوسرے ہی دن بھوکا رہتا ہے کہ دودھ والا دودھ نہیں لایا کیونکہ اس کا بل نہیں دے سکے تھے اس لیے اُس نے دودھ بند کر دیا ہے۔ دنیا کی پچاس فیصد آبادی آج بھی رات کو بھوکا سوتی ہے۔ خدا کے نظام میں تو کوئی بچہ بھوکا نہیں سوتا۔ زکوٰۃ کے معنی اب آپ نے سمجھ لیے کہ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ (30:40)۔ ذرا سوچو کہ تمہارے نظام میں یہ نقص کہاں واقع ہوتا ہے؟ ثُمَّ یُمِیتُكُمْ (30:40) ہمارا طبعی قانون ہے اور اُس کے مطابق ایک دن اس جسم کی مشینری نے چلنا بند کر دینا ہے اسے موت کہتے ہیں۔

حیوانی اور انسانی زندگی میں ایک بنیادی فرق ہے

کہا کہ اگر تصورِ حیات یہ ہے کہ بچہ پیدا ہوتا ہے، کھاتا پیتا ہے، بڑھتا پھولتا پھلتا ہے، جوان ہوتا ہے، بوڑھا ہوتا ہے، مر جاتا ہے اور اس کے بعد انسانی زندگی ختم ہو جاتی ہے تو حیوان کے ساتھ بھی یہی بتی ہے اور انسان کے ساتھ بھی یہی بتی ہے۔ اگر یہ تصورِ حیات ہے تو اب آپ کا نظام حیوانی سطح پہ آ گیا۔ حیوانی سطح یہ ہے کہ جس کی لالھی اُس کی بھینس۔ شیر کی قوت اگر بڑھی ہوئی ہے تو اُس کی موجودگی میں کوئی اور جانور شکار نہیں کر سکتا۔ البتہ حیوان میں بھی اتنا ہوتا ہے کہ اپنی ضرورت کے مطابق خون پیتا ہے، گوشت کھاتا ہے اور باقی دوسروں کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ وہاں Law (قانون) قوت ہے جس میں جتنی قوت ہے وہ اتنا ہی تسلط رکھتا ہے۔ کہا کہ اگر زندگی کا تصور حیوانی ہے کہ پیدا ہوا اور اس نے اپنی زندگی بسر کی، پھر اس نے مر جانا ہے، ختم ہو جانا ہے تو پھر کسی Value (قدر) کی، کسی انسانیت کے شرف کی کسی قسم کا، کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس نے جتنا چھین لیا، جھپٹ لیا وہ اس کا ہے۔ یہ ہے ایک سیکولر نظام کہ اس میں سارا مال جمع بھی کرنا ہے، دوسروں کی کمائی کو چھین بھی لینا ہے، دوسروں کو بھوکے بھی مار دینا ہے

محتاج بھی کر دینا ہے، محکوم بھی بنا دینا ہے۔ یہ سارا نظام اس لیے ہے کہ زندگی کا تصور یہ ہے کہ مر گئے اور معاملہ ختم ہو گیا۔ ”ایہہ جہان مٹھا، اگلا کن ڈٹھا“^①۔ اس اتنی سی چیز سے پھر ہر چیز جائز ہو جاتی ہے۔ اور زندگی کا دوسرا تصور یہ ہے کہ جسم پہ تو موت وارد ہوتی ہے لیکن جسے انسان کہا جاتا ہے وہ اس کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور جو کچھ اس نے یہاں کیا ہوا ہوتا ہے اُس کے مطابق اُس کے نتائج اُس نے وہاں بھگتتے ہوتے ہیں۔ یہ جو تصور حیات ہے کہ انسان یہاں جو کچھ کرتا ہے اگر یہاں اُس کے نتائج سے وہ کسی طرح بچ جاتا ہے تو وہ سوسائٹی کے قوانین ہیں۔ پہلے تو ان قوانین کی صورت یہ ہے کہ اگر سوسائٹی ربا کو جائز قرار دیتی ہے تو یہ کوئی جرم ہی نہیں ہے، اگر وہ اس کو جرم قرار دیتی ہے تو بچنے کی تدبیریں موجود ہیں لیکن اگر Concept of Life (تصور حیات) یہ ہے کہ

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خون جگر ودیعتِ مرگان یار تھا

(غالب)

مجھے کسی کے سامنے جا کر ایک ایک قطرے کا حساب دینا ہے پھر انسان یہاں حیوانی سطح کی زندگی بسر نہیں کرتا، اور پھر Law (قانون) جنگل کا نہیں ہوتا بلکہ Law of Values (اقدار کا قانون) ہوتا ہے۔ اور Value (قدر) یہ ہے کہ کسی دوسرے کی محنت سے کچھ بھی استحصال کرنا بدترین جرم ہے جس کا مواخذہ خدا کے ہاں ہوگا۔ فرد کی سطح پہ اور مملکت کی سطح کے اوپر بھی یہی نظام ہے۔ حضرت عمرؓ (581-644/ 45 AD) نے ایک فقرے میں بات بتادی۔ ان سے پوچھا گیا کہ خلافت کیا ہوتی ہے؟ کہنے لگے کہ میں تو اتنا ہی سمجھتا ہوں کہ خدا کے ہاں اس کی جوابدہی ہے کہ ”کہاں سے لیا تھا اور کہاں خرچ کیا تھا“؟ کیا نگاہیں تھیں ان لوگوں کی! کہا کہ اگر اس کا جواب اطمینان بخش دیدیا گیا تو وہ خلافت بھی ہے اور وہ جو غلیفہ ہے یہ بچ بھی گیا اور اگر اس Audit (آڈٹ) میں وہاں کوئی سقم رہ گیا تو نماز روزہ نہیں بخشوا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اس نظام میں نماز روزہ کا مقام اور اہمیت کیا ہے؟

نظام کو عملی شکل دینے کے سلسلہ میں نماز روزہ کا مقام اور اس کی اہمیت

عزیزانِ من! یہ جو میں نے نماز روزہ کہا تو ان کی اہمیت بھی کم نہیں ہے۔ ان کی تو اتنی ہی حیثیت ہے کہ مثلاً اگر آپ ایک بڑھئی کو دس بیس یا چالیس روپے^② دیہاڑی پہ لاتے ہیں۔ اُس سے آپ نے ایک دروازہ بنوانا ہے۔ وہ شروع میں آ کر اپنے تھیلے

① یہ جہاں مٹھا ہے اگلا جہان کس نے دیکھا۔

② یاد رہے یہ بات ستمبر 1979 کی 28 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

سے پتھر کی سل نکالتا ہے اور اپنے اوزار تیز کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اگر وہ بڑھئی سارا دن اپنے ان اوزاروں کو تیز کرتا رہے اور شام کو آپ سے کہے کہ لائیے چالیں روپے تو کیا آپ اُسے دیدیں گے؟ دروازہ بنانے کے لیے یہ اوزار تیز کرنا ضروری تھا، مگر وہ دروازہ تو بنائے نہیں اور سارا دن اوزار تیز کرتا رہے تو کیا اس سے دروازہ بنانے کا وہ مقصد پورا ہو جائے گا؟ عزیزانِ من! یہ جو نماز روزہ ہے، یہ تو ان ہتھیاروں اور اوزاروں کو تیز کرنے کے لیے ہیں تاکہ تم دروازہ بنا کر لگا سکو۔ یہ پتھر کی سل بھی ضروری ہے لیکن مقصود بالذات نہیں ہے، مقصود بالذات تو دروازہ بنانا ہے، مزدوری دروازے کی ملتی ہے۔ تصویر حیات یہ ہے کہ میں نے جو ان سے معاملہ کیا ہے کہ چالیں روپے لوں گا اور ان کا دروازہ مجھے بنا کر دینا ہے۔ اور یہ چیز یہی نہیں ہے کہ آج شام ختم ہوگئی اور معاملہ ختم ہو گیا بلکہ یہ جو ان کے ساتھ اقرار نامہ ہوا ہے تو وہ شام اور سویر کا سوال ہی نہیں ہے وہ مقصود تو دروازہ بنانا ہے۔ اسی طرح یہاں سے زندگی کے ختم ہونے کا سوال بھی نہیں ہے بلکہ زندگی اس سے بھی آگے چلے گی تو یہ نماز روزہ مقصود بالذات نہیں ہے ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ تصویر حیات ہے کہ **ثُمَّ يُحْيِيكُمْ** (30:40) پھر زندہ بھی ہونا ہے۔

خدائے علیم وخبیر اس نظام کائنات کو صرف آئینی قوت کے ساتھ کنٹرول کرتا ہے
قرآن کریم نے کہا ہے کہ **هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَفْعَلُ مِنْ ذَلِكُمْ مِنْ شَيْءٍ** ط **سُبْحَنَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ** (30:40) بتاؤ کوئی اور ہستی بھی ایسی ہے جو تمہارے لیے ایسا نظام پیدا کر دے۔ ٹھیک ہے ماں کا دودھ نہیں دیتے، ڈبے کا دودھ دیتے ہو تو ڈبے کا دودھ بھی تو خدا کا پیدا کردہ ہے کہ وہ جو گائے اور بھینس میں دودھ ہے، یہ اُسی کی شکل ہے۔ اصل یعنی اور بچن کے اعتبار سے تو یہ سارا رزق خداوندی ہے تم تو صرف شکل ہی بدلتے ہو، رزق تو وہی ہے جو گہیوں کا دانہ ہے جس سے تم نے ڈبل روٹی بنالی۔ پوچھا کہ کیا کوئی اور ایسی ہستی ہے جو رزق کی یہ بنیادی چیزیں تمہیں مہیا کر سکے۔ یہ چیزیں ایک مقصد کے حصول کے لیے مہیا کی تھیں۔

بقا اسی نظام حکومت کو ہوگی جو پوری نوع انسانی کے لیے منفعت بخش ہوگا
قرآن کہتا ہے کہ **أَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَمَا بَالُكُمْ فِي الْأَرْضِ** (13:17) اُسی عمل کو اُسی کام کو بقا حاصل ہوگی جو نوع انسانی کے فائدہ کے لیے کیا جائے۔ جن اعمال میں اپنی نجات ہوگی وہ اسلامی نہیں ہے وہ مذہب کی چیزیں ہیں۔ تم نے رندے کو تیز کرنا ہے، تیز اس لیے کرنا ہے کہ اس سے انسانیت کا بھلا ہو۔ کیا اس ذاتِ خداوندی کے علاوہ کوئی اور ایسا ہے؟ **سُبْحَنَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ** (30:40) جاؤ، نگاہ دوڑا کر دیکھو، کوئی اور تمہیں ایسا نہیں ملے گا جو اس کی اس صفتِ رزاقیت کے اندر شامل ہو۔

اب اُس کے دیئے ہوئے رزق کے متعلق اس نے کہا ہے کہ یہ تمام نوع انسانی کے لیے ہے اور وہ رب العلمین ہے۔ اُس کے اس دیئے ہوئے رزق کو جب تم سنبھال لو تو اُس میں سے آدھے انسانوں کو تو دو اور آدھے انسان بھوکے مرجائیں تو تم نے تو خدائی کا دعویٰ کر دیا۔

عزیزانِ من! سورۃ البقرہ کے شروع میں ہی جہاں زمین کا سوال ہے کہ ہم نے اس کو انسانیت کی بہبود کے لیے پیدا کیا، کہا کہ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا (2:22) خدا کے ہمسرا اور خدا نہ بناؤ کہ ہم نے انسانیت کی پرورش کے لیے پیدا کیا ہے اور تم اُس کو سمیٹ کر بیٹھ جاؤ۔ یہ دوسرا خدا بنا لینا ہے۔ کہا کہ جب بنیادی طور پر جو ذرائع رزق اور وسائل رزق ہیں، وہ صرف خدا کے ہیں، کسی انسان کے بنائے ہوئے نہیں ہیں، تو کسی انسان یا انسانوں کے نظام کو یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ اُس کی تقسیم اپنی مرضی کے مطابق کرے۔ جس دن بھی کوئی پوسٹ مین منی آرڈر کی تقسیم اپنی مرضی کے مطابق کرے گا تو دوسرے دن وہ جیل خانے میں ہوگا۔ وہ تو اُسے اُس پروگرام کے مطابق تقسیم کرنے ہیں جو وہاں سے ملا ہے۔ اُس کا اپنا حصہ تو وہ چار پیسے تنخواہ کے ہیں جو اس کو تقسیم کرنے کے مل رہے ہیں۔

انسانی ضرورتوں کو متعین کرنے کا فارمولا

میرے پاس جب دوست آتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ ہر ایک کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے اور ضرورت سے جو زائد ہے وہ دوسروں کے لیے دیا جاتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ صاحب! اگر ایک شخص اپنی ضرورتیں ہی اتنی زیادہ بڑھا دے کہ اس کے پاس کچھ بچے ہی نہیں بلکہ جو کمایا ہے وہ بھی کم ہی رہ جائے، یعنی کوٹھیاں بھی ضرورت ہے، موٹر سائیکل بھی ضرورت ہے، نوکر چاکر بھی ضرورت ہے۔ یہ ضرورتیں اگر اُس نے خود متعین کرنی ہیں تو کیسے کرے؟ ہمارے ہاں یہ مثالیں موجود ہیں کہ جو ضرورت متعین کرتا تھا وہ کیسے کرتا تھا، یہ ضرورتیں امیر المومنین متعین کرتا تھا۔ اس کی مثالیں سنئے۔ سب سے پہلے خلیفہ المسلمین حضرت ابو بکر صدیقؓ (573-634ء) خلافت سنبھالنے کے دوسرے دن حسب معمول کپڑا بچنے کے لیے نکلے۔ پہلے وہ کپڑے بچا کرتے تھے۔ یہ ان کا کاروبار تھا، کہا کہ کدھر جا رہے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ کاروبار کے لیے کپڑے لے جا رہا ہوں۔ کہتے لگے کہ حضرت! آج سے آپ کا سارا وقت امت کی امانت ہے اور آپ کو حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق اُسے صرف کریں۔ تو پہلی دفعہ یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ جو ہیڈ آف دی سٹیٹ یا سربراہ مملکت ہے اس کا وظیفہ کیا ہونا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ بھئی! یہ مجھ پہ چھوڑ دو اور کہا کہ مدینے میں ایک مزدور کی کم از کم اجرت جتنی ہے تو میرا وظیفہ بھی اتنا ہی مقرر کر دو کیونکہ میں امت کا مزدور ہوں۔ کہا کہ اس

میں گزارہ کیسے ہوگا؟ جواب دیا کہ جیسے اُس مزدور کا گزارہ ہوتا ہے۔ کہنے لگے اگر مزدور کا گزارہ نہ ہوا تو؟ کہنے لگے کہ پھر میں اُس مزدور کی اجرت بڑھا دوں گا تا کہ اُس کے صدقے میں میری اجرت بڑھ جائے۔ عزیزانِ من! ہمیں پتہ ہی نہیں ہے کہ خدا پر ایمان کسے کہتے ہیں، حیاتِ بالا خرت کا ایمان کسے کہتے ہیں؟ یہ کچھ ہم جانتے ہی نہیں ہیں۔

دنیا بھر میں ہر قسم کا فساد رزق کی غلط تقسیم کی بنا پر ہی برپا ہوتا ہے

وہ رزق جس نے پیدا کیا ہے وہ تو خدا کی ذات ہے۔ یہ سارا جو کچھ دنیا میں فساد برپا ہے یہ اُس کی غلط تقسیم کی وجہ سے ہے۔ سب سے بڑا ذمہ دار اپنا وظیفہ ایک مزدور کی مزدوری جتنا ٹھہراتا ہے تو نظام خود بخود ٹھیک ہو جاتا ہے۔ کہا کہ آخرت پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے یہ تمہارا نظام غلط ہے جس کی وجہ سے ظہر الفساد فی البرِّ و البحرِ (30:41) ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پوری دنیا کے اندر فساد ہی فساد برپا ہو جاتا ہے، ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (30:41) انسان خود نظام بناتا ہے تو یہ اُس کی وجہ سے ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے یہ باتیں کہی گئی ہیں جب ان کی نگاہیں جزیرۃ العرب سے ذرا آگے بھی نہیں جاتی تھیں۔ آج نظر آ رہا ہے کہ براور بحر کے اندر کس طرح سے عالمگیر فساد برپا ہے۔ ہمارے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ اللہ کو منظور ہی یہ ہے، تقدیر ہی یہ ہے، وہ جس قوم کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جس کا چاہتا ہے رزق تنگ کر دیتا ہے، جس کا چاہتا ہے کھلا کر دیتا ہے اور یہاں کہا ہے کہ اسکی وجہ یہ ہے کہ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (30:41) یہ ناہمواریاں خود لوگوں کی اپنی پیدا کردہ ہیں، خدا کی طرف سے نہیں ہیں۔

خدا تعالیٰ کی ذات انسانوں کو ان کی بد عملیوں کی بنا پر ساتھ کے ساتھ جھٹکا دیتی رہتی ہے

ابھی اس سے پہلے یعنی 36 ویں آیت ہی تھی جس میں کہا تھا کہ وَإِنْ تُصِيبْهُمْ سَيِّئَةٌ ۖ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ (30:36) یہ مصیبتیں جو تمہارے سامنے کھڑی ہوئی ہیں، یہ اچانک نہیں آئیں بلکہ یہ پہلے سے تمہاری بھیجی ہوئی ہیں۔ یہاں کہا کہ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (30:41) یہ انسانوں کے ہاتھوں کا کیا ہوا ہے۔ خدا کا نہیں۔ اس لیے کہا کہ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا ۖ (30:41) جو نظام انہوں نے وضع کیا ہے تو اُس میں کچھ حصہ ایسا ہے جس کا ابھی ابھی ان کو بدلہ مل جائے گا۔ یہ اس لیے ہے کہ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (30:41) شاید اس سے یہ نظام خداوندی کی طرف واپس آجائیں۔ اگر پہلے ہی ہلے کے

① ان کی خود پیدا کردہ ناہمواریوں کے بعض تباہ کن نتائج ان کے سامنے آچکے ہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص 940)۔

اندر ان کو ختم کر دے تَوَلَّعْلَهُمْ يَرْجِعُونَ (30:41) کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ جو لفظ یرجعون ہے یہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ (2:156) سے ہی ہے کہ خدا کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔ یہ لَعْلَهُمْ يَرْجِعُونَ ہے کہ ہم تھوڑا سا جھٹکا دیتے ہیں تاکہ یہ اپنے خود ساختہ نظام زندگی سے منہ موڑ کر ہماری طرف آجائیں۔ اگر جھٹکا نہیں دیا جائے گا تو وہ تو نظام خداوندی کی طرف نہیں جائیں گے۔ عزیزانِ من! قرآن کتنی بڑی عظیم چیز کہہ گیا ہے کہ غلط نظام قائم کرتے ہیں اور جب مکافاتِ عمل کی رو سے تباہیاں آتی ہیں تو ہم یہ نہیں کرتے کہ پہلے ہی جھٹکے میں پوری کی پوری قوم کو تباہ ہی کر دیا جائے۔ اگر یہ کر دیا جائے تو

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی

تو پھر تو کوئی بھی باقی نہ رہا جس کو قتل کرے۔

مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

بجز اس کے کہ ان کو پھر زندہ کرے پھر ان کو قتل کرے۔ وہ بہت بڑا کشادہ قلب ہے، وہ تنگ نظر نہیں ہے حالانکہ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ (85:12) ہماری گرفت بڑی محکم ہوتی ہے لیکن گرفت کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ جیسے ایک تنگ نظر انتقامی انسان کرتا ہے کہ ہڈیاں تک توڑ کر رکھ دے۔

می نہ سزد خدائے را

ان سبق آموز جھٹکوں کے باوجود سبق حاصل نہ کرنے والوں کا انجام

کہتا ہے کہ ہم تھوڑا سا جھٹکا دیتے ہیں تو اُن کی خود پیدا کردہ ناہمواریوں کے تباہ کن نتائج ان کے سامنے آتے ہیں۔ اگر یہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تَوَلَّعْلَهُمْ يَرْجِعُونَ (30:41) یہی نتائج اس امر کے لیے کافی محرک ہو سکتے ہیں تاکہ یہ واپس آجائیں یعنی یہ اپنے خود ساختہ نظام زندگی سے منہ موڑ کر نظام خداوندی کی طرف رجوع کریں۔ عزیزانِ من! سزا دینے والا بھی اتنا منصف ہو۔ کہا کہ جو اس جھٹکے کے بعد بھی واپس نہیں آتے تو ان کا حشر ہم سے نہ پوچھو یہ انہی سے جا کر پوچھو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلُ (30:42) جاؤ اقوامِ سابقہ کی اجڑی ہوئی بستیوں کے جو کھنڈرات ہیں اُن کے پتھروں کے نقوش کو پڑھو، ان کی داستانیں ان کے اوپر تمہیں لکھی ہوئی ملیں گی کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ ظہر الفساد جو ہوا تھا اور اُس کے بعد یہ پہلے جھٹکے کے بعد بھی باز نہیں آئے تھے تو کہا کہ ہم سے نہ پوچھو بلکہ ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے پوچھو۔ كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِينَ (30:42) ان کا جرم یہ تھا کہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے

قوانین کے تابع چلتے تھے۔

دین خداوندی کا سہارا بننے والے کو پھر کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں رہی

عزیزانِ من! 30 ویں آیت سے یہ بات شروع ہوئی تھی کہ فَاقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا (30:30) ہر طرف سے منہ موڑ کر اسی نصب العین کو سامنے رکھ کر اس کے نظام کی طرف بڑھتے چلے جاؤ۔ یہ ہے الدین۔ یہ سارا کچھ کہنے کے بعد پھر یہ کہا کہ فَاقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ ① (30:43) وہ دین جو بغیر کسی سہارے کے خود اپنے اعتدال و توازن پہ قائم کھڑا ہے جو بھی اس کا سہارا بنے گا اُس میں بھی یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ بھی کسی غیر کے سہارے کے بغیر اپنے پاؤں پہ آپ کھڑا ہو جائے۔ یہ دینِ قیم ہے۔ اس دینِ قیم کی طرف لوٹ آؤ۔ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ ② (30:43) قبل اس کے کہ وہ آخری تباہی کا وقت آجائے جب وہ آتا ہے تو پھر لوٹ کر نہیں جایا کرتا۔ تو اب يرجعون کی بات سمجھ میں آئی کہ وہ پہلے جھٹکے اس لیے دیتا ہے کہ اس سے بھی کچھ ان کو تنبیہ ہو جائے بات سمجھ میں آجائے کہ غلط نظام کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات نہیں ہے اور اس کے باوجود تم اپنے اُسی نظام کے اوپر اور اپنی ان غلط کوشیوں کے اوپر ہو تو پھر جاؤ اقوامِ سابقہ کے انجام کو دیکھو قبل اس کے کہ وہ آخری تباہی کا دن آجائے جو آتا ہے تو پلٹ کر نہیں جاتا۔

قوموں کی آخری تباہی کے نشانات کی شکل و صورت

اب سوال یہ ہے کہ وہ آخری تباہی کیسے آیا کرتی ہے؟ یہی نہیں ہے کہ تم سوئے ہوئے تھے صبح اٹھے تو سارے مر گئے ہوئے تھے۔ کہا کہ آخری تباہی اس طرح سے آیا کرتی ہے کہ يَوْمَئِذٍ يَصْدَعُونَ ③ (30:43) یہ جو تم آپس میں پارٹیاں بنا لیتے ہو تو ایک پارٹی دوسرے کے مقابلے میں کھڑی ہو جایا کرتی ہے اور قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ یہ ہو جاتا ہے تو پھر وہاں کھڑے ہو کر یہ نہ کہہ دینا کہ اللہ نے کیا کر دیا۔ قرآن میں ہے کہ جب مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ خدا نے مجھے خواخوہ کے لیے ذلیل کر دیا۔ مَنْ كَفَرَ

① بہر حال یہ لوگ جو روش بھی اختیار کرتے ہیں انہیں کرنے دو۔ تم اپنی تمام مساعی کو خدا کے حکم نظام کے قیام کے لیے وقف کر دو (30:30)۔

(پرویز: مفہوم القرآن، ص-940)۔

② قبل اس کے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے ظہور نتائج (انقلاب) کی وہ گھڑی سامنے آجائے جو کسی کے لوٹائے لوٹے گی نہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص-940)۔

③ یہ وہ وقت ہوگا جب یہ دونوں پارٹیاں ٹکھڑ کر الگ الگ ہو جائیں گی اور ایک دوسرے کے مد مقابل آکھڑی ہوں گی (پرویز: مفہوم القرآن، ص-940)۔

فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ❶ (30:44) جو صحیح نظام خداوندی سے سرکشی برتتا ہے تو اُس کی سرکشی کے تباہ کن نتائج اُسے بھگتنے پڑیں گے۔

نظام خداوندی کے عملی نتائج کی محسوس شکل اور علامات

وَمَنْ عَمِلْ صَالِحًا فَلَا نَفْسَ لَهُ يَمْهَدُونَ (30:44) اور جو خدا کے پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کرتا ہے اسے زندگی کی آسائشیں حاصل ہو جاتی ہیں اُسے رزق بھی ملتا ہے اور سکون کے لیے پنگھوڑے بھی ملیں گے۔ ابھی ہم نے بچے کی بات کہی ہے بچے کو رزق بھی ملتا ہے دودھ بھی ملتا ہے پھر اُس کو سکون کی ضرورت ہوتی ہے تو پنگھوڑا بھی دیا جاتا ہے جس کو ہلاتے ہو تو وہ سو جاتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ جائے کہ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْ فَضْلِهِ ❷ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ (30:45) ایمان اور عمل صالح کا بدلہ خدا کے فضل و کرم سے کسی کو ملتا ہے اور کفر کی راہ انسان کو کسی دوسری طرف لے جاتی ہے وہ راہ جو خدا کے ہاں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی۔

بات یہ ہوئی تھی کہ وہ جو آنے والی گھڑی ہوتی ہے اُس سے پہلے اُس کے لیے علامات بھیج دی جاتی ہیں 'Warnings' (تنبیہات) ہوتی ہیں 'تذیر' ہوتی ہے تاکہ وہ اس سے آگاہ ہو جائے خبردار ہو جائے اور اپنی روش صحیح کر لے۔ کہا کہ اسی طرح سے یہ جو صحیح نظام ہوتا ہے وہ بھی پہلے دن ہی آ کر اپنے نتائج برآمد نہیں کر دیتا۔ پہلے اُس کی ابتدا ہوتی ہے لیکن شروع ہی سے اُس کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات۔ ❸ وہیں سے بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس کے بعد اس کے نتائج بڑے ہی خوشگوار ہوتے ہیں اس لیے کہا کہ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ يُرْسِلَ الرِّيَّاحَ مُبَشِّرَاتٍ ❹ (30:46) بارش سے پہلے پروہ ❶ کی ہوائیں آتی ہیں۔ ہمیں شہر والوں کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا یہ جو کسان ہیں ان سے پوچھیے۔ وہ اُس ہوا سے فوراً اندازہ کر لیتے ہیں کہ دو تین دن کے اندر اندر بارش ہونے والی ہے اور وہ اُس پروگرام کے مطابق اپنی ہوائی کے لیے انتظامات کرتے ہیں۔ اتنا محکم اصول ہوتا ہے کہ اسی طرح سے چلتا رہتا ہے اگرچہ اب تو کیفیت کچھ اور ہی ہو گئی ہے۔

❶ جن لوگوں نے قوانین خداوندی سے انکار (کفر) کی راہ اختیار کی ہوگی اس کا وبال ان پر پڑے گا (پرویز: مفہوم القرآن ص-940)۔

❷ (مثل) ہونہار بچے کے آثار پہلے ہی اچھے نظر آتے ہیں۔

❸ قانون خداوندی کے مطابق چلنے کے خوشگوار نتائج ایسے ہیں جیسے خدا ہواؤں کو بھیجتا ہے تو وہ بارش کی خوشخبری دیتی ہیں (پرویز: مفہوم القرآن ص-941)۔

❹ پورب کی ہوا۔

موسموں کے تغیر و تبدل میں فرق

میں کہا کرتا ہوں کہ اس سے پہلے تو ہمارے شاعر رونا روتے تھے کہ

آسمان کی جو گردش ہے اُس کے ماتحت انسان کو چلنا پڑتا ہے۔ وہ یہ کچھ کہتے تھے کہ انسان آسمان کی گردش کے تحت چلتے ہیں۔ اب آسمان انسانوں کی گردش کے تحت چلتے ہیں جیسے ہماری زندگی ہمارا معاشرہ Unpredictabl (نا قابل پیش گوئی) ہے کہ کوئی پتہ ہی نہیں چلتا کہ کدھر دیکھیں، کچھ معلوم ہی نہیں کہ کل کیا ہو جانا ہے۔ کوئی شخص ایک دن کے لیے Predict (پیش گوئی) نہیں کر سکتا، جھکڑ میں کوئی نہیں بتا سکتا کہ ہوا کدھر کی چل رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہم ایسے نیچے ہو گئے ہیں، وہ آسمان ہمارے کچھ تابع ہی ہو گیا ہے کہ کوئی موسم وقت پہ آتا ہی نہیں ہے۔ مئی سے لے کر ستمبر تک جھلسا دینے والی گرمی ہے، حالانکہ اُس میں ہر آٹھ دس دن کے بعد ایک بارش ہو جایا کرتی تھی، پھر جولائی وغیرہ کے مہینے کے اندر برسات آیا کرتی تھی۔ اب سارا کچھ الٹ ہو گیا:

اٹنی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

اچھے نظام کے ابتدائی دور میں بھی راحت کا عنصر موجود ہوتا ہے

یہ جو نظام کائنات ہے، یہ غیر متغیر ہے۔ جب بارش کی خوشخبری دینے والی ہوائیں آتی ہیں تو وَلِيْذِيْقَكُم مِّن رَّحْمَتِهٖ (30:46) اُس کے بعد پھر بارش آتی ہے۔ وہ بارش تمہارے لیے سامانِ زندگی کا موجب بنتی ہے۔ اس طرح جو ابتدا ہوتی ہے وہ خوشگوار ہواؤں سے ہوتی ہے۔ اچھے نظام کا آغاز ہی ٹھنڈی ہواؤں سے ہو جاتا ہے، بارش اُس کے بعد آتی ہے خشکی میں یہ ہوتا ہے اور اُدھر وَلِتَجْرِى الْفُلُكُ بِأَمْرِهِ (30:46) اور سمندروں میں یہی ہوائیں قانونِ خداوندی کے مطابق کشتیوں کو چلاتی ہیں۔ اس طرح جب بارش آتی ہے یا اُس سے بھی پہلے کشتیاں اپنے اپنے ساحل کی طرف رواں دواں چل پڑتی ہیں۔ کیوں؟ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ (30:46) تاکہ تم تلاشِ معاش میں ادھر ادھر نہ نکلو۔ اور اُس کے بعد پھر فضلِ خداوندی کی کشائش ہوتی چلی جاتی ہے، پوچھو نہیں کہ کتنا ملتا ہے! وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (30:46) اور اس طرح یہ سب ہم اس لیے کرتے ہیں تاکہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔ اس کے برعکس غلط نظام یہ ہے کہ محنتیں کی جاتی ہیں نتیجے نہیں نکلتے۔ وہ اس لیے کہ

دانہ ایں می کارڈ آں حاصل برد

کھیتی یہ کرتا ہے فصل وہ لے جاتا ہے۔

شکر اور کفر کے معنی

عزیزانِ من! ”شکر“ یہ ہے کہ ہر ایک کی محنت بھرپور نتائج پیدا کرے۔ ”کفر“ یہ ہے کہ محنت اس کی ہو مگر اس کا حاصل کوئی لے جا کر اپنے ہاں ڈھانپ دے۔ یہاں کہا کہ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (30:46) تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج کی حامل ہوں۔ اس کے بعد پھر تاریخی شہادت آ گئی۔ وہاں پہلے کہا تھا کہ ان بستیوں کے کھنڈرات کو دیکھو۔ درمیان میں کہا کہ نظامِ خداوندی یہ کچھ کیا کرتا ہے۔ اب کہا کہ وَ لَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَى قَوْمِهِمْ فَجَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَأَنْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِينَ أَجْرُمْ ۖ (30:47) اس سے پہلے بھی ہمارے پیغامبر یہی پیغام لے کر آئے جواب ہم دے رہے ہیں۔ غلط روش پر کاربند قوم کو انہوں نے آگاہ کیا، تنذیر دی، وارننگ دی لیکن وہ نہیں مانے، جھکے آئے مگر باز نہیں آئے، وہ آخر تک چلے گئے تو پھر تو بہر حال وہی جو آخری تباہی کا وقت تھا وہ آگیا، فَأَنْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِينَ أَجْرُمْ ۖ (30:47)۔ فانتقمنا کے معنی عربی زبان میں انتقام نہیں بلکہ عرب اپنی زبان میں جرم کی سزا کو کہتے ہیں۔ یہاں اجر موموں کا لفظ بھی یہی بتا رہا ہے کہ یہ جرم کا نتیجہ ہے۔

خدا تعالیٰ نے مومن کی مدد کرنا اپنا فرض قرار دیا ہے

سکھیا پھانک لینے سے جو ہلاکت ہوتی ہے وہ سزا نہیں ہوتی بلکہ انسان کے اُن اقدام کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے سزا کو بھی ”جزا“ کہا ہے اور جزا کے معنی ہی ”کسی چیز کا فطری نتیجہ“ ہوتا ہے۔ أَجْرُمْ ۖ کے بارے میں یاد رکھیے کہ بنیادی طور پہ عربوں کے ہاں کسی دوسرے کے درخت سے پھل کا خوشہ کاٹ کر اپنے ہاں لے جانا جرم کہلاتا ہے اور ”اجرموا“ اسی سے ہے۔ یہ کتنی جامع قوم تھی۔ اب اس کے برعکس جو دوسرے لوگ تھے جو حق کا نظام لے کر اٹھے، ابھی ان کی ابتدا تو مُبَشِّرَاتِ کی ہواؤں جیسی ہی تھی، ساز و سامان بھی اتنا زیادہ نہیں تھا، تعداد کی بھی کثرت نہیں تھی، حتیٰ کہ ان کے پاس تو ابھی سر چھپانے کو جگہ بھی نہیں تھی لیکن جب بھی کوئی جماعت حق کا نظام لے کر اٹھتی ہے تو قرآن کہتا ہے کہ وہ غالب آ کر رہتی ہے۔ اور یہاں آگے ایک فقرہ ہے جس میں کہا ہے کہ وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (30:47) مومن ہو تو ان کی مدد کر کے اسے کامیاب بنانا ہم پر حق

① اسی قسم کے واضح قوانین ہم تم سے پہلے اپنے رسولوں کی معرفت بھیجتے رہے ہیں۔ وہ ان قوانین کو اپنی قوم کے سامنے پیش کرتے (لیکن وہ ان سے سرکشی برتی اور آخر الامر) انہیں ان کے جرائم کی وجہ سے پکڑ لیا جاتا (پرویز: مفہوم القرآن ص 941)۔

ہے واجب ہے۔ خدا کہتا ہے کہ ہم پر واجب ہے، کتنی بڑی چیز ہے جو کہہ رہا ہے!۔ ہمارے ہاں وہ حقوق العباد اور حقوق اللہ کی بحشیں چلتی ہیں۔ ارے حقوق تو سارے ہی عباد کے بندوں کے ہوتے ہیں۔ یہاں کہا کہ جی نماز پڑھنا خدا کا حق ہے۔ عزیزانِ من! سارے حقوق انسانوں کے ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔ ان حقوق کا جو ادا کرنا ہے وہ خدا کے احکام کی تعمیل ہے۔ بندوں کا حق خدا پر نہیں۔ خدا تو کہتا ہے کہ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا (30:47) ہم پر تمہارا حق ہے۔ دنیا کی کسی مذہبی کتاب میں مجھے یہ چیز نہیں ملی۔ تم مومن ہو جاؤ تو پھر یہ ہماری ذمہ داری ہو جاتی ہے اور تمہارا ہم پر حق ہو جاتا ہے کہ ہم تمہیں غالب کریں۔ ہمارے ہاں پچیس سال سے بلکہ ہزار سال سے دعائیں مانگی جا رہی ہیں کہ یا اللہ! اسرائیل کو تباہ و برباد کر دے۔ عزیزانِ من! سیدھی سی بات ہے یا تو یہ کہنا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) وہ وعدہ خلاف ہے یا ہم مومن نہیں ہیں۔

خدا تعالیٰ کی ذات بھی اگر اپنا وعدہ (معاذ اللہ) پورا نہ کرے تو اس سے بھی پوچھا جاسکتا ہے یہ جو وعدے کی بات ہے تو قرآن کی رو سے اس کی بڑی ہی اہمیت ہے۔ یعنی انسانوں کے متعلق تو یہ تھا کہ كَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا (17:5) وعدہ تم دوسرے انسانوں سے ہی نہیں کرتے وہ تو تمہارا اور ان کا معاملہ ہے، وعدے کے متعلق ہم بھی تم سے پوچھیں گے کہ تم نے پورا کیا تھا یا نہیں۔ اور یہ کہنے سے پہلے ایک اور چیز ہے کہ كَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا (33:15) جو ہم وعدہ کرتے ہیں اگر خدا نکر وہ پورا نہ ہو تو تم ہم سے پوچھ سکتے ہو کہ کیوں پورا نہیں کیا۔ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (30:47) اسی کو خدا کا قانون، خدا کا وعدہ کہا جاتا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ یہ ”ہمارا وعدہ ہے کہ مومنین کو غالب کر کے رہیں گے“ یہ ان کا حق ہے۔ پھر یہ کیوں نہیں ہوتا؟ میں نے کہا ہے کہ یا تو (معاذ اللہ) یہ کہنا پڑے گا کہ یہ جو اُس نے کہا ہے، یہ غلط کہا ہے، وعدہ کیا ہے اور وعدہ خلافی کر رہا ہے۔ حق ادا نہیں کر رہا (معاذ اللہ)۔

خدا سے اپنا کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کی بجائے دعائیں مانگتے رہتے ہیں اگلی شرط تھی کہ نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (30:47) مومنین کے ساتھ ہم یہ کرتے ہیں۔ تو بات صاف ہو گئی کہ ہم مومن نہیں ہیں اس لیے یہ نہیں ہو رہا۔ اُس نے تو مومنین کے لیے شرط لگا دی۔ بجائے اس کے ہم یہ کوشش کریں کہ اس کے مطابق ہم مومن بن جائیں تاکہ خدا کا وہ جو حق ہے وہ پورا ہو اور ہماری مدد ہو یہ ہم نہیں کرتے بلکہ بار بار اکٹھے ہو کر دعائیں کیے جاتے ہیں کہ یا اللہ! اسرائیل کا بیڑہ غرق کر دے۔ تیس سال سے عرفات کے میدان میں جمع ہو کر بھی یہ ہو رہا ہے۔ جس طرح خانہ بدوشوں کے لڑکے ہوتے ہیں کہ ”دے جا بابا اللہ دے واسطے“۔ یعنی تیس سال سے ان کی یہ صورت ہے اور وہاں سے پھر بھی مار پڑ رہی ہے۔ ایک دن

بھی کھڑے ہو کر اگر انہوں نے سوچ لیا ہوتا کہ وہ نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ کہتا ہے۔ اگر نصرت اس کی نہیں آتی اور اُس کے لیے تو مانگنے کی بھی ضرورت نہیں ہے وہ تَوْحَقُّا عَلَيْنَا (30:47) کہہ رہا ہے یہ نہیں کہتا کہ تم مانگو گے اور ہم بھیک کی طرح دیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تو ہمارا فریضہ ہے۔ اور اگر اس طرح سے نہیں ملتا تو پھر یہ ہے کہ ہم مومن نہیں ہیں۔ ایک دن وہاں کھڑے ہو کر یہ سوچ لیتے کہ کس لیے نصرت نہیں مل رہی تو دعائیں مانگنے کی بجائے مومن بننے کی طرف آ جاتے تو ہزار بار اُس کی نصرت ملتی۔ اس لیے کہ وہ وعدہ خلافی کبھی نہیں کیا کرتا۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الروم کی آیت 47 تک آ گئے۔ 48 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



آٹھواں باب : سورة الروم (آیات 48 تا اختتام)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1979ء کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة الروم کی آیت 48 سے ہو رہا

ہے: (30:48)

تاریخ انسانیت میں ابلیس کا کردار

سلسلہ کلام جو درحقیقت قرآن کریم کا بنیادی موضوع ہے وہ حق اور باطل، غلط اور صحیح نظام کے ٹکراؤ سے متعلق ہے۔ اس سے پہلی آیت میں کہا گیا کہ **وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَى قَوْمِهِمْ (30:47)** اے رسول! یہ بات کوئی تمہارے ہی ساتھ منفرد نہیں ہوئی، یہ تو جس دن بھی کائنات کی اسٹیج پہ آدم کی نمود ہوئی تھی، اُس کے مقابل میں ابلیس کی بھی نمود ہوگئی تھی۔ ابلیس نے وہیں چیخ دیدیا تھا کہ اسے اس قدر باعثِ تکریم اور وجہ شرف بنایا جا رہا ہے، ملائکہ کا مسجود بنایا جا رہا ہے، بہت بڑا مقام دیا جا رہا ہے، ٹھیک ہے بھیجیے اسے زمین پہ، میں بھی جاتا ہوں پھر آپ دیکھیے گا کہ میں اسے کس طرح گنگنی کا ناچ نچاتا ہوں۔ وہ جو اس کے الفاظ ہیں وہ تو اس سے بھی زیادہ سخت ہیں، ہمارے ہاں اس کے لیے لفظ ہی نہیں ملتا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ اُس نے ایک ایسا لفظ ^① استعمال کیا تھا جس کے مفہوم کی ادائیگی کے لیے گاؤں کے بچوں کی ایک مثال ہے کہ یونہی وہ کہیں سے کوئی پچھرا پکڑ لیتے ہیں اور بغیر زین کے، بغیر ساز کے، اُس پہ چڑھ دوڑتے ہیں، لگام بھی نہیں ہوتی، بلکہ مونج کی ایک رسی ہوتی ہے وہ اُس کی تھوٹھنی سے لپیٹ دیتے ہیں اور اُس رسی کو پکڑ کر جو کچھ اُس کا حلیہ بناتے ہیں تو اس لفظ کا تصور یہی ہے۔ دنیا کا ہر فرعون بھی کرتا ہے یہ جو کیفیت ہوتی ہے، وہ اتنے استبداد، پستی، قوت، ذلت کی کیفیت و ماہیت ایک لفظ میں آتی ہے۔

ابلیس کو زندگی بھر کے لیے ضمانت دینے کا وعدہ

اس وقت ابلیس نے کہا تھا کہ تم ذرا اس کو بھیجو اور پھر دیکھو کہ میں کس طرح اس کا حشر کرتا ہوں۔ کہا کہ ٹھیک ہے تم اپنی سی کر دیکھنا۔ ابلیس نے کہا کہ ایک بات ہے جس کی ضمانت چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ایسا نہ ہو جائے کہ میرا ہاتھ اس کی گردن پہ ہو اور تم اُس وقت میرا ٹینٹوا دبا دو، جب تک آدم موجود رہے مجھے بھی مہلت ملنی چاہیے۔ کہا کہ ٹھیک ہے، تمہیں بھی اس کی اجازت ہے۔ یعنی یہ ہے وہ جو چیخ ہے۔ بات تو قرآن کریم تمثیلاً سمجھاتا ہے۔ ساری تاریخ انسانیت اسی کشمکش کی تاریخ ہے۔ اور اُسی میں یہ کہا کہ اے رسول! یہ تمہارے ساتھ کوئی انوکھی بات نہیں ہو رہی ہے، یہ تو پہلے دن کی بات ہے اور ہم نے اُس سے اس کا وعدہ کیا ہوا ہے اور ہمارے وعدے برحق ہوتے ہیں۔ ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اگر ہم انسانی قلب پہ ہاتھ رکھ کر دیکھیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ کبھی کبھی اللہ میاں کو غصہ بھی چڑھتا ہوگا اور کبھی جی مسوس کر بھی رہ جاتا ہوگا کہ ہماری اس مخلوق کے ساتھ ہو کیا رہا ہے کہ جس کے متعلق ہم نے کہا تھا کہ ہم اسے احسن تقویم میں پیدا کر رہے ہیں۔ لیکن چونکہ وعدہ کر لیا تھا کہ میں دخل نہیں دوں گا، میں تمہارا ٹینٹوا نہیں دباؤں گا،

① اِحْتِنَاكَ: لَا حَتِيكَنْ ذُرِّيَّتَهُ (17:62)

معاف رکھیے گا، انسانی الفاظ ہی استعمال کرنے پڑتے ہیں، یہ سب کچھ اللہ میاں برداشت کرتا گیا، اپنے وعدے کے خلاف نہیں گیا اور یہ بڑی بات ہے۔ قدرت ہو تو وہ جو خدا کو حاصل ہے، وعدے کا پاس ہو تو یہ کہ اپنی آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ ہوتا دیکھتا چلا آ رہا ہے لیکن جو وعدہ کیا تھا کہ ہم دخل نہیں دیں گے، بڑی Fair Play ہوگی، لہذا وعدہ کے مطابق ابلیس کی کارگزاری میں دخل نہیں دیا گیا اور یہی شرفِ انسانیت ہے۔ اگر اُس کے مقابلے میں اُس وعدے کے خلاف انسان اور اس کے ساتھ یہل جاتے تو یہ فتح کچھ فتح نہ ہوتی۔ اکیلے تنہا مقابلہ کرتے ہوئے انسان کو اگر اُس کے ہاتھوں کبھی شکست بھی ہو جاتی ہے تو کہا کہ حق و صداقت کے دامن کو نہ چھوڑنا، شکست کھا جانا۔ انسان اپنی حمیت اور غیرت اور شرافت اور کرامت کو اگر برقرار رکھتا ہو کسی وقت کسی مستبد قوت کے ہاتھوں شکست بھی کھا جاتا ہے تو یہ وہ شکست ہے جس کے متعلق جگر (مراد آبادی) (1890-1960) کا بڑا خوبصورت مصرع ہے:

تجھے اے جگر مبارک یہ شکستِ فاتحانہ

حق کا دامن تھامتے ہوئے شکست کی قدر و قیمت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا

عزیزانِ من! جماعتِ مومنین کو اگر کبھی ان کے ہاتھوں شکست ہوتی تھی تو یہ وہ شکست ہوتی تھی جس کو ”شکستِ فاتحانہ“ کہا جاسکتا ہے لیکن قرآن نے تو رسول اللہ ﷺ سے کہا ہے فَجَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ (30:47) وہ واضح دلائل لے کر آئے۔ انبیائے کرام کو قرآن کہتا ہی یہ ہے کہ وہ دلائل لے کر آتے تھے حالانکہ بھیجنے والے کے پاس قوتیں تو اتنی تھیں کہ دنیا کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی لیکن وہ قوت کے زور پر ڈنڈے کے زور پر انبیاء کے ہاتھوں کچھ نہیں کراتا تھا بلکہ جہاں دیکھیے انبیاء کے بارے میں یہی کہا کہ دلائل لے کر آئے تھے، براہین لے کر آتے تھے۔ ٹھیک ہے طریقہ یہی ہونا چاہیے۔ قوت کا میدان تو حیوانات کی زندگی تک چھوڑا ہے وہاں Law of the Jungle (قانونِ جنگل) ہوتا ہے۔

شرفِ انسانیت کا وقار دلائل و براہین کے مقدس ترازو میں تولا جاتا ہے

انسان کی دنیا میں تو شرفِ انسانیت یہی ہے کہ یہ دلیل و برہان سے بات کرتا ہے۔ یہ انبیائے کرامؑ بالبینات آتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ دھاندلی سے استبداد سے اس کے مقابلے میں ڈنڈا پیش کرتے تھے۔ یہ تھی وہ چیز جس کو ان کا جرم کہا گیا ہے۔ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِينَ أَجْرَمُوا ① (30:47)۔ میں نے جیسا بچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ عربی زبان میں ”جرم“ اسے کہتے تھے کہ ”دوسروں کے درخت کا پھل کاٹ کر اپنے گھر لے جانا“۔ باقی چیزوں کو آپ اخلاقی معائب کہہ سکتے ہیں۔ اس کے اندر آپ دیکھیے

① (لیکن وہ ان واضح قوانین) سے سرکشی برتی۔ اور آخر الامر انہیں ان کے جرائم کی وجہ سے پکڑ لیا جاتا (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔ 941)۔

کہ بات کتنی گہرائی تک چلی جاتی ہے۔ کہا کہ یہ اس لیے نہیں تھا کہ وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ^① (30:47) ہم نے کوئی رعایت برتی ہے بلکہ اس لیے تھا کہ مومنوں کی مدد کرنا، ان کو غلبہ عطا کرنا ہمارے ذمہ فرض ہے۔ ”خدا کے ذمہ فرض ہے۔“

اس قدر محیر العقول کائنات کا مالک اپنے وعدہ کو پورا کرنا اپنا فریضہ قرار دیتا ہے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ میں نے بہر حال دنیا کی ساری مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوا ہے۔ یہ جو چیز ہے یہ کہیں کسی جگہ نظر نہیں آتی کہ خدا کہے کہ مجھ پر فریضہ عائد ہوتا ہے۔ اللہ لا انتہا قوتوں کا مالک، اقتدارات کا مالک، اپنے اوپر خود ایک فریضہ عائد کر لیتا ہے اور پھر اُس سے کبھی ادھر ادھر نہیں ہٹتا ہے۔ کہا کہ وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (30:47)۔ تو میں نے عرض کیا تھا کہ ہم جو محض دعائیں مانگ مانگ کر یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں اُس کی نصرت حاصل ہو جائے اور عملاً تجربہ بتا رہا ہے کہ نہیں حاصل ہوتی تو یہ کیا ہے؟ اُس نے شرط لگائی ہے کہ نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (30:47) وہ مومنین کی مدد کرتا ہے جو اپنی غیرت و حمیت پر حرف نہیں آئے دیتے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ بات بڑی صاف سی ہے۔ یہ کوئی ہے۔ نصرت کے معنی غلبہ ہوتا ہے یا اُس کا نتیجہ غلبہ ہوتا ہے۔ کہا کہ کہیے کہ اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ (110:1) نصرت کے تو معنی نظر آ جاتے ہیں۔ یہ چیز ذہنی نہیں ہے، نظری نہیں ہے، قیاسی نہیں ہے، یہ تخیلاتی نہیں ہے بلکہ یہ ایک محسوس چیز ہے جس کو نصرت خداوندی کہا جاتا ہے۔ یہ فتح ہے، کامیابی ہے، غلبہ ہے، تسلط ہے۔ یہ نکھر کر سامنے آتا ہے، یہ نہیں ہے کہ عقیدت کے طور پر اپنے ذہن میں یہ سمجھ لیا کہ ٹھیک ہے جی اللہ کی نصرت ہمارے ساتھ ہے ”بھادیں جو تیاں بین ڈیاں ہوں“ ^②۔ نصرت کے معنی کے لیے تو اُس نے دوسری جگہ کہا ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کفار کبھی مومنین پر غالب آ جائیں لیکن یہ نصرت مومنین کی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ یہ ہے شرط۔ اگر نصرت حاصل نہیں ہوتی تو یہ نہیں ہے کہ (معاذ اللہ) خدا اپنے وعدے سے انحراف کرتا ہے، وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ وہ نصرت تو برحق ہے لیکن جو اگلا ٹکڑا ہے وہ ہے نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (30:47)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم مومن نہیں ہیں۔ اُس نے شرط لگا دی تھی کہ اُن کی مدد کرونگا، اُن کو غلبہ عطا کرونگا۔ جیسا کہ میں نے متعدد بار عرض کیا ہے کہ قرآن کریم اپنے ہر نظریے، ہر دعوے کے اثبات کی صداقت میں جو مثالیں پیش کرتا ہے وہ محسوس (Concrete) ہوتی ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ وہ کیا مثال پیش کرتا ہے۔ اس کی طرف سے نصرت

① ہم پر واجب ہے کہ ہم ان لوگوں کی مدد کریں جو ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں اور اس مدد کا پہلا قدم یہ ہے کہ جو لوگ اس نظام حق و صداقت کی مزاحمت کریں انہیں راستے سے ہٹا دیا جائے (پرویز: مفہوم القرآن ص 941)۔

② خواہ جو تے ہی پڑ رہے ہوں۔

مومنین کی ہے خدا کی نصرت اور مومنین یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر کسی قوم کی جو مومن ہونے کی مدعی ہے نصرت نہیں ہوتی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مومن نہیں ہے۔

نصرت خداوندی کی مثال سمندر کی شکل میں بادلوں کی شکل میں بارش کی شکل میں دیکھیے
 کہا کہ اللّٰهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيُبْسِطُهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ وَيَجْعَلُهُ كِسْفًا فَتَرَى
 الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ فَإِذَا أَصَابَ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝ وَإِنْ كَانُوا مِنْ
 قَبْلِ أَنْ يُنْزَلَ عَلَيْهِمْ مِنَ قَبْلِهِ لَمُبْلِسِينَ ① (30:48-49)۔ یہ چودہ سو سال پہلے کی مثالیں ہیں۔ آج کا فلسفہ داں بھی
 ان کا معترف ہے اور گاؤں کا اہل چلانے والا بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ کہا ہے کہ تم دیکھو تو سہی کہ پہلے ہوائیں چلتی ہیں۔
 قرآن بارش کا پورا نظام بتا رہا ہے۔ تیز ہوائیں سمندر میں طغیانی یعنی ہيجان سا برپا کرتی ہیں۔ سمندر کا پانی اتنا کھاری اور کڑوا ہوتا
 ہے کہ چار قطروں سے زبان پھٹ جاتی ہے ایک گھونٹ لے لیا جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ سورج کی کرنیں اس قسم کے پانی
 سے تمام کڑوے کیلے مادے وہیں سمندر میں چھوڑ دیتی ہیں اور آبِ مقطر یعنی کشید شدہ پانی اپنے ڈول بھر بھر کر اوپر لے جاتی ہیں۔ یہ
 سرنجوں میں جو پانی استعمال ہوتا ہے وہ کشید شدہ پانی ہوتا ہے۔ نصرت خداوندی کے پروگرام ذرا ملاحظہ فرماتے چلے جائیے۔ وہاں
 پھر وہ ہوائیں ان بادلوں کو پھیلا دیتی ہیں۔ پانی اس شکل میں کہ وہ فضا میں معلق رہ رہا ہے۔ کبھی ذہن میں آسکتا ہے کہ یہ پانی جو
 ہمارے ہاں اتنا برستا ہے کیا وہ کہیں فضا میں معلق بھی رہ سکتا ہے۔ پہلے تو یہ کہ پانی سمندر سے اٹھتا ہے اور وہاں جانے کے بعد یہ فضا
 کے اندر تیرتا پھرتا ہے۔ وہ پانی جو پانی کی شکل میں ایک منٹ بھی فضا میں ٹھہر ہی نہیں سکتا، ہوائیں اُسے لیے لیے پھرتی ہیں۔ ہماری
 مشیت، ہمارے طبعی قوانین کے مطابق جس مقام پہ اسے برستا ہے پھر وہاں وہ پانی کی شکل میں برستا ہے۔ جب وہ برستا ہے تو کسان
 کے لیے وہ اس قدر وجہ بشارت، خوشخبری، خوشگواہی کا موجب ہوتا ہے کہ اُسے زندگی مل جاتی ہے حالانکہ اس سے ذرا پہلے وہ بالکل
 مایوس ہو چکا ہوا تھا۔

① اس ضمن میں ہواؤں کی مثال کو ایک دفعہ پھر سامنے لاؤ۔ وہ ہواؤں کو بھیجتا ہے تو وہ سمندر کے آنحضرات (بجارات) میں ہيجان پیدا کر کے انہیں اوپر
 اٹھاتی ہیں۔ پھر وہ اپنے قانونِ فطرت کے مطابق ان بادلوں کو فضا کی پہنائیوں میں پھیلا دیتا ہے۔ پھر وہ مختلف حصوں میں بٹ کر الگ الگ
 ہو جاتے ہیں۔ پھر ٹو دیکھتا ہے کہ ان بادلوں میں سے مینہ برستا ہے حالانکہ یہ لوگ اس سے پہلے اس بارش کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکے ہوتے
 ہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔ 941)۔

فصل اس کی پروان چڑھتی ہے جو زراعت کے اصولوں کے مطابق محنت کرتا ہے

کہا کہ یہ تو سارا پروگرام ہماری طرف سے ہوتا ہے لیکن اُس کے بعد ایک شرط نیچے کے لیے بھی ہے کہ یہ فصل صرف اُس زمین پہ اگاتا ہے جسے انسان نے زراعت کے لیے تیار کیا ہو۔ یہ ہے مومن۔ اُس کی یہ جو ساری نصرت ہے کہ وہ سمندر سے پانی کشید کر کے بارش کی شکل میں زمین پر برسانے تک ہوتی ہے، یہ اُسے کچھ فائدہ نہیں دیتی جس نے فصل بونے کے لیے اپنی زمین تیار نہیں کی، جس نے صاف اور صالح بیج وقت پہ نہیں بویا، جس نے وقت پہ بل نہیں چلایا، جس نے اُس پودے کی پرورش نہیں کی۔ کہا کہ ہماری طرف سے تو یہ نصرت ہمارے وعدے کے مطابق آتی ہے۔ آپ یہاں اُس مومن کی جگہ اُس کاشتکار کو رکھیے اور دیکھیے کہ یہ ”نصرت“ کس طرح صاف ہو جاتی ہے۔ اسے کہتے ہیں برہان یا بیانات۔ اگر انسان نیچے یہ کچھ نہ کرے تو اس کی نصرت کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔

یہ بارش کا جتنا نظام ہے یہ انسان کے بس کی بات نہیں، یہ تو اُس کی طرف سے آتا ہے، یہ ذرائع اسباب اُس کی طرف سے آتے ہیں لیکن ان ذرائع سے قانون کے مطابق جو فائدہ اٹھانا ہے یہ نیچے انسان کے ساتھ ہے۔ اس لیے خدا اور انسان کو ایک دوسرے کا رفیق کہا گیا ہے۔ اور وہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ جو حضور کی حیات ارضی میں آخری الفاظ ہیں کہ بل هو الرفیق الاعلیٰ ① ہمارا اور اُس کا تعلق باہمی رفاقت کا ہے، اس طرح کا کہ وہ رفیق اعلیٰ ہے اور ہم رفیق ادنیٰ ہیں۔ رفاقت کا تعلق اگر اُس کے ساتھ ہے تو پھر اُس کی نصرت فائدہ دے سکتی ہے۔ یہ جو کہا ہے کہ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (30:47) تو یہ کسان اس بات کے اوپر ایمان رکھتا ہے کہ یہ جو اس طرح بارش برسی، یہ جو اس نے زمین اس قسم کی بنائی، اس میں اگر بروقت صحیح بیج بویا جائے اور زراعت کے قانون کے مطابق پھر اس میں اگلے جو پروگرام ہیں اس کے مطابق طے کیے جائیں تو اس کا ایمان ہوتا

① 18 یا 19 صفر 11ھ کو نبی اکرم کا مزاج ناساز ہوا۔ قریب 13 روز علالت رہی۔ زمانہ علالت میں حضور اپنے فرائض کی انجام دہی میں اسی جذب و انہماک سے مصروف رہے۔ علالت کے تیرہویں روز (یکم ربیع الاول 11ھ) صبح 632ء صبح کے وقت طبیعت میں کچھ سکون تھا لیکن نقاہت زیادہ تھی اس لیے آپ نے حجرہ مبارک سے لیٹے لیٹے پردہ اٹھا کر مسجد کی طرف دیکھا تو لوگ نماز میں مشغول تھے۔ اللہ کے بندوں کو اپنے اللہ کے سامنے سجدہ ریز دیکھ کر فرط مسرت سے چہرہ بشارت ہو گیا۔ جھکی ہوئی نگاہوں سے درگاہ رب العزت میں تشکر و امتنان کے سجدے ادا کیے۔ جوں جوں دن چڑھتا گیا مرض کی شدت بڑھتی گئی۔ نقاہت سے بار بار غشی طاری ہو جاتی تھی لیکن جب ہوش آتا تھا تو زبان مبارک پر یہ الفاظ آتے تھے کہ مَعَ الدِّينِ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ”ان سعادتمند روحوں کی معیت جنہیں اللہ نے اپنے انعامات سے نوازا“۔ اور کبھی یہ کہ اَللّٰهُمَّ الرَّفِیقُ الْاَعْلٰی سب سے بڑی رفاقت خدائے بزرگ و برتر کی ہے۔ سہ پہر کے قریب تین مرتبہ فرمایا: یٰ ارفیق الاعلیٰ قلب کا سکون و اطمینان ایک ہلکے سے تبسم جاں نواز کی صورت میں چہرہ پر نکلتا پاک و نور افشاں ہوا۔ مگر فطرت کو یہ معصومانہ انداز ایسا خوش آیا کہ اس نے اسے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا۔ اور اس طرح اس پر بہار زندگی کی جوئے رواں دامن صحرا سے صحن گلستان میں داخل ہو گئی۔ (پرویز: معراج انسانیت، ادارہ طلوع اسلام، کراچی 1969ء، ص 771)۔

ہے کہ ایک ایک دانہ سات سات سودا نے دے گا۔

تعمیری پروگرام کی تکمیل کی خاطر مستحکم طور پر عمل پیرا ہونا اولین شرط ہے

وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا (41:30) یہ رہنا اللہ جو کہہ دینا ہے یہ تو اس کی ابتدا ہے، اُس کے بعد جو جم کر کھڑے ہونا ہے یہ جو ایمان ہے یہ کاشکار کا ہوتا ہے۔ میں جو کہا کرتا ہوں کہ گھر میں فاقے آرہے ہیں، بچوں کو کھانے کے لیے آنا نہیں مل رہا، ایک گیتوں کی بوری رکھی ہوئی ہے لیکن وہ اُسے پسواتا نہیں ہے بلکہ وہ اس بارش کے انتظار میں ہے۔ بارش برستی ہے تو وہ ان دانوں کو مٹی میں ملا کر چلا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! چھ مہینے تک ہر صبح آتا ہے دن بھر کھیت میں کام کرتا ہے، شام کو بغیر کسی قسم کی مزدوری لیے ہوئے خالی ہاتھوں واپس گھر چلا جاتا ہے۔ ایک دن نہیں، دو دن نہیں بلکہ کم از کم چھ مہینے تک بلا مزد و معاوضہ صبح جاتا ہے اور شام کو آ جاتا ہے۔ اُس کا ایمان ہے کہ یہ جو فصل میں نے بوئی ہے تو ایک ایک دانے سے سات سات سودا نے ملیں گے۔ یہ ایمان اُس سے سب کچھ کر رہا ہوتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (30:47)۔ مومنین کی مدد کرنا ہم پر فرض ہے۔ پھر کہا ہے کہ فَانْظُرْ إِلَىٰ اثْرِ رَحْمَتِ اللَّهِ (30:50)۔ رحمت کے معنی سامانِ نشوونما دینا ہوتا ہے۔ اُس کے سامانِ نشوونما دینے کی یہ علامات ہیں، آثار ہیں۔ یعنی اسی پانی سے یا ان ہواؤں سے یا ان بادلوں سے سامانِ نشوونما نہیں ملتا بلکہ یہ تو سامانِ نشوونما دینے کے لیے آثار ہیں، علامات ہیں، یہ نشانیاں ہیں کہ اس سے ملے گا۔ ملے گا ایسے کہ جب وہ کسان اُس سے رفاقت کرے گا۔ پہلے تو اُس کو اس بات کا ایمان ہوگا کہ یہ میرے گیتوں کی بوری جو میں نے بچوں کو فاقے رکھ کر پوائی نہیں، مٹی میں ملائی ہے یہ یقیناً ایک بوری کی جگہ سو سو بوریاں میرے گھر میں آئیں گی۔ یہ یقین ہے اس کا، یہ ایمان ہے اس کا، یہ مومن اس بات پہ ہے۔ اور یہ اس کے لیے صرف آثار ہیں۔ فَانْظُرْ إِلَىٰ اثْرِ رَحْمَتِ اللَّهِ (30:50) ان آثار کو دیکھ کر اس نتیجے پہ پہنچو کہ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (30:50) زمینِ مردہ میں کس طرح زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ زمینِ مردہ میں اس طرح زندگی پیدا ہوتی ہے۔

قوموں کی زندگی کے غیر متبدل اصول اسی طرح موثر ہیں جس طرح انسانی جسم کے لیے طبعی اصول

خدا کی طرف سے دیئے ہوئے سارے سامان، وسائل اور پیداوار ہیں۔ کہا ہے کہ انسان کی طرف سے ان کو اُس کے بتائے ہوئے قانونِ طبعی کے مطابق استعمال کرنا۔ اس طرح سے زمینِ مردہ میں حیاتِ تازہ پیدا ہوتی ہے۔ کہا کہ وہ جو ہم نے کہا تھا کہ حق و باطل کی اس کشمکش کے اندر بھی مومنین کی نصرت ہم پر فرض ہے تو وہ اس طرح سے فرض ہوتی ہے۔ یہ اگر کوئی مردہ قوم بھی ہے اور وہ

اس قسم کا ایمان ہمارے قوانین کی محکمیت کے اوپر لے آتی ہے اور پھر دیکھیے کہ یہ سارے آثارِ رحمت کس طرح آتے ہیں۔ وہ ان کو صحیح طریق پر Utilize (استعمال) کرتی ہے، قاعدے اور قانون کے مطابق استعمال کرتی ہے۔ اس کے بعد پھر وہ جو مردہ قوم ہے ایک زندہ قوم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ وہ عام طور پر کھیتی کی مثال دیتا ہے اور بڑی برجستہ مثال ہے۔ اُس میں جو چیز رفاقت کی ہے وہ بتاتا ہے کہ مومنین کی نصرت کیوں ہم پہ فرض ہے۔ غیر مومن کی کیوں فرض نہیں ہے، اس لیے کہ اُسی گاؤں کے اندر وہ دوسرا کسان جو گھر میں بیٹھا ہوا سویا رہتا ہے، اُسی دن وہ شام کو جا کر گھر میں رکھا ہوا گیہوں پھال لاتا ہے اور اُس کے گھر نہایت لذیذ پراٹھے پکتے ہیں۔ پکتے تو ہیں، صرف چار دن تک پکتے ہیں پھر اُس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ ہے فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِينَ أَجْرُمُوا (30:47) پھر فاتے آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ ہماری طرف سے نہیں آتے، ہم کسی کو فاتے نہیں دیتے، ہم نے تو سامانِ نشوونما اس طرح بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ یہ جو ان قوانین سے انکار کرتا ہے، وہ کافر ہے، اسے وہ آثارِ رحمت کچھ فائدہ نہیں دیتے، یہ تو مومن کو فائدہ دیتے ہیں۔ اور یہ روزمرہ کا تمہارا تجربہ ہے۔ اِنَّ ذٰلِكَ لَمْحٰی الْمَوْتٰی وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (30:50) اُس نے تو ہر بات کے لیے قانون مقرر کر دیا ہے، پیمانے مقرر کر دیئے ہیں اور اُس کے خلاف وہ کبھی نہیں کرتا۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا (33:62) ہماری روش میں، ہماری سنت میں، تم کبھی تبدیلی نہیں پاسکو گے۔

انسان کے لیے سطحِ ارض پر معیشت کے شعبے کی اہمیت

عزیزانِ من! چلتے چلتے ایک اہم چیز سامنے آگئی۔ قرآن کا معاشی نظام جب بھی میں نے پیش کیا ہے آپ دیکھتے چلے جا رہے ہیں کہ وہ اسے کتنی اہمیت دیتا ہے اور دینی بھی چاہیے۔ انسانوں کی اس سطحِ ارض کے اوپر جو طبعی زندگی ہے اُس کا تو مدار ہی معیشت کے اوپر ہے۔ یہ طبعاً زندہ رہے گا تو آگے جو اُس کے پروگرام ہیں ان کو بروئے کار لائے گا۔ وہ اقدار وہ Values، وہ تمام اصول، زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے پروگرام ہیں ان کو جو چلتا پھرتا انسان ہے یہی پورا کرے گا۔ اگر یہی زندہ نہیں رہتا ہے تو وہ تو آگے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اس سطحِ ارض کے اوپر اس کی جو طبعی زندگی ہے، بڑی اہم ہے۔ جب طبعی زندگی اہم ہے تو اس زندگی کو زندہ رکھنے، قائم رکھنے، برقرار رکھنے، آگے بڑھانے کے لیے جو سامان ہیں، جو وسائل ہیں، جو ذرائع ہیں، وہ بھی اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے معیشت کے نظام کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اگر یہ بگڑ جاتا ہے تو اس کے بعد یہ اقدار اور اصول وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مُلاً ہم کو کافر اور کافر ہم کو مُلاً کہتا ہے: پرویزؑ

کچھ عرصہ پیشتر مارکس ازم کا نظام یعنی کمیونزم روس میں چلا اُس کے بعد چین میں چلا۔ میرے متعلق عجیب صورت مشہور ہے۔ جب بھی میں نے روٹی کا سوال پیدا کیا تو مُلاً نے کہا کہ یہ کمیونسٹ ہے۔ کمیونسٹ سے گلہ آیا کہ صاحب! تم بات تو بڑی معقول کرتے چلے جاتے ہو لیکن آگے جا کر تمہیں پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے کہ بیچ میں اللہ لے آتے ہو تو تم تو مُلاً کے مُلاً ہو۔ مُلاً کافر کہتا ہے اور کافر ہم کو مُلاً کہتا ہے۔

وقت کے تقاضوں نے آج یہ ثابت کر دیا ہے کہ دنیا کا کوئی نظام خدا کے تصور کے بغیر چل ہی نہیں سکتا بہر حال اب تاریخ کا تجربہ بتا رہا ہے کہ کمیونزم اللہ کے بغیر چلتا نہیں ہے۔ باقی چیزیں چھوڑ دیجیے کہ بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وحی کیا چیز بہم پہنچاتی ہے جس کے نہ ہونے کی بنا پہ وہ نظام چل نہیں سکے۔ وہ نظام تو وہی ہے جو انہوں نے فطرت اور تاریخ سے مشاہدہ کے بعد پالیا تھا کہ ”ہر شخص کو اُس کی ضرورت کے مطابق دیا جانا نظام کا فریضہ ہے اور اپنی استطاعت کے مطابق کام کرنا اُس کا فریضہ ہے“۔ یہ ہے سارا نظام۔ یہ نظام وحی کی اُس چیز کے بغیر چل نہیں سکتا تھا۔ یہ کارل مارکس (1818-83) کی اُس کے ساتھیوں کے ساتھ Discussion (بحث و تمحیص) موجود ہے۔

کمیونزم کو عملی شکل دینے کے سلسلہ میں مارکس کی ناکامی کی وجہ

کارل مارکس (1818-83) نے جب یہ اصول دیا تو اُس وقت ان کے اعتبار سے یہ دنیا میں پہلی آواز تھی لیکن ان کے سامنے قرآن نہیں تھا اس لیے انہیں پتہ نہیں تھا کہ یہ پہلی آواز نہیں بلکہ چودہ سو سال کے بعد کی آواز دہرائی گئی ہے یہ الگ بات ہے کہ چودہ سو سال کی تاریخ میں پھر یہ آواز نہیں اُٹھی۔ بہر حال یہ آواز اُٹھی۔ اس کی پوری جماعت نے پوری پارٹی نے کہا کہ کیا خوب بات ہے جو تم نے کی ہے، موج ہو گئی، چلو اب اس کے اوپر عمل کرو۔ کہنے لگا کہ یہیں میری دشواری ہے کہ اسے چلا نہیں سکتا۔ انہوں نے کہا کہ کیا کہہ رہے ہو، ایک اصول دے رہے ہو اور چلا نہیں سکتے۔ کہنے لگا کہ اس اصول کے اندر ایک لم ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کے مطابق جان مار کر صبح سے شام تک کام کرے اور وہ اپنی ضرورت سے زیادہ کمالے اور اُس میں سے صرف اپنی ضرورت کے مطابق لے اور باقی سب کا سب دیدے اور روز ایسا کرے اور ساری عمر ایسا کرے۔ کہنے لگا کہ مجھے انسان کے اندر وہ Incentive، وہ محرک، وہ جذبہ نہیں ملتا جس کی بنا پہ وہ ساری عمر یہ کرے۔ میں اس لیے اُسے عملاً کبھی نہیں چلا سکتا۔

مارکس کے پاس مطلوبہ معاشی نظام کے لیے کوئی جذبہ محرکہ نہ تھا

Discussion (بحث مباحث) کے بعد اُس کی پارٹی کے بہت سے ممبر اس سے الگ ہو گئے، غصے ہو گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ شخص بڑے بلند گیر یکٹر کا آدمی تھا ورنہ کوئی اور ہوتا تو یونہی پیچھے لگ جاتا کہ بات ہی کوئی ہے یوں کر دیں گے اور جب نہ ہوا تو کہا کہ تمہاری وجہ سے نہیں ہوا۔ ہمارا کوئی لیڈر ہوتا تو یہ کرتا۔ اُس نے کہا کہ تاریخ کے مطالعہ نے مجھے بتایا ہے کہ علاج تو یہی ہے لیکن میری بصیرت یہ بتا رہی ہے کہ انسان کے اندر اس کے لیے Incentive (جذبہ محرکہ) ہونا چاہیے کہ وہ روز آ کر محنت کرے اور زیادہ سے زیادہ کمائے، کم از کم لے اور باقی سارا دوسروں کی احتیاجات کے لیے دیدے۔ تو وہ کس بنا پر ساری عمر یہ کرتا رہے؟ مجھے انسان کے اندر یہ جذبہ کہیں نظر نہیں آتا کہ وہ یہ کیسے کرے گا۔ پارٹی نے ساتھ چھوڑ دیا، اعلانیہ اس کو مردود قرار دیا۔ اُس نے کہا کہ جو جی میں آئے کہو لیکن جو بات میں سمجھتا ہوں کہ میں نہیں کر سکتا تو میں اُس کا وعدہ نہیں کر سکتا۔

زندگی بھر کے لیے ایک قابل عمل جذبہ محرکہ صرف قرآن حکیم ہی دیتا ہے

پہلی چیز تو یہ وحی ہے جسے وہ کہتے ہیں کہ تم خدا کو بیچ میں لے آئے ہو۔ ارے بھئی! خدا اور وحی انسان میں یہ جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہ کتابچہ ^① میں نے لکھا تھا: ”جہاں مارکس ناکام رہ گیا (اُس سے آگے)“ تو انہوں نے کہا کہ بھئی! مارکس ازم کو تو ابھی چھوڑ دو وہ تو ہم نہیں کر سکتے البتہ سوشل ازم پہ آ جاؤ کہ سارے ذرائع پیداوار حکومت اپنی تحویل میں لے لے اور اس طرح سے ذاتی جائیداد اور ملکیت کا تصور اٹھا دے۔ یہ ہے سوشل ازم۔ یہ انقلاب 1917ء میں آیا تھا۔ لینن (1870-1924) اُس کے بعد اسٹالن (1879-1953) اور پھر خروشیف (1894-1971) تھے۔ یہ لوگ ان کے نظریات کو چھوڑ کر کچھ اور ہی ہو گئے ہیں۔ اُس کا نام ابھی تک مارکس ازم رکھا ہوا ہے لیکن وہ سارے اصول چھوڑ دیئے ہیں۔

چین میں ماؤزے تنگ کی پرستش کے بعد اس کے اصولوں کی انتہا درجے کی نفی

China (چین) اٹھا تو لوگوں کی نگاہیں اُس کے اوپر اٹھیں۔ China (چین) نے یہ کہا کہ یہ روس والے مارکس ازم سے مرتد ہو گئے ہیں، ہم ان اصولوں کو لے کر اٹھے ہیں۔ ان کے ہاں ماؤزے تنگ (1893-1976) کی پرستش ہوتی تھی۔ فی الواقعہ ان لوگوں نے خدا کا انکار کیا۔ انسان خلا میں تو نہیں جیتا، اُس کو تو ایمان لانا ہوتا ہے اس لیے وہ ماؤزے تنگ پہ ایمان لائے۔ وہ

ماؤزے تنگ کی پرستش کرتے تھے۔ یہ آپ لوگوں نے فلموں میں یا ٹی وی پر دیکھا کہ جنگلوں میں چلے جا رہے ہیں اور راستے میں کوئی مشکل آگئی ہے تو ماؤزے تنگ کی کتاب نکالی اور دیکھا کہ اُس نے یہ کہا ہے اور اُس پہ چل پڑے۔ ماؤزے تنگ کا ابھی کفن بھی میلا نہیں ہوا اور آج کل آپ کیا خبریں پڑھ رہے ہیں۔ ماؤزے تنگ کے جہاں جہاں یہ اصول لکھے ہوئے ہیں وہ ان دیواروں سے ان اصولوں کے اوپر کوٹ کر رہے ہیں، بورڈ اتار رہے ہیں، تحریک چل پڑی ہے کہ اس نے جو Revolution (انقلاب) بتایا تھا وہ بہت بڑی غلطی کی تھی وہ اصول چل نہیں سکتے۔ اُس کے اصولوں کے خلاف تحریک چل پڑی ہے اور وہ تمام کے تمام اصول بدلے چلے جا رہے ہیں۔

ہر آنے والا انسان پہلے اصولوں کو چھوڑ کر نئے قانون بنا لیتا ہے

رشیا¹ نے سب کچھ بدلاتو نام ابھی تک انہوں نے مارکس ازم رکھا ہوا ہے۔ وہ چین کے اندر ماؤ ازم کا یہ سارا کچھ بدل رہے ہیں لیکن نام وہی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ جتنے بھی انسانوں کے بنائے ہوئے نظام اور اصول اور قواعد اور قوانین ہیں، وہ اُس کے بعد آنے والوں کا جب جی چاہے بدل دیتے ہیں، بدل کر کوئی اور اصول لے آتے ہیں۔ اب جو لوگ چین یا روس کے ابتدائی اصولوں پر ایمان لائے تھے وہ آج ان کو کچھ اور اصول دے رہے ہیں تو ان کی نگاہوں میں وہ مرتد ہوئے ہیں۔ وہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور سائبیریا کے صحرا کے اندر ان لوگوں کو محبوس کیا ہے۔ چین میں یہ چیز شروع ہوگئی ہے۔ یعنی یہ اصول روز تبدیل ہو رہے ہیں۔ اس کی ضمانت کیا ہے، اس پہ یقین کس طرح سے آئے کہ یہ جو اصول دیا جا رہا ہے یہ بدلے گا نہیں؟

وحی کی طرف سے دیئے گئے اصولوں کو نہ بدلنے کی ضمانت

وحی نے جو اصول دیا اُس کی خصوصیت یہ ہے کہ تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ (6:115) یہ مکمل ہو گیا جو کچھ ہم نے کہنا تھا، جو اصول دینے تھے دے دیئے اور اب لَا مُبَدِّلَ لَکَلِمَتِ اللّٰهِ (6:34) کلمات اللہ میں تبدیلی نہیں ہے۔ یہ ہے وحی۔ حکومتیں آئیں اور جائیں، افراد آئیں اور جائیں لیکن کوئی ان میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ عزیزانِ من! یہاں آ کر اللہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس کا اس پہ ایمان ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے اُس کا اس پہ بھی ایمان ہے کہ لَا مُبَدِّلَ لَکَلِمَتِ اللّٰهِ (6:34) ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا، اضافہ نہیں کر سکتا، منسوخ نہیں کر سکتا۔ ایک دفعہ اس کو دیکھ لیجئے، دلیل و برہان اور عقل و بصیرت کی رو سے پہچان لیجئے تو اگر آپ کا دل اس کے اوپر ٹھکتا ہے کہ یہ اصول صحیح ہیں تو ان کو قبول کر لیجئے۔ پھر دنیا کی کوئی قوت ایسی نہیں ہے جو آ کر یہ کہے

کہ صاحب! اس اصول کی بجائے ہم یہ کرتے ہیں۔

تمام عالمِ انسانیت کے لیے سکونِ قلب قرآن حکیم کے غیر متبدل اصولوں میں ہی مضمر ہے

یہ ہے وحی کی منفرد خصوصیت۔ یہاں ایمان کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے کسی قانون اور نظام میں یہ بات نہیں ہے۔ کوئی اس کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ میں کہہ رہا ہوں کہ پوری عالمِ انسانیت کس قدر امن اور اطمینان میں رہ سکتی ہے اگر اُسے معلوم ہو جائے کہ یہ جو ضابطہ قانون ہے اس میں دنیا کی کوئی قوت تبدیل نہیں کرے گی۔ اگر تبدیلی کرے گی تو وہ پھر قرآنی نظام نہیں رہے گا۔ وہ استبداد ہے، دھاندلی ہے، طاغوتیت ہے، شیطنیت ہے۔ اگر اس میں کسی نے بھی کوئی کسی بھی قسم کی تبدیلی کی ہے تو وہ اس کو خدا کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ مارکس ازم کو مارکس ازم نہیں کہا جائے گا کہ اُس میں فکرِ مارکس کا تو کوئی گوشہ بھی نہ رہے اور نام وہی دیتے چلے جائیں۔

اسلام کے خلاف گہری سازش

آپ کے ہاں جو ہوا ہے وہ یہ ہے کہ نظام تبدیل کیا اور پورے کے پورے قرآن کو ٹھپ کر کے رکھ دیا ہوا ہے۔ بد قسمتی سے نام وہی اسلام کا دیئے چلے جا رہے ہیں۔ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ (10:24)۔ جس نے اس میں تبدیلی کی اور پھر بھی اس کو وہی اسلام کہا تو یہ خدا کے خلاف چیلنج ہے، بغاوت ہے۔ قرآن کے نظام کے لیے منفرد خصوصیت یہ ہے کہ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ (10:24) اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

کائنات کا ایک ایک ذرہ پوری انسانیت کے لیے بلا مزد و معاوضہ ایک تحفہ ہے

قرآن نے بارش کی مثال دی، زمین کی مثال دی، کاشتکار کی مثال دی، نصرتِ خداوندی للمؤمنین کی مثال دی اور آگے بات آئی کہ وَلَئِنْ أَرْسَلْنَا رِيحًا فَرَأَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوا مِنْۢ بَعْدِهِ يَكْفُرُونَ (30:51) اس کے بعد وہی ہوائیں جو بارش لا رہی تھیں تو جب وہی ہوائیں چلتی ہیں تو فصل کو پکا دیتی ہیں۔ کسانوں سے پوچھو کہ گیہوں کو بونے کے بعد وہی ہوائیں اسے کیسے پکاتی ہیں، مکی جون میں یہ ہوائیں اتنی خشک ہوتی ہیں کہ ان سے وہ فصل پکتی ہے اور پھر یہی ہوائیں گیہوں کو گاہنے کے کام آتی ہیں۔ اگر ان ہواؤں میں ذرا سی نمی پیدا ہو جائے تو گیہوں کا دانہ آپ کو نہیں مل سکتا۔ یہ اُس نظام کے مطابق ہے۔ اس طرح سے یہ سب کچھ ملتا ہے۔ اور آگے وہ لفظ آیا جہاں یہ سارا نظام بتایا گیا کہ کاہے کے لیے تھا تو پھر انسان اس میں کرتا کیا ہے۔ مِنْۢ بَعْدِهِ يَكْفُرُونَ (30:51) یہاں آ کر انسان کا ہاتھ لگا، اُس نے ہمارا نظام چھوڑا۔ کفر کے معنی ہوتا ہے ”کسی چیز کو ڈھانپ کر رکھ

لینا۔“ کہا کہ ”سمندر تہاڑے پیو داسی“^① کہ جہاں سے یہ کشید شدہ پانی گیا، کیا یہ بادل تم نے کہیں سے خریدے تھے؟ یہ بارش کہیں سے تم نے گروی رکھی ہوئی تھی؟ یہ زمین جو ہم نے بچھادی ہوئی ہے یہ کس کی ملکیت تھی جو تمہارے پاس آگئی؟

نعمائے خداوندی سے انسان صرف استفادہ کرنے کا حق رکھتا ہے، ملکیت کا نہیں

ہم نے یہ سب کچھ کیا، تم نے تو صرف ہمارے ان اسباب سے فائدہ اٹھایا، صرف اس میں تمہاری محنت ہے۔ ذرائع اور سامان سارے ہمارے دیئے ہوئے ہیں تو لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (53:39) تم تو صرف اپنی محنت کے حقدار ہو۔ آؤ! باہمی سودا ہے، کاروبار ہے تو کاروبار میں حصہ بنالیں۔ بتاؤ تو سہی کہ اس سو میں کتنے فیصد تمہارا ہے اور کتنا فیصد ہمارا ہے۔ عزیزان! من! قرآن نے کہا کہ تمہاری تو صرف محنت ہے باقی یہاں سے وہاں تک سارا کچھ ہمارا ہے۔ اُس محنت میں بھی ہمارا قانون ہے کہ وہ جو دانے کو سوسو بنانا ہے تمہاری تو صرف محنت ہے۔ کسی کسان سے پوچھو تو کہے گا کہ ”جیہڑا زیادہ محنت کرے گا زیادہ پھل ملے گا۔“ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (53:39) تم اپنی محنت سے زیادہ کے حقدار نہیں ہو۔ کہا کہ جی ہمارا محنت کا تو ہم نے لے لیا ہم گھر لے جائیں گے لیکن یہ جو آپ کا ہے یہ جو نوے فیصد بوریاں بھری ہوئی رکھی ہیں یہ کس کو دیا جائے؟ عزیزان! آئیے پوچھ لیں کہ یہ کس کو دیا جائے۔ قرآن نے کہا کہ آئیے معاملے کی بات ہے ”تے ذرا نکھیر کے گل کرئیے۔“^② اگر ہمارا وہ جو زراعت کا قانون ہے وہ زمین کے اندر کارفرما نہ ہوتا تو فصل لینا تو ایک طرف وہ جو بیج ڈالا تھا وہ بھی آپ پر چٹی پڑ جاتی۔

سورج کے ذریعے سمندر کے نمکیاتی پانی کو کشید کرنے کا محیر العقول سلسلہ

کہا کہ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۚ ؕ أَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ (56:68-69) یہ پانی جس پہ اس کھیتی کا سارا دار و مدار ہے تو کیا یہ بارش کہیں تمہارے کارخانے سے ہوتی ہے؟ کیا اس کے اندر کوئی تمہاری کارگیری تھی؟ یہ جو اس قدر کشید شدہ پانی بادلوں کی شکل میں اڑائے پھر رہے ہیں پھر ان کو برسایا، اگر وہ سمندر کا ویسے کا ویسا پانی آجاتا تو جو یہاں اگی ہوئی کھیتیاں یا درخت ہیں، سارے جھلس کر رہ جاتے۔ عزیزان! اتنے سے ٹکڑے کے اوپر غور کرنا چاہیے کہ سمندر کا پانی ہے، ساری دنیا اس وقت صاف پانی کے لیے ترس رہی ہے جو پینے کو نہیں ملتا، لیکن سمندر کے کنارے بس رہے ہیں۔ سائنسدان بڑی بڑی ترکیبیں کر رہے ہیں، مشینیں بنا رہے ہیں کہ سمندر کے پانی کو پینے کے قابل بنایا جائے اور وہ اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ اگر ایک گلاس بھر پانی کسی طرح سے بنا لیتے ہیں تو اس پر اتنا خرچ آتا ہے جتنا گلاس بھر سونے پہ آتا ہے۔ اس لیے وہ

① کیا سمندر تمہارے باپ کی میراث تھا کہ

② ذرا واضح طور پر بات کریں، نکھار کریں۔

بیٹھے ہیں کہ کیا کریں۔ اور یہاں پوچھو ہی نہیں کہ کشید کیا ہوا پانی کس طرح بلا مزد و معاوضہ ایک پیسہ لگائے بغیر مل رہا ہے۔ کہا کہ بارش تو خیر ہوئی ہی سہی کہ سورج نے یہ کیا۔

کاروبارِ حیات میں انسانی زندگی کی نشوونما کے لیے قدرت کی کاریگری کا حصہ

کہا کہ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أَجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ (56:70) اگر بارش وہی برتی جو سمندر کا کھاری پانی ہے، تو فصل تو ایک طرف رہی تم بھی ختم ہو جاتے۔ بتاؤ تو سہی کہ اس کاروبار میں ہمارا کتنا حصہ ہے۔ اَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۝ ءَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ (56:68-69) کھیتی کے پکنے کے لیے حرارت کو دیکھیے کہ یہ کتنا بڑا سرچشمہ حرارت ہے جو ہم نے اوپر رکھ چھوڑا ہے، اُس میں ایندھن کہاں سے ڈلتا ہے، کیسے وہ کروڑوں سال سے اُسی رفتار سے گرمی دیئے چلا جاتا ہے، اُس کی حرارت کم ہی نہیں ہوتی، نہ وہ کبھی چولہا پھٹتا ہے کہ ”بی بی دے کپڑے سڑ جاؤں“۔ ❶ کس نظام کے ماتحت وہ دیئے چلا جا رہا ہے، وہ حرارت اور پھر یہ تمہارے ہاں کی جو حرارت ہے کہ جن لکڑیوں سے تم حرارت لیتے ہو وہ ساری کی ساری سبز لکڑیاں ہوتی ہیں پانی سے بھری ہوئی، وہی سورج ان میں سے پانی لے جاتا ہے تو تمہیں لکڑیاں دیدیتا ہے کہ لو بابا! جلاؤ اور اپنا کام کاج کرو۔ کہا کہ یہ کس کا نظام ہے؟ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً (56:73)۔ ذکر کے ایک بنیادی معنی ہوتے ہیں ”وہ شے جو از خود موجود ہو، ہماری بنائی ہوئی نہ ہو“۔ ❷ کہا کہ ہم نے اس کو اس شکل میں بنایا کہ یہ تمہاری بنائی ہوئی نہیں ہے بلکہ یہ سب کچھ ہمارا ہے۔ آؤ اس سارے کاروبار کے اندر حساب کر لو اور بتاؤ کہ تمہارا کیا ہے:

آنکھ نرگس کی ، دہن غنچے کا ، حیرت میری

ان کی تصویر میں پوچھو کوئی ان کا کیا ہے

کہا کہ میں کوئی ایسا پھر ڈالنے والا کاروباری نہیں ہوں؛ بتاؤ کہ کتنے پرسنٹ تمہارا ہے۔ کہا کہ جی ہماری تو محنت تھی باقی سارا آپ کا تھا۔ ٹھیک ہے ہم اپنا حصہ لے جاتے ہیں لیکن ہم نے پوچھنا یہ ہے کہ یہ جو باقی آپ کا رہ گیا ہے یہ کس کو دیدیں؟ کہا کہ وَمَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ (56:73) دنیا کے بھوکوں کو جا کر دیدو؛ ہمیں مل جائے گا۔

① بی بی کے کپڑے جل جائیں۔

② تاج العروس کے مطابق ”مَذْكُورًا“ کے معنی ہیں ”ایسی چیز جو اپنی ذات سے وجود میں آگئی ہو اور قائم ہو“ لیکن نے اس کے معنی athing existing by itself کہا ہے۔

(Lane, Edward William: An Arabic-English Lexicon, Librairie Du Liban, Beirut-Lebanon, 1968, p97.

دیگر تفصیل کے لیے دیکھیے: پروپوز: لغات القرآن (جلد دوم) ادارہ طلوع اسلام لاہور، 1960ء، ص 689 تا 700۔

خدا تعالیٰ کا نظام ربوبیت لامحدود وسعتوں کی صفات عظمیٰ کا حامل ہے

کہا کہ ہم نے قرآن کی ابتدا الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (1:1) سے کی تھی کہ ہم بھی قابلِ ستائش اس لیے ہیں کہ پوری عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پیانے پر تم بھی ربوبیت کرتے ہو، اپنے بال بچوں تک کرتے ہو، آگے زیادہ سے زیادہ کرتے ہو تو خاندان تک پہنچاتے ہو، بہت بڑا انتظام کسی نے کیا تو قوم کے لیے کچھ کر دیا۔ کہنے لگے کہ یہ ساری چیزیں ربوبیتِ کبریٰ ہیں، چھوٹے پیانے کے اوپر ہیں۔ جو ہمارا نظام ہے وہ ربوبیتِ عظمیٰ چاہتا ہے، عالمگیر انسانیت کی ربوبیت چاہتا ہے۔ اس کے لیے کہا کہ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (56:74) تم پوری کوشش کرو کہ خدا کی ربوبیتِ عظمیٰ کا جو نظام ہے اُس کو پورا کرو۔ اور وہ یہ ہے کہ اتنی محنت کر کے یہ سب کچھ اگاؤ، محنت کے مطابق اپنا حصہ لے جاؤ اور ہمارا حصہ ربوبیتِ عالمینی کے لیے اس دنیا کے بھوکوں کو دیدو۔ ان سے پوچھا کہ صاحب! خدا نے جو یہ کہا ہے کہ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (56:74)۔ تو یہ کیا ہے؟ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے رکوع میں جاؤ تو سُبْحَنَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ تین دفعہ پڑھو۔ عزیزانِ من! چھوڑیے ان کی باتوں کو دل دکھتا ہے۔

قرآنی حکومت میں نظامِ ربوبیت کی نشانی الارضِ للہ کی ترجمانی علامہ اقبالؒ کی زبانی

پھر سوچے کہ اُس نے شروع سے کیا نظام بتایا۔ بیچ ڈالنے سے لے کر آخر تک یہ جو آیات ہیں اقبالؒ (1877-1938) نے بڑی خوبصورتی سے اپنے ہاں ان کا ترجمہ کیا ہے۔ ”بالِ جبریل“ میں اُس کی نظم کا عنوان الارض للہ ہے:

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھتم سے بادِ سازگار
خاک یہ کسی کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشہٴ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوں انقلاب؟
وہ خدا یا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

عزیزانِ من! خدا نے اقبال (1877-1938) کو بڑی صلاحیت دی تھی، شعریت ہے تو اُس کا بدل نہیں ہے، حقائق کی یہ کیفیت ہے کہ قرآن کا ترجمہ کیے جا رہا ہے۔

اب سمجھ اس کے معنی کہ یہ سب کچھ ہم کرتے ہیں۔ اُس کے بعد کہا کہ مِنْ بَعْدِهِ يَكْفُرُونَ (30:51) تم اس کا روبرو سے بھی انکار کر جاتے ہو۔ جو کچھ وہاں سے پیدا ہوتا ہے اُس میں جو ہمارا حصہ ہے اُس کو ڈھانپ کر بیٹھ جاتے ہو، سارے کا سارا ہی لے کر چلے جاتے ہو۔ تمہاری یہ کیفیت ہے۔ اب بتاؤ کہ جو کاروبار میں اس قدر بددیانت ہو تو اُس کے متعلق کیا کہا جائے۔ یہ تمہاری کاروبار کی بددیانتی ہے کہ جتنا حصہ ہمارا ہے وہ بھی سمیٹ کر لے جاتے ہو اور ڈھانپ کر رکھ لیتے ہو۔ اُس کے بعد ہے کہ اے رسول! یہ جو کچھ ہم نے کہا ہے سو چوتو سہی کہ جو عقل و فکر سے اس کو سُنے گا اور غور کرے گا تو کیا وہ انکار کی جرأت کر سکتا ہے؟ لیکن یہ سب کچھ تم ان کو سناتے چلے جاتے ہو اُس کے باوجود یہ کہتے بھی چلے جاتے ہیں کہ نہیں، یہ سارے کا سارا زمیندار کا ہے، ساری زمین بھی اُس کی ہے، زمین کی ملکیت بھی اُس کی ہے۔ جو لوگ ایسے واضح حقائق کو یوں جھٹلاتے جائیں، انہیں راہِ راست پر کس طرح لایا جاسکتا ہے؟ فَإِنَّكَ لَا تَسْمَعُ الْمَوْتَى (30:52) زندہ انسانوں کو تو بات سمجھا سکتا ہے لیکن مُردوں کو نہیں سنا سکتا۔

سورج کی روشنی سے وہی شخص استفادہ کر سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے

قرآن تو یہ کہتا ہے کہ لِنُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70) تو اس غلط روش کے انجام سے اُسے ہی آگاہ کر سکتا ہے جس میں زندہ رہنے کی کوئی تمنا اور خواہش موجود ہے۔ کہتا ہے کہ وَلَا تَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ (30:52) اسی طرح سے جو بہرے ہیں تو ان کو بھی نہیں سنا سکتا۔ بہروں کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ان کو بھی سنایا جاسکتا ہے بشرطیکہ وہ تمہاری طرف منہ کر کے کھڑے ہوں کہ کچھ اشاروں سے، کچھ کنائیوں سے، سمجھ سکیں لیکن جو بہرہ منہ پھیر کر چلتا ہے اُس کو نہیں سمجھا سکتا۔ دونوں کیلگریز (اقسام) آگئیں: ایک یہ کہ مردے جن میں زندگی کی رمت تک نہیں اور دوسرے ایسے انسان کہ زندگی کی رمت تو ہے لیکن کیفیت یہ ہے کہ سننا ہی نہیں چاہتے۔ وَمَا أَنْتَ بِهَادٍ الْعُمَى عَنْ ضَلَالَتِهِمْ (30:53) اندھے کو کیا بتایا جائے کہ کونسا صحیح راستہ ہے اور کونسا غلط۔ ہمارے سورج کی روشنی اُسی کو فائدہ دے سکتی ہے جو اپنی آنکھیں کھولے۔ سورج کا طلوع کرنا تو ہمارے ذمہ فرض ہے لیکن آنکھیں کھولنا تو تمہارا کام ہے۔ یہ رفاقت ہے خدا کی اور انسان کی۔ ہمارے سورج سے تم فائدہ نہیں اٹھا سکتے اگر آنکھیں نہیں کھولتے۔ جو خود آنکھیں بند کر لے، جو اندھا بن جائے اُس کو اُس کی گمراہی سے کون صحیح راستے پہ لاسکتا ہے۔ اِنْ تَسْمَعُ إِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ (30:53) تو اُسے سنا سکتا ہے جو عقل و بصیرت کی رو سے اس فیصلے پہ

پہنچے کہ بات یہ ٹھیک کہتا ہے اور اُس کے بعد پھر وہ ان قوانین کے سامنے جھک جائے۔ صرف اتنی ہی بات نہیں ہے کہ وہ یہ سمجھ لے کہ بات یہ ٹھیک کہہ رہا ہے، یہ تو صرف ذہنی چیز ہے۔ عمل کے لیے صرف ذہن کا مطمئن ہونا کافی نہیں ہے بلکہ انسان کے جذبات کا اُس سمجھی ہوئی چیز کے جو تابع رہنا ہے یہ ہے اگلی چیز۔ اور یہ ہے جسے مسلمان کہتے ہیں:

جاننا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

(غالب)

طبیعت جذبات کے تابع چلتی ہے۔ آپ کو بہت سے لوگ ایسے ملیں گے جن کے متعلق آپ انہیں سمجھائیں گے کہ بابا! مر جاؤ گے کیا کرتے ہو، یہ چیزیں کھاتے ہو۔ وہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے ”میں وی جاننا ہیگاں پر بڑی کوشش کتی ہیگی اے پر نہیں چھٹ دی“^①

قوموں کی زندگی میں نشیب و فراز زندگی کا ایک لازمی جز ہے

کہا کہ اسی اصول میں قوموں کی زندگی کے عروج و زوال کا راز بھی پنہاں ہے۔ قوموں کی حالت بھی دراصل افراد کی سی ہوتی ہے، قوموں کی زندگی میں بھی یہ پروگرام آتا ہے کہ جیسا انسان کی طبعی زندگی میں پروگرام ہوتا ہے لیکن گھبراؤ نہیں کہ اس وقت تم میں بہت ضعف ہے، کمزوری ہے۔ اس کی مثال واضح ہے کہ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ ضَعْفٍ (30:54) ارے دیکھو تو سہی کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے، تو کتنا کمزور اور ناتواں ہوتا ہے۔ اُس بچے کی اُس حالت سے کہ جب وہ پیدا ہوتا ہے اُس کی پوری زندگی کے لیے تو اصول مقرر نہیں کیے جاسکتے۔ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ (30:54) کمزوری کے بعد نشوونما پاتا ہے، صحیح غذا ملے، صحیح قوانین کے مطابق اُس کی پرورش ہو تو وہ طاقتور ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے۔ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَ شَیْبَةً (30:54) لیکن اگر جوانی میں وہ ان قوانین کو توڑ دیتا ہے تو پھر کمزوری آ جاتی ہے۔ یہ عمل استمرار چاہتا ہے، استقلال چاہتا ہے، ثبات چاہتا ہے، دوام چاہتا ہے۔ وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ ”مرتے دم تک مومن رہو“ تو وہ یہ بات ہے۔ یہ کسی خاص دور تک نہیں کہ ان طبعی قوانین کی آپ نے اطاعت کر لی اور قوت آ گئی بلکہ یہ تو اسی طرح مسلسل جاری رکھنا پڑے گا، مرتے دم تک مسلم رہنا پڑے گا۔ یَخْلُقْ مَا یَشَاءُ (30:54) یہ سب تخلیقی پروگرام ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق جاری و ساری ہے۔

① یہ مجھے بھی معلوم ہے، بڑی ہی سرتوڑ کوشش کی ہے مگر یہ ہے کہ نہیں چھوٹی۔

جسمانی صحت کی طرح قوم کی صحت کو برقرار رکھنا زندگی بھر کے لیے ضروری ہے

اب سوال یہ ہے کہ اس کا یہ تخلیقی پروگرام کس طرح جاری و ساری ہے؟ کہا کہ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْقَدِيرُ (30:54) اس کے لیے اس نے علم کی بنا پر قانون مقرر کیے ہیں۔ یہ صیغہ بتا رہا ہے اور عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ جو ”قدیر“ کا صیغہ ہے اس کا کیا مطلب ہے ”یہ استمرار چاہتا ہے، تسلسل چاہتا ہے، دوام چاہتا ہے“۔ یہ چیز نہیں ہے کہ کسی وقت ہنگامی طور پر ہم کچھ ایسی چیز کر دیتے ہیں بلکہ دوامی طور پر یہ ہمارا نظام اسی طرح سے چلا آ رہا ہے اس میں تبدیلی نہیں پیدا ہو سکتی۔ قوموں کی بھی کیفیت ہے۔ کوئی بات نہیں اگر وہ کسی وقت کمزور ہو گئی ہے تو اُس کے قانون کے مطابق غذا دی جائے، اُس کے مطابق پرورش کی جائے تو ماشاء اللہ توانا ہو جائے گی لیکن اُس کے بعد انہوں نے پھر ان قوانین کو چھوڑ دیا تو پھر کمزوری آ جاتی ہے اور صحت بگڑتی ہے اور یہ کمزوری آہستہ آہستہ قبر کی طرف لیے چلی جاتی ہے۔ یوں قوموں کے اوپر وہ ساعت آ جاتی ہے جب نظر آتا ہے کہ ان کی طبعی زندگی، قومی زندگی ختم ہو رہی ہے۔ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ لَا مَابِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ ط كَذَلِكَ كَانُوا يُؤْفَكُونَ (30:55) جب پھر وہ زوال آتا ہے تو اُس وقت یہ کہتے ہیں کہ صاحب! اصل میں ہمیں مہلت کا وقفہ زیادہ نہیں ملا تھا۔ انبیائے کرام کا سلسلہ پہلے دن سے جاری رکھا، مسلسل کہتے چلے آئے، آخری نبی کو جو کتاب دی ہے وہ محفوظ رکھ دی اور مکمل کر دی۔ اس کے باوجود جب وہ پھر اپنے ہاتھوں سے کیے ہوئے جرائم کی مکافات کے رو سے زوال پذیر ہوتے ہیں، موت سامنے آتی ہے، تو کہتے ہیں کہ ہمیں کچھ زیادہ وقت نہیں ملا تھا۔ کہا کہ كَذَلِكَ كَانُوا يُؤْفَكُونَ (30:55) اصل میں بات تو یہ ہے کہ وقت تو بہت تھا، کہا بھی جاتا تھا، بات بتائی بھی جاتی تھی لیکن بہرے کی طرح منہ موڑ کر چل دیتے تھے اور آج کہہ رہے ہیں کہ صاحب! ہمیں بہت تھوڑا وقت ملا۔

عزیزانِ من! وقت تھوڑا نہیں ہوتا، بس سمجھنے کی بات ہے۔ وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَالْإِيمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِلَى يَوْمِ الْبُعْثِ (30:56) لیکن وہ لوگ جن کو علم اور ایمان حاصل ہے وہ یہ بات ان سے کہتے ہیں کہ کیا کہہ رہے ہو کہ وقت بہت تھوڑا تھا، ارے تمہیں تو اتنا لمبا وقت ملا تھا اور اس کے باوجود یہ بات آج کہتے ہو۔ تم قانونِ خداوندی کے مطابق اس تمام دور میں سے گزرے ہو۔

موت و حیات کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد قابلِ غور ہے

یہاں یہ لفظ ہے: يَوْمِ الْبُعْثِ (30:56)۔ میں یہ عرض کر دوں کہ جسے مرنے کے بعد کی زندگی، قیامت کی زندگی، آخرت

کی زندگی، موت کے بعد کی زندگی کہتے ہیں، وہ اسلام اور ایمان کی بنیاد ہے اور اُس پہ ہمارا ایمان ہے لیکن اسے سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن نے زندگی اور موت یا موت کے بعد پھر زندگی جو کہا ہے تو یہ صرف اگلی دنیا کے لیے نہیں کہا بلکہ اس دنیا کے اندر بھی قوموں کی موت اور حیات کے متعلق جو قوانین دیئے ہیں ان کے لیے بھی یہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ”بعث“ کا جو لفظ ہے یہ عام طور پر ہمارے ہاں مرنے کے بعد کھڑے ہو جانے کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کے معنی ہوتا ہے کہ ”کسی کو راستے سے ہٹا دینا“ جو موانعات کسی کی راہ میں کھڑے ہونے کے لیے زندہ ہونے کے لیے ہوں ان کو ہٹا دینا۔“ وہ جو مرنے کے بعد کی زندگی کے لیے یہ بعث لفظ قرآن میں آیا ہے تو وہ یہ ہے کہ تمہاری زندگی کے راستے میں جو کچھ موانعات آگئے تھے وہ ہم ہٹا دیں گے۔ اس دنیا کے اندر کی یہ چیز کبھی ہے۔

ہر وہ طاقت یا نظام جو انسانیت کے راستے میں رکاوٹ ہے خدا تعالیٰ کا قانون اسے اپنے راستے سے ہٹا دے گا

دوسرے مقام پہ یہ کہا ہے کہ یہ اتنے بڑے بڑے جتنے بھی سرمایہ دار ہیں، یہ لوگوں کی محنت کو دبائے بیٹھے ہیں، محنت کشوں کی محنت کا استحصال کرتے ہیں، وہ سرمایہ دار یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ بعث ہوگی ہی نہیں۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قیامت آئے گی ہی نہیں۔ یہ ترجمہ غلط ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہمیں راستے سے کوئی ہٹا ہی نہیں سکتا، ہم جو انسانیت کی راہ کو روکے بیٹھے ہیں تو کوئی طاقت ہمیں راستے سے ہٹا نہیں سکتی۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جو بھی انسانیت کے راستے کے اندر رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں تو ہم بعث کرتے ہیں، ہم ان رکاوٹوں کو دور کر دیتے ہیں۔ اسی لفظ بعث کے معنی انقلاب ہوتا ہے۔ یہ جماعت جو اٹھتی ہے یہ صرف یہ کرتی ہے کہ انسانیت کے راستے کے اندر جو یہ لوگ رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں یعنی یہ نظام سرمایہ داری، نظام ملوکیت، نظام پیشوائیت والے تو وہ آسمانی انقلاب قرآن کی روشنی میں ان رکاوٹوں کو راستے سے ہٹا دیتا ہے ”تے نہر چلن لگ جاندی اے“۔^① یہ جو لوگ تھے یہ کہتے تھے کہ تم یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں راستے سے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ تو یہی تمہاری غلطی تھی۔ فَهَذَا يَوْمُ الْبُعْثِ (30:56) وہ آج کا دن آگیا، وہ دور آگیا ہے کہ تمہیں راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔ وَلَكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (30:56) تم اپنے زعم میں سمجھے بیٹھے تھے کہ ہمیں ہٹانے والا کوئی ہے۔ یاد رکھو! جو چیز بھی خدا کے نظام اور قانون کے خلاف کی جائے گی اسے ہٹا دیا جائے گا۔ وہ جو کہا ہے کہ مہلت کا وقفہ تو اُس میں ضرور آتا ہے، دانے کو گندم کا خوشہ بننے میں چھ مہینے ضرور لگ جاتے ہیں لیکن یہ اُس خدا کا اٹل قانون ہے کہ جو بھی انسانیت کے راستے میں کھڑا ہوگا اور جس کے

① تو نہر بہنا شروع کر دیتی ہے۔

ہاتھوں سے نکریم انسانیت کے اوپر حرف آئے گا تو وہ راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔ یہ خدا کا قانون ہے اور وہ خیر اور عظیم خدا ہے۔ وہ ہنگامی وقت نہیں ہے بلکہ قدر ہے۔ کہا کہ **فَيَوْمَئِذٍ لَا يَنْفَعُ الدِّينَ ظَلَمُوا مَعْدَرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ** (30:57) جب یہ وقت آ جاتا ہے یہ انقلاب کی گھڑی آ جاتی ہے تو کوئی معذرت قابل قبول نہیں ہوتی۔ یہ جو معذرت کا لفظ ہے اس کے معنی ہوتے ہیں ”اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرنا“۔ عذر لفظ اسی سے ہے اور اُس کے معنی ہوتے ”پردہ پوشی کرنا“۔ یہاں کہا ہے کہ یہ نہیں ہے کہ پھر بھی اعتراف کر لیں بلکہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ اس قسم کے کچھ دلائل، کچھ Arguments (براہین) کوئی Logic (منطق) دیں کہ نہیں جی، یہ تھا اور وہ تھا۔ کہا کہ پھر ان کی یہ کچھ کیفیت ہوتی ہے۔

مہلت کا وقفہ ختم ہو جائے تو پھر توبہ کی قبولیت کا وقت بھی ختم ہو جاتا ہے

اب آگے ایک اور بڑی بات آتی ہے۔ کہا کہ جب یہ استبداد ان کے ہاتھ میں تھا، قوت ہاتھ میں تھی، تو نظر آتا تھا کہ دنیا میں ان جیسا بہادر کوئی نہیں ہے، ان جیسا جرأت والا کوئی نہیں ہے۔ اب کیفیت یہ ہے **وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ** (30:57) وہ ہر چوکھٹ کے اوپر ہاتھ رکھیں گے اور کہیں بھی ان کا سجدہ قبول نہیں ہوگا، یہ ان کے کسی کام نہ آ سکے گا۔

اب اس سورۃ کی آخری آیات آرہی ہیں اور میں نے کہا تھا کہ سورۃ کی آخری آیات سورۃ کا طغص ہوتی ہیں۔ کہا کہ **وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ** (30:58) ہم قرآن میں مثالیں دے کر بات سمجھاتے ہیں، مختلف طرق و اسالیب سے حقائق کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں، تشبیہات سے بات سمجھاتے ہیں کہ مثال سے بات اور واضح ہو جاتی ہے۔ **لَسِنَ جِئْتَهُمْ بِآيَةٍ لَّيْقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مُبْطِلُونَ** ① (30:58) ان کو لاکھ سمجھاؤ لیکن یہ کہتے ہیں کہ یار چھوڑو ”ایہہ جگ مٹھا“ اگلا کن ڈٹھا“۔ آگے سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ تم یونہی ڈرا دیتے ہو، ہماری قوت تو بہت زیادہ ہے۔ ہر فرعون کی کیفیت یہی ہوتی ہے اور اس کیریکٹر کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب موت سامنے آتی ہے تو پکاراٹھتا ہے کہ میں ایمان لایا اور اُسے جواب ملتا ہے کہ فٹے منہ تیرا۔ ② تمہیں ایمان لانا اب یاد آیا۔ اب خدا یاد آ رہا ہے جب موت سامنے آئی ہے، کچھ تو کیریکٹر دکھاتا۔ عزیزانِ من! قرآن ہے۔ وہ جو غیرت ہے، حمیت ہے، خودداری ہے اُس کو کفر میں بھی قابل تحسین قرار دیتا ہے۔ کہا کہ استبداد تھا، تو فرعون تھے لیکن آخر میں تمہارا کیریکٹر تو یہ نکلا کہ اب موت سامنے آئی ہے تو ایمان والی بات کر رہے ہو۔

① لیکن اس کے باوجود جن لوگوں نے پہلے سے طے کر لیا کہ وہ تمہاری دعوت کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے خدا کا کوئی قانون بھی جب ان کے سامنے پیش کیا جائے گا تو وہ یہ کہہ کر اس کی مخالفت کریں گے کہ یہ سب جھوٹ اور فریب کاری ہے (پرویز: مفہوم القرآن ص 944)۔

② ٹھف! لعنت تجھ پر۔

دلوں پر مہر کیونکر لگتی ہے؟

قرآن کریم کہتا ہے کہ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (30:59) جو بھی علم و بصیرت سے کام نہیں لیتا، تعصب کی بنا پر اس قسم کی روش اختیار کر لیتا ہے، تو بس یوں سمجھو کہ دلوں پہ مہریں لگ جاتی ہیں۔ عزیزانِ من! دلوں پہ مہریں لگتی ہیں، کانوں میں ڈاٹ لگ جاتے ہیں، آنکھوں پہ پردے پڑ جاتے ہیں۔ یعنی ساری دنیا دیکھ رہی ہوتی ہے کہ کس قدر قیامت آرہی ہے، کس قدر فساد ہو رہا ہے، کس قدر ظلم ہو رہا ہے، کس قدر بنیادیں کمزور ہو رہی ہیں مگر

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

وہ اس لیے کہ ان کے دلوں پہ مہر لگ جاتی ہیں کہ لَا يَعْلَمُوْنَ (30:59) نہ ان تک صحیح معلومات پہنچتی ہیں اور نہ وہ خود علم و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ ان لوگوں کی بات یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ان کا یہ طرزِ عمل تمہارے دل پر بڑا گراں گزرتا ہے، تمہیں رنج ہوتا ہے، افسوس ہوتا ہے۔ تمہاری کیفیت اُس معالج کی طرح ہوتی ہے جو مریض کا صحیح علاج کرے۔ ضدی مریض کی حالت سے جو کیفیت معالج کی ہوتی ہے، وہی تمہاری ہو جاتی ہے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کے قلب حساس کا ذکر اور بدرجہ اتم استقامت کی تلقین

قرآن نے کہا کہ ہم تمہاری کیفیت کو جانتے ہیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مشکلات کا بڑا سامنا ہے، لمبی منزل ہے، راستے بڑے دشوار گزار ہیں لیکن فَاصْبِرْ (30:60) استقامت کو ہاتھ سے نہ چھوڑو، چلے جاؤ، راستہ صحیح ہے، بالکل نہ گھبراؤ۔ اس لیے کہ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (30:60) خدا کے وعدے سچے ہیں۔ اور اس استحکام کے پروگرام کے اندر ایک تھوڑی سی نصیحت بھی ہے، ایک تلقین ہے جو بڑی اہم ہے۔ یعنی یہ کہ اس سے منہ موڑ لینا، تھک کر بیٹھ جانا، استقامت نہ رہنا یہ تو الگ بات ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوگا۔ کہا کہ وَلَا يَسْتَخِفُّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْقِنُوْنَ (30:60) تم سے کوئی ذرا سی بھی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جس سے ان کو قیاس گزرے کہ تم گھبرا گئے ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ تم نہیں گھبراؤ گے، استقامت ہوگی لیکن دیکھنا کبھی اس قسم کی کوئی حرکت، کوئی آثار نہ ہوں کہ یہ لوگ سمجھیں کہ تم گھبرا گئے ہو۔ یہ کرو اور دیکھو کہ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (30:60) خدا کے وعدے کس طرح ایک ایک کر کے پورے ہوتے ہیں کیونکہ ان کی نصرت تمہارے مومن ہونے کے ساتھ مشروط تھی اور اس طرح سے تمہارے ایمان اور ثبات کی زندہ شہادت مل جائے گی۔ اور پھر دیکھو کہ کس طرح خدا کے وعدے سچے ہو کر آتے ہیں۔ اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (2-110) نصرتِ خداوندی یوں آئے گی کہ

یہی قوم نہیں بلکہ پوری دنیا فوج در فوج چلی آئے گی۔

آخر کار نوع انسانی کو وحی کی روشنی سے استفادہ کرتے ہوئے استقامت کا سبق حاصل کرنا ہی پڑے گا جب یہ صورت ہو جائے کہ نظام قائم ہو جائے، سلطنت مل جائے، مملکت مل جائے، بڑی مستحکم ہو، دنیا فوج در فوج آ رہی ہو تو اُس کے بعد راوی عیش لکھتا ہے کہ موج ہو گئی اب تو کچھ کرنے کا کام ہی نہیں ہے۔ کہا کہ یوں نہ سمجھو۔ یہی تو وہ وقت ہے جب اور زیادہ محنت اور کوشش سے تمہیں کام لینا پڑے گا۔ یہ نہ سمجھ لینا کہ اب کام ختم ہو گیا ہے بلکہ یہ ہونے کے بعد تو ایک اور منزل شروع ہوتی ہے۔ ایک سیکنڈ کے لیے بھی سستانہ جانا، تساہل نہ برتنا، تغافل نہ برتنا۔ فَسَبِّحْ (110:3) اور تیزی سے اس میں کوشش کرتے چلے جاؤ۔ اگر کہیں کوتاہی ہو تو وہیں اُسی وقت اُس کے ازالے کی کوشش کرو۔ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (110:3)۔ اُسی وقت اس کے ازالے کی کوشش کرو۔ یہاں تَوَّابًا (110:3) آیا ہے۔ پتہ چلے کہ غلط راستہ ہے تو وہاں سے پیٹھ پھیر کر ادھر کو واپس آتا ہے تو اس کا ہر قدم تائب کا ہوتا ہے اور اسے توبہ کہتے ہیں۔ اور خدا وہاں کھڑا دیکھ رہا ہوتا ہے جہاں سے اس نے غلط راستہ اختیار کیا تھا کہ یہ پلٹتا ہے یا چلا ہی جا رہا ہے۔ کہا کہ کسی مقام کے اوپر بھی جب تم محسوس کرو کہ غلط قدم اٹھ گیا ہے تو پلٹ کر پھر اس طرف قدم اٹھاؤ۔ جب تم یوں قدم اٹھاؤ گے تو تم تائب ہو گے اور خدا وہاں کھڑا ہوا دو قدم اٹھائے گا۔ خدا تواب ہے جو شدت سے بھاگ کر آتا ہے کہ ”اوٹوں آتے سہی“۔^①

عزیزانِ من! سورۃ الروم آج ختم ہوتی ہے، آئندہ سورۃ لقمن 31 ویں سورۃ سے درس شروع ہوگا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط

.....

سُورَةُ الْقَمَنِ

پہلا باب: سورة لقمن (آیات 1 تا 11)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1979ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورة لقمن سے ہو رہا ہے جو 31 ویں سورة ہے۔

حروفِ مقطعات کی وضاحت

سابقہ سورة کی آخری آیات میں سے ایک آیت میں یہ کہا گیا تھا کہ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (30:58)۔ اس قرآن میں دین سے متعلق انسانی زندگی سے متعلق جتنے بھی حقائق ہیں انہیں مختلف مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ اور اسی کے تسلسل میں اس سورة کی پہلی آیت ہے اَلَمْ (31:1)۔ یہ پہلے الفاظ تو وہی ہیں جنہیں مقطعات ❶ کہتے ہیں۔ یہ متعدد

❶ ان کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورة طہ، طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2005ء، ص 21 تا 22۔ نیز مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورة الشعراء، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2008ء، ص 23 تا 24۔

مقامات پہ آئے ہیں اور ہر مقام پہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ عربی اسلوب بیان کا ایک انداز ہوتا تھا۔ قرآن سے پہلے تو عربی زبان میں کوئی کتاب تھی ہی نہیں، کتاب کی شکل میں تو وہاں یہ پہلی کتاب آئی ہے اس سے پہلے تو ان کے ہاں صرف شاعری تھی۔ عربی زبان کے شعراء کے کلام میں یہ انداز تھا اور عبرانی زبان میں بھی یہ انداز تھا کہ وہ الفاظ کے حروف لے کر ان سے مخففات بناتے تھے۔ ان مخففات کے ذریعے سے وہ اپنی بات بیان کرتے تھے۔

قرآن کی بہت سی سورتیں ایسی ہیں جن کے ابتدا میں یہ مخففات آتے ہیں۔ ان مخففات کا انداز تو اب یہی ہے کہ وہ لفظ ان حروف کا امتزاج ہے۔ ان حروف کے متعلق میں اپنی بصیرت کے مطابق ہمیشہ یہ کہا کرتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے ہی مختصرات ہیں، انہی کی سمٹی ہوئی مخفف سی شکل ہے۔ اس کے معنی اس انداز سے میں نے اپنے ”مفہوم القرآن“ میں بھی کیے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ الـم اللہ علیم و حکیم کا ارشاد یہ ہے کہ **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذْ تَقُوْلُوْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ عَمَلُكُمْ** (31:1)۔ اللہ علیم و حکیم کا ارشاد یہ ہے کہ **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذْ تَقُوْلُوْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ عَمَلُكُمْ** (31:1)۔ وہ جو ہم نے پہلے کہا ہے کہ اس قرآن میں تمام حقائق اور موضوعات کے متعلق ہم نے مختلف مقامات پر بیان کیا ہے تو اب کہا ہے کہ یہ بھی اسی الکتاب کی آیات ہیں جو آپ کے سامنے اب آرہی ہیں۔

حکمت کے لفظ کا قرآنی مفہوم: زندگی کی حدود کو متعین کرنا

الکتاب تو بہر حال قرآن ہے، یہی منزل من اللہ ہے اور کتاب حکیم ہے۔ بہت سے مقامات پہ قرآن کریم کو قرآن حکیم، کتاب حکیم کہا گیا ہے۔ حکمت کے متعلق تو میں متعدد مقامات پہ یہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ بڑی بنیادی چیز ہے۔ حکمت کے متعلق نظری طور پر کہا جائے تو یہ وہ شے ہے جو دلائل و براہین کی رو سے ثابت کی جائے، یونہی دھاندلی سے کوئی بات نہ کہہ دی جائے یا منوالی جائے۔ یہ نہ ہو کہ ایک بات کو صحیح کہا ہے لیکن پتہ نہیں چلتا کہ کیوں کہا گیا ہے۔ جو اس کی The why of it ہے وہ کیا ہے اس کی علت کیا ہے کیوں کہا گیا ہے مقصد کیا ہے؟ یہ تمام چیزیں حکمت میں آ جاتی ہیں اور جب اسے ہم عملی زندگی میں لیتے ہیں تو اسے عربوں کی ایک مثال سے سمجھیے۔ عربوں کے ہاں یہ جو ریوڑ چراتے تھے تو ہوتا یہ تھا کہ کوئی بھیڑ اُدھر بھاگ جاتی تھی، کوئی اُدھر بھاگ جاتی تھی، چرواہا انہیں اکٹھا کر کے جب محفوظ راستے پر چلاتا تھا کہ دائیں بائیں اُدھر اُدھر نہ ہونے پائیں تو یہ جو طریق ہوتا تھا یہ طریق حکمت کہلاتا تھا۔ اب یہ جو کتاب ہے تو آپ سوچ لیجیے کہ اس میں حکیم کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ زندگی کے دریا کو سیلاب نہیں بننے دیتی، یہ اُس کے لیے ساحل متعین کرتی ہے کہ وہ انہی ساحلوں کے درمیان میں دریا اور نہر کی شکل میں چلتے تاکہ اس کے سارے فوائد تعمیری ہوں۔ جو نہی وہ ساحل ٹوٹیں یعنی ان کے جو کنارے ہیں وہ اُدھر اُدھر سے خواہ وہ پورے ٹوٹ جائیں یا کہیں سے شکاف پڑ جائے تو پھر اس سے پانی کی وہ تعمیر باقی نہیں رہتی بلکہ وہی پانی تخریب کا موجب بن جاتا ہے، سیلاب بن جاتا ہے۔ یہ حکمت ہے۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ ذہنی طور پر فلاسفی کے بھی یہی معنی ہیں کہ وہ جو حکمت اور دانائی اور دانشمندی ہے اس کے ساتھ قائل کرنے کی قوت کا نام ہوتا ہے۔ اس میں واقعات کے اسباب و نتائج کا

ناگزیر تعلق ہوتا ہے۔ اسے فلسفہ کہتے ہیں اور وہ کرتا یہ ہے کہ انسان کے منتشر خیالات کو ایک خاص راستے کے اندر لے جاتا ہے۔ اسی کو Logic (منطق) کہتے ہیں کہ اسباب و علل کی طرح بات میں سے بات بنے کہ اس کی وجہ یہ ہوئی اور اس کی وہ اگر یہ قاعدہ چھوڑ دیا جائے تو وہ ذہنی انتشار ہوتا ہے۔ ”حکیم“ میں تو بہت سی چیزیں آتی ہیں۔

قرآن کریم کو کتاب حکیم کہا ہے اور اس کے بعد اس کا مقصد یہ بتایا ہے کہ یہ **هُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُحْسِنِينَ** (31:3) ہے۔ اب عام ترجمہ آپ دیکھیں گے تو اُس میں لکھا ہوگا کہ یہ احسان کرنیوالوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے تو اس سے کیا بات سمجھ میں آئے گی یعنی اس چیز کی کیا تک ہے کہ ایک کتاب حکیم ہے؟ عالمگیر انسانیت کی ہدایت کے لیے دی جا رہی ہے اور بتایا بھی جا رہا ہے کہ وہ ہدایت ہے اور رحمت ہے لیکن ساتھ **لِّلْمُحْسِنِينَ** کہا جا رہا ہے جیسے شروع میں دوسری ہی سورۃ البقرہ کے اندر آتا ہے کہ **ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ** (2:2)۔ اس کے لیے ترجمہ کیا جاتا ہے کہ یہ ہدایت ہے متقیوں کے واسطے تو جو پہلے ہی متقی ہے اُس کو ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ کیا کبھی کسی نے کھڑے ہو کر یہی سوچا بھی ہے؟ تفسیریں اٹھائیں تو ان میں بھی یہی ہے، ترجمے اٹھائیں تو جس ترجمے کو لیجئے خواہ وہ کسی زبان میں کیوں نہ ہو وہاں یہی ملے گا کہ متقیوں کے لیے ہدایت ہے اب جو متقی نہیں ہیں ان کے لیے تو اس میں کچھ نہ ہو! اور جو پہلے ہی متقی ہیں ان کو ہدایت کی کیا ضرورت ہے۔

قرآن حکیم کو قرآن کی زبان میں ہی سمجھا جاسکتا ہے

میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ جب تک قرآن کریم کے ان الفاظ کے جو بنیادی معانی ہیں ان کو Reconstruct (از سر نو تعمیر و تشکیل) نہیں کیا جائے گا، یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ اس کے وہ معنی کیا ہیں، قرآن سمجھ میں نہیں آئے گا۔ قرآن ہی کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ نہیں رکھا بلکہ یہ عجیب بات ہے کہ اُس زمانے کی زبان محفوظ ہے اور یہ بھی محفوظ ہے کہ یہ عرب ان الفاظ کو کن معنی میں استعمال کرتے تھے۔ اس سے قرآن کا سمجھنا کتنا آسان ہوا۔ متقین کی وہ بات تو میں نے آپ کو پہلے بتائی تھی کہ حضرت عمر ♦ (581-644/45AD) سے پوچھا گیا کہ متقی کس کو کہتے ہیں؟ انہوں نے پوچھنے والے اُس بدو سے کہا کہ جب تم خاردار جھاڑیوں میں سے گزرتے ہو راستہ ایسا ہے جس کے دائیں بائیں ایسی کانٹے دار جھاڑیاں ہیں کہ کپڑوں کو الجھا دیتی ہے تو کیا کرتے ہو؟ عربوں کے کپڑے تو آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ تو ٹینٹ پہنے ہوئے چلے جا رہے ہوتے ہیں۔ پوچھا یہ ہے کہ وہ کچھ پہنا ہوا ہوا اور خاردار جھاڑیاں ہوں تو کیا کرتے ہو؟ کہا کہ ہم کپڑوں کو اکٹھا کرتے ہوئے ان کانٹوں سے بچتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ کہا کہ یہ متقی ہونا ہے۔ آپ دیکھیے کہ وہ لوگ کیسے سمجھتے تھے اور پھر ان باتوں کو کیسے سمجھاتے تھے!

ایک بدو پوچھ رہا ہے کہ متقی کسے کہتے ہیں؟ اس کے لیے یہ چیز کہہ کر صحیح راستہ بتا دیا ہے۔ عزیزانِ من! اسے کہا گیا کہ جب تم کسی ایسے راستے سے گزرتے ہو جہاں خاردار جھاڑیاں ہوں تو کیسے گزرتے ہو؟ اس نے کہا کہ جی ادھر سے لباس کو یوں لپیٹتے ہیں ادھر سے

یوں لپیٹتے ہیں، ادھر کانٹے سے بچتے ہیں، ادھر کانٹے سے بچتے ہیں۔ کہا کہ جو اس طرح سے راستے کے خطرات سے یوں سمٹ کر، لپٹ کر، محفوظ ہو کر، گزرتا ہے تو اسے متقی کہتے ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ کتاب حکیم اُسے صحیح راستہ دکھاتی ہے جو راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنا چاہتا ہو۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ یہ کہے کہ مجھے بچ کر چلنا ہے، مجھے الجھنا نہیں ہے، ان کانٹوں سے کپڑے نہیں پھڑوانے ہیں۔ جو راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنے والا ہے، یہ کتاب اُس کے لیے ہدایت ہے۔ اگر کوئی جائے ہی خودکشی کرنے کے لیے تو اُس کے لیے یہ کہنا کہ صاحب! آگے نہ بڑھنا، پانی زیادہ گہرا ہے، وہ کہے گا کہ میں تو آیا ہی ڈوبنے کے لیے ہوں۔ جو آیا ہی ڈوبنے کے لیے ہے، راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بچنا ہی نہیں چاہتا ہے، اُسے یہ صحیح راستہ کیا دکھائے گی۔ اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ کیا تم زندگی میں خطرات سے بچ کر چلنا چاہتے ہو تو آؤ تمہیں وہ راستہ دکھائیں۔

انسانیت کے لیے دوسری اہم شرط محسنین کا کردار ہے

شرط دوم **الْمُعْصِينَ** ہے۔ وہاں **الْمُعْصِينَ** (2:2) تھا اور یہاں **الْمُعْصِينَ** (31:3) ہے۔ پہلی چیز اتنی ہی ہے کہ خطرات سے بچنا ہی چاہیے لیکن یہ تو Negative (منفی) پہلو ہے۔ یہ خطرات سے بچنا ہے، اُس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اُس کو بچایا جاتا ہے یعنی چلنے والے کے کپڑے بچتے ہیں، کانٹوں سے پاؤں بچتے ہیں۔ وہ کسی چیز سے بچنا ہے۔ یہ چیز منفی پہلو ہوتا ہے لیکن یہ بھی بڑا ضروری ہے کہ انسان کی خطرات سے حفاظت ہو۔ اس سے وہ انسان تو پھر ویسے کا ویسا ہی رہا۔ اس کے بعد **الْمُعْصِينَ** (31:3) ہے۔ اب ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ یہ الفاظ اتنے پامال ہو گئے ہیں کہ ان کے بھی پھر معنی بیان کرنے پڑتے ہیں۔ محسن کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو اپنی زندگی کو حسین بنانا چاہے۔ اب یہ Positive (مثبت) بات آگئی۔ میں نے کہا ہے کہ اب تو یہ بھی سمجھنا پڑے گا کہ زندگی کو حسین بنانا کیا ہے؟ انگریزی زبان میں Beautification کی بھی یہ چیزیں موجود ہیں۔ یہاں محسنین آیا ہے۔ قرآن میں آیا ہے کہ محسنین حسن کائنات کو نکھارنے والے ہیں، اپنی زندگی کو حسین بنانے والے ہیں۔ متقین وہ ہیں جو حفاظت سے چلنے والے ہیں، خطرات سے محفوظ رہنے والے ہیں۔ اتنا حصہ تو یہ ہے کہ وہ جیسے ہیں ویسے ہی رہے، کچھ اور نہیں بنے ہیں۔ یہی مقصد نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو حسین بنانے کے خواہشمند ہیں، ان کے لیے صحیح راستے کی طرف راہنمائی بھی ہے۔ صحیح راستے کے لیے صحیح منزل کی طرف پہنچنے کے لیے راہنمائی تو بڑی ضروری ہے اور راستے میں مسافر کے لیے سامان سفر بھی تو چاہیے جسے زادِ سفر کہتے ہیں وہ بھی تو چاہیے تو رحمة (31:3) کہا ہے۔

رحمت کے معنی زادِ سفر کے ہیں، سامانِ نشوونما کے ہیں۔ کیا بات ہے قرآن کی! تین الفاظ ہیں: **هُتَّى وَرَحْمَةً لِّلْمُعْصِينَ**

(31:3)۔ ان کے اندر پوری کائنات سمٹا کر رکھ دی ہے۔ پہلے تو ان کے لیے جو یہ تہہ کریں کہ ہم نے اپنی زندگی کو حسین بنانا ہے، یہ ضروری بات ہے کہ اُس کے لیے صحیح راستہ کونسا ہے؟ یہ صحیح راستہ متعین کرنا ہے۔ اب دوسری بات یہ ہے کہ مسافر راستے پہ چل پڑا ہے، چلا جا رہا ہے، لمبی منزل ہے، راستے میں اس کو زادِ سفر کی ضرورت ہوگی اور یہ زادِ سفر وہ ہے جو اسے خرید کر نہیں لینا ہوگا۔ رحمت کے معنی ہی یہ ہیں

کہ جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ از خود ملے۔ وہ اس قسم کا ہدایت کرنے والا ہو، راستہ دکھانے والا ہو، جو صرف راستہ ہی نہ دکھائے بلکہ پورے راستے میں اس کے لیے زادِ راہ کا انتظام بھی کرے۔ وہ جو شاہراہوں پر Midway Hotel کھولے ہوئے ہوتے ہیں، وہ اسی انتظام کے لیے ہی تو ہوتے ہیں لیکن انہیں ہوٹل کیسے کہا جائے کیونکہ وہاں تو ہر چیز پیسے سے ملتی ہے، جبکہ رحمت یہ ہے کہ وہ زادِ راہ بھی از خود ملے، بلا مزد و معاوضہ ملے۔ اس نے راستہ ہی نہیں بنایا بلکہ راستے کے اوپر اس قسم کے Midway Hotels کھولے ہیں، وہ مہمان خانے ہیں، جہاں وہ سب کچھ بلا مزد و معاوضہ ملے گا۔ کہا یہ ہے کہ وہ جو راستے بھر میں خطرات سے حفاظت کرتے ہیں، وہ متقی ہیں اور اس کے بعد زندگی کو خوشنما اور حسین بنانے کے لیے سارے سامانِ نشو و نما بلا مزد و معاوضہ ہیں، جو انہیں ملتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ ان کے لیے کہا کہ **الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ** (31:4)۔ یہی الفاظ کم و بیش شروع میں آئے ہیں۔ جہاں سے سورۃ البقرۃ شروع ہوتی ہے۔ آیا ہے کہ **الْم - ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هَدَىٰ لِلْمُتَّقِينَ - الَّذِينَ يُؤْتُونَ بِالْغَيْبِ وَيَقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ** (2:1-2)۔ اور اس کے بعد ہے کہ **وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ** (2:4)۔ یہاں بھی وہی شرائط ہیں اور یہ بنیادی شرائط ہیں۔ اب ہمارے ہاں محسنین کا ترجمہ احسان کرنے والے کیا گیا ہے، **وَيَقِيمُونَ الصَّلَاةَ** کا ترجمہ نماز پڑھنے والے کیا گیا ہے اور **وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ** کا ترجمہ اڑھائی پرسنٹ زکوٰۃ دینے والے کیا ہے۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ محسنین کا ترجمہ ”احسان کرنے والے“ کر کے کیوں یہ مطمئن ہو گئے؟ وہ اس لیے کہ وہ جو اڑھائی پرسنٹ زکوٰۃ کے طور پر دیتے ہیں تو وہ دوسروں کے اوپر احسان کرتے ہیں تو یہ خود بخود ہی اس کے اندر آ گئے ورنہ اگر یہ چیز قرآن کی رو سے ہوتی ہے کہ اس کی زندگی حسین بن جائے تو پھر دیکھنا پڑے گا کہ کیا ہماری ان نمازوں سے ان نمازیوں کی اڑھائی پرسنٹ زکوٰۃ دینے والوں کی زندگی حسین ہوتی ہے؟ کیا یہ حسنِ کائنات میں اضافہ کرتے ہیں، کیا یہ اس کی زلفوں کی مشاطگی کرتے ہیں کیا؟ اس کی زلفوں کو سنو اتے ہیں؟

- ① خدائے عظیم و حکیم کا ارشاد ہے کہ تم جس ہدایت کی آرزو رکھتے ہو (1:5) وہ ہمارے اس ضابطہ قوانین کے اندر محفوظ ہے (15:9) جس میں نہ بے یقینی اور تذبذب ہے، اور نہ کوئی نفسیاتی الجھن۔ یہ ضابطہ قوانین سفرِ زندگی میں ان لوگوں کو انسانیت کی منزل مقصود کی طرف لے جانے والی راہ بتاتا ہے جو غلط راستوں کے خطرات سے بچنا چاہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ان حقیقتوں پر یقین رکھتے ہیں جو نگاہوں سے اوجھل ہیں اور صحیح روش کے ان نتائج پر بھروسہ رکھتے ہیں جو اگرچہ ابتداءً ان کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں جن کا آخر الامر سامنے آ جانا یقینی ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے یہ لوگ اس نظام کو قائم کرتے ہیں جس میں تمام افراد قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے جائیں اور جو سامانِ نشو و نما انہیں دیا جاتا ہے اس میں سے اپنی ضروریات کے بقدر لے کر (2:219) باقی نوعِ انسانی کی پرورش کے لیے کھلا رکھتے ہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص 2)۔
- ② وہ اس طرح اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ اس ضابطہ خداوندی پر عمل کرنے سے ایک نئی زندگی کی نمود ہو جاتی ہے اور یوں حال کی جدوجہد سے انسان کا مستقبل روشن ہو جاتا ہے..... وہ مستقبل جس کا سلسلہ اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ وہ مرنے کے بعد بھی آگے چلتا ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 32-3)۔

کائنات کو حسین سے حسین تر بنانے کے فریضہ کی ادائیگی اور اس کا ثمر

اللہ تعالیٰ نے جو انسان کو خالقیت کے اندر اپنا رفیق بتایا ہے تو یہ بہت بڑا مقام ہے۔ اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا ہے۔ ویسے تو حید کی کیفیت یہ ہے کہ جب ہم اللہ صاحب اقتدار کہیں گے تو اُس میں کوئی بھی شامل نہیں لیکن اُس نے تخلیق کے اندر انسانوں کو شامل کیا ہے۔ یہ انسانوں کی خصوصیت ہے حیوان کی نہیں ہے کہ وہ خدا کے امر تخلیق میں رفیق بنتا ہے اور رفیق ایسا بنتا ہے کہ اس کے لیے اقبالؑ (1877-1938ء) کی وہ نظم دیکھنے کی ہے۔ اس کے شروع میں کہا گیا ہے کہ خدا نے یہ کہا کہ دیکھیے! ہم نے یہ کائنات بنائی اور یہ کڑے بنائے اور یہ ارض بنائی:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایام آفریدم

(پیام مشرق)

تاریک رات تو نے بنائی تھی تو میں نے بجلی کے قمقمے ایجاد کیے۔ کہو تمہاری راتوں کو نور دینے والا تو ہے یا میں ہوں۔

سفال آفریدی ایام آفریدم

یہ مٹی اور مٹی کا تو وہ ہی تھا کہ تم نے بنا کر یہاں رکھ دیا۔ سوچو تو سہی کہ اُس میں حسین آنسو رے کس نے بنائے تم نے بنائے یا ہم نے بنائے؟ ٹھیک ہے کہ میٹرل (مواد) کا پہلے موجود ہونا نہایت ضروری ہے وہ تو یہ کہہا نہیں بنا سکتا۔ وہ میٹرل (مواد) تو خدا کا ہی دیا ہوا ہے لیکن اُس میٹرل (مواد) کو جو حسین بنا دینا ہے تو یہ ہے حسن کائنات میں اضافہ کرنا۔ وہ As it is (جیسا ہے) تو کوئی بات نہیں۔ خدا نے آدم کو پیدا کر کے کہا کہ دیکھو یہ ہماری کائنات ہے یہ ہم نے ایسے بنا دی ہے اور کیا اب اس کا ایسا رکھنا ہی مطلوب و مقصود ہے؟ اس نے کہا

گفت آدم کہ چنیں ہست و چناں خواہد بود^①

یہ غلط ہے کہ یہ جیسی ہے یہ ویسی وہی رہے گی۔ تم نے ایسی بنائی ہے تو میں اسے ایسی بارونق بناؤں گا۔ خدا نے کہا کہ زندہ باد! یہی تو اس کا حسنِ رفاقت ہے کہ غاروں کے اندر بسنے والے انسانوں کو چاند پر بننے والے انسان بنا دیا۔ اب یہ وہ چیز ہے جو محسنین کے اندر آتی

① باقی مخلوق خدا کی بنائی ہوئی کائنات کو چھیڑتی نہیں لیکن انسان کی یہ حالت ہے کہ بقول علامہ اقبالؑ

گفت یزداں کہ چنیں است و چناں خواہد ماند گفت آدم کہ چنیں ہست و چناں خواہد بود

یہ کچھ ہے (What is) کو جو کچھ ہونا چاہیے (What ought to be) بنا دینے کا جذبہ انسان ہی کے سینے میں پنہاں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ خود کائناتی قوانین کے مطابق بھی کائنات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرح پوری کی پوری کائنات ارتقائی منازل طے کیے جا رہی ہے (پرویز: ابلیس و آدم ادا رہ طوع اسلام لا ہو 1983ء ص 45)۔

ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ ان یورپ والوں نے خارجی کائنات کو تو حسین بنایا لیکن اپنی زندگی کو حسین نہ بنا سکے۔ اب چہرہ روشن ہے مگر اندرون چنگیز سے تاریک تر ہے۔ انہوں نے حسن کے یہ معنی سمجھے ہیں کہ یہ سارا میک اپ (Make up) ہے۔ میری بیٹیاں معاف رکھیں۔ وہ جو باہر چمکتی ہوئی، بھڑکتی ہوئی، پری نظر آتی ہے گھر میں آ کر منہ ہاتھ دھو کر شیشے کے سامنے کھڑی ہوتی ہے تو اپنے آپ سے ڈرجاتی ہے۔ زندگی کو حسین بنانے کے یہ معنی نہیں ہیں۔ یہ غازہ کی اور حنا کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ زندگی اس پیکر کا ہی نام نہیں گو کہ اس کو بھی صاف ستر رکھنا ضروری ہے۔ زندگی تو انسانیت کا نام ہے۔ یہ تو حسن انسانیت کے اندر اضافہ ہے۔ اب یہ جو محسن ہیں تو اس میں دونوں حسن کائنات کو نکھارنے اور سنوارنے والے بھی اور اپنی زندگی کے اندر حسن پیدا کرنے والے بھی آ جاتے ہیں۔ اور یہ **وَيَقِيظُونَ الصَّلَاةَ** سے پیدا ہوگی۔

فضا کے اندر نظامِ صلوٰۃ پر عمل پیرا ہونے والے پرندوں کی مثال

جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تو بہت بڑا پروگرام ہے۔ صلوٰۃ کے معنی تو آپ جانتے ہی ہیں۔ جیسا قرآن کریم نے کہا ہے کہ دیکھو تو سہی کہ یہ فضا میں اڑنے والے پرندے کس طرح اپنی تسبیح اور صلوٰۃ کو جانتے ہیں۔ ان کے جتنے فرائض منصبی ہیں یہ ان سے واقف ہیں۔ راستے میں چنگی سے چلنے کی کیفیت یہ ہے کہ ایک چھوٹا سا پرندہ اپنے گھونسلے سے اڑتا ہے، سارا دن اس فضا کی پہنائیوں کے اندر سیٹکڑوں ہزاروں میل کا سفر طے کرتا ہے۔ شام ہوتی ہے تو کوئی راستہ نہیں، کوئی جی ٹی روڈ نہیں، کوئی راستے پہ نشانات راہ نہیں، اور نہ ہی کسی سے پوچھتا ہے لیکن سیدھا اپنے گھونسلے میں آ جاتا ہے، کبھی اس کو Miss (فرا موٹ) نہیں کرتا۔ یہ ہیں ہدایتِ خداوندی پہ چلنے والے۔ اس کو صلوٰۃ کہتے ہیں کہ ”جو فریضہ آپ کے سپرد کیا گیا ہے، جو راستہ آپ کو دکھایا گیا ہے، جو نظام تجویز کیا گیا ہے، اس کو اس طرح سے قائم کیا جائے کہ اس نظام کے اندر بسنے والا ہر شخص قوانینِ خداوندی کی از خود اطاعت کرتا ہوا چلا جائے“۔ جیسا ریس کورس میں وہ نمبر دو کا گھوڑا ہوتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ عرب اس گھوڑے کو مصلیٰ کہتے تھے جو ریس کورس میں دوسرے نمبر پہ آئے مگر شرط یہ ہو کہ پہلے اور اس کے درمیان فاصلہ نہ ہو اور یہ پہلے سے آگے بھی نہ بڑھے۔ یہ ہے صراطِ مستقیم جس کے لیے کہا کہ **إِنَّ رَبِّيَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ** (11:56) میرا خدا صراطِ مستقیم پہ جا رہا ہے۔ یہ نمبر اول کا گھوڑا ہے، بلا تمثیل ہے اور مصلیٰ ہے نمبر دو گھوڑا، اس کے پیچھے پیچھے چلنے والا آگے نہیں بڑھے گا لیکن دونوں میں فاصلہ بھی نہیں ہوگا۔ یہ جو نظام قائم کیا جائے گا یہ ایسا ہوگا کہ اس میں ہر فرد صفاتِ خداوندی کا ایسا حامل ہو کہ ان دونوں میں انقطاع بھی نہ ہو اور یہ آگے بھی نہ بڑھ سکے۔ یہ ہے نظامِ صلوٰۃ۔ اس سے حسنِ زندگی میں اضافہ ہوتا ہے۔

اشیائے زکوٰۃ کا طریق اور اس کا مقصد و منتہا

نظامِ صلوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ ایتائے زکوٰۃ ہو یہ اپنے آپ ہی کے لیے نہیں بلکہ کہا ہے کہ ہم نے راستے کے اندر رحمت (سامانِ نشوونما) کے لیے ڈوے ہوٹل کھولے تھے تو ہم تو اُس میں سے ایک لقمہ بھی نہیں چکھتے۔ دوسری جگہ ہے کہ ہم تو صرف تمہیں کھلاتے ہیں، تم نے دیکھا ہے کہ ہم تو کبھی نہیں کھاتے۔ کہا کہ اسی طرح سے اپنی زندگی کو تو تم نے حسین بنایا لیکن اس سے اتنا ہی مقصد نہیں تھا، مقصد ایتائے زکوٰۃ ہے۔ اس کے لیے تمام انسانیت کو سامانِ نشوونما مہیا کرنا تمہارا مقصود ہے۔ یہ ہیں محسنین۔ وہ جو دوسرے انسان ہیں، وہ بھی تو انا، صحت مند، حسین، نشوونما یافتہ ہوں گے تو پھر یہ جو کائنات کا حسن ہے اس میں اضافہ ہوگا۔ آپ اپنے آپ نہایت صحت مند تو انا پہلوان بن جائیے تو وہ بھی ٹھیک ہے لیکن اگر آپ کے ساتھ جو ہمسایہ ہے، وہ تپ دق (TB) کے اندر مبتلا ہے اور مر رہا ہے تو کیا آپ اس معاشرے کو حسین کہیں گے؟ وہ تو پوری عالمگیر انسانیت کے لیے ایک نظام ہے۔ یہ ایتائے زکوٰۃ اور اقامتِ صلوٰۃ سارے قرآن میں اکٹھے آتے ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ ہے ”خدا کے قوانین کے پیچھے اس طرح اتباع کرتے چلے جانا کہ یہ عمل مسلسل و متواتر ہو، لیکن یہ تو ایک فرد ہو گیا۔ مقصود حیاتِ اتنا ہی نہیں ہے کہ یہ اس طرح سے چلتا ہے بلکہ اگلی چیز اس عمل کے لیے لازم و ملزوم ہے کہ ایتائے زکوٰۃ ہو یعنی ”باقی انسانوں کی نشوونما کا بھی سامان کرو“ اور جب یہ دو چیزیں آجائیں گی تو پھر اپنی زندگی میں بھی اور حسن کائنات میں بھی اضافہ ہوگا۔ اب ہم یہاں آگئے جہاں یہ نظام ان مارکس ازم والوں سے، روس والوں سے، ان کے مقابلے میں بالکل مختص ہو گیا۔ آپ کو یاد ہے کہ میں نے آپ کو ہمیشہ یہ بتایا ہے کہ مارکس (1818-83ء) نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ معاشی مشکلات کا حل صرف ایک ہی ہے کہ ”ہر شخص اپنی محنت کے مطابق کام کرے اور اس میں سے اپنی ضروریات کے مطابق لے کر باقی جتنا فاضل ہے یہ انہیں دیدے جن کی کمائی ان کی ضروریات پوری نہیں کر سکتی۔ اس نے کہا ہے کہ یہ ہے میرے نزدیک صحیح نظام یعنی

From each according to his capacity, to each according to his needs.

مارکس جہاں نا کام رہ گیا اس سے آگے

میں نے بتایا تھا کہ خود اُس کی پارٹی کے لوگوں نے اُس سے یہ کہا کہ یہ بڑا بلند اصول ہے جو تم نے دیا ہے اور ہمارے دل میں ٹھک گیا ہے کہ حل یہی ہے اب اسے قائم کرو۔ وہ کہنے لگا کہ یہی تو مشکل ہے۔ وہ آج کے سیاستدانوں کی طرح نہیں تھا کہ دل میں جانتے ہیں کہ یہ چیز ممکن نہیں ہے لیکن پھر بھی بلند آہنگ دعاوی کرتے چلے جاتے ہیں کہ یہ کر کے دکھادیں گے اور ہم وہ کر کے دکھادیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَمَا يَخْتَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ** (2:9) لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن کم بخت اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔

ایک تاؤ دیا جاتا ہے تو ساری منافقت کا طمع اتر جاتا ہے۔ مارکس (1818-83ء) نے یہ اعتراف کیا کہ میں اس کو عملاً قائم نہیں کر سکتا اس لیے کہ یہ بات ہے کہ ایک شخص صبح سے شام تک جان مار کر محنت کرے اور اس میں سے اتنا سا اپنے لیے لے اور باقی سارا دوسروں کو دیدے اور یہ ایک دودن کی بات نہیں بلکہ ساری عمر ایسا کرے؟ سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کیوں کرے؟ اس کا Incentive (جذبہ محرکہ) کیا ہے کہ جو اسی طرح سے کرتا چلا جائے؟ مجھے یہ جذبہ محرکہ نہیں مل رہا اور اس کے بغیر یہ نظام چل نہیں سکتا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ بات تو میری سمجھ میں آئی ہے لیکن وہ جذبہ محرکہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اس پر اس کی پارٹی کے ممبر اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ یہ لوگ کفر میں بھی پختہ تھے یہ کتنی بڑی جرأت تھی جو اس نے کی تھی ورنہ کہہ دیتا کہ ٹھیک ہے جی چلائیں گے اور چلانے کے دس دن بعد کہہ دیتا کہ میں کیا کروں؟ میرے ساتھ اس قسم کے لوگ ہیں اور یہ ساری ذمہ داری ان کے سر عائد کر دیتا مگر اس نے ساری ذمہ داری اپنے اوپر لی کہ میں یہ چیز فکری طور پر تو دے سکا ہوں لیکن مجھے وہ جذبہ محرکہ نہیں مل رہا۔

مارکس کی ناکامی کے بعد سوشل ازم کی شکل میں لینن کی ناکامی

لینن (1870-1924ء) تک نے بھی یہ بات کہدی پھر جب اُسے کہا کہ تم ہی کچھ کرو تو اس نے کہا کہ بات تو وہ ٹھیک کہتا ہے۔ پوچھا گیا کہ پھر یہ کیسے ہوگا۔ کہنے لگا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ انسان کچھ اور ٹھوکریں کھاتا ہو خود کسی اس نتیجے پر پہنچے کہ مجھے یہ کرنا ہے پھر تو وہ یہ کچھ کچھ ہو سکے گا لیکن آج تو انسانوں میں یہ بات میں نہیں دیکھتا اس لیے میں بھی یہ نہیں کر سکتا۔ وہ سوشل ازم کے اوپر آ گئے کہ چلو وہ تو نہیں ہو سکتا البتہ اتنا تو کر لیجیے۔ یہ سوشل ازم ہے جو آج رائج^① ہے یہ مارکس ازم نہیں ہے یہ کمیونزم ہے۔ یہ سوشل ازم ہے جو چل ہی نہیں سکتی تھی اور وہ بھی ناکام رہی ہے، کیونکہ انسان کے لیے اس میں جذبہ محرکہ Incentive نہیں ہے۔

اس سلسلہ کے حل کے لیے قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ جذبہ محرکہ کی لم

عزیزانِ من! Incentive (جذبہ محرکہ) کے بغیر تو آدمی چار پائی سے نہیں اٹھ سکتا، گھر کے کمرے سے باہر نہیں نکلتا، بازار نہیں جاتا، کام نہیں جاتا۔ کچھ حاصل کرنے کے لیے پہلے اپنے اندر ایک چیز پیدا ہوتی ہے۔ یہ جذبہ ہی ہے جو آپ کو اس طرح سے کاروبار میں مصروف رکھتا ہے تو یہ ہے جذبہ کہ انسان اس طرح سے ساری عمر محنت کرتا رہے اور اپنی ضرورت کے مطابق لے کر باقی دوسروں کو دیتا چلا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ انسان وہ کچھ کیوں کرے؟ اس کا جذبہ محرکہ کیا ہے؟ اگر زندگی کو اسی دنیا کی زندگی سمجھ لیا جائے تو پھر تو ہر شخص یہ کہے گا کہ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں دوسرے کی خاطر جان ماروں کیونکہ کل کو اس نے بھی اور میں نے بھی مر جانا ہے۔ جذبہ

① یہ 1917ء میں پہلی دفعہ روس میں رائج ہوا۔

محرکہ یہ ہے جو قرآن نے کہا کہ **وَسَمَّ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ** (31:4) زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے بلکہ زندگی کو اور آگے بڑھنا ہے آگے جانا ہے، ختم نہیں ہو جانا۔ جسم کی موت کے ساتھ انسان کی زندگی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس سے بلند منزلیں طے کرنے کے لیے یہ آگے جاتی ہے اور بلند منزل وہ طے کرتا ہے جو اس دنیا میں دوسروں کی نشوونما کا سامان پہنچاتا ہے۔ جب یہ ایمان حاصل ہو جائے کہ میں جتنا دوسروں کو دوں گا اتنی ہی میری جو اگلی منزل ہے وہ زیادہ بلند ہوتی چلی جائے گی تو اس پر قرآن کہتا ہے کہ اس ایمان کے بھروسے پر انسان یہ کچھ کر سکتا ہے اس کے بغیر نہیں کر سکتا۔ یہ **وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ** (2:4) یونہی نظری (Academic) سی بات نہیں ہے بلکہ یہ وہ (Rationale) ہے وہ لنک (Link) ہے جو مارکس کو نہیں مل رہا تھا جس کی وجہ سے وہ عملی قدم نہیں اٹھا رہا تھا اور نہ ہی وہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے ہاں آخرت پر ایمان ہے ہی نہیں بلکہ وہ زندگی کو اسی دنیا کی زندگی مانتے ہیں۔ اس لیے اس شخص نے اس کا اعتراف کر لیا کہ میں جذبہ محرکہ نہیں دے سکتا۔ اس کے ذہن میں آخرت پر ایمان کا تصور ہی نہیں تھا اور ان میں سے کسی کے ذہن میں بھی نہیں ہے۔ یہ جو کمیونسٹ ہیں یا سیکولر تصور حیات والے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس نظام کو قائم نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ وہ جھکڑ کی طرح چلے گا اور دوسرے دن ختم ہو جائے گا۔

روس کی تباہی و بربادی کے بعد چین میں لال کتاب کا حشر

روس کا جو حشر ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ وہاں کیا ہوا ہے اور کیا ہو رہا ہے! اب China (چین) کے اوپر نگاہیں اٹھ رہی تھیں کہ صاحب! وہ دیکھیے۔ اس میں کم از کم وہ چیز نظر آتی ہے کہ وہ تو صرف ماؤزے تنگ (Meo Ze-dong 1893-1976) کی شخصیت تھی جس کے بل بوتے پہ یہ چل رہا تھا۔ ابھی اس کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ توڑ پھوڑ شروع ہو گئی جب کہ ماؤزے تنگ کی وہ لال کتاب ان کے لیے صحیفہ کائنات تھی۔ آپ نے تصویروں میں دیکھا ہوگا کہ جنگلوں میں کھڑے ہیں راستے میں کوئی مسئلہ پیش آ گیا ہے تو لال کتاب کھول لی ہے ان لوگوں کا اس لال کتاب پہ اتنا ایمان تھا آج اسی کتاب میں ماؤزے تنگ کے یہ سارے نظریے اور اقوال درج ہیں جو انہوں نے جہاں جہاں شہروں میں گاؤں میں جہاں کہیں بھی جگہ تھی نقش کر کے پینٹ کر کے لگا دیئے تھے آج وہ سارے غائب ہوتے جا رہے ہیں اور اس کی بیوی سمیت اس کے ساتھیوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔ اس سے آپ دیکھیے کہ وہ جو قرآن تیسرا کھڑا **وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ** (2:4) کہتا ہے وہ کتنا اہم ہے اور قرآن اسے ہر جگہ کیوں لاتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو میں نے اپنی اس کتاب میں کہا تھا کہ ”جہاں مارکس ناکام رہ گیا (اس سے آگے)“ تو یہ اُس سے آگے ہے۔

① پرویز: نظام ربوبیت، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور، 1989ء جہاں مارکس ناکام رہ گیا (اس سے آگے) ص 318 تا 356۔

ایک جگہ تو قرآن میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جو آخرت پہ ایمان نہیں رکھتا، وہ ایتائے زکوٰۃ کو نہیں پہنچ سکتا۔ میں ”کیوں“ اپنی محنت کا سارا ماحصل دوسرے کو اٹھا کر دیدوں؟ اس ”کیوں“ کا جواب نہیں مل سکتا سوائے ایمان بالآخرت کے۔ تو یہ جو چیز ایمان بالآخرت ہے، یہ اس لیے دی جاتی ہے کہ ایتائے زکوٰۃ کا نظام ممکن ہو۔ یہ ممکن ہی اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ آخرت پر ان کا ایمان ہو۔ یہ وجہ ہے جو قرآن ہمیشہ اس کو لاتا ہے اور یہ کچھ کہنے کے بعد وہاں سورۃ البقرۃ میں بھی یہی کہا تھا اور یہاں بھی یہی کہا کہ **أُولَٰئِكَ عَلَىٰ سَنَدٍ مِّن رَّبِّهِمْ** (31:5)۔ یہ دیکھنا چاہو کہ کون اس راستے پہ چل رہا ہے جس نے ہمیں کہا تھا کہ ہمارا وہ راستہ ہے، اس راستے میں رحمت بھی ملے گی اور اس کی زندگی بھی حسین ہو جائے گی؟ عزیزانِ من! یہ دیکھنے کی بات ہے۔ اس کے لیے کہا ہے کہ **أُولَٰئِكَ** (31:5) یہ ہیں وہ لوگ جن میں یہ چیز ہے۔ اور پھر سنئے! یہ دیکھنے کے لیے اقامتِ صلوٰۃ کا نظام ہے جس میں ہر شخص قوائینِ خداوندی کی پیروی کرتا چلا جائے جیسے ہر پرندہ اسی طرح سے پیروی کیے چلا جاتا ہے جو فریضہ اس کے ذمے سونپ دیا گیا ہے وہ خود اس کو ادا کیے چلا جاتا ہے۔

انسانی اعمال کے سلسلہ میں کھیتی کی مثال کی اہمیت

اس اقامتِ صلوٰۃ سے مقصود ایتائے زکوٰۃ ہے کہ نوعِ انسانی کی نشوونما کے لیے وہ سب کچھ دیئے چلا جاتا ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **أُولَٰئِكَ عَلَىٰ سَنَدٍ مِّن رَّبِّهِمْ** (31:5)۔ یہ ہیں وہ لوگ جو صحیح راستے پہ چلنے والے ہیں اور اگلی بات یہ ہے کہ **وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ** (31:5) یہ وہ لوگ ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔ یہاں پھر کھیتی سے ہی تشبیہ دی ہے۔ قرآن عام طور پہ کھیتی سے تشبیہ دیتا ہے۔ اس لیے کہ جو عمل کا دانہ ہے وہ برومند ہونے کے لیے ایک وقفہ چاہتا ہے، مسلسل حفاظت چاہتا ہے، مسلسل قانون کا اتباع چاہتا ہے اور اس کے بعد جا کر ایک دانہ سات سات سودانے دیتا ہے۔ یہ جو آخر میں دانے دیتا ہے وہ آخرت ہے۔ آخرت کے معنی مستقبل (Futurity) ہیں کہ مستقبل پر یقین رکھے۔ جو کسان اس مستقبل پہ یقین نہیں رکھتا وہ کبھی بیج بوتا ہی نہیں ہے، محنت کرتا ہی نہیں ہے۔ زراعت کی فلاحیت کی قرآن کی یہ ایسی برجستہ مثال ہے کہ انسان عیش عیش کراٹھتا ہے۔ جیسا میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ گھر کا پورا اثاثہ ایک بوری گیہوں کی ہے، فاقے آرہے ہیں، آٹا ہے نہیں۔ وہ اس گیہوں کو جا کر پسواتا نہیں ہے بلکہ جا کر مٹی میں ملا کر آ جاتا ہے۔ چھ مہینے تک صبح اٹھتا ہے، درانتی رسی پہوڑا ہاتھ میں لیتا ہے اور سارا دن جا کر وہاں اس کھیت میں گرمی کے زمانے میں خون پسینہ ایک کرتا ہے، سردیوں کی راتوں میں پانی دیتا ہے اور یہ کچھ کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ کسی قسم کے Return (معاوضہ) کے بغیر کیوں کرتا چلا جاتا ہے؟ اس لیے کہ **وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ** (2:4) اسے اس کے مستقبل کے اوپر ایمان ہے کہ اس نے اتنے دانے دینے ہیں، اس میں اتنی فصل پیدا ہو جانی ہے۔ جس دن اس کا اس کے اوپر ایمان نہیں رہے گا اس کا مستقبل تاریک ہو جائے گا اور یہی انسانی اعمال کی مثال ہے۔ جو

اس کھتی کی حفاظت نہیں کرتے تو لوگ کھڑی فصلیں کاٹ دیتے ہیں۔

انسان کا ہر آنے والا سانس پہلے سانس کی آخرت ہوتا ہے

یہ ٹھیک ہے کہ آخرت کے معنی مرنے کے بعد کی زندگی بھی ہے لیکن اس کے یہی معنی ہی نہیں ہیں بلکہ انسان کا ہر آنے والا جو سانس ہے وہ پہلے سانس کی آخرت ہے، ہر نیا دن پچھلے دن کی آخرت ہے۔ یہ وہی ہے جسے مستقبل یا Future کہتے ہیں، ہر نئی نسل جو ہے وہ مستقبل ہے، قوم کے بعد اگلی آنے والی قوم اس کی مستقبل ہے اور اسی طرح سے اس زندگی کے بعد آنے والی زندگی اس کا مستقبل ہے۔ یہاں بھی وہی قوم مصلح ہو سکتی ہے جو اپنا ہی خیال نہ کرے بلکہ آنے والی نسلوں کا بھی خیال کرے آنے والی قوم کا بھی خیال کرے۔ کہا ہے کہ **أُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ** (31:5)۔ ایک تو یہ ہیں اور ان کے مقابل میں دوسرے

لوگ وہ ہیں جن کے لیے کہا ہے کہ **وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ بِضَيْفٍ عِلْمٍ يَتَّخِذُهَا هُزُولًا** (31:6)۔ قرآن انسانی زندگی کو اتنی قیمتی متاع بتاتا ہے کہ اس نے کہا کہ جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق تلف کر دیا تو یوں سمجھو کہ گویا اس نے پوری انسانیت کو تباہ کر دیا۔ یہاں کہا ہے کہ جو اتنی قیمتی زندگی ہے یہ اسے بچھ دیتے ہیں اور اس کے بدلے ”لھو“ خریدتے ہیں۔ ہمارے ہاں لھو و لعب تو عام استعمال ہوتا ہے۔ انہوں نے ”لھو“ کے معنی گانا بجانا کر دیا کہ بس وہ اس گانے بجانے کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اب یہ گانے بجانے والے تو کچھ تھوڑی سی ہی Percentage (فی صد) ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ ”اور وہ لھو ہیں جو تاش کھیتے ہیں۔“ عزیزان من! عرب ہر اس بات کو جو کسی بلند مقصد کی طرف سے توجہ کو ہٹا کر کسی کمتر درجے کی طرف کر دے، تو وہ اسے لھو کہتے تھے۔ بلند ترین درجہ تو یہ تھا کہ زندگی کو حسین بنائے، خود بھی خوشحال رہے اور دوسروں کے لیے بھی یہ کچھ کیجیے، تخلیق کائنات کے اندر اضافے کرتے چلے جائیے۔ اس طرح سے آخرت بھی حسین ہوتی چلی جائے گی۔ یہ کتنا بڑا بلند مقصد ہے! اس مقصد کے مقابلے میں آپ اپنی زندگی یا صرف اپنی طبعی زندگی کے مطابق خواہ قوم ہو یا فرد ہو، جو کچھ بھی وہ کریں گے، وہ بلند مقصد کی طرف سے توجہ ہٹا کر، پست مقصد کی طرف لے آئی والی چیز ہوگی۔ یہ ہے لھو۔ اب ان کو کون بتائے اور کون سمجھائے کہ یہ ”لھو“ نہ گانا بجانا ہے اور نہ تاش کھیلنا۔ یہ تو کبھی بلند مقصد کی طرف سے توجہ ہٹا کر کسی کمتر درجے کی طرف لے جانے والی چیز ہے۔

① یہی لوگ ہیں جو خدا کے بتائے ہوئے صحیح راستے پر چلتے ہیں اور یہی ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں (2:5)۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص 945)۔

② جو زندگی کا بلند مقصد اپنے سامنے نہیں رکھتے، اور طبعی زندگی کی عارضی لذتوں اور بے معنی مسرتوں ہی کو مقصود و حیات سمجھ لیتے ہیں، وہ اس طرح خود بھی گمراہ ہوتے ہیں، اور دوسروں کو بھی بلا علم و دانش، صحیح راستے سے بہکاتے ہیں۔ یہ زندگی کے بلند مقاصد اور ان کی طرف لے جانے والے صحیح راستے کو مذاق سمجھتے ہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص 946)۔

قرآن حکیم کے بنیادی تصورات کو سمجھے بغیر اس کتاب عظیم کا پروگرام سمجھ میں نہیں آ سکتا

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ جب تک یہ جو دین کے Basic Concepts (بنیادی تصورات) ہیں ان کی تعمیر نو نہیں کی جائے گی نہ قرآن کے مقاصد سمجھ آئیں گے نہ پروگرام سمجھ آئے گا نہ اس کا مفہوم سمجھ آ سکتا ہے۔ میں یہ کہوں تو یہ پیچھے پڑ جائیں گے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ **يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْغَفْوَةُ (2:219)** یہ پوچھتے ہیں کہ اتنی محنت کرنے کے بعد ہم اس میں سے کتنا خود لیں اور کتنا دوسروں کو دیدیں۔ کہا کہ اوبابا! یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تمہاری اپنی نشوونما کے لیے جتنے کی ضرورت ہے اتنا لو اور اس سے زائد جو چھتا ہے وہ دوسروں کی نشوونما کے لیے دیدو۔ وہ تو سارے کا سارا دینا تھا۔ یہ ہے ایتائے زکوٰۃ کا بلند مقصد جو یہ نہیں کرتے ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ **لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ (31:6)**۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہزار برس سے یہ امت دوسرے راستوں پہ پڑی ہوئی ہے۔ وہ **هَلَّا وَرَحْمَةً (31:3)** اس راستے کو بتاتا تھا جس میں ایتائے زکوٰۃ تھا۔ مگر یہ ان کو **الْحَدِيثُ (31:6)** کی طرف لانے کے بعد دوسرے ہی راستے پر ڈال دیتے ہیں۔ گاڑی دوسری پٹری پہ پڑ گئی۔ اور اس کے بعد ہے کہ جب ان سے اصل بات کہی جائے **هَلَّا وَرَحْمَةً (31:6)** کرتے ہیں مذاق اڑاتے ہیں استہزا کرتے ہیں۔ استہزا کے اندر ایک نفرت کا پہلو ہوتا ہے ذلت کا پہلو ہوتا ہے۔ اب ہمارے ہاں تو مشکل یہ ہے کہ اس کے ترچے مزاح اور استہزا کیے جاتے ہیں جب کہ مزاح تو بڑی چیز ہے۔ اس کے لیے انگریزی میں Humour کا لفظ ہے۔ اس میں دوسروں پہ پھبتیاں کسنا، طعن کرنا، تشنیع کرنا نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جو بلند مقصد کے متعلق کچھ بات کرنے والے ہیں یہ ان سے استہزا کرتے ہیں ان کا مذاق اڑاتے ہیں ان پہ طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ اس طرح سے یہ دوسروں کی ذلت کرتے ہیں مگر انہیں پتہ نہیں ہے کہ **أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ (31:6)** اس روٹ کے نتیجے میں جو ہونے والا ہے وہ ذلت آمیز تباہی ہے۔ یہ بلند مقصد کی طرف بلانے والوں کے ساتھ استہزا کرتے تھے۔ استہزا کی نسبت سے اس تباہی کو ذلت آمیز قرار دیا ہے۔ کہا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے پھر یہ کہ وہ اپنی مفاد پرستیوں کے نشے میں اتنے سرمست ہوتے ہیں کہ **وَإِذَا تَلَّيَا عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَلَّى مُكْتَبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا كَأَن تَفْهِيمٌ (31:7)** جب ان کے سامنے قوانین خداوندی پیش کیے جاتے ہیں تو نہایت نخوت اور تکبر سے یوں منہ موڑ جاتے ہیں گویا کہ ان کے کانوں میں ڈاٹ لگ رہے ہیں جن کی وجہ سے انہوں نے سنا ہی نہیں کہ انہیں کیا کہا گیا ہے۔

① یہ لوگ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی بلا علم و دانش صحیح راستے سے بہکاتے ہیں (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔ 946)۔

نفسیاتی طور پر سب سے زیادہ نخوت اور تکبر میں گرفتار علما کی اکثریت ہوتی ہے

ٹھیک ہے کہ نخوت اور تکبر دولت کے نشے میں ہوتا ہے لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ سب سے بڑا جو تکبر اور نخوت ہے وہ ان میں ہوتا ہے جنہیں علما کہتے ہیں۔ ان کے ہاں کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے گروہ کے سوا باقی سب کو فاسق، گنہگار، جہنم کے کُندے کہتے ہیں۔ چلے جا رہے ہیں اپنے اس انداز کے اندر اور جو نبی کسی کی پتلون پہ نظر پڑی کہ وہ ٹخنوں سے نیچے ہے تو ماتھے پہ جگر کے نقشے بننے لگ جاتے ہیں آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں منہ سے جھاگ نکل رہی ہے دنیا بھر کی گالیاں طر و طعن و تشنیع ان کے خلاف کیے جا رہے ہیں۔ اس استکبار کے ساتھ یہ چلتے ہیں کہ جیسے جیب کے اندر انہوں نے جنت کی ٹکٹیں رکھی ہوئی ہیں اور وہ بانٹنے کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ اتنا تکبر اور اتنی نخوت ہوتی ہے۔ کہا کہ **وَلَّی مُسْتَكْبِرًا (31:7)**۔ یہ ہیں جو سب سے پہلے منہ موڑ کر جاتے ہیں۔ یہ گنہگار بیچارہ تو پھر بھی کبھی سن ہی لیتا ہے اس کے دل میں کبھی خیال پیدا ہو ہی جاتا ہے کہ خدا کی بات ہے مگر یہ ہیں کہ **وَلَّی مُسْتَكْبِرًا كَان لَّمْ يَسْمَعْهَا كَان فِي سَنَاءٍ وَقُرًّا (31:7)** ایسے جیسے ان سنی کی جاتی ہے ایسے جیسے کانوں میں ڈاٹ لگے ہوئے ہیں اس لیے کہا کہ **فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (31:7)** ان کو مطلع کر دو کہ ان کی یہ روش انہیں بڑے الم انگیز عذاب میں مبتلا کر دے گی۔ یہاں استکبار تھا، بڑا پین تھا اور اس نشے میں بدمست ہونا تھا۔ اب یہاں ان کی اس تباہی کو الم انگیز تباہی کہا ہے دردناک تباہی کہا ہے۔ یہ تباہی ذلت آمیز ہوتی ہے الم انگیز ہوتی ہے دردناک ہوتی ہے کیونکہ یہ ان کے مکافاتِ عمل کے نتیجے میں آتی ہے۔ وہ خدا جو رؤف و رحیم بھی واقع ہوا ہے ان انسانوں کے متعلق جو اپنے ہاتھوں سے تباہی اپنے اوپر لیتے ہیں کہتا ہے کہ **يَحْسِرُونَ عَلَىٰ أَلْبَابِهِ (36:30)** او میرے بندے! تجھے کیا ہو گیا ہے تو نے کیا کر دیا ہے!! لیکن جب تو میں اس مقام پہ اس منزل پہ پہنچ جاتی ہیں کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ذلت آمیز تباہیاں مول لیتی ہیں تو ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ جب یہ تباہی یوں ہوتی ہیں تو ان کی اس تباہی پہ نہ زمین روتی ہے نہ آسمان آنسو بہاتا ہے۔

اب ایک طرف ان لوگوں کا گروہ ہے اور اس کے مقابلے میں وہی اقامتِ صلوٰۃ اور اتائے زکوٰۃ والے **الْمُقْسِيُونَ (31:5)** ہیں۔ کہا کہ **إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (31:8)**۔ ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جو آخرت کا یہ ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ہاں وہ متعین پروگرام قائم کرتے ہیں جو بتایا گیا ہے یعنی اقامتِ صلوٰۃ اور اتائے زکوٰۃ کرتے ہیں تو قرآن نے اسے **عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (31:8)** کہا ہے یہ بڑی چیز ہے۔

انسانی ذات کی نشوونما انسان کی اپنی صلاحیتوں کی رہن منت ہوتی ہے

انسان کو خدا نے بڑی صلاحیتیں دی ہیں۔ وہ Potential Form (مضمر حالت) کے اندر ہیں غیر نشوونما حالت

(Undeveloped Form) میں ہیں۔ یہ قرآن وہ پروگرام دیتا ہے جو کہیں باہر سے لا کر اس انسان کو کچھ اور نہیں بناتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ اس کے اندر کی صلاحیتیں Develop (بارزر) ہوتی چلی جاتی ہیں اور اس کا حسن نکھرتا چلا جاتا ہے۔ صحت تو اسی کا نام ہوتا ہے کہ اندر سے صحیح صالح خون پیدا ہو باہر سرخی لگا لینے سے تو انسان کی صحت نہیں ہوتی۔ صحت اندر کی کیفیت کا نام ہوتا ہے۔ اس کو وہ **عِلْمٌ وَ الصَّالِحَاتُ** کہتا ہے۔ یہ وہ پروگرام ہے جو اس کی اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دے دیتا ہے Develop (بارزر) کر دیتا ہے تو اس کی صحت برومند ہو جاتی ہے۔ وہ جو پروگرام Adopt (اختیار) کرتا ہے تو اس کے ماحصل کو قرآن نے **لَعَلَّكُمْ جَنَّاتُ النَّعِيمِ - ظِلِّينَ فِيهَا** (31:8-9) کہا ہے۔ یعنی اس کے لیے پُر آسائش زندگی ہوگی یہاں بھی اور اس کے بعد بھی۔ ہمارے ہاں تو جو نہی جنت کا لفظ آیا فوراً آخرت کی طرف نگاہ گئی حالانکہ یہاں کی ذلت اور خواری کی زندگی کو بھوک کی زندگی کو خدا کا عذاب کہا ہے خوف اور بھوک کو خدا کا عذاب کہا ہے ذلت اور مسکنت کو خدا کا غضب کہا ہے۔ ان کی یہاں کی ساری زندگی اس قسم کی ہوتی ہے اور جب ان سے کہیے کہ صاحب! اعمالِ صالحہ یہ نتیجہ کیوں نہیں پیدا کرتے تو کہتے ہیں کہ کریں گے لیکن وہاں آخرت میں جا کر پیدا کریں گے۔ قرآن تو یہاں کی بات کرتا ہے وہ تو پہلی دعا جو سکھاتا ہے وہ یہ ہے کہ **رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنًا ۖ وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنًا ۖ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ** (2:20) اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل ہوں اور اُس سے آگے **فِي الدُّنْيَا حَسَنًا ۖ وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنًا ۖ** (2:20) کہتا ہے کہ اُخروی زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل ہوں وہ تو پہلے اس دنیا کے اندر حسنات کہتا ہے دنیا کی یہ زندگی حسین بناتا ہے اور یہ حسن مسلسل ہے جو آگے جاتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ یہاں تپ دق کا مارا ہوا مرتا ہے وہاں پہلوان بن جاتا ہے۔ جس پودے کی جڑیں کمزور ہیں وہ پھل بھی نہیں دے سکتا۔ یہ یہاں کی زندگی کے متعلق خوشگوار یوں کا ذکر ہے۔ اس لیے وہ قرآن میں جنت کا لفظ لاتا ہے۔

اونٹ کا معدہ چاک کر کے پانی پینے والی قوم کو جنت کی خوشخبری

عزیزانِ من! عربی زبان میں آپ دیکھیے ان عربوں کے ہاں صحرا کی زندگی تھی، کوسوں تک کوئی درخت ہی نظر نہیں آتا تھا، جھاڑیاں ہوتی تھیں، کہیں درخت نظر آتا تھا تو وہ کھجور کا درخت تھا اتنے سے حصے میں اُس کا سایہ ہوتا ہے۔ جنت کا لفظ اس نے اس لیے کہا ہے کہ وہ اس قسم کے گھنے سائے والے باغات اور درخت ہوں جن کے نیچے چیزیں ان کے سائے سے چھپ جاتی ہیں۔ ان عربوں کو اس ریگستان کی زندگی بسر کرنے والوں کو یہ خوشخبری دی جائے کہ اس قسم کے باغات ہوں گے۔ وہ پینل یا بڑ کے درخت کے باغ نہیں بلکہ وہ نہایت عمدہ پھل کے باغات ہوں۔ ایسے باغات یا تو وہ شام میں دیکھتے تھے یا طائف کی وادی میں یہ چیزیں ہوتی تھیں یعنی یہ تھے اعلیٰ درجے کے انار، بہترین قسم کی کھجوریں، انگور کے لٹکے ہوئے خوشے۔ ان کے ہاں صحرا میں پانی نہیں تھا، وہ اس پانی کو ترستے تھے، صحرا میں

پانی ختم ہو جاتا تھا تو اونٹ کا معدہ چاک کر کے اس کے اندر سے پانی نکال کر پی جاتے تھے۔ پانی کی یہ کیفیت تھی۔ یہاں یہ کہا گیا کہ ایسے باغات ہوں گے جن میں پانی یہی نہیں کہ تالاب بھرا ہوا ہوگا بلکہ رواں دواں ہوگا یعنی ان کے تخیل کے مطابق اس سے زیادہ کوئی چیز دلکش خوشگوار زندگی کو حسین بنانے والی، بہترین آسائش دینے والی ہو ہی نہیں سکتی۔

سنیے! عزیزانِ من! حضرت بل کے مزار کے کنارے جمعہ کا اجتماع تھا اور واعظ وعظ کر رہا تھا۔ سردی کا زمانہ تھا، برقیں پڑی ہوئی تھیں، کشمیر کا علاقہ تھا تو وہاں جنت کا بیان ہو رہا تھا۔ میں نے کہا کہ اگر اس نے یہ کہا کہ اتنے گھنے سائے ہوں گے، اس کے اندر پانی کڑکڑاتا جاڑا ہوگا، تو لوگوں کے دانتوں نے بجانا شروع کر دینا تھا مگر اس واعظ نے کہا کہ جنت میں اتنے اتنے بڑے لحاف ہوں گے، کونکہ ہوگا، وہ کونکہ خود جلے گا، جلتا رہے گا۔ میں نے کہا کہ ان کی جنت یہی ہو سکتی ہے۔ اگر وہ ان سے کہتے کہ وہاں گھنے سائے ہوں گے اور پانی ہوگا ”تے او کہندے سانوں ذرا تھوڑی جہنم وی دکھا میاں!“^① یہ یاد رکھیے کہ قرآن کا یہ انداز تھا۔ ان کے لیے یہ کچھ تھا۔ جب حضرت عمرؓ کے زمانے (634-644/45AD) میں فتوحات حاصل ہوئی ہیں تو آپ دیکھے گا کہ ایران سے فتح کے بعد جو گورنر سعد بن ابی وقاص ♦ کا خط آیا ہے تو اس میں انہوں نے جو وہاں کا نقشہ کھینچا ہے کہ وہاں ہمیں کیا کیا ملا تو وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا تھا بلکہ وہ قرآن کی آیات لکھتے چلے جاتے ہیں۔ لکھا ہے کہ وہاں قالین ہوں گے، فرش ہوں گے، چاندی سونے کے برتن ہوں گے تو آپ جانتے ہیں کہ وہ ایرانیوں کے ہزاروں سال کے اکٹھے کیے ہوئے نوادرات تھے اور کیا کچھ تھا! وہ یہ کچھ لکھ کر کہتے ہیں کہ ہمیں یہ بھی ملا، ہمیں یہ بھی ملا۔ یہ جنت النعیم تھیں جن کے وعدے کیے جا رہے تھے کہ یہ جنت النعیم تمہیں ملیں گی، تم ان میں رہو گے۔ یہ معنی کیسے ہوئے؟ عزیزانِ من! قرآن تو دُور جانے ہی نہیں دیتا، وہیں بات سمجھا دیتا ہے۔ کہا کہ **لَإِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتُ النَّعِيمِ - خَالِدِينَ فِيهَا (9:31)** جو لوگ ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور انسانی معاملات کو سنوارنے والے کام کرتے ہیں ان کے لیے پُر آسائش زندگی ہوگی، یہاں بھی اور اس کے بعد بھی۔ یہ کچھ کہا اور اس کے بعد کہا کہ **وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا (9:31)** اللہ کے وعدے سچے ہیں۔

صداقت اور حق کے الفاظ کے فرق کو واضح کرنے کے لیے چالیس ہزار شہروں اور قلعوں کا ثبوت آئیے عربوں سے پوچھیں کہ ان کے نزدیک ”حق“ اور ”صداقت“ کے کیا معنی ہیں۔ جب تک وہ نظریے کی حیثیت سے ہے تو وہ ”صداقت“ ہے، ان کے ہاں ”حق“ کے معنی یہ ہیں کہ کسی نظریے کا ٹھوس اور محفوظ شکل میں ثابت ہو کر سامنے آ جانا۔ وہ اگر محسوس شکل میں سامنے Establish (قائم) نہیں ہوتا تو اس وقت تک وہ اُس کو حقیقت یا حق نہیں کہتے بلکہ صداقت کہتے ہیں کہ

① تو وہ کہتے کہ میاں! ہمیں تھوڑی سی جہنم بھی دکھا دو۔

ٹھیک ہے ہمارا ایمان ہے بات سچی ہے۔ حق کے اندر دو چیزیں ضروری ہیں ایک یہ کہ وہ شے محسوس شکل میں ہو اور دوسرا یہ کہ وہ Establish (قائم) ہو جائے۔ اس لیے ایک نظریہ جب محسوس شکل میں Establish (قائم) ہو کر سامنے آئے تو وہ اس کو حق یا حقیقت کہتے تھے۔ یہاں کہا یہ ہے کہ وَعَدَ اللّٰہُ حَقًّا (31:9) ہم جو وعدہ کر رہے ہیں یہ محسوس شکل میں Establish (قائم) ہو کر تمہارے سامنے آ جائے گا۔ ان کے ہاں حقیقت کہتے ہی اس چیز کو تھے۔ یعنی ویسے تو ہمارے ہاں حقیقت Real کو یا Reality کو کہتے ہیں اور اس سے Realise کا لفظ ہے۔ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ Realise کے معنی کیا ہیں؟ Realise کے معنی ہوتے ہیں: To Make Real۔ یہ ہیں حق کے معنی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ یہ رسول اللہ کے ذرا بعد غالباً حضرت ابو بکرؓ کا ہی زمانہ (34-632ء) تھا کہ ان کے ہاں کسی سپاہی سے ایک غیر مسلم نے پوچھا کہ دنیا میں ہر کلمہ کی ایک حقیقت ہوتی ہے تمہارے کلمہ کی حقیقت کیا ہے؟ اس نے جواب دیا تھا کہ یہ چالیس ہزار شہر اور قلعے جو ہم نے فتح کیے ہیں ہمارے کلمہ کی یہ حقیقت تمہیں نظر نہیں آتی۔ اسے کہتے ہیں حق اسے عرب حقیقت کہتے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ وَعَدَ اللّٰہُ حَقًّا (31:9) چند ہی آیات پہلے سورۃ الروم میں اس نے کہا تھا کہ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (30:47) یہ وہی چیز ہے کہ ”مومنوں کو یہ خدا کا وعدہ ہے جو ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ جائے گا۔ عطا کر دینا یہ ہمارے اوپر حق ہے“۔ جب حق کے بنیادی معنی آپ یہ لیں گے کہ وہ Establish (قائم) شکل میں محسوس طور پر سامنے آ جائے تو اس نے وہ ٹھیک کہا تھا کہ یہ چالیس ہزار شہر اور قلعے جو ہم نے فتح کیے ہیں یہ ہمارے کلمہ کی حقیقت ہے۔ ان کے ہاں تو حق کے معنی یہ ہوتے تھے۔

خدا العزیز ہے اور اس کا وعدہ نظری ذہنی یا لفظی نہیں بلکہ الحق ہوتا ہے

کہا ہے کہ وَعَدَ اللّٰہُ حَقًّا (31:9) یہ وعدہ محض نظری نہیں ہے ذہنی نہیں ہے لفظی نہیں ہے۔ اس کے اوپر تو تم ایمان لے آؤ گے کہ اللہ کے وعدے سچے ہوتے ہیں۔ وعدے سچے نہیں بلکہ وعدہ حق ہے کہ یہ محسوس شکل میں Establish (قائم) ہو جائے گا کہ یہ جو ہم کہہ رہے ہیں کہ لَعَنَ جَنَّتِ النَّارِ (31:31) یہ محسوس شکل میں ہمارے سامنے آئے گا تو حق بنے گا ورنہ ویسے تو ایمان ہے کہ اللہ کے وعدے سچے ہیں لیکن اس کو وہ وعدہ حق اس شکل میں کہا جائے گا جب وہ تمہارے سامنے محسوس شکل میں آئے گا۔ کہا کہ کس طرح سے یہ بات ہے؟ جواب دیا کہ اس طرح سے کہ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (31:31)۔ ہمارے ہاں تو یہ لفظ عزیز ہی پھر اور معنوں میں استعمال ہونے لگ جاتا ہے یعنی ہماری ان سے عزیز داری ہے۔ آگے بڑھیں تو کہتے ہیں کہ وہ بڑا عزیز، معزز ہے اس کی بڑی عزت ہے۔ یہاں کہا ہے کہ وَهُوَ الْعَزِيزُ (31:9)۔ جب خدا کے لیے عزیز کا لفظ آئے تو اس سے عزیز داری تو ہے نہیں۔ عربی زبان میں

عزت کے معنی غلبہ کے ہیں۔ یہاں کہا کہ **وَهُوَ الْعَزِيزُ** (31:9)۔ وہ صاحب غلبہ ہے، قوت اور اقتدار رکھتا ہے یعنی اپنے وعدے کو ایک محسوس حقیقت بنانے کا اقتدار رکھتا ہے۔ وہی وعدے کو حقیقت بنا سکے گا جس میں اس کی قدرت ہو۔ یہ ہماری قدرت ہے لیکن اس قدرت کے متعلق یہ نہ سمجھو کہ ہم یہ ساری چیزیں ڈنڈے کے زور پر کریں گے۔ سنو! ہم استبداد نہیں کریں گے، دوسروں کی جنتیں چھین کر تمہیں اس طرح سے نہیں دیں گے۔ ہم عزیز ہیں، ہمارا اقتدار ہے لیکن یہ **الْحَكِيمُ** (31:9) ہے۔ یہ حکمت کے ساتھ ہے، یہ Rationally (شعور و استدلال پر) ہے۔

زندہ قوموں کی پہچان

عزیزانِ من! دنیا میں امن اور خوشحالی اسی قوم کو نصیب ہو سکتی ہے جس کو اقتدار حاصل ہو، وہ عزیز بھی ہو اور حکیم بھی ہو۔ خدا کی یہ دونوں صفیات اکٹھی آتی ہیں:

قوتِ بے رائے جہل است و جنون

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں

اگر محض حکمت ہی حکمت ہے اور اس کے ساتھ غلبہ وغیرہ نہیں ہے تو کہا کہ یہ افسانے ہیں اور اگر قوت ہی قوت ہے اور اس کے ساتھ حکمت نہیں ہے تو یہ جنون ہے۔

کائنات کے اس وسیع و عریض محیر العقول سلسلہ کی پہچان

کہا ہے کہ **وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ** (31:9) آؤ تمہیں بتائیں کہ وہ کس قسم کا عزیز و حکیم ہے؟ سنو! **خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَلٍ تَرَوْنَهَا** (31:10) اس فضا کے اندر عظیم الجثہ کڑے ہیں، تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ کڑے کتنے بڑے عظیم ہیں۔ یہ دُور بیٹھے ہوئے ہمیں تو سورج اتنا سا ہی نظر آتا ہے۔ یہ سورج آپ کی زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے اور یہ ان سب عظیم الجثہ کڑوں میں سے چھوٹا ہے۔ بڑے تو یہ کہکشاں کے ذرے ہیں جو ریت کی طرح نظر آتے ہیں۔ کہا کہ اتنے عظیم القدر کڑے فضا میں تمہیں کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہ **بِغَيْرِ عَمَلٍ** (31:10) ہیں۔ ان کے نیچے کوئی ستون نہیں ہوتا لیکن وہ تو علیم و حکیم بات کر رہا ہے جب Scientific Discoveries (سائنسی حقائق بے نقاب) ہوں گی تو اس وقت تو کہیں گے کہ صاحب! یہ بات تو نہیں ہے کہ ان کے نیچے کوئی ستون نہیں یعنی **بِغَيْرِ عَمَلٍ تَرَوْنَهَا** (31:10)۔ اس قسم کے ستون نہیں ہیں جنہیں تم آنکھوں سے دیکھ سکو بلکہ وہ کششِ ثقل ہے۔ اب سائنسدان بتا رہا ہے کہ یہ کن ستونوں کے سہارے سارے کے سارے کھڑے ہیں۔ ستونوں کا انکشاف ہو رہا ہے لیکن وہ آنکھ سے نہیں

دیکھے جارہے۔ یہ بِغْيَرٍ عَلَيَّ تَرَوْنَهَا (31:10) ہے۔

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے۔ کہا ہے کہ وَاللّٰی فِی الْاَرْضِ رَوَّاسٍ (31:10) اس زمین کو دیکھیے۔ اس میں تو تمہیں یہ ہمالیہ جیسے پہاڑ اور قراقرم جیسے پہاڑ نظر آتے ہیں۔ کیا کبھی ذہن میں آ سکتا ہے کہ اتنے اتنے پہاڑوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے یہ کڑھ ارض فضا میں کہیں کھڑا رہ سکتا ہے؟ کہا کہ کھڑا ہی نہیں ہے بلکہ یہ اَنْ تَعِیْتُ بَکَ (31:10) تیزی سے گھوم رہا ہے۔ عزیزانِ من! یہ دنیا کا سائنسدان بوکائے ❶ (1911-1989ء) ہے جو اس کے سامنے جھکا ہے کہ چودہ سو سال پہلے یہ بات قرآن نے کہی۔ اس نے تو یہ بات سمجھ لی کہ عربوں کے ہاں جا کر میری ”لغات القرآن“ کی طرح اس نے اس کے معنی خود متعین کیے تو بات سمجھ میں آ گئی۔ ہمارے ہاں تو یہی تھا کہ زمین ہمیں کھانے پینے کا سامان دیتی ہے۔ عربوں سے پوچھو کہ یہ کیا چیز ہے؟ ہر چیز جو مسلسل حرکت میں رہنے والی ہو تو اس کے لیے یہ لفظ ”تمید“ آتا ہے۔ وہ ”تمید“ چکی کے اوپر کے پاٹ کو کہتے تھے۔ کہتا ہے کہ تمید حرکت کر رہی ہے، بکم یعنی تمہیں اپنے اوپر لیے اس طرح تیزی سے چل رہی ہے کہ ”تسی ڈگدے دی نہیں ہینگے“ ❷ اور بِغْيَرٍ عَلَيَّ کھڑی ہے، اتنے اتنے بڑے پہاڑ ہیں، ایک جگہ ساکن نہیں ہے بلکہ تمہیں ساتھ لیے ہوئے تیزی سے گھوم رہی ہے۔ ہمارا غلبہ اور حکمت ساتھ دیکھی ہے۔ پھر فوراً ہی کہا کہ وَبَثَّ فِیْہَا مِنْ کُلِّ دَآبَّةٍ (31:10) تم ہی نہیں، پتہ نہیں کتنے جاندار ہیں، جو اس زمین کے اوپر اس طرح سے چلے جارہے ہیں، ان میں سے کوئی بھی نہ گرتا ہے نہ کوئی لغزش کرتا ہے۔

یہاں تو صرف ارض کا ذکر ہے کہ یہاں متنفس ہیں، جاندار ہیں جن کو ذی حیات کہتے ہیں۔ ان ذی حیات میں یہ سب آ جاتے ہیں۔ یہ بات پہلے بھی آچکی ہے لیکن (42:29) میں سب کے متعلق یہ چیز آئی ہے۔ عزیزانِ من! یہ وہ آیات ہیں جن پر آج یورپ کے علم افلاک کے سائنسدان مجو حیرت ہیں۔ میں فرانس کے سائنسدان ❶ کا ذکر کرتا ہوں کہ وہ ان آیات کی بنا پر عیش عیش کراٹھا اور قرآن کی صداقت پر پکاراٹھا ”اللہ اکبر“ کہ چودہ سو سال پہلے علم افلاک والے کے ذہن میں یہ تصور نہیں آ سکتا تھا جو قرآن کہہ گیا ہے۔ عرب کی سرزمین میں جہاں علم کا نشان نہیں تھا، ایک ان پڑھ شخص وہاں بیٹھا ہوا یہ بات کہہ رہا ہے۔ کہا کہ وَوَجَدَ اٰیٰتِہٖ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (42:29) یہ فضائی کڑے ساری پہنائیوں میں Universe (کائنات) کے اندر پھیلے ہوئے ہیں اور یہ ارض ساری کی ساری اس کی تخلیق ہے اور یہ اسی طرح سے ویرانے نہیں ہیں بلکہ وَبَثَّ فِیْہَا مِنْ کُلِّ دَآبَّةٍ (42:29)۔ یہ زمین اور ان کڑوں میں سے بھی ایسے

❶ اس کی کتاب کا حوالہ یہ ہے:

Bucaille Maurice: The Bible, The Qur`an And Scienc, Islamic Book Service, 1998.

❷ کہ آپ گرتے بھی نہیں ہیں۔

ہیں جن کے اندر ذی حیات مخلوق بستی ہے۔ مخلوق کے معنی ہمارے جیسے ہی بندے نہیں بلکہ پتہ نہیں کہ وہ کس قسم کی مخلوق ہے۔ اس نے تو جامع لفظ ”ذی حیات“ دیا ہے اس نے انسان نہیں کہا، حیوان نہیں کہا، بلکہ یہ کہا کہ ان میں ذی حیات بستے ہیں۔ یعنی جن کڑوں کے متعلق اس سے پیشتر ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ ہے کیا؟ آج یہ سائنسدان اس نشان پہ چلے ہوئے ہیں کہ جس کڑے میں ان کو کہیں نمی مل گئی تو سمجھ لیجئے کہ وہاں ذی حیات ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے کہا تھا کہ **وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ** (21:30) یاد رکھو! جہاں کہیں پانی ہوگا، وہاں زندگی ہوگی۔ مرغ کے پیچھے اسی لیے پڑے ہوئے ہیں کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ وہاں نمی کے آثار نظر آتے ہیں، ہم نے دیکھا ہے کہ وہاں کیسے ذی حیات ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ** (42:2)۔ اور وہ ذی حیات جو اس نے ان میں (زمین اور آسمانی کڑوں میں) پھیلا رکھی ہیں۔ وہاں صرف ارض تھا اور یہاں ”فیہما“ ہے یعنی ان سب کے اندر۔ آگے کہا ہے کہ **وَبَوَّعْنَا عَلَى جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ فَنَزَّلْنَا** (42:29) اس کے قانون میں یہ بھی بات ہے کہ یہ آبادیاں آپس میں کبھی مل بھی جائیں گی۔ اللہ اکبر! یہاں کہا کہ **وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ** (31:10) اور اس نے سطح زمین پر انواع و اقسام کے ذی حیات پھیلا رکھتے ہیں اور آگے کہا ہے کہ وہ **وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً** (31:10) بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور یہ کہ زندگی پانی سے ہے۔ یہاں کا پانی تو سمندر کا ہے جو اچھے بھلے جاندار کو مار دیتا ہے۔ میں نے پچھلی دفعہ یہ عرض کیا تھا کہ اُس کا جو واٹر سپلائی سسٹم ہے وہ یہ ہے کہ یہاں سمندر سے کھاری پانی کو کشید کر کے اس کے بعد پھر بارش کی شکل میں وہ اسی زمین کے اوپر واپس لے آتا ہے۔ آگے کہا کہ **فَأَنبَتْنَا فِيهِنَّ كُلَّ رَوْحٍ كَرِيمٍ** (31:10)۔ پھر اس پانی اور اس زمین کے امتزاج سے یہاں وہ کس قدر انواع و اقسام کی اعلیٰ درجہ کی چیزیں اُگاتا چلا جاتا ہے اور پھر اُس کے ساتھ ”کریم“ کا لفظ آیا ہے کہ یہ ہماری کرم نوازیاں ہیں وہ بڑا کریم واقع ہوا ہے۔

خدا تعالیٰ کا قائم کردہ نظام ربوبیت اور اس کے متعلق ہدایات

عزیزانِ من! اب اگلی بات آئی کہ **هَذَا خَلْقُ اللَّهِ** (31:11) ان انسانوں سے کہو جو اپنا معاشی نظام بناتے پھرتے ہیں کہ یہ تو وہ کائنات ہے جسے ہم نے پیدا کیا ہے یہ پانی، یہ زمین اور اس سے اُگنے والی ساری چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں۔ **بَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ** (31:10)۔ جہاں جاندار پیدا کیے تو ان جانداروں کے لیے یہ رزق کا سامان خدا نے پیدا کیا ہے۔ آگے کہا کہ **فَأَرْوَيْنَا مَاذَا خَلَقَ النَّبِيُّنَ مِنْ تُوْبِهِ** (31:11) یہ جو سمیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں ان سے پوچھو کہ تم نے کیا پیدا کیا ہے۔ پوچھو ان سے کہ تم نے کیا پیدا کیا ہے؟ **بَلِ الْخَالِقُونَ فِيهِ خَسَالٍ مُّبِينَةٍ** (31:11)۔ جو اپنا پیدا کیا ہوا نہیں ہے دوسرے کا پیدا کیا ہوا ہے اُس کو سمیٹ کر بیٹھ جانا انتہائی ظلم ہے، کھلا ہوا ظلم ہے۔ ان سے کہو کہ ان میں کیا چیز ہے جو تم نے پیدا کی ہے؟ جس نے پیدا کی ہے یہ اُس کی ملکیت ہے۔ وہ اپنی

ملکیت کی تقسیم کے متعلق جو کہتا ہے تو یہ اُس کے مطابق تقسیم کرنے کی بات ہے۔ اس کے مطابق تقسیم نہ کرنا بے حد ظلم ہے اور عربی زبان میں ظلم کے لفظ کے متعلق میں نے یہ عرض کیا ہوا ہے کہ ”جس شے کو جس مقام پہ ہونا چاہیے اُسے وہاں نہ کھا جائے تو اسے ظلم کہتے ہیں۔“ اس ظلم میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ خدا کو اُس کے مقامِ خدائی سے اتار کر نیچے لے آؤ کہ یہ تیری ملکیت نہیں ہے۔ یہ ظلم ہے یعنی خدا کو اس کے مقام سے نیچے لے آنا اور انسان کو اُس کے مقام سے اونچا لے جانا کہ جس کا یہ مالک ہو نہیں سکتا اُس کا مالک بنا دینا، یہ ظلم ہے۔ کس طرح ایک لفظ کے اندر دونوں طرف سے یہ جو ظلم کی چیز ہے وہ بیان کرتا ہے۔ کہا کہ اس نظام کے اندر ہم نے دآبہ کی پرورش کے لیے جو کچھ دیا تھا اُس کو افراد سمیٹ کر لے جائیں کہ صرف اپنی خاندانی، قومی پرورش ہو تو پہلی چیز یہ کہ یہ ظلم ہوا کہ جس مقصد کے لیے یہ چیزیں تھیں وہ مقصد پورا نہ ہوا۔ دوسرا ظلم یہ ہے کہ خدا نے جو پیدا کیا تھا وہ اس کی ملکیت تھی اس سے چھین لی۔ تیسری چیز یہ ہے کہ جن کی یہ نہیں ہیں یہ ان کو دیدیں۔ اسی لیے کہا کہ الظَّالِمُونَ هِيَ ضَلَالٍ مُّبِينٍ (31:11) اس سے زیادہ کھلی ہوئی گمراہی کوئی نہیں۔ عزیزانِ من! ہم سورۃ لقمن کی 11 ویں آیت تک آئے ہیں۔ 12 ویں آیت کو ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



دوسرا باب: سورة لقمن (آیات 12 تا 13)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزان من! آج اکتوبر 1979ء کی 19 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورة لقمن کی آیت 12 سے ہو رہا ہے:

(31:12)

تاریخی طور پر حضرت لقمان کے متعلق مختلف بیانات کی وضاحت

جیسا کہ میں نے پچھلے درس میں عرض کیا تھا کہ اس سورة کا نام ہی سورة لقمان ہے اور یہ لفظ یہ نام 12 ویں آیت میں پہلی دفعہ آتا ہے۔ کہا ہے کہ **وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ (31:12)**۔ حضرت لقمان ؑ کے متعلق یقینی طور پر با تحقیق نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کونسی شخصیت ہیں اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ خدا کے نبی تھے کیونکہ قرآن کریم میں زمرہ انبیائے کرام ♦ میں ان کا نام کہیں نہیں آتا۔ ان کو نبی کہہ کر نہیں پکارا گیا۔ حضرت لقمان کی بہت سی ضرب الامثال عربوں کے ہاں مشہور تھیں، جنہیں حکمت کی باتیں کہا جاتا ہے۔ یہ بعض

① قرآن کریم نے حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ ♦ کے درمیان ایک ایسی ہستی کا ذکر کیا ہے جو اگرچہ بال تصریح حضرات انبیائے کرام کے زمرہ میں شامل نہیں لیکن ان کی تعلیم کو نمایاں حیثیت دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ہودؑ اپنے قبیحین کے اپنی برباد ہونے والی قوم کے دیار و مسکن سے نکل کر حجاز کی جانب آ گئے تھے اور اسی علاقہ میں ان کی نسل (عاد ثانیہ) بڑھی اور پھیلی۔ ان میں ایک نیک سیرت حکمران گزارے جسے لقمان کہا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمران حضرت ہودؑ کی شریعت کا تبع تھا اور اپنی حکمت و دانائی کے لحاظ سے حکیم لقمان کے نام سے مشہور تھا۔ ایک قدیمی کتبہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے (پرویز: جوئے نور، طلوع اسلام ٹرسٹ، (رجسٹرڈ) لاہور، 1994ء، ص 61)۔

خیالات ہیں اور میں نے عرض کیا ہے کہ یہ کوئی تاریخی تحقیق تو نہیں ہے، بس یونہی خیالات ہیں۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ حضرت ایوبؑ کے بھانجے تھے۔ میں پھر اسے عرض کر دوں کہ یہ کوئی تاریخی تحقیق کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ لوگوں کے خیالات ہیں جو میں نے عرض کیا ہے اور یہ آپ کے سامنے بھی آگئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حضرت داؤدؑ کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے اور یہ ایک ہزار سال تک زندہ رہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ مصر کے رہنے والے ایک حبشی غلام تھے۔ مستشرقین بھی اس باب میں کوئی یقینی رائے نہیں رکھتے۔ یورپ میں بہت سی اس قسم کی حکمت کی باتیں بطور ضرب الامثال مشہور ہیں اور وہ ان کے ذہن میں ایک افسانوی سی فکر ہے۔ سیلز کا خیال ہے کہ یہ یونانی AESOP ہیں۔ یہ وہی سیلز ہے جس نے قرآن کریم کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

اس کا خیال ہے کہ یہ لقمان بھی AESOP (ایساپ) ہیں۔ ایک ڈاکٹر اسپرینجر (Dr. Spranger) ^① ہیں، انہی کے ہاں ایک لفظ ALXAI ہے، اُس کی بھی ضرب الامثال بہت مشہور ہیں۔ اُس نے کہا ہے کہ یہ لقمان الکسانی (ALXAI) ہیں۔ یہ (Victorian Era 1837-1901) کا مصنف ہے اس کا بھی یہی خیال ہے۔ تورات کی کتاب ^② الامثال میں بہت سی اس قسم کی ضرب الامثال ہیں، وہ ایک نام لموایل ہے، وہ ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں یعنی یہ اس کے متعلق مختلف خیالات ہیں۔ عربوں میں بہر حال لقمان کے نام سے بہت سی ضرب الامثال مشہور تھیں اور قرآن کریم میں یہیں یہ لفظ آیا ہے نہ ہی اس کی تفصیل کہیں اور دی گئی ہے اور نہ انہیں زمرہ انبیاء کرامؑ میں شامل کیا گیا ہے۔ چونکہ ان کی حکمت کی باتیں مشہور تھیں، اس لیے قرآن کریم نے بھی یہ کہا ہے کہ **وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ (31:12)** انہیں حکمت و دانائی کی باتیں عطا کی گئی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وحی کے ذریعے انہیں دی گئی ہوں تو پھر وہ انبیاء میں آئیں گے اس لیے کہ قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں ہماری طرف سے ہادی نہ بھیجا گیا ہو۔ اُن میں سے بعض کا ذکر ہم نے بالتصریح کر دیا ہے۔ اس لیے یہ بھی مان لیا جائے کہ یہ جو ان کو حکمت کی باتیں کہا گیا ہے اگر یہ بذریعہ وحی آئی تھیں تو ان کو نبی مان لیا جائے گا۔ بہر حال ان کا احترام تو ہم پر ضروری ہو گیا کہ خدا نے خاص طور پر قرآن کے اندر ان کا نام لیا اور اس طرح سے

① اس ڈاکٹر کا خیال ہے کہ یہ ایبوند کے الکسانی (ALXAI) ہی کا دوسرا نام ہے۔

② تورات کی کتاب الامثال میں یاقہ کے بیٹے اجور (امثال 30/1) اور لموایل بادشاہ (امثال 31/1) کی حکمت کی باتیں، عرب کے لقمان کے نصائح سے ملتی چلتی ہیں۔ اس قیاس کے مطابق جناب لقمان کو بنی اسماعیل میں سے ہونا چاہیے غرضیکہ کثرت تعبیر سے یہ خواب ابھی تک پریشان ہے۔ اس کا حل آنے والے زمانہ کے انکشافات کا منتظر ہے۔ قرآن کریم تاریخ کی کتاب نہیں اس لیے اس نے لقمان میں تذکیر و معظمت سے بحث کی ہے حسب و نسب اور مقام و زبان سے نہیں (پرویز: جوئے نور طلوع اسلام ٹرسٹر (رجسٹرڈ) لاہور، 1994ء، ص 66)۔

ان کے ذکر کو ابدیت سے ہمکنار کر دیا۔ قرآن کریم قیامت تک محفوظ رہے گا تو یہ لقمان اور اس کی حکمت کی باتیں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں یہ بھی محفوظ رہیں گی۔ گویا اہمیت اس اعتبار سے ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے خود لقمان کی حکمت کی باتوں کو قرآن کریم میں درج کیا اور لقمان کی یہ باتیں اس لیے درج ہوئیں کہ وہ باتیں قرآن کریم کی حکمت کے مطابق ہیں۔ ہم اس اعتبار سے بھی انہیں لیں گے کہ قرآن کریم کے مطابق اگر کوئی شخص بھی کچھ کہتا ہے تو ہم کہیں گے کہ تم سچ کہتے ہو۔ کسے باشد اگر وہ ہم سے یہ کہے کہ بھئی! سچ بولنا اچھی بات ہے تو ہم کہیں گے کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ سوال نہیں ہے کہ جو شخص یہ کچھ کہہ رہا ہے وہ از خود کہہ رہا ہے یا اس نے کہیں سے سنا ہے یا ان کی کسی کتاب میں لکھا ہے بلکہ ہمیں اُس بات سے واسطہ ہے جو بات اُس نے کہی ہے ہم اس لیے اُسے صحیح تسلیم کریں گے کہ وہ قرآن کے مطابق ہے۔ ہمارے پاس اصول یہ ہے کہ کوئی بات بھی جو کہیں سے بھی آئے اگر وہ قرآن کے مطابق ہے تو ہم اُسے صحیح تسلیم کر لیں گے۔ اگر وہ قرآن کے خلاف ہے تو اُس کی نسبت کسی کی طرف بھی کیوں نہ کی جائے ہم کہیں گے کہ یہ صحیح نہیں ہو سکتی اس لیے کہ ہمارے پاس پرکھنے کی جو کوئی ہے وہ خدا کی کتاب ہے۔ اس لیے اس اعتبار سے یہ جتنی چیزیں خدا کی کتاب نے خود لقمان کی کہی ہیں ان کی حکمت کو ہم اس لیے سچا مانتے ہیں کہ قرآن نے ایسا کہا ہے اور جو کچھ کہا ہے اسے آپ دیکھیں گے کہ وہ قرآن کریم کی حکمت کے مطابق ہے۔ ہمارے ہاں تو پھر لقمان کو طبیب کی حیثیت سے مانا جاتا ہے۔ اب تو ہمارے ہاں آہستہ آہستہ طبیب کا لفظ ہی پیچھے ہٹ گیا ہے اُس کی جگہ حکیم کا لفظ ہی آ گیا ہوا ہے۔ یہ جتنے ہمارے ہاں طبیب ہیں وہ حکیم ہی کہلاتے ہیں حالانکہ حکمت اور طبابت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر طبابت کے ساتھ حکمت شامل ہو تو پھر پوچھیے نہیں کہ شفا کس طرح سے آتی ہے لیکن حکیم تو اصل میں عربی زبان میں فلاسفر کے لیے ہی آتا ہے۔ حکمت ودانائی کی بات Reason سے یا Rationally جو کچھ کہا جائے گا اُس کے لیے یہ لفظ آتا ہے اگرچہ معنی کے اعتبار سے تو آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ اس کے اندر بڑی وسعت ہے لیکن بہر حال جب حکمت کی باتیں کہا جائے گا تو وہ ودانائی کی باتیں ہوں گی Reason کی باتیں ہوں گی۔

عربوں کے ہاں الفاظ کو محسوسات کی بنیاد پر جانا اور سمجھا جاتا تھا

حضرت لقمان کے متعلق پہلی چیز یہ کہی گئی کہ **اِنَّ الشُّكْرَ لِلّٰہِ (12:31)**۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے: ”اللہ کا شکر کرو“۔ اور شکر کرنے کا عمل آپ کو معلوم ہی ہے کہ وہ کھانا کھایا اور اس کے بعد کہا کہ یا اللہ! تیرا شکر ہے تیرا احسان ہے۔ اتنی بڑی چیز جو خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ یہ کرو تو یہ تو کوئی بہت بڑی چیز ہے۔ یہ چیز تو ہمارے دروس میں بیسیوں دفعہ آچکی ہے یہ اصطلاحات پہلی دفعہ نہیں آئیں۔ میں نے کہا تھا کہ شکر کا مفہوم عربوں کے ہاں یہ ہوتا تھا کہ ”وہ طریق اختیار کرنا جس سے

کسی کی محنت بھرپور نتائج پیدا کر دے۔“ چنانچہ وہ اس لفظ کو یوں استعمال کرتے تھے۔ میں نے کہا ہے کہ عربی زبان میں بات سمجھ میں اس لیے آ جاتی ہے کہ عرب اپنے ہاں جب یہ الفاظ استعمال کرتے تھے تو محسوس چیزوں پر ان کا اطلاق کرتے تھے وہ ان چیزوں کو محسوس چیزوں پر Apply (منطبق) کرتے تھے۔ عرب تو فلاسفی، نظری چیزوں سے واقف ہی نہیں تھا بلکہ وہ صرف محسوسات سے واقف تھا۔ جتنے بھی قرآن کریم کے اندر یہ الفاظ یا عربی زبان میں جو الفاظ اس قسم کے آئیں گے وہ تصوراتی نہیں ہوتے، وہ محض نظری طور پر نہیں بولتے تھے بلکہ وہ محسوس چیزوں کے اوپر ان کا اطلاق کرتے تھے اور وہاں سے پھر ایک تصور لیتے تھے۔ بات اس لیے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ وہ محسوس چیزوں پر اس کا اطلاق کرتے تھے۔

شکر کے لفظ کا وہ مفہوم جو محسوس شکل میں سمجھا جاسکتا ہے

شکر کے معنی یہ ہیں کہ ”جس کی محنت بھرپور نتائج پیدا کرے۔ وہ بکری یا اونٹ یا بھیڑ جس کے تھن دودھ سے اتنے بھرے ہوئے ہوں کہ ان میں سے خود دودھ کے قطرے ٹپک رہے ہوں، تو یہ جو تھن ہوتا تھا یہ مشکور ہوتا تھا“ اب یہاں سے آپ تصور میں لائیے کہ وہ پھر اس محسوس چیز کے لیے جب یہ لفظ بولتے تھے تو اب آگے ساری بات چل پڑی کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ ”کوئی ایسا طریق جس سے انسان کی محنتیں ایسے بھرپور نتائج پیدا کریں کہ وہ دودھ کے قطروں کی طرح ٹپکتے ہوئے نظر آجائیں“ یہ ہے جسے خدا کا شکر کہا لیکن خدا کا شکر نہیں بلکہ یہ اللہ شکر ہے۔ ترجمہ تو اس کا ہم یہی کریں گے کہ خدا کے لیے شکر۔ مفہوم جہاں بھی آئے گا کہ جسے آپ خدا کے لیے کہتے ہیں تو یہیں تو اس نے کہا تھا کہ **إِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ** (31:12) ارے بابا! ہم تو ان چیزوں سے مستغنی ہیں، جو ان سے مستغنی ہے، ہم اس کے لیے یہ کہیں کہ ہم اُس کے لیے یہ کرتے ہیں، کچھ عجیب سی بات لگتی ہے۔ جہاں بھی یہ چیز آئے کہ ”خدا کے لیے یا خدا کے راستے میں“ تو اُس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ اُس مقصد کے حصول کے لیے ہے جو خدا نے مقرر کیا ہے یعنی اُس مقصد کے حصول کے لیے بھرپور محنت کرو، پوری پوری محنت کرو۔ جو خدا نے مقرر کیا ہے۔

اسلام مذہب نہ ہونے کی بنا پر ہی سچا دین ہے

عزیزانِ من! ایک ہی بات آگے آئی جس نے مذہب اور دین کے فرق کو محسوس طور پر نکھار کر سامنے کر دیا اور وہاں سے یہ چیز بھی آئی کہ اسلام ہی کیوں سچا دین ہے۔ یہ جو آپ کے ہاں ازم (Isms) ہیں، یہ ادیان ہیں۔ یہ جو دھرم ہیں مثلاً ہندومت، یہودیت، عیسائیت، یہ دین نہیں ہیں، یہ مذاہب ہیں۔ اسلام مذہب نہیں ہے، اس لیے اسلام کا ان کے ساتھ تقابل ہی غلط ہے۔ یہ تو دو مختلف نوع کی چیزیں ہیں۔ ہمارے ہاں سارے مناظرے، بحثیں مذہب والوں کے ساتھ ہوتے چلے جاتے ہیں اور ہم نے ثابت کر دیا کہ اسلام سب

سے اچھا مذہب ہے جب کہ یہ مذہب ہی نہیں ہے۔ اسے ثابت کرو کہ یہ مارکس ازم سے اچھا ہے، یہ کپٹل ازم سے اچھا ہے، یہ ڈیما کریسی سے اچھا ہے، یہ ہرازم (Ism) سے اچھا ہے۔ یہ جسے آج آپ ازم کہتے ہیں یہ نظام حیات ہیں، نظام زندگی ہیں۔ یہ ہیں الدین کے معنی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ایک چیز سامنے آتی ہے جس سے ازم (Ism) اور مذاہب کی بات نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ جو اللہ ہے اس کے لیے یہ نہیں ہے کہ اللہ کے لیے یہ کچھ کیا جاتا ہے۔

مذہب کے اندر انسان کا ہر عمل خدا کے لیے کیا جاتا ہے جب کہ دین میں انسان کا ہر فعل اس کی اپنی ذات کے لیے ہوتا ہے

مذہب میں جو بھی اہل مذہب کرتا ہے وہ اللہ کے لیے کرتا ہے۔ یہاں تک کہ قرآن کریم میں ہے کہ **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ** (51:56)۔ اس کا عام ترجمہ آپ دیکھیں گے یہ کیا جاتا ہے کہ ہم نے جن اور انس کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کرتے رہیں یعنی پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ ہمیں سجدے کرتے رہیں ہماری پرستش کرتے رہیں۔ عزیزان! غور کیجیے کہ خود خدا کے متعلق اس سے کیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس تصور میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ ہمیں اس دنیا میں بھیجا، ہم سے نہ پوچھا، نہ ہماری کوئی رائے لی نہ ہماری کوئی رضامندی لی، بغیر پوچھے یہاں بھیج دیا اور بھیجنے کے بعد کہا کہ ہم نے اس لیے بھیجا ہے کہ ہماری پرستش کرتے رہو۔ خدا تو کہتا ہے کہ **فَاللَّهُ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ** (3:97) ہم اس سے مستغنی ہیں۔ دنیا میں خدا کو ماننے والے جتنے ہیں وہ جو کچھ کرتے ہیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ خدا کے لیے یہ کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اللہ کو خوش کر لو، اسے راضی کر لو۔ یعنی یہ سارا کچھ ہو ہی اس لیے رہا ہے کہ وہ ناخوش ہے اسے خوش کر لو، وہ ناراض ہے اسے کسی طرح سے راضی کر لو۔ یعنی اُس کا کوئی کام کر رہے ہیں۔ وہ جیسے مزدور کو یہاں مزدوری پہ لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں بنیاد کھودو، یہاں دیوار کے لیے مٹی لے آؤ، اینٹ لے آؤ تو مزدوروں کا اُس میں اپنا کوئی Interest (دل چسپی) نہیں ہوتی، تعلق نہیں ہوتا، وہ تو شام کو ہاتھ جھاڑ کر چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ مکان بھی پورے کا پورا تعمیر ہو جاتا ہے تو وہ اپنی روزانہ کی اجرت لیتے ہیں اور اُس کے بعد چلے جاتے ہیں۔ وہ سب کچھ اس کے لیے کرتے ہیں ان کا تعلق اس میں اتنا ہی ہوتا ہے کہ انہیں اس میں سے روٹی مل جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا خدا کا تصور یہ ہے؟ وہ تو اپنے آپ کو مستغنی کہتا ہے: **غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ** (3:97)۔ وہ ساری کائنات سے مستغنی ہے تو کیا وہ اپنے کسی کام کے لیے یہ کچھ کہے گا کہ یہ کرو اور وہ کرو؟

مذہب میں خدا کی پرستش کا تصور دین کی ساری عمارت کو ہی منہدم کر دیتا ہے

آپ نے غور فرمایا کہ کتنی بڑی چیز ہے۔ مذہب میں پرستش کا تصور یہ ہے کہ خدا یہ چاہتا ہے کہ تم بیٹھے میرے قصیدے پڑھا کرو مجھے

سجدے کیا کرو میرے آگے ہاتھ جوڑا کر ڈورا کرو اور یہ سارا کچھ میرے لیے کیا کرو۔ یعنی جو کچھ وہ کہتا ہے وہ اپنے لیے کہتا ہے کہ میرے کچھ کام (معاذ اللہ) رکے ہوئے ہیں تم یہ کراؤ۔ مذہب کا یہ تصور ہے۔ پہلی چیز حکمت کی جو کمی گئی ہے وہ یہ کمی ہے کہ **اِنْ شَكَرْ لِلّٰهِ** (31:12)۔ اب میں لفظ شکر ہی کہے جاؤنگا۔ تو کہا کہ تم شکر کرو ^① کیونکہ **وَمَنْ يَشْكُرْ فَاِنَّا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ** (31:12) جو شکر ^②

کرتا ہے وہ میرے لیے نہیں بلکہ اپنی ذات کے لیے کرتا ہے۔ عزیزانِ من! دنیا کے مذاہب کی مبینہ کتابیں تو ایک طرف رہیں، فلسفے تک کی چیزوں کو ڈھونڈ ماریے اور دیکھیے کہ یہ چیز کن بلندیوں پہ جا کر کمی گئی ہے۔ ایک حکم دیا جاتا ہے کہ شکر کرو اور کہا یہ جاتا ہے کہ جو ایسا کرتا ہے وہ میرے لیے کچھ نہیں کر رہا بلکہ وہ اپنے لیے یہ کرتا ہے۔ ہم تو صرف اُس کو Direction (ہدایت) دے رہے ہیں ہمارا کوئی بگڑا ہوا کام وہ نہیں سنوار رہا بلکہ وہ اپنے ہی بگڑے ہوئے کام سنوار رہا ہے وہ اپنی ہی ذات کو حسین بنا رہا ہے۔ یہ جتنے احکام بھی ہیں ان میں سے میں دو چار مثالیں پیش کرتا ہوں۔ آپ نے غور کیا ہے کہ یہ نقطہ کتنا اہم ہے اس ایک نقطے سے اسلام باقی تمام ادیان سے اور باقی تمام مذاہب سے الگ ہو جاتا ہے کتنا افضل ہو جاتا ہے کتنا منفرد ہو جاتا ہے کتنا Unique ہو جاتا ہے! ہر جگہ تصور یہ ہے کہ خدا کا جو حکم ہے مانا جاتا ہے اُس کا حکم ہے اُس کا کوئی کام ہے اُس کے لیے یہ کیا جاتا ہے جبکہ خدا کہتا ہے کہ **مَنْ يَشْكُرْ فَاِنَّا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ** (31:12)۔ ایک دوسری جگہ کہا ہے کہ **فَاِذَا جَاءَ ظُلْمٌ مِّنْ رَبِّكَ** (6) تمہارے خدا کی طرف سے Search

Light (دانش نورانی) آگئی اُس نے راستے روشن کر دیئے۔ اس لیے **فَعِنَّ اَبْصَرَ** (6:105) جو آنکھیں کھول کر چلے گا تو **فَلْيَنْفِصْ** (6:105) اُس کا اپنا ہی فائدہ ہوگا۔ ہمارا کام یہ تھا کہ ہم نے سورج طلوع کر دیا، روشنی کر دی اب اُس کے بعد اس روشنی میں جو دیکھ کر چلے گا تو اُس کا اپنا فائدہ ہے۔ ہمارا کوئی کام بگڑا ہوا نہیں تھا جس کے لیے ہم نے سورج کو طلوع کیا، راستے روشن کیے اور تمہیں کہا کہ آنکھیں کھول کر چلو۔ **وَمَنْ عَمِيَ فَغَلِيظَ** (6:104) اور جو آنکھیں بند کرے گا وہ خود گڑھے میں گرے گا۔ نہ آنکھیں کھول کر چلنے والا ہمارا کچھ سنوارے گا نہ آنکھیں بند کر کے چلنے والا ہمارا کچھ بگاڑے گا۔ باقی رہا یہ کہ ہم نے سورج چڑھا دیا، طلوع کر دیا، روشنی کر دی، راستے روشن بھی کر دیئے تو کیا ایک بات آگے اور بھی کر دیجیے کہ آکر ان کی آنکھیں بھی زبردستی کھول دیجیے؟ کہا کہ نہیں، یہیں تو انسانیت کا اور حیوانات کا فرق شروع ہوتا ہے۔ حیوان کی آنکھیں تو ہم زبردستی کھولتے ہیں لیکن انسان کے شرف کا تقاضا ہے کہ اس سے زبردستی نہ کی جائے۔ اس کے راستے روشن کر دیئے جائیں اور اُس کے بعد پھر یہ چیز اس پہ چھوڑ دی جائے کہ آنکھ کھول کر چلتا ہے یا آنکھ بند کر کے چلتا ہے کیونکہ

① یعنی یہ کہ نعمائے خداوندی کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کیا کرو (شکر)۔

② جو نعمائے خداوندی کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرتا ہے اس کی ذات کی صلاحیتیں بھر پور انداز سے نشوونما پاتی ہیں (پرویز: مفہوم القرآن)

وَمَا آتَاكُمْ بِحَفِيفٍ (6:105) ہم کوئی کوتوال مقرر نہیں ہوئے ہیں کہ ڈنڈے مارا کر تمہاری آنکھیں کھولیں کہ صحیح راستے پہ چلو۔ اُس کا کوئی کام بگڑ رہا ہوتا تو وہ تو ڈنڈے مارتا۔ مزدور اگر ہماری مرضی کے مطابق کام نہیں کرتا، تغافل برتا ہے تو ہم اُس کو ڈنڈے مارتے ہیں کیونکہ ہمارا کام بگڑ رہا ہوتا ہے۔ اور جو روشنی کے ہوتے ہوئے خود ہی آنکھیں بند کر کے چلتا ہے تو خدا کہتا ہے کہ ہم ان کو ڈنڈے مار کر ان کی آنکھیں نہیں کھولتے۔ یہاں کہا ہے کہ فَلْيَنْفِسْ (6:106) اپنی ذات کے لیے یہ خود یہ کچھ کرے گا۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ (10:108) پوری نوع انسانی کو مخاطب کیا گیا ہے۔ کہا کہ اے نوع انسان قَدْ جَاءَكُمْ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ (10:108) الحق تمہارے خدا کی طرف سے آگیا ہے۔ ان الفاظ کے معنی اگر بیان کرونگا تو ایک درس اس کے لیے کافی نہیں ہو سکے گا۔ کہا ہے کہ الحق تمہارے خدا کی طرف سے آگیا۔ اب فَقَدْ اِهْتَدَيْتُمْ (10:108) جو بھی اس صحیح راستے پر چلتا ہے فَلْيَنْفِسْ لِنَفْسِهِ (10:108) وہ اپنے لیے چلتا ہے۔ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهِ (10:108) جو صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راستہ خود اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو خود خطرات میں ڈالتا ہے۔ وَمَا آتَاكُمْ بِوَكِيلٍ (10:108) ہم ڈنڈا لیے تمہارے پیچھے نہیں پھرتے کہ تمہیں زبردستی سیدھی راہ پر چلائیں۔ یہ تو پہلے یہ سمجھنے کی بات ہے کہ یوں چلنا میرے فائدے میں ہے اور اس کے خلاف جانا میرے نقصان میں ہے۔

انسانی دنیا میں جبر کا پہلو انسان کی انسانیت کو پامال کر دیتا ہے

عزیزانِ من! جہاں کہیں جبر کا پہلو آیا تو دین بھی گیا، شرفِ انسانیت بھی گئی، حق بھی گیا۔ خدا نے بار بار کہا ہے کہ ہم تم پہ حفیظ نہیں، ہم تم پہ وکیل نہیں اس لیے کہ یہ جَوِلْتُمْ لِنَفْسِكُمْ (10:108) کہا ہے یہ انسان کی اپنی ذات کے لیے کہا ہے۔ انسانی ذات کی خصوصیت اختیار و ارادہ ہے۔ اس کائنات میں اختیار و ارادہ کئی اور پر تو خدا کو حاصل ہے اور اس کائنات کے اندر صرف انسان کو دیا گیا ہے۔ یہ خصوصیت خداوندی ہے جو خدا نے انسان کو دی ہے۔ اسی لیے یہ جو خصوصیت دی گئی ہے تو قرآن میں اس کو تَفَضَّلْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي ﴿38:78﴾ کہا ہے کہ یہ ہماری توانائی تھی، ہماری اتھارٹی تھی، ہماری قدرت تھی، ہماری ایک خصوصیت تھی، اس میں سے ہم نے اسے کچھ دیدیا ہے۔ یہاں زندگی نہیں کہا کیونکہ زندگی تو حیوانات کو بھی ملی ہوئی ہے۔ یہ اختیار و ارادہ کی خصوصیت جو انسان کو دی گئی ہے اسے کہا گیا ہے کہ یہ تو ہماری خصوصیت تھی، ہم نے اس کو اس میں سے دیدیا۔ یہ انسان کی ذات ہے ذات کا تو تقاضا ہی اختیار و ارادہ ہے۔ جتنا یہ اپنے اختیار و ارادے کو استعمال کرتا چلا جائے گا ذات میں توانائیاں پیدا ہوتی چلی جائیں گی اور جتنا اختیار و ارادے کو خدا کی بتائی اقدار کے مطابق استعمال کرتا چلا جائے گا اتنی ہی اس کی ذات حسین ہوتی چلی جائے گی۔

① میں اس میں اپنی توانائی کا ایک شمع ڈال دوں اور یوں وہ صاحب اختیار و ارادہ انسانی ذات کا حامل بشر بن جائے (پرویز: مفہوم القرآن ص-1064)

انسان کا ہر عمل خالصتاً انسانی ذات کے متعلق ہی ہوتا ہے

قرآن نے کہا کہ **فَعَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَ مِنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ** (18:29) جب بات ہی یہ ہے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ تمہارے ہی فائدے کے لیے ہے تو پھر اس میں ہم زبردستی کیوں کریں گے۔ کہا کہ **وَمِنْ جَاهِدٍ فَأِنْتُمْ جَاهِدٌ لِنَفْسِكُمْ** (29:6) جو بھی تم محنت کرو گے جو جدوجہد بھی تم کرو گے وہ ہمارے لیے نہیں بلکہ وہ تم اپنی ہی ذات کے لیے کرو گے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو **سَنُؤَاتِلُكَ اللَّهُ لَتَغِيْبَنَّ عَنِ الظَّالِمِيْنَ** (29:6) خدا تو تمام کائنات سے مستغنی ہے۔ ہم اپنے لیے کسی سے کوئی کام کیوں کرائیں گے ہمارا کونسا کام رکا ہوا ہے جس کے لیے ہمیں ضرورت ہو کہ تم یہ کرو اور تم وہ کرو۔ ہم تو صرف Direction (ہدایت) دیتے ہیں۔ اب آپ غور فرمائیے کہ پہلے یہ حکم دیا گیا ہے کہ ان اشکر للہ (31:12) تو وہ ایسا ہے جیسے کوئی حکم ہے۔ قرآن کریم حکم والی بات یوں نہیں کہتا بلکہ وہ ہدایت کہتا ہے اور اُس کا ترجمہ Direction ہوتا ہے۔ وہ ڈاکٹر کی طرح آپ کو ڈائریکشن دیتا ہے کہ یہ دوائی اتنے اتنے گھنٹے کے بعد یہ سفوف اس طرح سے یہ کپسول یوں کھالینا ہے پرہیز یوں کرنا ہے۔ اگر وہ مریض یہ سارا کچھ ڈائریکشن کے مطابق کرتا ہے تو کیا اُس سے ڈاکٹر کی صحت ٹھیک ہوتی ہے؟ نہیں وہ مریض تو اپنی صحت کے لیے یہ کرتا ہے۔ اگر اُس کے خلاف جاتا ہے تو ڈاکٹر کبھی بیمار نہیں ہوتا بلکہ اس مریض کا اپنا مرض بڑھتا ہے۔ ڈائریکشن دی اور اُس کے بعد مریض سے کہد یا کہ جینا چاہتے ہو تو یہ کرو مرنے چاہتے ہو تو یوں نہ کرو۔ یہ ہے **فَانْتَعَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ** (31:12)۔

عزیزانِ من! پہلی چیز یہ سمجھ لیجیے کہ الدین کا جو نظام ہے اُس میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جس طرح سے ان احکام کی تعمیل کی جاتی ہے وہ خدا کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی اپنی ذات کے سنوارنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور اُس کے لیے محسوس شکل میں ایک اسٹینڈرڈ (معیار) ہمارے سامنے رکھا ہے کہ یہ کچھ کرتے جاؤ گے تو تم ایسے بن جاؤ گے۔ خدا تو محسوس نہیں ہے نہ ہی یہ کہہ سکتا تھا کہ تم خدا بن جاؤ گے اور اگر کہتا بھی تو ہمیں کیا معلوم ہوتا کہ کیا بن جاؤ گے۔ اُس نے کہا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ تمہارے جیسے ایک انسان نے جو کچھ ہم نے کہا ہے اُس کے مطابق عمل کیا ہے اور حرفاً حرفاً عمل کیا ہے وہ صاحبِ خلقِ عظیم ہے۔ اور وہ ہیں ہمارے نبی محمد ﷺ۔ جن کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ **لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ اَسْوَةٌ خَسَّةٌ** (60) اس جیسے تم بن جاؤ گے اگر تم نے خدا کے اقدار کی پابندی کی۔ تمہیں وحی نہیں مل سکتی لیکن تمہاری سیرت، تمہارا نفس، تمہاری ذات سنور جائے گا اور حسین ہو جائے گی۔ اس کے لیے یہ محمد ﷺ تمہارے لیے محسوس معیار ہیں۔ خدا کے لیے نہیں کچھ کیا جا رہا بلکہ اپنی ہی ذات کے لیے یہ کچھ کیا جاتا ہے۔

① جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے (پرویز: مفہوم القرآن ص 665)

تری جلوہ گاہ جمال میں مرا ذوق دید نکھر گیا

تری ضوفشانی حسن نے مری حیرتوں کو سجا دیا

جبینِ نیاز کا ایک ایک سجدہ انسانی ذات کو قدم قدم پر سرفرازیوں کی نوید دیتا ہے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ کوئی انسان خدا تو نہیں بن سکتا البتہ صفاتِ خداوندی کا عکس اُس کے اندر آ جاتا ہے۔ مقصد ہی خدا کا یہ تھا کہ چھوٹے پیمانے پہ جس پیمانے پہ ہم نے تمہیں اپنی توانائی میں سے ایک شمع دیا ہے اسی پیمانے پہ ہماری جو مکمل ترین صفات ہیں ان کا بھی ایک ایک عکس اپنے اندر پیدا کرتے چلے جاؤ۔ اور خدا تو اس کے لیے بیتاب ہے کہ تم کسی طرح سے چھوٹے پیمانے پہ ہمارے جیسے بن جاؤ۔ یہ ہے خدا جو قرآن پیش کرتا ہے:

شعاع مہر خود بیتاب ہے ذوقِ تمنا سے

حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

شعاع مہر نہ ہو تو شبنم سے کہیے کہ اڑ کر تو دکھائے۔ یہ زمین پہ گر جائے گی پستیوں کی طرف آ جائے گی اڑ نہیں سکے گی یہ صرف شعاع مہر کا صدقہ ہے کہ یہ پستیوں کی بجائے بلندیوں پہ جا پہنچتی ہے۔ جس قطرے کو وہ شعاع نصیب نہیں ہوتی وہ خاک میں مل جاتا ہے پست ترین درجے پہ آ جاتا ہے۔ جس کی قسمت یاد رکھتی ہے جس کو وہ شعاع مل جاتی ہے تو پوچھو نہیں کہ پھر وہ کہاں جا پہنچتا ہے۔ جہاں سے گر کر نیچے آیا تھا انہی بلندیوں کے اوپر چلا جاتا ہے اور یہی معراجِ انسانیت ہے۔ کہا ہے کہ **وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ** (31:12)۔ جو نعمائے خداوندی کو تو انینِ خداوندی کے مطابق صرف کرتا ہے اس کی ذات کی صلاحیتیں بھرپور انداز سے نشوونما پاتی چلی جاتی ہیں۔ عزیزانِ من! موضوع ہی یہی ذاتِ انسانی ہے۔ پھر وہ بات آگئی مگر شعر تو فارسی کا ہے لیکن اس مقام کے اوپر ہے بڑا برجستہ:

حکایتِ قد آں یارِ دلنواز کنم

میں اُس یارِ دلنواز کے قد کی حکایتیں بیان کر رہا ہوں۔

بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

مگر اس بہانے عمر تو اپنی ہی دراز کر رہا ہوں۔ یہ ہے ذکرِ ذاتِ نبیؐ ہے قرآن کا دیا ہوا خدا کا تصور۔ ”بے ساختہ چھٹی پونوں جی کر اوند اے“۔

① جو ایسا کرتا ہے اسکی ذات کی صلاحیتیں بھرپور انداز سے نشوونما پاتی ہیں (پرویز: مفہوم القرآن ص 947)

② بے ساختہ ان سے بے تکلیف ہونے کو دل چاہتا ہے۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
 کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جمینِ نیاز میں
 لیکن جمینِ نیاز کا یہ جو سجدہ ہے وہ اُس کے لیے نہیں ہے۔
 ترے سنگِ در نے بدل دیا ہے یہ پستیوں کو فراز میں
 اور اب اس کا نتیجہ یہ ہے:

کہ ہزاروں عرش جھلک رہے ہیں مری جمینِ نیاز میں
 اُس کے ہاں جو سجدہ کیا جاتا ہے تو اُس کو سجدے کی کیا ضرورت ہے! وہ تَلَعَيْنِ عَنِ الطَّعَيْنِ (29:6) ساری کائنات سے
 مستغنی ہے۔ وہ اس کا محتاج ہی نہیں کہ کوئی شخص اس کے لیے کچھ کرے۔ وہ تو اپنی پستیوں کو فراز میں بدلنے کا ایک بہانہ ہے۔
 یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
 ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

حقوق اللہ کا تصور بنیادی طور پر ہی غلط ہے

قرآن نے کہا ہے کہ وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ (31: 31)۔ میں کہا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں حقوق اللہ کا ایک تصور
 ہے یعنی یہ کہ ہمارے اوپر اللہ کے حقوق ہیں۔ یہ تصور غلط ہے۔ حقوق العباد ہی ہیں جو ہمارے ہیں اللہ تو بطور حق کے ہم سے کچھ بھی نہیں
 مانگتا، وہ تو کہتا ہے کہ جو کچھ بھی ہے وہ لِنَفْسِهِ تمہاری ہی اپنی ذات کے لیے ہے اے اے بابا! تمہارے ہی لیے ہے مجھے اس کی ضرورت
 ہی نہیں۔ آگے کہا ہے کہ وَمَنْ كَفَرَ (31: 12) جو اس سے انکار کرتا ہے فَلَانَ اللَّهُ غَنِيًّا حَنِيتًا (31: 12) اس کا نقصان اسی کو
 اٹھانا پڑتا ہے خدا کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا اس کا قانون اپنی نتیجہ خیزی کے لیے کسی کی مدد کا محتاج نہیں۔ وہ از خود حسن و خوبی سے کار فرما رہتا
 ہے کہ اس کے نتائج ہر دیدہ و بینا سے بے ساختہ خراجِ تحسین وصول کر لیتے ہیں۔ وہ اپنا کوئی بگڑا ہوا کام اسی لیے سنوارنا چاہتا ہے کہ لوگ
 کہیں: واہ بھی شاہجہان! کیا خوب تاج محل بنایا ہے۔ وہ جو بنانے والے تھے ان کا اتنا ہی کام تھا کہ انہوں نے شاہجہان کی خاطر اینٹ
 لگائی، گارا لگایا، پتھر لگایا اور کرکرا کے چلے گئے۔ پھر تاج محل بن گیا تو شاہجہان کی تعریف ہونے لگی۔ انسان کا یہی جذبہ ہے جو اس قسم کی
 چیزیں بناتا ہے کہ کسی طرح سے اُس کی حمد و ستائش ہو۔

انسانوں کی طرح خدا تعالیٰ کی ذات کسی سے اپنی تعریف کروانے کی محتاج نہیں

قرآن کہتا ہے کہ مَنْ كَفَرَ (31: 12) جو اس طرح نہیں کرتا تو ہمارا کیا بگاڑتا ہے۔ اپنا ہی بگاڑتا ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ فَلَانَ اللَّهُ

غَنِيًّا حَيَاتًا (31:12)۔ یہاں حمید آیا ہے۔ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ فعلیل کے وزن کے اوپر جو الفاظ آتے ہیں تو ان کے معنی ہوتا ہے کہ ہنگامی طور پہ ایسا نہیں کہ کبھی ایسا ہو گیا بلکہ وہ ہوتا ہے جو مستقلاً بالکل اُسی قسم کا ہی رہے۔ یہاں کہا ہے کہ ہم تو شروع سے آخر تک حمید ہی حمید ہیں۔ اس لیے کیا ہم تمہارے تاج محل بنانے کے محتاج ہیں کہ تم بناؤ گے تو ہماری تعریف ہوگی؟ نہیں، ہم تو بذاتہ حمید ہیں۔ ہم یہ اس لیے چاہتے ہیں کہ ہم تو حمید ہیں ہی لیکن یہ سب کچھ کرنے والے کو ہم محمد ﷺ کہتے ہیں کہ جن کی حمد کی جائے گی۔ وہ احمد تھا، ہماری حمد کرتا تھا، یہ کرتے کرتے وہ مقام محمود پہ پہنچ گیا۔ عزیزانِ من! یہ وہی حمد کا لفظ ہے۔ مقام محمود پہ پہنچ گیا اور ساری دنیا کے لیے محمد ﷺ بن گیا۔ اور وہی ہے جواب ہمارے لیے اسٹینڈرڈ ہے اسوۂ حسنہ ہے ورنہ خدا تو حمید ہے جب اسلام نہیں تھا تب بھی وہ حمید تھا جب انبیائے کرام نہیں تھے تب وہ حمید تھا جب انسان نہیں تھے تب وہ حمید تھا جب کاریگر نہیں تھے اُس کا ”تاج محل“ اُس وقت بھی موجود تھا۔ اس نے غنیًّا حیاتًا (31:12) کہا ہے۔ یہ شکر یعنی صلاحیتوں کا بھرپور انداز میں نشوونما پانا تمہاری اپنی ہی ذات کے لیے ہے۔

عزیزانِ من! یہ ہوتا کس طرح ہے؟ یہ بات اگلی ہی آیت میں بتادی۔ میں نے کہا ہے کہ نفسِ انسانی کی خصوصیت اُس کا اختیار و ارادہ ہے، خدا بھی اُس میں دخل نہیں دیتا۔ کہا ہے کہ **فَعَسَىٰ أَشَاءَ فَلْيُصْبِحَ وَمَنْ أَشَاءَ فَلْيَكُفِّرْ** (18)۔ میں نے کہا ہے کہ جہاں یہ اختیار و ارادہ سلب ہوا یعنی اس نے اپنے طور پہ اُس پہ کوئی پابندیاں عائد کر لیں تو وہ تو ان پابندیوں سے ”می شود از جبر پیدا اختیار“۔ جب وہ پانی ساحلوں کے اندر ہوتا ہے تو ایک نہر کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور وہ ہے جو تعمیری نتائج پیدا کرتا ہے۔

خدا تعالیٰ نے بھی اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں

اپنے اوپر جو پابندی خود عائد کی جاتی ہے اُسے جبر نہیں کہا جاتا۔ خدا نے خود اپنی ذات پہ بھی پابندیاں عائد کی ہوئی ہیں۔ کہا ہے کہ **عَلَىٰ نَفْسِنَا رَحْمَةً** (6:12) ہم نے اپنے اوپر فرض قرار دیا۔ تو جو اپنے اختیار سے برضا و رغبت پابندی عائد کرتا ہے، خدا یہ کہنے سے (معاذ اللہ) مجبور نہیں ہو گیا۔ **حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ** (30:47) آیا ہے۔ یہ جو بظاہر پابندی نظر آتی ہے تو یہ اصول یاد رکھیے کہ برضا و رغبت اگر کوئی اپنے اوپر پابندی عائد کرتا ہے تو یہ پابندی جبر نہیں کہلاتی۔ جبر وہ ہے جو دوسرے کی طرف سے پابندی عائد کی جائے۔ انسانی ذات کی تحسین و تزئین اور نشوونما (Development) اُس وقت ہوتی ہے کہ اس کے اختیار و ارادے کے اوپر خارج سے کوئی جبر نہ ہو بلکہ یہ از خود اُسے سواحل کے اندر محبوس کر دے۔ خدا بھی اس کے اوپر حفیظ اور وکیل اور دار و غم نہیں بننا چاہتا۔ اسے کہا ہے کہ اپنی ذات کے لیے یہ کچھ کرو۔ اگلی ہی آیت کے اندر یہ بات واضح کر دی۔ کہا کہ **وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ** (31:13)۔ لقمان اپنے بیٹے سے کہہ رہا ہے۔ قرآن نے یوں انداز بیان کیا ہے کہ لقمان بیٹے کو کچھ نصیحت کر رہے ہیں۔ **وَأَسْوَأَ يَظُنُّ** (31:13) وہ اس کو نصیحت

کر رہے ہیں، مار مار کر نہیں کہہ رہے حالانکہ بیٹے کو تو تھڑ مار مار کر بھی کچھ کرایا جاتا ہے۔ یہاں حکمت کی بات تھی اس لیے وہ اُس کو بھی نصیحت کے انداز سے سمجھا رہے ہیں۔ کہا کہ **لَا تَشْرِكْ بِاللَّهِ الشِّرْكُ لظَلَمٌ عَظِيمٌ** (31:13)۔ ویسے تو عظمت کے معنی بلندی اور حمیت ہوتا ہے، ”عظم“ ان ہڈیوں کو کہتے ہیں جن کے سہارے سارا جسم کام کرتا ہے۔ کہا کہ سب سے بڑا جو بنیادی ظلم ہے وہ شرک ہے۔

قرآن حکیم نے عبادت، پرستش، توحید اور شرک کے بنیادی تصورات کے فرق کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے

عزیزانِ امن! ہم نے جب اپنے ہاں عبادت کا ترجمہ پرستش کر لیا اور خدا کی پرستش کرنے لگ گئے تو اُس کو معبود کہا۔ اب ہم نے شرک کا مفہوم یہ سمجھ لیا کہ یہ بتوں کی پرستش کرنا ہے یعنی خدا کے سوا کسی اور کی پرستش کرنا، ہمارے ہاں شرک ہو گیا اور شرک کہتے ہی ان کو ہیں جو بت پرست ہوتے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ یہ بہت بڑی سازش تھی۔ الدین تو وہ نظام تھا جو آپ کو اعلون بنا رہا تھا، تمام اقوامِ عالم کے اوپر آپ کو غالب بنا رہا تھا۔ یہ کس طریق سے آپ کو وہ بنا رہا تھا؟ وہ یونہی اٹھا اٹھا کر تو نہیں بنا رہا تھا۔ یہ تو کچھ تصورات دیئے تھے کچھ اصول دیئے تھے کچھ اقدار دی تھیں، احکام دیئے تھے کچھ ساحل باندھے تھے۔ ان کے مطابق چلنے کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ اسلام جو الدین ہے وہ **لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ** (9:33) تمام دنیا کے جو نظام ہیں، یہ ان کے اوپر غالب ہو گیا اور جو مومن تھے ان کو **أَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ** (3:139) کہا تھا، یہ مومنین کا مقام تھا۔ یہ مقام بنیادی طور پر کس بنا پر حاصل ہوا تھا؟ اس سے جسے توحید کہتے ہیں۔ آج تو اس کے کچھ معنی ہی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں توحید وہ ہے جس نے دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا تھا اور اب یہ ”فقط مسئلہ علم الکلام“ ہے یعنی یہ اب علم کلام کا ایک مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ وہ کیا چیز تھی جس سے یہ ساری دنیا پر بالا و بلند ہوئے تھے؟ وہ تھی شرک سے اجتناب یعنی یہ کہ شرک نہ کیا جائے۔ یہ کہہ کر بڑا آسان ہو گیا کہ صاحب! ہم تو بتوں کی پرستش نہیں کرتے، خدا کے اس حکم کی تعمیل ہو گئی۔ بتوں کی پرستش تو انہوں نے ہزار برس سے چھوڑی ہوئی ہے لیکن نہ تو ان کا یہ اسلام **لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ** (9:33) ہوا، نہ یہ اعلون ہوئے۔ ہوا یہی کہ اس نے عبادت کہا تھا، انہوں نے پرستش شروع کر دی۔ پرستش سے تو یہ باقی مذاہب پر آگئے، بس طریق پرستش میں ذرا فرق ہو گیا۔ ہمارے ہاں ایک اصلاحی چیز ہوئی۔ کہا گیا کہ یہ قبروں پہ جانا اور دیئے وغیرہ جلانا غلط ہے لیکن اس سے بھی تو وہ بات نہ بنی کیونکہ یہ بھی ایک نظری سی چیز ہو گئی۔ یہ کیا چیز تھی جو یہ شرک ظلمِ عظیم تھا۔

خدا نے خود بتایا ہے کہ شرک کسے کہتے ہیں۔ کہا کہ **لَا تَشْرِكْ بِىْ خَعْبٌ آتٍ** (18:2) وہ اپنے حق حکومت میں کسی کو

شریک نہیں ہونے دیتا۔ خدا ان معنوں میں معبود نہیں ہے کہ وہ ایک پرستش کی شے ہے بلکہ وہ ان معنوں کے اندر ہے کہ حکم صرف اس کا واجب التعمیل ہے، حکومت صرف اُس کی جائز ہے۔ لا الہ کوئی اور الہ نہیں ہے۔ ہم نے تو الہ کا ترجمہ بھی معبود کر رکھا ہے کہ کوئی پرستش کے قابل نہیں سوائے اللہ کے جبکہ لفظ الہ کے معنی عربی زبان کے اندر صاحب اقتدار ہیں۔ لا الہ یہ ہوا کہ کائنات کے اندر کوئی نہیں جسے حق حکومت حاصل ہے۔ توحید یہ ہے کہ الا اللہ اُسی خدا کو حق حکومت حاصل ہے۔ یہاں کہا ہے کہ لَا يَشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (18:26) وہ اپنے اس حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا اور مومن کی Definition (تعریف) یہ ہے کہ لَا يَشْرِكُ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (18:110)۔ وہاں (18:26) میں ”حکم“ کا لفظ تھا یہاں (18:110) میں ”عبادت“ کا لفظ ہے۔ قرآن تو اپنے معنی آپ کر رہا ہے۔ کہا کہ مومن خدا کے حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا اگر شریک کیا جائے تو یہ شرک ہو گیا اور یہ ظلم عظیم اس لیے ہے کہ اس سے خدا تو اُس مقام سے نیچے آ گیا، اُس مقام پہ تو اُس صورت میں تھا کہ لا الہ ہوتا، کوئی اور دوسرا اُس کا ہمسرہ نہ ہوتا بلکہ اُس کا مقام منفرد ہوتا بلند ترین مقام اُس کا ہوتا لیکن جب بھی آپ نے کسی انسان کو اس کا حق دیدیا تو وہ اور یہ دونوں نیچے آ گئے۔ اور یہ انسان کہ جس نے اُس کا محکوم ہونا تھا، یہ اب اُس کے حق حکومت میں شریک ہو کر اُس کے مقام کے اوپر چلا گیا۔ یہ اپنے مقام پہ نہ رہا تو یہ ظلم ہو گیا، وہ اپنے مقام پہ نہ رہا، یہ ہو گیا ظلم۔ اُس نے کہا کہ یہ دونوں طرف سے ظلم ہے اور یہی تو ظلم عظیم ہے۔

عزیزانِ من! وہ **الانفس** (31:12) تھا کہ جو کچھ انسان کرتا ہے وہ اپنی ذات کے لیے کرتا ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما (Development) اس کی تحسین و تزئین اس طرح سے ہوتی ہے کہ اس کے اختیار و ارادے میں وسعتیں پیدا ہوں اور اگر یہ اپنے اوپر کسی قسم کی پابندی عائد کرتا ہے تو خود طیب خاطر اپنی رضا مندی سے عائد کرے جیسے خدا نے اپنی رضا مندی سے اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کی ہوئی ہیں۔ اسی طرح انسان خود اپنے اوپر پابندیاں عائد کرے۔ وہ پابندیاں **الانفس** (25:43) نہ ہوں کہ تمہاری اپنی خواہشات ہوں، اپنی آرزوئیں ہوں، اپنی تمنائیں ہوں، جو جہاں چاہیں بے محابہ ہو جائیں یعنی جہاں تک جی چاہے چلی جائیں یا جہاں جی چاہے رک جائیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ خدا کی بتائی ہوئی پابندیاں ہیں، صرف خدا کی بتائی ہوئی ہیں اور ان پابندیوں کو تم نے خود اپنے اوپر عائد کرنا ہے۔ یہ ہالہ دین یہ ہے صحیح اسلام۔ اسی لیے اُس نے کہا کہ **إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ** (12:40) جو الحکم ہے یہ صرف اُس کے لیے ہے، اس کی ذات کے لیے ہے، کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اب سوال یہ رہ گیا کہ جیسے خدا تو غیر محسوس، غیر مرئی (Invisible) ہے وہ تو **لَا تَرِيكَ الْبَصَرُ** (6:104) ہے۔ نہ وہ ہمارے سامنے آئے، نہ ہم اس کی بات سنیں تو

① (حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی خواہشات اور جذبات کو اپنا معبود بنا رکھا ہے) سو جو شخص اپنی خواہشات کا غلام اور پرستار بن جائے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 824)۔

② انسان کا علم محسوسات تک محدود ہے۔ اس کی نگاہیں غیر محدود و غیر محسوس ذات خداوندی کی کنہ و حقیقت تک پہنچ ہی نہیں سکتیں۔ اس کے برعکس وہو بدرک الابصار (6:104) علم خداوندی تمام نگاہوں کو محیط ہے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 313)۔

کیسے معلوم ہو کہ اُس کا حکم کیا ہے؟ اُس کی حکومت کیسے اختیار کریں اور یہ معلوم ہو کہ یقینی طور پر واقعی اُس کی حکومت ہو رہی ہے؟ اُس نے کہا کہ بات بڑی آسان ہے۔ ہم تو سامنے نہیں آتے، ہم تو محسوس نہیں ہیں لیکن ہم نے اپنے احکام کا ایک ضابطہ خود تمہاری طرف نازل کر دیا ہے۔ ہمارا حکم بھی انفرادی طور پر نہیں مانا جائے گا بلکہ قانون کی اطاعت کی جائے گی۔ Rule of Law (قانون کی حکمرانی) ہوگا، وہ ڈکٹیٹر بھی نہیں بننا چاہتا۔ قانون کی کتاب دیدی کہ یہ قانون ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ کسی انسان کو اس میں حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے لیے قانون بنائے۔ جسے آپ اسلامی حکومت کہتے ہیں وہ قانون نہیں بناتی ہے بلکہ وہ خدا کے قوانین کو ان حالات کے مطابق نافذ کرتی ہے جن حالات میں اُس دور میں انسان گزر رہے ہوتے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی صفات کو انسان انسان کے اندر علی حد بشریت پیدا کرنا ہے

عزیزانِ من! ایک بات اور سن لیجیے کہ خدا کی صفات انسان کے اندر علی حد بشریت پیدا ہوتی جاتی ہیں لیکن خدا کی جو صفت یا جو خصوصیت ہوتی ہے اُس کی وہ صفت یا خصوصیت اس کے اندر داخل نہیں ہونی چاہیے۔ اگر وہ داخل کر دی جائے تو پھر یہ خدا بن جاتا ہے پھر یہ شخص خدا کے مقام پہ پہنچ جاتا ہے۔ یہ تو خدا کی صفات کو انسان کے اندر علی حد بشریت پیدا کرنا ہے۔

ایک دوسرے پر حکومت کرنے کا تصور حیوانات میں بھی نہیں پایا جاتا ہے

خدا کے احکام کے متعلق اُس نے خصوصیت یہ دی تھی کہ لَا تَبْدِيلَ لِكَالِهِ اللَّهِ (10:64) اُس کے ان قوانین میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اگر ان میں تبدیلی کر دی جائے تو یہ بھی شرک ہے اور اگر انسانوں کے بنائے ہوئے کسی قانون میں یہ خصوصیت پیدا کر دی جائے کہ وہ تبدیل ہی نہیں ہو سکتے تو یہ بھی شرک ہے۔ یہ جسے آپ آدمیت کی تاریخ کہتے ہیں، وہ اسی خوں فشاں داستان کا تذکرہ ہے کہ ہر انسان چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح دوسرے انسان پر کچھ حکومت کرے، کچھ دباؤ رکھے جبکہ حیوانات کے اندر یہ بات نہیں ہوتی۔ شیر جیسا تو توں کا مالک، کبھی کسی دوسرے شیر کے اوپر اس طرح حکومت نہیں چاہتا، وہ اپنی نوع کے کسی فرد کے اوپر حکومت نہیں چاہتا۔ یہ انسان کے اندر ایک ہوس ہے کہ دوسرے انسان کے اوپر کچھ اتھارٹی رکھے، خواہ چھوٹی سی رکھے۔ اس میں وہ لذت لیتا ہے۔

انسان میں کسی ادنیٰ سی سطح پر بھی حکومت کرنے کا تصور اسے فرعون بنا دیتا ہے

عزیزانِ من! آپ چھوٹے سے چھوٹے پیمانے سے شروع کیجیے تو دیکھیے کہ یہ جو مزدور ہوتے ہیں تو انگریز نے ان میں سے ایک کو

Mate بنا دیا۔ اُس زمانے میں فلی کی تنخواہ آٹھ آنے زیادہ ہوتی تھی لیکن ”اوہ میٹ فیر کے نوں حقہ وی نہیں پین دینداسی“^①۔ باقی سارے مزدور تھے اور یہ میٹ تھا تو اُس کی گردن اکڑ جاتی تھی۔ یہ کیا چیز تھی؟ یہ اپنے جیسے انسانوں پر تھوڑا سا حق حکومت اُس کو مل گیا تھا۔ جونہی یہ چیز آئی یہ انسان سے شیطان ہوا۔ دفنوں میں سارے کلرک ہوتے تھے ایک کو ہیڈ کلرک کہہ دیا جاتا تھا، کبھی تو اس کو کچھ الاؤنس دیدیا جاتا ہے ”کدوی ایویں ای ٹرخایا جاندا تے ایہدے ای خوش ہوندا ہیگا کہ ہیڈ کلرک تے ہیگاں“^②۔ اُس کی بیوی سے بھی پوچھیے تو وہ کبھی یہ نہیں کہتی کہ میرے میاں وہاں کلرک ہیں بلکہ وہ کہتی ہے کہ ”اوجی او تھے ہیڈ کلرک نیں“^③۔ اس جذبے کو آپ دیکھیے اور اسے بڑھاتے چلے جائیے۔ کتنا ہی دولت مند دکاندار کیوں نہ ہو اُس کی یہ کیفیت نہیں ہوتی لیکن جونہی اُس نے انڈسٹری قائم کی اور اُس کے ماتحت ہزار مزدور ہوئے تو اُس کے بعد اُس کو دیکھیے کہ وہی جو دولت مند تھا اب کیا بن گیا ہے۔ کسی آدمی کا کیریکٹر پرکھنا ہو تو اُس وقت پرکھو جب وہ خاوند بن جائے ہمارے ہاں تو اُسے کہتے ہی خداوند مجازی تھے۔ وہ تو ذرا سی جھک پیدا ہوئی اُس (لفظ خداوند) میں سے ”ذ“ نکال دیا اور وہ ”خاوند“ بن گیا، ورنہ اندر سے وہ اپنے آپ کو خداوند ہی سمجھتا ہے۔ پھر (معاذ اللہ، معاذ اللہ) حدیثیں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیں کہ (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر خدا کے سوا کسی کو سجدے کی اجازت ہوتی تو میں عورت کو کہتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کیا کرے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آدمی کا کیریکٹر پہچانا ہو تو اُس وقت دیکھیے جب وہ خاوند بن جائے۔ اب میری بہنیں اور میری بیٹیاں ہنس تو رہی ہیں تو اب آپ کی بھی بات کہہ دوں۔ جب کسی عورت کا کیریکٹر پہچانا ہو تو اُس دیکھیے جب وہ ساس بن جائے۔ عزیزانِ من! بات ساری اتنی ہے کہ

آدمی کو خدا نہ دکھلائے آدمی کا کبھی خدا ہونا

ساری قیامت اس کے اندر ہے۔

مالکِ یوم الدین کا عملی مفہوم اور اس کی خصوصیت

جسے آپ دین کہتے ہیں، دن میں معلوم نہیں کتنی دفعہ ہم نماز پڑھنے والے کوئی چوالیس مرتبہ تو مالکِ یوم الدین کہتے ہی ہیں اور الدین تو ہم روزِ پکارتے ہیں، دین ہر وقت ہم زبانوں پہ لاتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ الدین کیا ہے؟ وہ نظام جس میں حکومت صرف خدا کی

① لیکن وہ میٹ کسی کو تھوڑی سی فرصت بھی نہیں لینے دیتا تھا کہ وہ حقہ پی سکے۔

② کبھی اسی طرح (بغیر الاؤنس) ٹرخا دیا جاتا ہے لیکن اس پر بھی وہ خوش ہو جاتا ہے کہ ہیڈ کلرک تو ہوں۔

③ جی! وہ وہاں ہیڈ کلرک ہیں۔

قائم رہے۔ الدین کی تشریح قرآن نے خود کر دی۔ کہا کہ تم روز دین اور الدین کہتے ہو تو سنو! وَمَا آتَاكُمَا يَوْمَ الْيَوْمِ
(82:17) کچھ علم بھی ہے تمہیں کہ جب الدین نافذ ہو تو اُس دور کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ اتنا اہم ہے کہ کہا کہ ثُمَّ مَا آتَاكُمَا يَوْمَ
الْيَوْمِ (82:18) ایک دفعہ پھر پوچھتا ہوں تم سے کہ کچھ معلوم بھی ہے تمہیں کہ الدین جس دور کے اندر نافذ ہوگا تو اُس دور کی کیفیت
کیا ہوگی؟ عزیزانِ من! توجہ سے سنئے قرآن کا ایک لفظ Miss (بھول) نہ کر جائیے گا۔ کہا کہ يَوْمَ لَا تَعْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا
(82:19) جس میں کسی انسان کا کسی دوسرے انسان پہ کوئی دباؤ نہیں ہوگا۔ یہ ہے الدین کا دور۔ تو کیا انارکی (انتشار) ہو جائے گی؟ کہا
کہ وَالْأَعْرَافُ يُوسَّيْئِلُهُ (82:19) اس دور میں معاملات سارے اُس کے قانون کے مطابق چلیں گے۔ عزیزانِ من! کہا ہے کہ يَوْمَ
لَا تَعْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا (82:19) کسی بات میں بھی کوئی انسان دوسرے انسان کا دبیل ❶ نہیں ہوگا۔ یہ ہے الدین اور اب
بات سمجھ میں آئی جو کہا کہ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (31:13) یاد رکھو! شرک ظلم عظیم ہے۔ خدا کو واحد مان لینے سے کہ صرف ایک
ہی خدا ہے اُس کا کیا سنو رہا ہے دوسرا کہتا ہے کہ نہیں دس بیس ہیں تو اُس کا کیا بگڑتا ہے کوئی کہتا ہے کہ ہے ہی نہیں تو اُس کا کیا بگڑتا ہے۔
وہ تو غِنَى عَنِ الطَّعَامِ (3:97) ہے۔ انسان تو ایک طرف جب یہ پوری کائنات ہی نہیں تھی تو وہ تو اُس وقت بھی خدا تھا۔ اُس کا
کچھ نہیں بگڑتا بلکہ انسان ہی کا بگڑتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے درس میں یہ بات سنائی تھی یا نہیں کہ یہ جو شرک کے معنی ہیں ہماری
نگاہوں سے تو یہ صدیوں سے اوجھل رہے ہیں۔ ہم نے بت پرستی کو ہی شرک سمجھا ہے اور اس سے اجتناب کیا تو تو حید والے بن گئے یا مثلاً
قبروں پہ جس نے جانا چھوڑ دیا تو تو حید والے بن گئے۔

1935ء میں تو حید کے ہی سلسلہ میں ملازمت کے دوران علامہ پرویز کے ساتھ ایک ہونے والا ذاتی واقعہ
غیر مسلم اور خاص طور پہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تو اُمِ مغرب اچھی طرح جانتی تھیں کہ شرک کیا ہے اور اسلام میں تو حید کسے کہتے ہیں۔ یہ
ایک ذاتی واقعہ ہے جسے میں عرض کر رہا ہوں اور آپ کو معلوم ہے کہ میں درس میں ذاتی باتیں نہیں کیا کرتا۔ چونکہ یہ واقعہ میرے ساتھ ہوا
ہے اس لیے میں کہہ رہا ہوں۔ یہ واقعہ غالباً 1935ء میں یا جب پہلی دفعہ ”آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دلی“ قائم ہوا پیش آیا اور پہلی دفعہ ہی یہ
سوال سامنے آیا کہ جو گورنمنٹ سرونٹ ہیں کیا ان کو بھی ریڈیو پر تقریر کرنے کے لیے بلایا جائے کیا ان کو اجازت دی جائے یا نہ دی
جائے؟ سوال اس طرح سے پیدا ہوا کہ حج کی تقریب تھی۔ میں وہاں کی مسجد میں خطبے بھی دیا کرتا تھا نمازیں بھی پڑھایا کرتا تھا۔ عام طور
پہ سیکرٹریٹ کے اندر کچھ مسلمانوں کا نمائندہ بھی سمجھا جایا کرتا تھا لکھتا پڑھتا بھی تھا کتابیں بھی تھیں۔ انہوں نے مجھے بلایا کہ حج کی

تقریب پر ریڈیو پہ ایک تقریر کرو۔ پہلی دفعہ یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا گورنمنٹ سرونٹ ریڈیو پہ جاسکتا ہے یا نہیں؟ میں ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھا جسے اب منسٹری آف انٹیریئر (وزارت امور داخلہ) کہتے ہیں۔ یہ اس قسم کے تمام معاملات وہیں طے ہوا کرتے تھے۔ یہ سوال وہاں ہوم ڈیپارٹمنٹ میں آیا اور بات چلی کہ اجازت دی جائے یا نہ دی جائے کیونکہ یہ بات اصولی نوعیت کی تھی۔ نیچے سے یہ چیز کبھی گئی کہ اجازت دی جائے لیکن مقرر کو کہا جائے کہ وہ پہلے اپنی تقریر کا مسودہ پیش کیا کرے یہاں سے وہ مسودہ دیکھ لیا جائے۔ اگر وہ قابل اعتراض نہ ہو تو پھر اجازت دیدی جائے۔ یہ بات اوپر چلی گئی۔ سیکرٹری، مشرقی علوم کا فاضل تھا۔ وہ مجھے اس لیے بھی جانتا تھا کہ یہ ایک قدر مشترک بھی تھی۔ اُس نے مجھے بلایا اور کہنے لگا کہ یہ سوال آیا ہے تو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہارا اس تقریر میں موضوع کیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ جی! یہ خالص ایک مذہبی تقریر ہے، مذہبی موضوع ہوگا، میں اسوہ حضرت ابراہیم ♦ پیش کروں گا اور اس سلسلے میں حج کی بات آئی ہے۔ میں نے اسوہ ابراہیمی ♦ کو اپنا موضوع قرار دیا ہے اور اُس کے مطابق میں وہاں تقریر کروں گا۔ مجھ سے کہنے لگا کہ اچھا! اسوہ ابراہیمی ♦ پہ آپ تقریر کریں گے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ صاحب! یہ تو بڑا Innocent (معصوم) سا موضوع ہے، مذہبی تقریر ہے، مذہبی تقریر ہونی ہے۔ اس کو تو سیاست سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ کہا کہ اسوہ ابراہیمی ♦ کے اندر یہ کہو گے جو قرآن نے کہا ہے جو

حضرت ابراہیم ♦ نے کہا تھا کہ اِنِّیْ وَجَعْتُ وَجِیْعًا لِّبَنِّیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (6:80)۔ مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ کہو گے؟ میں نے کہا کہ ہاں جی یہ تو آیت ہے اور میں یہاں سے شروع کروں گا۔ کہنے لگے کہ جو مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (6:80) ہے تو کیا آپ کو پتہ ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ لَا تُشْرِکْ فِیْ حُکْمِہٖ اَحَدًا (18:26) وہ اپنے حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ کہنے لگے کہ یہ جو یہاں برطانیہ کی حکومت قائم ہے یہ تو شرک عظیم ہو جائے گی۔ کیا اس کا کوئی تعلق سیاست سے نہیں ہے؟ عزیزانِ من! میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ یعنی اس اعتبار سے کہ یہ چیز جو ہم ہزار سال سے بھولے ہوئے ہیں، ہم نے اس کو بت پرستی قرار دیا ہے لیکن یہ تو میں کس طرح سے یہاں پہنچی ہوئی ہیں کہ شرک کے معنی وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔

اُس وقت میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ تو میں جو چاہتی ہی نہیں ہیں کہ کسی طرح سے بھی اسلام کا احیا ہو تو یہ اس لیے نہیں کہ جو ہم کہتے ہیں کہ صلاح الدین ایوبی کا یہ بدلہ لے رہے ہیں بلکہ اس لیے ہے کہ انہیں پتہ ہے کہ جو اسلام ہے وہ کیا ہے، الدین کس کو کہتے ہیں؟ یہ دین تو کسی انسان کی حکومت کو مانتا نہیں ہے، یہ اگر دنیا کے اندر قائم ہو گیا تو کسی انسان کی حکومت ہی باقی نہیں رہے گی۔ یہ وجہ ہے جو مذہب کی تو اتنی اجازت دیئے چلے جاتے ہیں اتنی Facilities (سہولیات) ہمیں وہاں انگریز کے زمانے میں مذہب میں حاصل تھیں۔

انگریز نے آزادی کی جنگ کے بعد آتے ہی جو اعلان کیا تھا وہ یہی کیا تھا کہ ہندوستان میں رہنے والے تمام اہل مذاہب کو ان کی مذہبی آزادی ہوگی اور پھر اس کے گن گائے گئے، قصیدے پڑھے گئے۔ وہ جو (الطاف حسین) حالی (1837-1914ء) نے کہا تھا:

بجنا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹا

سنکھ اور اذان گو بجتے ہیں روز برابر

یعنی جن کی حکومت ہے، ان کے ہاں تو آٹھویں دن جا کر کہیں پکار ہوتی ہے اور آپ اندازہ لگائیے کہ ان کی حکومت نے تم کو اتنی آزادیاں دی ہیں کہ ”سنکھ“ اور اذان گو بجتے ہیں روز برابر۔ اذان کی آزادی تو تھی لیکن اللہ اکبر کے معنی سمجھنے کی آزادی نہیں تھی۔ وہاں نمازوں کا بڑا اہتمام ہوتا تھا، اس قدر اس کے لیے انتظامات ہوتے تھے کہ پہلے سیکرٹریٹ کے درمیان میں وہ ایک عام سی گاؤں کی مسجد تھی پھر وہ اتنی عالیشان مسجد بن گئی تھی اور میں وہاں خطبے دیا کرتا تھا۔ یہ کاہے کی آزادی تھی؟ یہ مذہب کی آزادی تھی۔ دین کے متعلق تو اس سیکرٹری نے مجھے بتایا دیا تھا کہ یہ اسوۂ ابراہیمیؑ پیش کرو گے اور اس کے بعد تم کہو گے کہ یہ توحی مذہبی تقریر ہے، اس کو سیاست سے کیا تعلق!! یہ الگ بات ہے کہ اس کے بعد اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا کہ میں نے اس کے اوپر یہ آرڈر پاس کیے ہیں کہ یہ تقریر کرنے والا سمجھ بوجھ کا آدمی ہے، گورنمنٹ سروس کے اندر بھی ہے، سروس کے قواعد و ضوابط سے واقف بھی ہے۔ اگر اس کو ملازمت کے اندر رہنے کی ضرورت ہوگی تو خود اپنی تقریر پہ پابندی کرے گا اور اگر جی نہیں چاہے گا تو اس کو توڑنے گا، اس کو ملازمت سے نکال دینا، یہ خود ہی بھگلتا پھرے گا۔ میں کہہ رہا تھا کہ شرک کے معنی وہ جانتے تھے اور اب بھی یہ تو میں جانتی ہیں۔

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

یہ گل ہے جو نہیں جانتا تھا مگر یہ تحریک پاکستان کے زمانے میں جو ہماری مخالفت کرنے والے علاقے، اس کا ان کے ساتھ جھگڑا ہی اتنا تھا۔ وہ جھگڑا اقبالؒ (1877-1938) نے ایک شعر میں بیان کر دیا ہے:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت

نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلام کا احیا تو مذہب کی بجائے دین کی حکمرانی سے مشروط ہے

عزیزانِ من! اسلام کی آزادی تو اس دن ہوگی، جس دن کیفیت یہ ہو کہ لَا يَشْرِكُ فِيهَا حَكِيمٌ أَحَدٌ (18:26) اور اس کے

بعد پھر عملاً کیفیت یہ ہو کہ اُس دور کے اندر ایک خدا کی محکومیت اختیار کرنے سے دنیا کی ہر حکومت سے انسان اونچا ہو جائے **يَوْمَ لَا تَعْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا** (82) اسلام کا احیا اُس دور میں ہوگا جب کیفیت عملاً یہ ہوگی کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا ذمیل نہیں رہے گا۔ اب آپ نے بات سمجھ لی کہ **وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ** (31:13) اور پھر یہ چیز کہ **يُبْنِي لَا تَشْرِكُ بِاللّٰهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ** (31:13)۔ لقمان کی حکمت کی باتوں میں سے دو ہی چیزیں پہلے ہمارے سامنے آئیں آگے بھی بات آتی چلی جائے گی لیکن مضمون دوسرا شروع ہو رہا ہے اس لیے میں اجازت چاہتا ہوں۔

آج ہم سورۃ لقمان کی دو ہی آیات 12 اور 13 لے سکے ہیں 14 ویں آیت سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط

.....

تیسرا باب: سورة لقمن (آیات 14 تا 16)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1979ء کی 26 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة لقمن کی آیت 14 سے ہو رہا ہے:

(31:14)

آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلی آیات میں لقمان کی چند حکمت آموز باتوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ ہم یقینی طور پہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ان کا شمار مہرہ انبیاء میں تھا کیونکہ قرآن نے ایسا نہیں کہا لیکن جو کچھ اُس میں کہا گیا ہے وہ قرآنِ کریم کی تعلیم کے ہی مطابق ہے بلکہ اُسی کے احکام ہیں اُسی کی تعلیم ہے۔ پچھلی آیت تک تو ہم آچکے تھے کہ **إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (31:13)**۔ شرک کو ظلمِ عظیم کیوں کہا گیا اس کی وضاحت میں نے کی تھی۔ خدا کے سوا کسی اور کی محکومیت یا اطاعت اختیار کرنا شرک ہے اور ظلمِ عظیم اس لیے ہے کہ اس طرح سے نہ خدا اپنے مقام پہ رہتا ہے اُس کے برابر ہم دوسرے کو بٹھا دیتے ہیں اور نہ انسان اپنے مقام پہ رہتا ہے اسے اس کے مقام سے جو اس کا خدا کی محکومیت کا مقام تھا ہم اس سے اونچا لے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ ظلم ہے۔ اور چونکہ معاملہ ایک طرف خدا کا اور دوسری طرف انسان کا ہے جو کہ کائنات میں سب سے اشرف اور صاحبِ اختیار ہے ان دونوں کو جب اپنے مقام سے ہٹا دیا جائے تو یہ ظلمِ عظیم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے جسے قرآنِ کریم نے شرک کہا ہے۔ یہ شرک بت پرستی نہیں ہے پرستش کا تو سوال ہی قرآن میں نہیں آتا۔

والدین سے حسن سلوک: لقمان کی بات

لقمان کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اگلی بات قرآن نے یہ بھی ہے کہ **وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهَنَا عَلَى وَهْنٍ وَفِضْلُهُ فِي عَاقِبَيْنِ إِنْ أَشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ إِلَى الْعَصِيرِ - وَإِنْ جَاهَدَكَ عَلَى أَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبُكُمْ فِي النَّيِّا مَعْرُوفٌ لِّبَعِ سَبِيلَ مَنْ آتَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (31:14)** ہم نے (خدا نے) والدین کے متعلق بھی انسان کو کچھ احکام اور ہدایات دی ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ اُس کی ماں کو دیکھو کہ پہلے تو وہ نومینے تک اُس گوشت کو اپنے رحم میں اٹھائے پھرتی ہے اور پھر اُس کی رحم کے اندر ہی اس طرح سے پرورش ہوتی ہے کہ ماں کا اپنا ہی ایک جسم کا جزو ہے جس سے یہ بچہ تیار ہو رہا ہے۔ گویا وہ اپنے جسم کا ایک حصہ اس بچے کی تخلیق کے لیے منتقل کیے جا رہی ہے خود کمزور ہوتی چلی جاتی ہے اور اُس بچے کی تخلیق کیے چلی جاتی ہے۔ عجیب انداز سے یہ چیز کہی۔ پھر اُس کے بعد وہ پیدا ہوتا ہے تو کم از کم دو سال تک اُس کو دودھ پلاتی ہے۔ یہ جو دودھ ہے یہ بھی تو اندر کوئی خارج کی مشین تو لگی ہوئی نہیں ہے کہ جہاں سے وہ دودھ ہے بلکہ ماں کے اپنے جسم کا ہی حصہ ہوتا ہے اُس کے خون ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے جسے وہ بچے کی پرورش کے لیے ادھر منتقل کرتی چلی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق کہا تھا کہ اُس کی صفتِ رحیمیت ہے۔ وہ جو میں نے عرض کیا ہے کہ جو ”رحم“ ہے وہ مادہ ہی ایک ہے۔ خدا کی صفتِ رحیمیت اور اُس کے ساتھ ماں کی جو رحیمیت ہے یہ دونوں اس بچے کی اندر شامل ہوتی ہیں۔ کہا ہے کہ **إِنْ أَشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ (31:14)**۔ اس میں پہلے کہا تھا **إِنْ أَشْكُرْ لِلَّهِ (31:12)** خدا کا شکریہ بھی ادا کرو اور اس کے ساتھ ہی ان والدین کا بھی شکریہ ادا کرو۔ یہ شکر یہ ادا کرنا کیا چیز ہے؟ باقی کائنات کو چھوڑ دیجیے انسانی بچے کو لیجیے۔ آپ یہ دیکھیے رحمِ مادر کے اندر اُس کی پرورش کا اور ربوبیت کا جو انتظام ہے یہ رحیمیت ہے کہ خدا کی طرف سے سامانِ نشوونما ملتے چلے جانا اور نہایت لطافت و راحت و محبت سے بلا مزد و معاوضہ ملتے چلے جانا۔ یہ خدا کی رحیمیت تھی اُس کا ایک نظام ہے اُس کا ایک انتظام ہے جو رحمِ مادر میں ہوتا ہے۔ اس میں اُس ماں کا اپنا کوئی حصہ خود نہیں ہوتا یعنی یہ اُس کی اپنی کوشش ہے یا اپنے کسب و ہنر سے نہیں ہوتا اُس کے اختیار و ارادے سے بھی نہیں ہوتا۔ یہ تو خالص خدا کی طرف سے رحیمیت ہے۔ اس رحیمیت کا یہ جو درجہ ہے یہ جو حصہ ہے اس کے لیے تو خدا کا شکریہ ہے۔

بچے کی پیدائش کے بعد ماں کی مامتا کا بدرجہ اتم کردار

اب اُس کے بعد بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اُس پیدا ہونے میں یہ جو اُس کے لیے ذریعہ پرورش ہے جسے دودھ کہا جاتا ہے یہ بھی خدا ہی کے نظام کے تابع ہوتا ہے۔ وہی جو رحمِ مادر کے اندر تھا اُسی کی ذرا بدلی ہوئی شکل باہر آ گئی۔ اس میں اب ماں بھی شریک ہوتی ہے۔ یعنی

رحم کے اندر یہ بات نہیں تھی کہ ماں نہ چاہے تو بچے کی جو پرورش ہے وہ نہ ہو سکے۔ یہاں باہر آنے کے بعد سامان خدا کا دیا ہوا ہوتا ہے لیکن اُس کے اندر اُس بچے کو بروقت دودھ دینا، صحیح دودھ دینا، اُس کی حفاظت کرنا، اُس کی پرورش کرنا، نگہ پر داخت کرنا، ماں پہ ہوتا ہے۔ گویا بچے کی نشوونما کا جو پہلا مرحلہ تھا وہ خالصتاً خدا کی طرف سے سامان بھی تھا اور نگہبانی بھی اُسی کی تھی، ماں کا اُس کے اندر دخل ہی نہیں تھا۔ وہ تو جیسا قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ تو ایک بوجھ اٹھائے ہوئے تھی، حمل کے معنی ہی بوجھ ہوتا ہے۔ اُس میں اس کا دخل نہیں تھا۔ اب بچے کی پیدائش کے بعد سامان نشوونما تو خدا ہی کی طرف سے مل رہا ہے لیکن اُس میں اب ماں کا دخل ہو گیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اُس سامان نشوونما کو اس بچے کی پرورش کے لیے صرف میں لائے۔ اب اس میں انسان یعنی ماں اور خدا دونوں شریک ہو گئے۔ ماں کے اندر ایک جذبہ جو بچے کی پرورش کا ہے وہ ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ یہ حیوان اور انسان میں مشترک ہے۔ حیوانی بچے کی ماں بھی اُسی طرح سے بچے کو دودھ دیتی ہے اور اُس کی پرورش کرتی ہے۔

پرورش کے سلسلہ میں انسانی بچے اور حیوانی بچے میں بنیادی فرق ہے

انسانی بچے کی ماں کو بچے کی پرورش کے لیے اُس سے زیادہ تر دو اور مشقتیں اٹھانا پڑتی ہے اور پھر اس کے لیے اتنا لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ حیوانوں کے تو بچے اتنے میں خود بچے پیدا کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جتنے میں یہ میاں صاحب گھٹنے چلنے کے بھی قابل نہیں ہوتے۔ دواڑھائی سال تک کے لیے انسانی بچہ ماں کے دودھ پہ رہتا ہے۔ حیوانوں میں سے کوئی حیوان بھی ایسا نہیں ہے جس کا بچہ اتنے لمبے عرصے تک اس طرح سے اس نشوونما کے اوپر رہے۔ اور پھر ماں کی محبت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اُس کا توجہ چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو بچے کے اندر اٹھیل دے، اُس کو فکر ہی اُس بچے کی ہوتی ہے۔ ذرا دودھ میں کمی ہوئی تو ماری ماری پھرتی ہے کہ میرے دودھ میں کمی کیوں ہوگئی، بچہ بھوکا رہ جائے گا۔ اپنے دودھ کی افزائش کے لیے کہیں غذاؤں کا انتظام ہے، کہیں دواؤں کا انتظام ہے۔ بچہ اگر کسی وقت دودھ نہیں پیتا ہے تو یہ نہیں کہتی کہ چلو اچھا ہوا میرا آج کا دودھ تو بیچ گیا بلکہ اُس کے لیے پھر وہ ماری ماری پھرتی ہے کہ بچہ کیوں دودھ نہیں پی رہا۔ وہ ڈاکٹروں کے پاس جاتی ہے اس کا علاج کراتی ہے۔ کیفیت یہ ہوتی ہے کہ سردیوں کی ٹھنڈی رات میں وہ بچہ ساتھ سلایا ہوا ہوتا ہے وہ رات کو پیشاب کر دیتا ہے تو وہ جگہ ٹھنڈی ہو جاتی ہے، ماں خود اُدھر سو جاتی ہے اور بچے کو خشک جگہ پہ سلاتی ہے، اگر وہاں بستر پہ جگہ نہیں رہتی تو وہ اپنے پیٹ پہ اُس کو سلاتی ہے۔ یعنی اُس کی زندگی کا، اُس کی کوششوں کا، اُس کی امیدوں کا سارا محور ہی یہ بچہ ہو جاتا ہے۔

ماں کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے دامن کے حسین و جمیل خوابوں کے تصور میں گزرتا چلا جاتا ہے پہلے ہی دن سے اُس کے ذہن میں یہ ہے کہ چاند بچہ ہے، سہرے لگیں گے، یہ کچھ ہوگا۔ اُس کی اتنی لمبی تمنائیں اس بچے کے ساتھ

مرکوز ہوتی ہیں۔ وہ جب ابا اماں کہنے لگتا ہے تو پوچھو نہیں کہ کس طرح نذر نیاز بانٹتی ہے خوشی میں لڈو تقسیم کرتی ہے کہ بچے نے بولنا سیکھا ہے۔ اور اگر وہ دو قدم چلنا سیکھتا ہے تو پوچھو نہیں کہ ماں کا دل کتنا بلیوں اچھلتا ہے ایک ایک کو کہتی ہے کہ اب تو منے نے چلنا بھی سیکھ لیا ہے کھڑا ہونے بھی لگ گیا ہے۔ یعنی آپ دیکھیے کہ یہ کیا جذبہ ہے جو یہ پیدا ہو گیا ہے۔ اُس کے بعد یہ جو سالگرہ منانے کی چیز ہے تو یہ ماں کے اسی سفر کے جذبے کے ابھار کی ایک شکل ہے۔ کہتی ہے کہ ماشاء اللہ بچہ ایک سال کا ہو گیا ہے اب اس کی دوسری سالگرہ ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ساری توجہات کا مرکز یہ بچہ ہو جاتا ہے۔ یہ جذبہ اُسی خالق نے پیدا کیا ہوا ہے اس میں سامانِ نشوونما یعنی جو دودھ ہے وہ بھی اُسی کا ہے لیکن اُس کے بعد اس کی تقسیم کا جو انتظام ہے اس کا جو استعمال ہے اُس میں اب انسان ساتھ آ گیا۔

خدائے رحیم کی رحمانیت میں طبقاتی تقسیم کوئی وجود نہیں رکھتی

عزیزانِ من! اب یہیں سے ایک نقطے کی طرف آجائیے کہ اُس نے جو سامانِ نشوونما دیا ہے تو محل یا کوٹھی کے اندر رہنے والی بیگم صاحبہ کے رحم کے اندر بچہ ہو یا اُس کے سروٹ کوارٹیا جھونپڑی کے اندر مزدور کی بیوی کا بچہ ہو خدا کی رحیمیت دونوں جگہ یکساں کام کر رہی ہوتی ہے۔ وہاں امیر اور غریب کے بچے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ جب بچہ دنیا میں آتا ہے تو جس قسم کا دودھ جس انداز سے اس بیگم صاحبہ کی چھاتیوں سے آتا ہے اُسی قسم کا اُس مزدور کی بیوی کی چھاتیوں سے آتا ہے اُس کی رحیمیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اب اس میں اگر کسی جگہ کوتاہی ہوتی ہے تو میں نے کہا ہے کہ انسان بچ میں آ جاتا ہے۔ لیکن وہ جو اس بچے کی پرورش کے لیے دودھ دے رہا ہے وہ دونوں میں یکساں ہوتا ہے۔ اُسی طرح سے دونوں میں عرصہ گزرنے کے ساتھ وہ دودھ گاڑھا ہوتا چلا جاتا ہے جوں جوں بچے کے معدے میں ہضم کی قوت بڑھتی چلی جاتی ہے وہ دودھ پتلے سے گاڑھا ہوتا چلا جاتا ہے کہ غذائیت زیادہ ہو اور ”مائیت“^① اُس کے اندر کم ہو۔ یہ اُس مزدور کی بیوی اور رئیس صاحب کی بیوی کے اندر دونوں میں یکساں طور پر یہ نظام کار فرما رہتا ہے کیونکہ یہ اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔

انسانیت کی برادری کو سامانِ نشوونما کے بل بوتے پر تقسیم کرنا عظیم شرک ہے

جونہی وہ پرورش کا پہلا نظام ختم ہوتا ہے اور بچے کی پرورش یا اُس کی نشوونما انسانوں کے ہاتھوں سے ہوتی ہے تو اب محل کے بچے میں اور اس کوارٹ کے بچے میں فرق پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ وہ جو سامانِ نشوونما دیا ہوا ہے وہ اُسی کا دیا ہوا ہے لیکن اب وہ انسانوں کے ہاتھ میں ہے اس سے تفریق شروع ہو جاتی ہے اور یہ تفریق شرک ہے۔ یہیں سے سارے مسائل شروع ہوتے ہیں۔ بچے کے دودھ پینے تک

① یعنی پانی (یہ ماء سے ہے)

نہ اُس مزدور کی بیوی کے بچے میں اور نہ اُس بیگم صاحبہ کے بچے میں کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔ جو ملتا ہے، جس انداز سے ملتا ہے، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ جب تک رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اُس وقت تک تو ان دونوں میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اور جو نبی زندگی کا اگلا قدم اٹھتا ہے اور انسانوں کے ہاتھوں میں رزق کی تقسیم آتی ہے تو مزدور کی بیوی اور شہزادے کے بیٹے میں فرق شروع ہو گیا اور ساری عمر اس کے اندر فرق رہے گا۔ خدا نے تو کوئی فرق نہیں کیا تھا، رحم مادر میں کوئی فرق نہیں کیا تھا، جو دودھ اُس نے دونوں بچوں میں سپلائی کیا تھا اُس میں کوئی فرق نہیں کیا تھا۔ لیکن جب بھی وہ بچہ کچھ کھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو اب یہ جو اس کے منہ میں لقمہ جاتا ہے اور اُس کے منہ میں لقمہ جاتا ہے تو یہاں آ کر طبقاتی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں سے شرک ہو جاتا ہے کیونکہ انسان نے اُس کے اندر دخل دینا شروع کر دیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اس ماں کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنا خون، اپنی روح، اپنی جان سب کچھ انڈیل کر بچے کے اندر ڈال دے۔

انسانی دنیا میں انسان کے اختیار و ارادے پر پہلی پابندی

میں نے جو ابھی ابھی کہا ہے کہ وہ دو قدم چلنے لگتا ہے تو اس کو اتنی خوشی ہوتی ہے کہ بچہ اپنے پاؤں پر چلنے لگ گیا ہے لیکن جب یہی بچہ بڑا ہو کر خود اپنے پاؤں پہ چلنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ میں اپنے پاؤں پر چلوں تو پھر یہ ماں اور باپ اُسے اپنے پاؤں پر چلنے نہیں دیتے، پھر وہ چاہتے ہیں کہ تمہیں ہماری مرضی کے مطابق چلنا پڑے گا۔ اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جو خدا کی طرف سے رزق ملتا ہے وہ رزق دیئے چلے جاتا ہے۔ یاد رکھیے کہ تقسیم رزق کی وجہ سے سارے طبقات پیدا ہوئے ہیں۔ خدا نے تو سامانِ رزق سب کے لیے اسی طرح سے دیا ہوا ہے۔ اب پھر اُس نقطے پر آئیے کہ جب یہ اپنے پاؤں پہ چلنے کے قابل ہوتا ہے اور چلنا چاہتا ہے تو پھر ماں باپ اسے اپنے پاؤں پہ نہیں چلنے دیتے۔ لیکن خدا جو رزق دیئے چلا جا رہا ہے تو وہ اس کے بڑا ہونے پر بھی اس کے اختیار و ارادے کو سلب نہیں کرتا، وہ کہتا ہے کہ **فَعَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَ عَنِ شَاءَ فَلْيُفْسِقْ** (18)۔ ہمارا کام یہ تھا کہ ہم نے تمہیں رزق بھی دیدیا، ہم نے تمہیں راستہ بھی دکھا دیا، اب تمہارا جی چاہے ادھر جاؤ یا تمہارا جی چاہے ادھر جاؤ، ہم دخل نہیں دیں گے۔ اب ماں باپ اور خدا کا فرق شروع ہو گیا۔

قرآنی تعلیم کی بنا پر ماں باپ کی اطاعت کا تصور باطل ہے

عزیزانِ من! قرآن کریم نے یہ ایسے ہی نہیں کہا کہ والدین کے ساتھ احسان کرو۔ یہ بات تو دین کے نظام میں داخل ہے۔ یہ کیا بات تھی کہ **آيْ اَشْكُرْ لِّيْ وَلِيَ الْاَيْمٰنِ** (31:14) ایک آیت پہلے **آيْ اَشْكُرْ لِلّٰہِ** (31:12) کہا ہے، وہاں صرف خدا کے متعلق کہا ہے کہ اس کا شکر کرو اور یہاں والدین کے متعلق کہا ہے کہ ان کا بھی شکر کرو۔ کہا یہ ہے کہ ان کی اطاعت تم پہ فرض نہیں ہے۔ اور یہ بات

آپ کو یاد ہوگا کہ کئی درسوں میں آپ کی ہوئی ہے۔ جتنے بھی دنیاوی مذاہب ہیں ان کی کتابیں بھی دیکھیں، اخلاقیات کی کتابیں بھی دیکھیں، ہر جگہ یہی ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے اور آپ کے ہاں تو یہ مسلمہ ہے۔ قرآن کریم نے کہیں یہ نہیں کہا کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے یا ان کی اطاعت کرو۔ قرآن میں ہے کہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ أَطِيعُوا آبَاءَكُمْ وَأَطِيعُوا إِسْرَافَكُمْ** (4:36) اور ہر جگہ یہی ہے۔ بلکہ یہاں تو کہا کہ اگر یہ کہیں کہ خدا کے ساتھ شریک ^۹ بھی کرو تو **فَلَا تَطِيعُوا اللَّهَ** (31:15)۔ انہیں اس سے سختی سے روک دیا گیا ہے۔ جسے ہم کہتے ہیں کہ اطاعت فرض ہے تو یہاں روکا گیا ہے کہ تم نے بالکل بھی اطاعت نہیں کرنی ہے۔ کہا کہ **وَصَابِقًا فِي التَّيْبَةِ** (31:15) اور قائد معروف کے مطابق دنیا کے اندر ان کا ساتھ دو ان کے ساتھ احسان کرو شفاقت کرو۔ ان کی اطاعت نہیں کرو۔ **وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ** (31:15)۔ اطاعت کا تو کہا ہے کہ قطعاً نہیں کرنی ہے اور جو ہمارے راستے پہ چل رہا ہے اُس کے پیچھے پیچھے چلو۔ یہ بات پہلے بھی آپ کی ہے لیکن چونکہ یہاں یہ آیتیں آئی ہیں اس لیے ان کا دہرانا ضروری ہے۔ میں نے کہا ہے کہ دنیا کے ہر مذہب میں کسی سے سنیہ یا اخلاقیات والے ہیں ان سے سنیہ تو یہی کہیں گے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔

ماں باپ کی اطاعت کے سلسلہ میں رام چندر کی کہانی

ہندو دھرم کے اندر تو آپ کو معلوم ہے کہ جوان کے رام چندر جی ہیں وہ ولی عہد تھے۔ ان کے ہاں رام کو ایثار یعنی خدا کا اوتار مانتے ہیں اور اُس کی پرستش ہوتی ہے۔ رام نے کیا کار نمایاں سر انجام دیا تھا جس کی وجہ سے اُس کو خدا مانتے ہیں؟ یہ کہ رام کا باپ بوڑھا ہوا تھا اُس نے ایک جوان بیوی سے شادی کر لی۔ اُس نے اس بوڑھے سے قول لے لیا کہ تمہارے بعد میرا بیٹا ولی عہد ہوگا حالانکہ وہ رام بڑا تھا اور وہ ولی عہد مقرر ہو چکا تھا۔ رام کو بلایا اور کہنے لگے کہ بیٹے! اس کو میری بڑھاپے کی مت ماری ہوئی کہو یا کوئی اور چیز کہو کہ میں یہ قول دے چکا ہوں کہ جو ولی عہدی ہے تمہارے پاس نہیں بلکہ چھوٹے بیٹے کے پاس ہوگی۔ وہاں لکھا ہے کہ یہ اتنا غلط فیصلہ تھا کہ باپ بھی رو رہا تھا اور بیٹا بھی رو رہا تھا لیکن بیٹے نے باپ سے کہا کہ پتا جی! آپ جب قول دے چکے ہیں تو قول نہ ہاریے، میں آپ کی اطاعت کرونگا۔ بادشاہ کی بیوی نے یہ کہا تھا کہ یہی نہیں کہ ولی عہد نہ رہے بلکہ اس کو دیس نکالا دیدیا جائے۔ تو رام نے کہا کہ میں کل ہی چلا جاتا ہوں۔ اور

① وہ اپنے ماں باپ سے حسن سلوک سے پیش آئے (پرویز: مفہوم القرآن، ص-1177)۔

② وان جاهدک علیٰ ان بشرک بی مالیس لک بہ علم (31:15) لیکن ماں باپ سے حسن سلوک کی اس قدر تاکید کے ساتھ ہم نے انسان سے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر وہ تم پر زور دیں کہ تم شرک کے مرتکب ہو۔ ان کا ایسا کہنا جہالت پر مبنی ہے۔ کائنات میں کوئی ہستی ایسی نہیں جو خدا کی شریک ہو سکے (پرویز: مفہوم القرآن، ص-948)۔

③ تو تم ان کی بات بھی نہ مانو (پرویز: مفہوم القرآن، ص-948)۔

یوں رام راج پاٹ چھوڑ چھاڑ کر جنگل میں چلے گئے۔ ان کے ہاں رام کا یہ جو عمل تھا کہ اُس نے باپ کے اس قول کے پالن میں اُس کی اطاعت کی اور جنگل میں چلا گیا، اتنا بڑا کام تھا کہ کہا: یہ انسان نہیں، یہ تو خدا ہے۔ یعنی دھرم میں یہ بات آئی اور عمل کی یہ کیفیت ہوئی۔ 1965ء کی جنگ¹ میں کھیم کرن فتح ہوا، تو ہماری فوجوں نے یہ بتایا کہ ہم جو کھیم کرن گئے ہیں تو ہم نے وہاں دیکھا کہ سارے کھیم کرن کے اندر کوئی مرد نہیں تھا، کوئی جوان عورت نہیں تھی بلکہ جو بوڑھے ماں باپ تھے وہ سارے اندر پڑے ہوئے تھے اور ان کے نوجوان ان کو چھوڑ کر بھاگ گئے ہوئے تھے۔ ایک طرف اطاعت کی کیفیت یہ ہے اور عمل کی کیفیت یہ ہے۔ ہمارے ہاں کے مجاہدین نے ان کو وہاں سے اٹھایا تھا اور نہایت حفاظت سے ان کی پرورش کے طریقے پر وہاں سے ان کو ہمارے ملک کے اندر پہنچایا تھا کہ جہاں ان کی بڑی نگہداشت اور پرورش ہو رہی تھی²۔

والد کے سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کا اسوۂ حسنہ

قرآن نے ہمارے سامنے اسوۂ ابراہیمیؑ پیش کیا ہے جس کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان! آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ اپنے ہاتھ سے سارا دن بت بناتے رہتے ہیں شام ہوتی ہے تو اُس کے سامنے سجدہ کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ ہے اسوۂ ابراہیمیؑ کہ باپ بھی غلط پہ چلتا ہے تو بیٹا اُس کو بھی ٹوکتا ہے۔ اس کے برعکس ان کے ہاں کا اسوہ یہ تھا کہ رام نے باپ کے قول کا پالن کیا اور دونوں مان رہے تھے کہ یہ غلط ہے۔ ادھر وہ ابراہیمؑ ہیں جنہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ غلط کر رہے ہو۔ قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی زندگی ہمارے لیے اسوہ قرار دی ہے۔ اُس کے ساتھ ہی ماں باپ کے متعلق کہا ہے کہ **وَبِالْوَالَتَيْنِ إِحْسَانًا** (4:36)۔ یہ صحیح مقام ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا اور میں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ عربی قاعدے کی رو سے احسان کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ”کسی میں جو کمی پیدا ہو جائے تو اُس کی کو دور کر دینا۔“

① اس تمام کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویز: (i) شہر کے لوگ، طلوع اسلام (11:18) نومبر 1965ء، ص 21 تا 24۔ (ii) پاکستان کی نئی زیارت گاہیں، طلوع اسلام (1:19) جنوری 1966ء، ص 57 تا 76۔ (iii) پاکستان کی نئی زیارت گاہیں، (2) طلوع اسلام (3:19) مارچ 1966ء، ص 61 تا 67 بقیہ ص 80۔ (iv) شہدائے جنگ ستمبر 1965ء، طلوع اسلام (10:27) اکتوبر 1974ء، ص 25 تا 47 (v) شہدائے جنگ ستمبر 1965ء کی یاد میں، طلوع اسلام (9:30) ستمبر 1977ء، ص 41 تا 56 (vi) شہدائے جنگ ستمبر 1974ء کی یاد میں: ان کارناموں کو افسانے نہ بننے دیجیے۔ طلوع اسلام (9:31) ستمبر 1978ء، ص 21 تا 35۔

بڑھاپے میں قید تنہائی کا احساس

قرآن نے یہ نہیں کہا کہ ماں باپ کی صرف روٹی کا انتظام ضرور کر دیا کرو۔ قرآن نے ہر جگہ یہی کہا ہے کہ **وَالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا** (4:36) اپنے والدین سے حسن سلوک سے پیش آؤ۔ ان میں جو کمی رہ گئی ہے اسے دُور کرو۔ اب غور کی بات یہ ہے کہ یہ کیا کمی واقع ہوئی ہے؟ ایسے ماں باپ بھی ہیں اور بہت سے ہونگے جو زندگی کے آخری دم تک ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے ہیں یعنی ان کے پاس اتنی دولت، اتنا رزق موجود ہوتا ہے۔ پھر یہ احسان کیا ہے؟ یہ کمی پورا کرنا کیا ہے؟ ہمارے ذہن میں تو یہی ہے کہ بڑھاپے میں وہ اس قابل نہیں رہتے کہ کمائی کریں اس لیے ان کو روٹی دیا کرو۔ اور پھر جس طرح سے روٹی دیجاتی ہے وہ ہمیں معلوم ہے۔ قرآن نے روٹی دینے کی بات نہیں کہی۔ عزیزانِ من! قرآن کا تو ایک ایک نکتہ غور طلب ہے۔ کمی یہ ہوتی ہے کہ بڑھاپے میں تنہائی ہو جاتی ہے اور تنہائی دنیا میں سب سے زیادہ سنگین سزا ہے۔ اُس کے اپنے وقتوں کے دوست، رفیق جن کے ساتھ وہ باتیں کر سکتا تھا، وہ ایک ایک کر کے اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ جو اگلی جزیں (نسل) آتی ہے اُس میں اور ان میں جذباتی Gap (خلا) ہوتا ہے اس لیے یہ اُس کے رفیق بن نہیں سکتے۔ خود جو بیٹے ہیں وہ بڑے ہو چکے ہوتے ہیں ان میں اور ان میں جذباتی فرق ہوتا ہے۔ یہ جو چیز ہے یہ سب سے بڑی کمی ہے۔ پھر قرآن کریم کہتا ہے کہ عمر کے تقاضے سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کی عقل بھی اوندھی ہو جاتی ہے، یہ کچھ چڑچڑے بھی ہو جاتے ہیں، ناقص العقل ہو جاتے ہیں، بھولنے لگ جاتے ہیں، حافظہ کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ ساری ان کے اندر کی ہوتی گئی۔ اب یہ جو کچھ ماں باپ کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ ڈانٹ رہا ہے، جھڑک رہا ہے، اباجی! ابھی آپ سے یہ کہا تھا اور آپ یوں کر رہے ہیں، دن رات اُس اباجی کو روٹی تو دی جاتی ہے لیکن اُس کے ساتھ یہ کچھ ہو رہا ہے۔ یہ تو ابھی وہاں ہو رہا ہے جہاں جوائنٹ فیملی ہے جس کے اندر یہ اباجی یا اماں جی رہ رہی ہیں ورنہ ایسی صورتیں بھی تو ہمارے معاشرے میں ہیں کہ تلسی داس (1550-1624) نے کہا ہے:

دھیاں جوانی لے گئے اور بھونیں لے گئیں پُت

تلسی داس نرول جی تم رہ گئے اوت کے اوت

تو ماں باپ کا اس عمر میں آکر جو ”اوت کا اوت رہ جانا ہے“ یہ ہے اصل میں جو ان کی کمی ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ **وَالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا** (4:36) ان کی اس کمی کو پورا کرو۔ یہ (اہل مغرب) بڑا احسان جتا رہے ہیں کہ انہوں نے اپنے ہاں ویلفیئر اسٹیٹ قائم کی ہے، اولڈ ایج بینیفٹ قائم کیے، اولڈ ایج ہاؤسز بھی مقرر کیے۔ جو لوگ ولایت، خاص طور پر لندن وغیرہ میں گئے ہیں وہ آکر بتاتے ہیں کہ ان بوڑھوں بیچاروں کا وہاں کیا حشر ہوتا ہے۔ لڑکھڑاتے ہوئے، چلتے ہوئے، تنہا اکیلے کہیں ہائیڈ پارک (Hyde

(Hark) کی ایک بچ میں ایک بیٹھا ہے اور کہیں دوسری پہ دوسرا بیٹھا ہے۔ یعنی کل ہی جن کا یہ سارا ذہن ساری دنیا کے اندر شریک تھا آج وہ اس حالت میں ہیں:

عالم کی فضا پوچھو محروم تمنا سے

بیٹھا ہوا دنیا میں اٹھ جائے جو دنیا سے

یہ اگر دنیا سے اٹھ جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔

قرآن حکیم کے نزدیک فیملی سسٹم ایک نعمت سے کم نہیں

وہ کہتے ہیں کہ وہ جو ہائیڈ پارک (Hyde Hark) میں بچہ بیٹھا ہوتا ہے اُس کو روٹی مل رہی ہے، کپڑا مل رہا ہے۔ جس کو یہ سامان پرورش کبہ رہے ہیں یہی تو اُس کی کمی نہیں ہے۔ کمی تو یہ ہے کہ ہر بوڑھا وہاں روتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ جسے آپ فیملی سسٹم کہتے ہیں جسے آپ گھر کہتے ہیں یہ بہت بڑی چیز ہے۔ انسان تمدنی حیوان (Social Animal) واقع ہوا ہے۔ جمعی میں نے عرض کیا ہے کہ اس کی سنگین ترین سزا تنہائی ہے یہ اس کی افتادِ تخلیق کے خلاف ہے یہ انسانوں کے اندر ہی رہ سکتا ہے۔ جتنا جی چاہے کھانے پینے کو دیجیے لیکن اگر تنہائی دیجیے تو آپ دیکھیے کہ انسان کے اوپر قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے انسان کی وہ زندگی رکھی ہے جو کہ انسان کی تمدنی زندگی کے اندر کا تقاضا ہے۔ اسے آپ فیملی سسٹم کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی یہ چیز ابھی کل تک محفوظ تھی۔

یورپ میں سوائے انکل کے نہ چچا ہوتا ہے نہ ماموں، پھوپھا نہ خالو

یورپ نے جہاں اور بڑی ترقیاں کیں انہوں نے عائلی زندگی یا فیملی لائف کا تصور ہی ختم کر دیا۔ وہ جو انہوں نے عائلی زندگی کا نقشہ ختم کیا ہے تو ان کی زبان کے اوپر دیکھو کہ اس چیز کا کتنا اثر ہوا ہے۔ ہمارے ہاں چچا اور ہوتا ہے، ماموں اور ہوتا ہے، پھوپھا اور ہوتا ہے، خالو اور ہوتا ہے۔ ان کے اپنے مقام ہوتے ہیں لیکن وہاں انگریزی زبان میں صرف انکل (Uncle) ہوتا ہے اگر نکھیڑ کرتے ہیں تو Maternal-Uncle کہہ دیتے ہیں لیکن پھر بھی بات سمجھ میں نہیں آتی یعنی ان کے ہاں رشتوں کے لیے زبان میں لفظ ہی نہیں رہے۔ فیملی لائف کو اجاڑنے سے یہ اثر ہوتا ہے۔ Father-in-Law تک تو بات چلتی ہے لیکن جب Brother-in-Law ہوتا ہے تو پھر تو جیسے ہمارے Law میں کنفوژن ہے اسی طرح ان کے ہاں Brother-in-Law کا پتہ نہیں چلتا کہ سالہا ہے یا بہنوئی ہے یعنی ان کے ہاں کیونکہ بولی میں کچھ فرق ہی نہیں ہے وہ صرف In law والی بات ہے۔ اس لیے ادھر کا Brother-in-Law ہوا تو کیا، ادھر کا Brother in Law ہوا تو کیا، ورنہ فیملی لائف کے اندر تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ سالہا اور بہنوئی کیا چیز ہوتی

ہے۔ اسی طرح سے پھوپھی اور خالہ اور چچی اور ممانی وغیرہ سب کی سب آنٹی ہوتی ہیں۔ یعنی وہ جو فیملی کے اندر رشتوں کے الگ الگ تعلقات تھے اور یہ بڑا فرق تھا آج شاید اگلی جرنیشن (نسل) سمجھ نہ سکے کہ ماموں میں اور چچا میں فرق کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے ہاں فیملی کا جو تصور تھا اُس کا نقشہ ہی بدل دیا۔

Homes (گھروں) کے بجائے Houses (مکانات) ہیں

وہاں یورپ کے اندر آپ کو Houses (مکانات) ملیں گے Homes (گھروں) نہیں ملیں گے۔ ہوم اور ہاؤس میں بڑا فرق ہوتا ہے:

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا

کئی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

انسان ہو اور اس کی یہ زندگی ہو تو اس کا جو اندرونی تقاضا ہے یہ زندگی اُس کے خلاف ہے کہ ”کئی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر“۔

قرآن حکیم کی روشنی میں والدین اور اولاد کے لیے حدود کا تعین

قرآن کریم نے یہ جو رد دیا ہے کہ **وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا** (4:36) والدین کی کمی کو پورا کر دو تو قرآن ہر جگہ یہ زور دیتا چلا جا رہا ہے۔ اور اطاعت سے منع فرما دیا۔ قرآن نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ جب تک تو بچہ ماں باپ کی نگرانی کا ان کی پرورش کا محتاج ہے اپنے فیصلے آپ نہیں کر سکتا اُس وقت تک ٹھیک ہے ان کی ہدایت کے مطابق اُس کو چلنا چاہیے لیکن جب وہ اس عمر میں پہنچ جائے کہ وہ خود صاحب اختیار و ارادہ ہو گیا ہے تو اُسے اپنے فیصلے آپ کرنے ہوں گے۔ جب وہ صاحب اختیار و ارادہ ہوتا ہے تو خدا کہتا ہے کہ میں بھی اس کے ارادے میں دخل نہیں دیتا۔ خدا کہتا ہے کہ **فَمَنْ شَاءَ فَلْيُصِبْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُضِلَّ** (18:2) ہم دخل نہیں دیتے اور پھر یہ جو دخل کی بات بھی ہے تو زمانہ بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہوتا ہے آج سے پچاس سال پہلے کے دور کا انسان ہے عمر کے اعتبار سے خواہ وہ کتنا ہی آگے کیوں نہ چلا گیا ہو لیکن زمانے کے اعتبار سے وہ بہت پیچھے رہ جاتا ہے ①۔ Age (عمر) اس نئی نسل کی ہوتی ہے البتہ ان کو ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے صحیح راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے صحیح راستہ دکھانے کی ضرورت ہے ان کی صحیح تعلیم کی ضرورت ہے ان کی صحیح تربیت کی ضرورت ہے۔ یہ سارا کچھ دینے کے بعد جیسا قرآن کہتا ہے کہ **الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ** (2:147) یعنی یہ بات تو ان تک پہنچائیے کہ غلط اور صحیح راستے کون سے ہیں ان کی تعلیم و تربیت کیجیے لیکن انہیں اپنے فیصلے آپ کرنے ہوں گے۔ اسی لیے قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ **فَلَا تَطْغَوْا** (31:15) اطاعت والی بات مت کرو۔ **وَصَابِرْهُمْ فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا** (31:15)

① عمر (Age) اور زندگی (Life) میں بڑا فرق ہے۔ اسے ہم اپنے سامنے نہیں رکھتے، زندگی عمر بھر نہیں ہوتی۔

بس ان سے دنیاوی معاملات میں نیک برتاؤ کرتے رہو ان کے ساتھ رفاقت ہے قاعدے قانون کے مطابق رہو اور اُس کے لیے کہ انداز کیا ہونا چاہیے دوسری جگہ کہا ہے۔ قرآن ہر جگہ بات تو یہیں سے شروع کرتا ہے کہ اطاعت اور محکومیت تو صرف خدا کی ہے۔ کہا کہ **وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِلَٰهًا** (17:23) حکم یہ ہے کہ محکومیت و اطاعت اختیار کرنی ہے تو وہ صرف خدا کے قوانین کی اختیار کرنی ہے۔ خدا کے بعد جنہوں نے پرورش کیا تھا وہ ماں باپ تھے جن کے شکرے کے متعلق ابھی کہا گیا ہے کہ ان کا شکر یہ ادا کرو ❶۔ کہا کہ **وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا** (17:23) ان کی کمی کو پورا کرو ان کا حسن برقرار رکھو ان کا توازن برقرار رکھو۔

دیکھیے! قرآن بڑے بڑے اہم معاملوں کے متعلق اصولی حکم دیئے جاتا ہے زیادہ جزئیات میں نہیں جاتا۔ یہ ایسا مسئلہ تھا کہ جس

میں وہ جزئیات تک جا رہا ہے کہ **إِنَّمَا يَنْبَلِغُنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرُ أَذْهَمًا أَوْ كِلَسَمًا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا آفٌ وَلَا تُنْهَرُ هُمَا وَفَلَّ لَسَمًا قَوْلًا كَرِيمًا** (17:23) اگر تمہاری زندگی میں دونوں یا ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے تک پہنچ جائے تو ان کو جھڑکانہ کرو سختی سے بات نہ کیا کرو ایسی کوئی حرکت نہ ہو کہ جس سے ان کے عزت نفس میں فرق آئے۔ گھر کے اندر وہ جگہ جہاں آپ کوڑا کرکٹ پھینکتے ہیں اُس کو ٹھہر کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کو کوڑا کرکٹ پھینکنے کا مقام نہ دینا **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ** (17:70) ہم نے ہر انسان کو واجب التکریم پیدا کیا ہے خواہ یہ بوڑھا ہی کیوں نہ ہو گیا ہو لیکن ہے تو انسان۔ اگلی چیز یہ ہے کہ تم پر ان کے دوفرض ہیں کیونکہ انہوں نے تمہاری پرورش بھی کی ہوئی ہے۔ کریم کا لفظ بتا رہا ہے کہ اُس نے تکریم کے اوپر زور دیا ہے کہ اس کے خلاف کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس سے اس کی تکریم انسانیت میں فرق آئے۔ یہ ہے جس کا قرآن بار بار حکم دے رہا ہے کہ **وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا** (17:23) اور یہ انسان کے لیے ہی تھا۔ حیوان کا تو رشتہ ہی اُس وقت ختم ہو جاتا ہے جس وقت وہ بچہ دودھ سے الگ ہو جاتا ہے اور اُس کا ماں سے الگ پرورش کا ذریعہ شروع ہو جاتا ہے تو وہ نہ ماں کو پہچانتا ہے نہ باپ کو پہچانتا ہے۔ یہاں انسان کے معاملے میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن ان چیزوں کی کتنی تاکید کیے چلا جا رہا ہے۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ عمر کے تقاضے سے ان کی بعض چیزوں میں ضعف آ جاتا ہے کمزوری آ جاتی ہے لیکن تمہارا تو توازن برقرار ہے تم اپنا توازن کیوں کھو رہے ہو لہذا ان کے ساتھ کھنگلی سے مت پیش آؤ جھڑکو نہیں۔ اگلی بات یہ ہے کہ کوئی بات ایسی نہ کرو جس سے اس کی تکریم انسانیت میں فرق آ جائے۔ اوبابا! انہوں نے تمہاری پرورش اس طرح سے کی تھی جیسے ہم نے رحیمیت کے مطابق کی تھی۔ کہا کہ **وَاضْفِضْ لَّهُمَا جَنَاحَ الْاُثَلِ مِنَ الرَّحْمَةِ** (17:24) یہ پرورش دیکھتے ہو کہ مرغی کس طرح سے اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہے وہ خطرے سے ہی بچانے کے لیے بلکہ سردی سے بچانے کے لیے بھی اپنے پروں کے نیچے لے لیتی ہے۔ یہ پروں کے نیچے لینے والی جو بات ہے اس کے لیے یہ خفض کا لفظ ہے کہ **وَاضْفِضْ لَّهُمَا جَنَاحَ** (17:24) تو ان کے سامنے

❶ ان شکری ولو اللدیک (31:14) اسے خدا کا اور اپنے ماں باپ کا سپاس گزار ہونا چاہیے (پرویز: مفہوم القرآن ص 948)

جھک جھک کر ان کو اپنے پروں کے نیچے لے لو کیونکہ یہ اب اس قابل ہو گئے ہیں **وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْنِي** کما رَبَّنِي صَغِيرًا (17:24) جب تم چھوٹے چھوٹے چوزے تھے تو انہوں نے تمہیں اپنے پروں کے نیچے لیا تھا اب یہ بھی چھوٹے چھوٹے چوزے سے ہی ہو گئے ہیں اب تم ان کو اسی طرح اپنے پروں کے نیچے لے لو **كَمَا رَبَّنِي** (17:24) جس طرح سے انہوں نے پرورش کی تھی تم بھی اس طرح سے ان کی پرورش کرو۔

اطاعت اور اتباع میں ایک بنیادی فرق ہے

عزیزانِ من! میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ قرآن نے کہا ہے کہ **فَلَا تَطِيعُوا** **وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ** (31:15) اطاعت کسی کی نہیں کرنا۔ اطاعت تو کسی کے حکم کو ماننا ہے اتباع کسی کے نقش قدم پہ چلنا ہے۔ پیچھے پیچھے چلنے کے لیے تو تاکید یہ ہے کہ **مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ** (31:15) جو میری طرف آرہا ہے اُس کے پیچھے پیچھے چلو۔ لیکن اطاعت ہو یا اتباع ہو ان دونوں کے اندر قرآن کا ایک بڑا بنیادی نکتہ مخفی ہے۔ اطاعت کو ہمارے ہاں Obedience (فرمانبرداری) کہتے ہیں Obey (حکم تسلیم) کرنے کے اندر تو اختیار و ارادہ ہوتا ہی نہیں ہے لیکن عربی زبان کے اندر اطاعت اُس Obedience (فرمانبرداری) کو کہتے ہیں جو اپنی رضامندی سے کی جائے۔ جبر سے یا رضامندی کے بغیر جو حکم ماننا ہے اُس کے لیے لفظ اطاعت آتا ہی نہیں ہے۔ جو کھجور پک کر از خود گر جائے عرب اُسے اطاع النحل^① کہتے ہیں جسے جھانپل سے مار کر جھاڑا جائے اُس کے لیے عرب اطاع النحل کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔ جو Obedience (فرمانبرداری) اس طرح سے کی جائے وہ اطاعت میں آتی ہی نہیں ہے۔ خدا کے لیے بھی اطاعت کا لفظ ہے کہ یہ برضا و رغبت کرنا ہے۔ ساری بنیادی بات یہی ہے انسان کی تکریم یہی ہے کہ اس کے اختیار و ارادے کو سلب نہ کیا جائے وہ اپنے اختیار و ارادے سے یہ کچھ کرے۔ اور اسی طرح سے یہ جو اتباع ہے یہ بھی بالجبر والی بات نہیں ہے کہ رسہ باندھ کر اُس کو پیچھے پیچھے گھسیٹا جائے۔ گائے کا جو نوزائیدہ بچہ ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ آگے آگے ماں جاتی ہے اور بچہ اُس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا ہوتا ہے تو یہ برضا و رغبت جا رہا ہوتا ہے۔ اُس ماں کے اندر اس کے لیے اتنی کشش ہوتی ہے خواہ وہ ضرورت کی کشش ہی کیوں نہ ہو تو اُس کے لیے یہ بچہ باندھ کر اُس کے پیچھے نہیں چلایا جاتا بلکہ اُس کشش کی بنا پر اُس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہوتا ہے۔ گائے کے بچے کا اس طرح سے جو پیچھے چلنا ہے صرف اس کے لیے اتباع کا لفظ آتا^② ہے۔ وہ جو خدا کے راستے کے اوپر آگے جا رہا ہے اُس کی چال اور انداز اتنا دلکش ہونا چاہیے کہ وہ یوں اُس کے پیچھے چلے جس طرح گائے کے پیچھے اُس کا بچہ جا رہا ہے۔ اطاعت تو کسی اور کی کرنی نہیں ہے لیکن اتباع بھی کرنا ہے تو اُس کا کرنا ہے جو میری طرف آ رہا ہو اور پھر

① اطاع النحل کے معنی ہوتے ہیں کھجوریں پک گئیں (تاج العروس)۔ اب انہیں زور لگا کر توڑنا نہیں پڑے گا۔ وہ ٹوٹنے کے لیے خود ہی آمادہ ہیں (پرویز لغات القرآن جلد سوم ادارہ طلوع اسلام لاہور 196) ص 1095

② عرب اسے بقرة متبع کہتے ہیں یعنی اس گائے کو کہتے ہیں جس کا بچہ اس کے پیچھے پیچھے رہتا ہو اور اس کے پیچھے چلنے والے بچے بچھڑے کو تبع کہتے ہیں (تاج العروس)۔ حوالہ پرویز لغات القرآن جلد اول ادارہ طلوع اسلام لاہور 1960 ص 372۔

اس انداز سے کرنا ہے جو میں نے ابھی عرض کیا ہے جیسے گائے کا بچہ اُس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ یہ قرآن کے الفاظ کا اعجاز ہے۔ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک بھی ہے، یہ بھی کہا ہے کہ انہیں جھڑک بھی نہیں، ڈانٹ بھی نہیں، ان کی نگریم انسانیت کے اوپر کوئی حرف نہ آنے پائے۔

قرآن حکیم کے نزدیک عدل کا مقام، شہادت کی اہمیت اور اس کی نوعیت

عزیزانِ من! جہاں عدل اور انصاف کا معاملہ آجائے تو وہاں نہ ماں نہ باپ نہ بھائی نہ بہن۔ یہاں قرآن نے عدل کا ایسا اصول دیا ہے کہ اس سے بلند اصول تصور میں نہیں آسکتا۔ Law of Witness (قانون شہادت) کے اندر تو ایک طرف رہا کہ ایسی Provision (گنجائش) ہو انسان کے ذہن میں یہ بات نہیں آسکتی تھی۔ عدل کا دار و مدار شہادت کے اوپر ہوتا ہے۔ یہاں تک تو یہ کیفیت ہے کہ اُس جج نے یا مجسٹریٹ نے ایک واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور اُس کے سامنے وہ مقدمہ پیش ہو رہا ہو اور گواہی اُس کے خلاف جارہی ہے۔ جج کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ یہ واقعہ یوں ہے۔ اُس کو یہ فیصلہ لکھنا ہوگا کہ شہادت یہ کہتی ہیں، اس لیے میں یہ فیصلہ دے رہا ہوں۔ یہ شہادت بڑی چیز ہے۔ لیکن قرآن نے شہادت دینے والے کے متعلق کیا قانون مقرر کیا ہے یا کیا خصوصیت مقرر کی ہے یہاں سے سارا نظام عدل بدل جائے گا۔ کہا کہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوِّمِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ** (4:135) اے شہادت دینے والو! عدل کا جھنڈا تم نے گاڑنا ہے۔ شہادت دینے کے لیے جاؤ نہ مدعی کی طرف سے نہ مدعا علیہ کی طرف سے نہ ملزم کی طرف سے نہ مستغیث کی طرف سے۔ کسی کی طرف سے نہیں جاؤ بلکہ **شُهَدَاءَ لِلَّهِ**

(4:135) صرف خدا کے حکم کی تعمیل کے لیے وہاں جاؤ۔ یہاں پہلے ہی دن یہ دو طبقے بن جاتے ہیں: (1) Prosecution

Witness (شاہد استغاثہ) اور (2) Defence Witness (شاہد صفائی)۔ قرآن تو دو پارٹیاں بناتا ہی نہیں ہے۔ کہا کہ

شُهَدَاءَ لِلَّهِ (4:135)۔ جا کر خدا کی طرف سے شہادت دو اور جو تمہاری شہادت ہے وہ تو کسی نہ کسی کے خلاف تو جائے گی تو کہا کہ **وَلَوْ**

عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ (4:135) تمہاری اپنی ذات کے خلاف بھی شہادت جائے تب بھی سچی شہادت دو۔ اپنے خلاف بھی سچی شہادت دو۔

عزیزانِ من! عدل کے معیار (Standard) کہیں اور سے لا کر تو دکھائیے۔ پھر ذہن میں لائیے کہ جسے ہم کہتے ہیں کہ نظام

خداوندی اور نظام مصطفیٰ ﷺ ہوتا کیا ہے۔ کہا ہے کہ **وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ** (4:135) شہادت دو وہ تمہارے اپنے

خلاف جائے خواہ تمہارے ماں باپ کے خلاف بھی کیوں نہ جائے۔ اب یہاں کوئی رو رعایت نہیں ہے۔ والدین کے متعلق یہ سارے

احکام ہیں کہ ان کی عزت کرو، ان کو اتنا مقام دو، ان پہ اتنا احسان کرو، انہیں جھڑکو نہیں، ڈانٹو نہیں، ان کی نگریم نفس کرو لیکن جہاں عدل کا

معاملہ آیا ہے تو کہا کہ شہادت دو خواہ وہ ماں باپ کے خلاف بھی کیوں نہ جائے۔ اور آگے ہے کہ **وَالْأَقْرَبِينَ** (4:135) خواہ وہ

تمہارے کتنے ہی قریبی کیوں نہ ہوں ان کے بھی خلاف شہادت جاتی ہے تو جائے کیونکہ تم تو اللہ کے گواہ بن کر گئے ہو۔ اِنْ يَكُنْ غَنِيًّا
 اَوْ فَخِيرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِعِصَا (4:135) کوئی پارٹی امیر ہے یا کوئی پارٹی غریب ہے، تمہیں اس سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ تم تو خدا کی
 طرف سے گئے ہوئے ہو اور خدا کا حق ان دونوں سے زیادہ فائق ہے۔ اس لیے کہا کہ فَلَا تَتَّبِعُوا السَّوْءَ اَنْ تَعْلَمُوْا (4:135)
 اپنے ان جذبات کا اتباع نہ کرو جو عدل کے راستے میں رکاوٹیں بن جایا کرتے ہیں۔ وَاِنْ تَلَوْا اَوْ تَصْرِفُوْا (4:135) بات کو موڑ
 توڑ کر بھی نہ کہو بات میں ابہام نہ ہو، تلخیص نہ ہو، بات ذومعنی نہ ہو، داؤ پیچ نہ ہو۔ دو ٹوک بات کرو جیسے وہ وزیر خاں کی مسجد کی کچھلی دیوار
 ہے۔ قَوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (33:70) کھری، نکھری ہوئی، سیدھی بات کرو۔ موڑ توڑ کر کے بات نہ کرو۔ اَوْ تَصْرِفُوْا (4:135) یہ
 بھی نہ کرو کہ سمن (Summon) کے اوپر تعمیل ہی نہ ہونے، دواعراض نہ برتو۔ اس لیے کہ یہ سب چیزیں تم ان لوگوں سے تو چھپا لو گے
 لٰكِنْ فَلَانَ اللّٰهُ كَانَ بِمَا تَصْلُوْنَ خَبِيْرًا (4:135) اس کے اوپر ایک اور بھی ہے جس کو ہر بات کی خبر ہے۔ اگر تمہارا ایمان یہ ہے
 کہ اس عدالت کے بعد ایک اور عدالت بھی ہے جہاں جا کر اس مقدمے کی اپیل ہو جانی ہے تو وہ عدالت خداوندی ہے جو آخرت میں
 ہونی ہے۔ اُس کا دھیان رکھو کہ اپیل میں اگر تم نے ملزم ثابت ہو جانا ہے تو ہمیں کیوں نہیں اس بات کا فیصلہ کر لیتے۔ یہ تو پھر بھی شاید کوئی
 تھوڑی سزا دے لیکن وہاں تو پوچھو ہی نہیں کہ وہ کیا سزا دے گا۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ والدین کے متعلق جو اتنی تاکید ہے تو اُس تاکید کے
 باوجود جہاں مقام عدل آتا ہے وہاں کسی کی رورعایت نہیں ہے۔ لیکن میں پھر وہیں آ جاؤں جہاں قرآن کریم نے والدین کے متعلق باتیں
 کہی ہیں۔

ہوم لائف (گھریلو زندگی) کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی ہدایت

عزیزانِ من! قرآن کی رو سے ہوم لائف (گھریلو زندگی) یہ ہے کہ گھر کی ایسی زندگی ہونی چاہیے کہ بڑھاپے کی عمر میں جہاں یہ تنہا
 رہ جاتے ہیں اور Physically (جسمانی طور پر) بھی بہت سی کمزوریاں آ جاتی ہیں تو ان میں سے کسی کمزوری کی بنا پر ان کی مکرمیم
 انسانیت میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیے۔ اسی لیے باقی بھی جو رشتہ داریاں ہیں یعنی جسے آپ خاندانی زندگی کہتے ہیں اُس میں ذی القربی
 بھی اُس نے اسی لیے شامل کیا ہوا ہے لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کی فضا کے اندر جو سانس لینا ہے یہ تو اُس کی باتیں ہیں۔
 جب تاکید کی جائے گی کہ صاحب! اتنے سانس لیا کرو اور ایسے سانس لیا کرو تو وہ سانس اس صاف فضا کی تاکید ہے۔ یہ بسیں جو
 Carbon Monoxide (کاربن مونو آکسائیڈ) چھوڑتی چلی جاتی ہیں، تو یہ نہیں کہا گیا کہ ان کے پیچھے منہ لگا کر زور زور سے
 سانس لیا کرو۔ قرآن کے یہ جتنے بھی احکام یا ہدایات آپ کو ملیں گی تو یہ اُس نظام اور فضا کی ہیں جس میں قرآن کے مطابق یہ چیزیں

ہو رہی ہوں۔ بہر حال یہاں قرآن نے تاکید کی ہے کہ یاد رکھو! ہماری رحیمیت کے ساتھ ماں باپ کی رحیمیت بھی شامل ہے اس لیے ان میں جب کسی معاملے میں کمزوری پیدا ہو جائے یا کمی پیدا ہو جائے تو اُس کو پورا کرو۔ اور اتباع صرف اس راستے کی کرو جس کا ہر قدم خدا کی طرف اٹھتا ہے۔ کہا کہ **ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّتُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ** (31:15) یاد رکھو! تم اپنے ہر عمل کے لیے خدا کے سامنے جوابدہ ہو۔ وہ تمہیں بتا دے گا کہ تمہارے اعمال تمہیں کس مقام پر لے آئے ہیں۔ تمہارے اعمال کے نتائج، خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے متعین ہوتے ہیں۔

ماں باپ کے لیے فرمانِ ربی

عزیزانِ من! ماں باپ سے یہ کہا گیا کہ ہمارے ہاں سے جو رزق ملتا تھا تو ہم طبقاتی تقسیم نہیں کرتے تھے، غریب اور امیر کے بچے کو یکساں دیتے تھے لیکن جب رزق کی تقسیم تمہارے ہاتھ میں آئے تو تم بھی یہ فرق نہ کرنا۔ آگے چل کر ماں باپ سے کہا کہ ہم نے اتنی تاکید کر دی ہے کہ تمہاری مکریم اور عزتِ نفس قائم رہے لیکن ان کے اوپر جبر نہیں کرنا، اپنے معاملات یہ خود اپنے فیصلے سے کریں گے۔ ہم ان کے اختیار و ارادے میں دخل نہیں دیتے تو تم بھی ان کے اختیار و ارادے میں دخل نہ دو۔ اور ان سے یہ بات کہی گئی کہ جو کچھ تم کرو گے اُس کے متعلق سوچ لو کہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ قرآن کے الفاظ میں پھر لقمن نے اپنے بیٹے سے کہا کہ **يٰۤاَيُّهَا اِنْ تَكُ مِنْ اٰنْقَالٍ حَبِيٍۡٓٔ مِّنْ خَرْتَلٍ فَتَكُنْ فِیۡ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّعُوۡتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یٰۤاَيُّهَا اللّٰهُ لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ** (31:16)۔ بچھلی آیت یعنی (31:15) میں تھا کہ ایک ایک عمل جو ہے اُس کا نتیجہ تمہارے سامنے آ جائے گا تو اس آیت میں یہ بات بتائی کہ اے میرے بیٹے! اپنے ذہن میں یہ بات نہ رکھو کہ ہم نے ایسا انتظام کر لیا ہے کہ اس بات کا کسی کو پتہ نہ ہونے پائے، کانوں کان خبر ہی نہ ہو۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے، یہاں تم انتظام کر سکتے ہو لیکن آگے ایک آنکھ اور ہے جو **لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ** (31:16) ہے۔ وہ ہے جسے مائیکرو سکوپسٹ کہتے ہیں کہ اُس ذرے کو خواہ چٹانوں کی تختیوں میں چھپا دو آسمان کی بلندیوں کے اوپر لے جاؤ زمین کی پستیوں کے اندر لے جاؤ جہاں جی چاہے لے جاؤ خدا وہاں سے نکال کر لے آئے گا۔

قرآنِ حکیم کی ساری کی ساری تعلیم کا مقصد زندگی کا محور انسانی ذات کی نشوونما ہے

یہ جو خدا کا نظامِ عدل ہے کہ تمہارے ایک ایک عمل کا، بلکہ دل میں گزرنے والے خیالات تک کا بھی اپنا نتیجہ خدا کے قانون کے مطابق مرتب ہو کر رہتا ہے یہ ہے سارا محور قرآن کی تعلیم کا اور دین کا کہ کوئی عمل بھی ایسا نہیں ہے جس کا نتیجہ تمہیں نہ بھگتنا پڑے۔ کہا ہے کہ **فَمَنْ يَّصْلَحْ يُّصْلَحْ لِّنَا خَيْرًا اَمْرًا - وَمَنْ يَّضَلْ يُّضْلَلْ لِّنَا شَرًّا اَمْرًا** (99:7)۔ یہ چیز سمجھانے کے لیے بھی کوئی

محسوس شے ہی کہنی چاہیے تھی کہ کوئی عمل نتیجہ پیدا کیے بغیر نہیں رہتا۔ اب یہ دونوں عمل تو سامنے آ گئے۔ خیر وہ اعمال ہیں جن سے انسان کی ذات کی نشوونما ہو جاتی ہے۔ ذات کی نشوونما کے لیے اُس کے جسم کی پرورش اور نشوونما نہایت ضروری ہے کیونکہ یہی وہ گھوڑا ہے جس کے اوپر اس سوار نے کم از کم اس دنیاوی زندگی میں سفر کرنا ہے۔ آپ کے ہاں ٹرانسپورٹ یا کمیونیکیشن (Communication) کے جتنے بھی Means (ذرائع) ہیں وہ یہ جسم ہے لہذا آپ کے مقاصد کو آگے پہنچانے کے لیے گھوڑا Perfect (مکمل) ہونا چاہیے اس دنیا کی زندگی کی خوشحالی کے لیے گھوڑے کا توانا ہونا بڑی ضروری ہے۔ اس لیے اس دنیا کی جو طبعی زندگی ہے اس زندگی کی خوشحالی فارغ البالی، نشوونما کا ملنا بڑی اہم چیز ہے لیکن یہ مقصود بالذات نہیں ہے۔ اقبالؒ (1877-1938ء) کیا خوب بات کہہ گیا ہے:

مقام پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چن
نہ سیر گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

(اقبال: بال جبریل)

یہ زندگی مقصود بالذات نہیں ہے۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے آپ کے ہاں کا گھوڑا مقصود بالذات نہیں بلکہ آپ کو صرف منزل تک پہنچانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ مقصود بالذات یہ ہے کہ انسانی ذات کی اس کے نفس کی اس کی Personality کی اس کی خودی کی نشوونما ہو۔ انسانی ذات نے مرنے کے بعد آگے چلنا ہے۔ خیر وہ عمل ہے جس سے اُس کی نشوونما ہوتی ہے، شر وہ عمل ہے جس سے اُس کی تخریب ہوتی ہے۔ اُس میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔

قرآن حکیم قدم قدم پر انسانی عقل کو وحی کی روشنی سے منور کرتا چلا جاتا ہے

قرآن کا انداز یہ ہے کہ ایک بات کہتے ہوئے اپنی مثبت بات بھی کہتا ہے اور غلط یا باطل تصورات جو پھیلے ہوئے ہوتے ہیں ساتھ ہی ساتھ ان کی تردید بھی کیے جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک گناہ سرزد ہو گیا جسے آپ شر کہتے ہیں، جرم کہہ لیجیے تو وہ گناہ سرزد ہو گیا تو کیا اُس کے بعد انسان دھتکارا گیا؟ راندہ درگاہ ہو گیا؟ سنور نے کے امکانات ختم ہو گئے؟ کوئی اور Possibilities (امکانات) نہیں رہیں؟ دنیا میں جتنے مذاہب پہلے پھیلے ہوئے تھے ان کے ہاں تو یہی چیز تھی کہ جیسے عیسائیت نے تو یہ بات کہی کہ ہر بچہ اپنی پیدائش کے ساتھ اپنے اولیں ماں باپ کے گناہ کی آلائش لے کر آتا ہے اور وہ کسی عمل سے دھل ہی نہیں سکتی۔ یہ تو رات کا تصور ہے۔ تو یوں نظر آتا ہے کہ جیسے انسانوں کو خدا نے اس طرح پیدا کیا کہ گناہوں کی آلائش ان کے ساتھ دی اور وہ آلائش دھل نہیں سکتی تو جو آلائش والے انسان ہیں وہ تو جہنم میں جائیں گے۔ تو ایسا ہوا کہ جیسا یہ کچھ کرنے کے بعد خدا کو یہ خیال آیا کہ یہ میں کیا کر بیٹھا، یہ تو جتنے انسان پیدا ہوتے چلے جاتے

ہیں، یہ تو سارے جہنم میں جائیں گے تو جنت میں کیا کسی گدھے کو بھیجوں گا۔ یعنی آپ تصور دیکھیے، آپ دیکھتے ہیں کہ قدم قدم کے اوپر اس میں کتنا فرق آتا ہے۔ یہ گناہوں کی آلائش عمل کے ذریعے صاف نہیں ہو سکتی تو بیچارے کیا کریں؟ اس کے متعلق ایسا تصور تورات میں پایا جاتا ہے کہ جیسے بیٹے نے پوچھا ہو (یہ میں تمثیلاً عرض کر رہا ہوں) کہ ابا جان! کیا بات ہے آج آپ بہت افسردہ نظر آتے ہیں؟ اُس نے کہا کہ بیٹا! کیا بات کروں وہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) ایک غلطی کر بیٹھا ہوں کہ انسانوں کو پیدا کر رہا ہوں اور ہر انسان آلائش کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، آلائش والا جنت میں جا نہیں سکتا سب جہنم میں جائیں گے اب اس کے لیے کوئی چارہ کار سوچتا نہیں ہے۔ انہوں نے کہا: ابا جی! اس میں افسوس کی کوئی ایسی بات نہیں ہے اس کا حل موجود ہے۔ کہنے لگے کہ میں آپ کا اکلوتا بیٹا ہوں مجھے دنیا میں بھیج دیجئے یہ لوگ مجھے صلیب دے کر میری جان لیں گے اور آپ اعلان کیجیے کہ میرے بیٹے کا جو خون ہے وہ انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ عزیزان! من! یہ سارا کچھ سن کر آپ کے لبوں پہ مسکراہٹ آ جاتی ہے، کروڑ در کروڑ انسان مانتے چلے آ رہے ہیں اور آج مان رہے ہیں۔ وہ آئے اور انہوں نے ان کو صلیب پہ چڑھا دیا، خون ہوا اور خدا نے یہ اعلان کر دیا کہ جو بھی میرے بیٹے کے خون کے کفارے پر ایمان رکھے گا، اسے ہم جنت میں داخل کر دیں گے۔ تو ادلیں ماں باپ یعنی آدم اور حوا کا گناہ ہر آنے والے پہ لگ رہا ہے۔ آپ سوچ رہے ہیں کہ یہ کیا تصور ہے۔ وہ بیٹے کے صلیب کے بعد کے انسان تو یوں ہوئے اور جو پہلے کے انسان تھے وہ بھی تو اسی طرح سے پیدا ہوئے تھے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آپ اگر ذرا سا بھی تھوڑے سے ذہنی لیول پہ Rationally (استدلال سے) ان چیزوں پر Think (سوچ بچار) کریں تو نظر آ جاتا ہے کہ انسان کیا مانتے چلے آ رہے ہیں۔ یہی چیز ہندوؤں کے ہاں ہے کہ پچھلے جنم کوئی اس قسم کا کرن کر بیٹھے تو اس جنم کے اندر چوہا پیدا ہو گئے یا بلی پیدا ہو گئے یا کتا پیدا ہو گئے یا شورور پیدا ہو گئے۔ اب اس جنم میں جو جی میں آئے وہ کر لیں لیکن چوہا آدمی نہیں بن سکتا، شورور برہمن نہیں بن سکتا تو یہاں بھی عمل کا کوئی دخل نہ رہا۔ پچھلے جنم کا کوئی کرن کہ جس کا اس کو علم ہی نہیں ہے کہ میں کیوں مارا گیا اور اس جنم کے اندر کچھ بھی کر لے لیکن وہ فیصلہ تبدیل نہیں ہو سکتا۔

قرآن حکیم اپنے ہاں زندگی کا ایک اعلیٰ وارفع تصور پیش کرتا ہے

عزیزان! من! سنئے قرآن کیا تصور دیتا ہے؟ اُس نے کہا کہ **خَلَقَ الْإِنْسَانَ خَضِيقًا** (4:28) انسان کمزور واقع ہوا ہے اس سے لغزشیں ہو سکتی ہیں، لغزشوں کا ازالہ بھی ہو سکتا ہے۔ صحت مند انسان سے بھی کسی وقت کھانے پینے میں غلطی ہو جاتی ہے تو اگر کسی ایک وقت کی غذا سے انسان کی موت ہی اُس وقت واقع ہو جائے تو یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اُس نے اندر اتنی قوتِ مدافعت رکھی ہوئی ہے کہ وہ اس کا ازالہ کر سکے۔ یہ طیب اور ڈاکٹر کرتا یہ ہے کہ آپ کے اندر جو قوتِ مدافعت ہوتی ہے وہ اُس کو طاقت دیتا ہے اس کا نام علاج ہے۔ اگر

کسی وقت کوئی ایسی غلطی ہوگئی کہ جس سے یہ جو مرض ہے اُس کا نتیجہ ایسا ہو گیا تو اس کے لیے ایسی Provision (گنجائش) رکھ دی گئی کہ اگر اُس کا استعمال کر لیا جائے تو Power of Resistance (مدافعت کی قوت) اتنی بڑھ جائے کہ وہ اُس کا ازالہ کر دے۔ یہ نہیں ہے کہ ایک دفعہ کی غلطی سے ہمیشہ کے لیے راندہ درگاہ ہو جائے۔ وہ جو میں مثال دیا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں بھی یہ تعلیم کے اندر جو نصاب رکھا ہوا ہے تو 50% بھی پاس مارکس لے لیجیے تو وہ پاس مارکس ہو جاتے ہیں لیکن Divisions اور چیزیں ہیں۔ 56% مارکس بھی پاس مارکس ہو جاتے ہیں۔ اس طالب علم کی اگلی کلاس میں جانے کی جو صلاحیت ہے وہ اتنی ہے کہ یہ جو اس میں کمی رہ گئی ہے وہ صلاحیت اُس کو پورا کر دے گی لہذا اس کو اگلی کلاس میں Promote (ترقی) کر دو۔ یہ جو Provision (گنجائش) رکھنا ہے کہ اگر کہیں غلطی ہوگئی ہے تو اُس غلطی کے ازالے کے لیے خدا کی طرف سے Provision (گنجائش) رکھ دینا جو ہے یہ اُس کی رحمانیت کا تقاضا ہے کہ یونہی راندہ درگاہ نہ ہو جائے کہ ایک غلطی ہوئی اور ختم ہو گئے۔

گناہ اور جہنم کے سلسلہ میں یہودیت کے تصور کے برعکس قرآن حکیم کی تعلیم

یہودیت کے اندر تو یہ نہیں ہے ایک گناہ سرزد ہوا تو جہنم میں گئے۔ اب جہنم میں گئے تو اُس کے بعد تو پھر معاملہ ختم ہوا۔ کونسا انسان ایسا لے آئیں گے جس سے گناہ سرزد نہیں ہوا۔ جہنم میں چلے جاتے ہیں اُس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ دو تین دن کے بعد ہمارے جو اسلاف ہیں جو بڑے بزرگ گزرے ہیں ان کو پتہ چلے گا (جیسے وہ حوالات میں دیدیتے ہیں تو بعد میں پتہ چلتا ہے اور وہ ضمانت کے لیے جاتے ہیں) تو تیسرے دن ان کو پتہ چلے گا اور وہاں وہ جائیں گے اور وہاں جا کر خدا سے کہہ کر ہمیں جہنم سے نکال لائیں گے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ مذاہب کیا تھے اور یہ مذاہب کیا ہیں۔ یہاں قرآن نے یہ چیز کہی کہ **يُنْقَلَبُ لَكُمْ مِنْكُمْ خَيْرٌ** کا بھی آئے گا اور **يُنْقَلَبُ لَكُمْ شَرٌّ** کا بھی آئے گا۔ کوئی ایسی چیز نہیں جو ان میں سے ہم کسی کو معاف کر دیں اور اُس کا نتیجہ نہ نکلے لیکن اصول ہمارے ہاں یہ ہے کہ وہاں تو نظام ترازو ہوگا ایک پلڑے کے اندر تمہارے خیر رکھ دیئے جائیں گے یعنی صحت مند قوتیں صلاحیتیں جو صحت کو برقرار رکھنے کی ہیں دوسرے پلڑے کے اندر تمہارے ہاں یہ Resistance (مدافعت) کی Power (قوت) بھی رکھ دی جائے گی۔ اُس میں دیکھا یہ جائے گا کہ **فَتَبَوَّيْنِي عِيشَةً رَّاضِيَةً - وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ** (101:6) جس کا یہ صلاحیتوں کا پلڑا جھک گیا تو اُسے Promote (پاس) کر دیا جائے گا **وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ - فَأُولَٰئِكَ بِأُولِيئِهِ** (101:8-9) اور جس کا یہ پلڑا کمزور رہ گیا تو وہ ہے جو نقصان میں رہے گا تو جہاں یہ کہا کہ **يُنْقَلَبُ لَكُمْ خَيْرٌ** (99:7) بھی یعنی جو چیز ہوگی وہ سامنے آ جاگی اُس کے ساتھ ہی یہ چیز کہی کہ اُس ایک غلط قدم سے یہ نہیں ہوگا کہ ہمیشہ کے لیے راندہ درگاہ ہو جاؤ۔

اپنی غلطی کا اعتراف اپنی اصلاح کا ایک لازمی جز ہے

عزیزانِ من! اس میں ایک بڑی شرط ہے کہ اس کا اعتراف کیا جائے کہ ہاں مجھ سے یہ غلطی ہوئی ہے اس کی ندامت ہو اور اس کی ذمہ داری اپنے اوپر لی جائے کہ میں اس غلطی کا ذمہ دار ہوں۔ کہا کہ جو یہ مانتا ہی نہیں ہے کہ میں نے یہ غلطی کی ہے اُس کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ اصلاح کے لیے پہلی چیز تو یہ ہے کہ کہے: یہ قدم غلط ہے، اُس کو غلط تسلیم کرے گا تو صحیح قدم اٹھائے گا۔ جو غلط راستے پہ چلا جا رہا ہے ہر مسافر اُسے کہتا ہے کہ غلط راستے پہ جاتے ہو اور وہ آگے سے کہتا ہے کہ ”جاوئے جا“ تینوں کی ^①؟“ پہلی چیز یہ ہے کہ اُس کو اس کا اعتراف ہو کہ یہ راستہ غلط ہو گیا ہے اُس کو اس کی ندامت ہو کہ مجھ سے بھول چوک ہو گئی ہے وہ ذمہ داری کو قبول کرے کہ میں اپنے اس Action (عمل) کا ذمہ دار ہوں۔ وہ جو کئی بار بات سامنے آ گئی ہے اور دہرائی جاتی ہے کہ قصہ آدم و ابلیس ہے ہی یہ کہ آدم سے بھی ایک لغزش ہوئی اور ابلیس سے بھی ایک معصیت ہوئی۔ آدم سے پوچھا گیا کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ اُس نے کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (7:23) اے ہمارے نشوونما دینے والے! مجھ سے بھول ہو گئی، چوک ہو گئی، غلطی ہو گئی، لغزش ہو گئی، میں اس کا ذمہ دار ہوں مجھے اس کی ندامت ہے۔ کہا کہ کوئی بات نہیں، تم نے ذمہ داری کو قبول کیا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ یہ تمہاری لغزش تھی تو کوئی بات نہیں، تم ہمیشہ کے لیے راندہ درگاہ نہیں ہو سکتے اب فَايَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (2:38) ہماری طرف سے صحیح راستہ اور غلط راستہ دکھانے کی چیزیں آتی رہیں گی، تم ان پر چلتے چلے جاؤ، اُس کے بعد تمہاری یہ جو غلط راستے پہ چلنے کی چیز تھی اس کا ازالہ ہو جائے گا لیکن شرط یہ ہے کہ تم اس صحیح راستے پہ چلے جاؤ گے۔ ابلیس سے کہا گیا کہ تم نے یہ معصیت کیوں کی؟ کہنے لگا کہ تیرے حکم کے بغیر تو کوئی پتہ بھی نہیں مل سکتا، تیرے حکم اور منشا کے بغیر میں کیسے معصیت کر سکتا ہوں، میں اس معصیت کا ذمہ دار ہی نہیں ہوں۔ اسے کہا گیا کہ تیری اصلاح قیامت تک نہیں ہو سکتی۔ ابلیس تو کہتے ہی مایوس کو ہیں۔ خدا کا بڑا عجیب نظام عدل ہے۔

لغزش کے سلسلہ میں توبہ کرنے والے کے لیے خدا کی طرف سے رحمانیت کے دروازے ہمیشہ کھلے

رہتے ہیں

وہ جو چیز تھی کہ اگر کوئی لغزش ہو بھی گئی ہے تو اس کے ازالے کی صورت پیدا ہو سکتی ہے اور صورت یوں پیدا ہو سکتی ہے کہ غلطی کو غلطی مانے، اپنی ذمہ داری کو تسلیم کرے۔ توبہ کے معنی یہ ہیں کہ چوراہے سے اگر غلط راستے کی طرف قدم اٹھ گیا ہے اور چلتا گیا ہے آگے

① چل بے! تجھے کیا؟

چل کر کہیں محسوس ہوا، معلوم ہوا کہ یہ راستہ غلط ہے جدھر میں آ رہا ہوں تو قرآن نے کہا کہ صحیح راستے پر چلنے کے لیے پہلی بات یہ ہے کہ جتنا غلط راستہ طے کیا ہے، پچھلے پاؤں وہاں پھر لوٹ کر اُسی چوراہے پہ جائے تو یہ جو وہاں سے پچھلے پاؤں لوٹ کر آنا ہے عربی میں اسے توبہ کہتے ہیں۔ وہاں کھڑے کھڑے ہی اگر کہتا رہے گا کہ میں نے غلطی کی جو ادھر آ گیا یا اللہ! میری توبہ ہزار بار توبہ، لیکن وہیں کھڑا ہے تو عرب اس کے لیے توبہ کا لفظ استعمال نہیں کرتے اس کے لیے لازم تھا کہ لوٹ کے آئے۔ اب اگر وہ وہاں چوراہے پر آ گیا تو کیا منزل مقصود پہ پہنچ گیا؟ نہیں، بلکہ اب اسے یہاں سے صحیح راستے پہ چلنا بھی ہوگا۔ سارے قرآن میں ہے کہ من تائب واصلح جو پلٹ کے وہاں آیا اور پھر صحیح راستے کے اوپر چلا تو کہا کہ جو ایک دفعہ غلط راستے پہ چلا ہے اس کے لیے ہم نے پھانک بند نہیں کر دیئے ہوتے، صحیح راستے کے دروازے کھلے ہی رکھتے ہیں کہ ادھر آ تو جا۔ وہ جو میں نے اُس دن کہا تھا وہ بڑی عجیب چیز ہے کہ انسان جب اس راستے کی طرف پلٹ کر آتا ہے جسے اُس نے کہا کہ وہ خدا کی طرف آنے والا ہے تو عربی زبان میں اس پلٹ کے آنے والے کو ”تائب“ کہتے ہیں۔ خدا نے بندے کے متعلق کہا ہے کہ جب یہ ”تائب“ ہوتا ہے تو ہم ”تواب“ آتے ہیں، وہ ایک قدم پلٹتا ہے تو ہم دو قدم آگے بڑھتے ہیں۔ وہ گلے لگانے کے لیے دو قدم آگے بڑھتا ہے۔ انسان ہے تو غلطی کر سکتا ہے اس لیے کہا ہے کہ آ جا جلدی سے آ جا ہماری طرف۔ یہ جو غلطی ہو گئی ہے جو نقصان ہو گیا ہے اُس کے ازالے کا امکان رکھا گیا ہے۔

عدل کے سلسلہ میں پلڑے کی مثال ایک بڑی واضح مثال ہے

یہ ہے خدا کی رحمانیت۔ اس کے لیے اس نے پلڑے کی مثال دے کر بتایا ہے۔ یہ جھکنے والا پلڑا اور اٹھنے والا پلڑا، بڑی عجیب مثال ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اُس کے برائیوں کے پلڑے میں کچھ نہیں ہوتا، معصوم کا تصور غلط ہے۔ خدا کا جو لغزش کے ازالے کا تصور ہے وہ یہ ہے کہ اُس کا نیکوں کا پلڑا جھکا ہوا ہو۔ اسی لیے کہا کہ یَا تَبَّٰہُ اللّٰہُ (31:16) ایک ایک ذرہ سامنے لائے گا، کھینچ کر سامنے لائے گا اس لیے کہا کہ یَا دِرْکُھُو! اِنَّ اللّٰہَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ (31:16)۔ تم اُس سے کچھ بھی چھپا نہیں سکتے لیکن اس کے بعد یہ نہیں ہے کہ اُس کے بعد وہ یونہی فیصلہ کر دے بلکہ پلڑے میں ڈالے گا، ترازو کھڑا ہوگا۔ وہ کاٹنا تمہارے سامنے ہوگا تو دیکھ لیجیے گا کہ جو پلڑا جھکے گا تو اُس جھکنے کے بعد تو ہم سے پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔

عزیزانِ من! قرآن کریم نے آج کی آیات میں والدین کے متعلق، بوڑھے ماں باپ کے متعلق، فیملی لائف کے متعلق، ان کی تنہائی کے احساس کو مٹانے کے متعلق، تکریم و عزت، انسانیت کو برقرار رکھنے کے متعلق اور ہر انسان کے متعلق یہ تصور دیا کہ اس باب میں جو کچھ تم کرو گے، ہم جانتے ہیں کہ تم کس طرح کر رہے ہو، تمہارے دل کے ارادوں تک سے واقف ہیں۔ ہمارا قانون بڑا باریک ہیں ہے اور

ہر ایک کی حالت سے باخبر ہے۔

انسانی اعمال کا حساب تو ہر سانس میں ساتھ کے ساتھ ہوتا چلا جاتا ہے

ایک ایک چیز جو ہے وہ ہمارے میزانِ عدل میں ہے۔ کہنے کو تو ہم یہ کہتے ہیں کہ آخرت میں جا کر کھلے گی، وہ تو ہر سانس میں اُس کا میزانِ عدل موجود ہے، ہر سانس میں تلتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے اگر تمہارا یہ لغزشوں کا پلڑا کسی وقت بھاری ہو گیا ہے تو کوئی بات نہیں **إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ** (11:11)۔ یہ قرآن کا عجیب اصول ہے کہ یاد رکھو اگر کچھ خیر ہی کام ہو گئے ہیں تو تعمیری کام اتنے زیادہ کرو کہ وہ گڑھا بھی بھر جائے اور اُس سے زائد بھی کچھ تمہارے پاس بچ جائے۔ تخریبات کا اور سیئات کا ازالہ حسنات کے ذریعے سے ہوتا ہے لہذا اُس سے زیادہ حسنات کا پہلو لاؤ، اس کے بعد کامیابی ہو جائے گی۔ اصلاح کا یہی پہلو ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے۔ اگر معاشرے میں غلطیاں ہو گئی ہیں، نقصانات ہو گئے ہیں تو حسنات اتنے زیادہ تعداد میں کر لو کہ وہ غلطیوں کے پلڑے کو بھی ڈھانپ دے اور تمہارا یہ پلڑا بھی جھک جائے۔

عزیزانِ من! سورۃ لقمان کی آیت 16 تک ہم آگئے، 17 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط

.....

چوتھا باب: سورۃ لقمن (آیات 17 تا 21)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزانِ من! آج نومبر 1979ء کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ لقمن کی آیت 17 سے ہو رہا ہے: (31:17)۔ آغازِ درس سے پہلے میں آپ احباب کی خدمت میں عید الاضحیٰ کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اسے قبول فرمائیے۔

جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا کہ سورۃ لقمن کی سابقہ آیات میں ان نصائح کا ذکر چلا آ رہا تھا اور وہ ابھی مسلسل چلا آ رہا ہے جو لقمان نے اپنے بیٹے کو کی تھیں۔ میں نے پہلے درس میں یہ عرض کیا تھا کہ لقمان کے متعلق متعین طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کونسی شخصیت تھی حتیٰ کہ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ نبی بھی تھے یا نہیں کیونکہ قرآنِ کریم نے انہیں بالتصریح زمرہ انبیائے کرام میں شامل نہیں کیا لیکن جو باتیں ان کی طرف منسوب کر کے یا ان کی جو باتیں قرآن نے کہی ہیں وہ بالکل وحی کے مطابق ہیں۔

اڑھائی ہزار سال سے مسئلہ خیر و شر کی پیچیدگیوں کا قرآنی حل

سابقہ آیات کے تسلسل میں اگلی بات شروع میں یہ کہی ہے کہ **يُنَبِّئُ أَقِيمِ الصَّلَاةَ وَآتِ بِالْمَعْرُوفِ وَأَنَّهُ عَنِ الْغَضَبِ**

(31:17) اے بیٹے اقامتِ صلوٰۃ کا انتظام کرو، معروف کا حکم دو، منکر سے روکو۔ یہ اصطلاحات اس سے پیشتر متعدد بار آچکی ہیں، بار دیگر ان کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ نظامِ صلوٰۃ کے متعلق تو میں برس سے یہ چیز چلی آرہی ہے اور قرآن کریم کے تو ہر دوسرے تیسرے صفحے پر یہ چیز سامنے آئے گی۔ اسی طرح سے معروف اور منکر بھی ہے۔ معروف ہر وہ بات ہے جسے قرآن کریم صحیح اور خیر تسلیم کرے۔ منکر وہ ہے جس کے خلاف قرآن کہے۔ جسے انگریزی میں Good & Evil (خیر و شر) کہتے ہیں اور جو مسئلہ اڑھائی ہزار سال سے علمائے اخلاقیات اور فلاسفوں میں مابہ نزاع چلا آرہا ہے وہ یہ ہے کہ Absolute Good (مطلق خیر) کسے کہتے ہیں اور Absolute Evil (مطلق شر) کیا ہوتا ہے یعنی مطلق خیر کسے کہتے ہیں اور مطلق شر کیا ہوتا ہے؟ یہ طے ہی نہیں ہو سکا۔ قرآن کریم نے تو اس کو دو لفظوں میں بیان کر دیا کہ خدا کی وحی جس چیز کو خیر کہتی ہے وہ خیر مطلق ہوتا ہے، جسے وہ شر قرار دیتی ہے وہ منکر ہو جاتا ہے۔ قرآن پر ایمان لانے والوں کے لیے یہ مسئلہ آسان ہو گیا۔ میں ابھی آگے چل کر عرض کروں گا کہ یہ بات یونہی ہے کہ قرآن ماننے والے اس کو بس یونہی مان لیتے ہیں۔ یہ بات یونہی نہیں مانی جاتی لیکن بہر حال جو المعروف اور منکر ہے، اُس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی سند کی رو سے جسے قرآن صحیح Recognize (تسلیم) کرتا ہے وہ صحیح ہے، جسے وہ Recognize (تسلیم) نہیں کرتا وہ غلط ہے۔

قوموں کے لیے الفاظ کے حقیقی مفہوم کی اہمیت کے سلسلہ میں لفظ ”صبر“ کی ایک مثال

آگے یہ کہا ہے کہ **وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ** (31:17) اس کا عام ترجمہ یہی ہوتا ہے کہ مصیبت پر صبر کیا کرو۔ اور جب ہم صبر کا لفظ اپنے ہاں بولتے ہیں تو اس کا مفہوم ہمارے سامنے یہ ہوتا ہے کہ جب کچھ نہ بن پڑے، بیچارگی کا عالم ہو، کچھ بن نہ سکے، کچھ ممکن نہ ہو، بے کسی ہو، بے بسی ہو تو اُس موقعہ پہ کہا جاتا ہے کہ بھئی! اب صبر کے سوا چارہ نہیں ہے۔ عام طور پر کسی کی مرگ پر موت کے بعد یہ کہتے ہیں اس لیے کہ مردہ کو تو واپس زندہ کر کے نہیں لایا جاسکتا۔ یعنی ایسی بیچارگی کہ جس کا کوئی علاج ہی ممکن نہ ہو تو اُس مقام پر یہ بولا جاتا ہے۔ اور اس سے ورے بھی جس مقام پہ بھی کچھ ایسا ظلم، کوئی ایسی تکلیف، ایسی مصیبت، جس کا کوئی علاج نہ ہو سکے، اُس وقت کہا جاتا ہے کہ صبر کرو۔ ہمارے ہاں کا عورتوں کا طبقہ تو ہے ہی مظلوم طبقہ۔ ان کے ہاں عام طور پہ یہ چیز ہوتی ہے کہ جب بھی کوئی بہن دوسری بہن سے اپنی کوئی مصیبت بیان کرتی ہے تو وہ اس کے سوا کچھ کہہ ہی نہیں سکتی کہ ”اچھا بہن صبر کرو، ہن صبر دے سوا چارہ وی کی ہے، ہووی کی سکا اے“؟، یعنی جہاں یہ ہو کہ ”ہووی کی سکا اے“؟، تو وہاں کہا جاتا ہے کہ صبر کرو۔ اور اُس کے آگے ہے کہ **إِنَّ اللَّهَ**

① اچھا بہن صبر کرو۔ اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، ہو بھی کیا سکتا ہے؟

② ہو بھی کیا سکتا ہے؟

الصَّبْرُ (2:153) اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو صابر ہوتے ہیں۔ اب سوچئے کہ جہاں یہ کہا جائے کہ ہو ہی کچھ نہیں سکتا، انتہائی بے کسی ہے، مظلومیت ہے، بے بسی ہے، کوئی چارہ کار نہیں ہے تو یہ ایک ایسی عظیم چیز ہوئی جو کہا کہ اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی اگر کوئی کسی واقعہ کے خلاف چارہ جوئی کریں، ہمت کریں، اُس کا مداوا سوچیں، کوئی اس کا علاج کریں تو پھر ان کے ساتھ تو اللہ نہیں ہوتا۔ اور جو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور رونا شروع کر دے تو اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔

کہتا ہوں کہ آہی جائے گا صبر
پھر کہتا ہوں کہ اگر نہ آیا تو؟

”تے فی ردوب مر ۱“

قرآن حکیم کے مروجہ تراجم کی وجہ سے غلط نظریات کے پیدا ہونے کا نتیجہ

قوموں کے اندر الفاظ کے جو مفہوم رائج ہو جاتے ہیں اصل میں الفاظ کے مفہوم یوں نہیں ہوتے بلکہ وہ قوم اپنے اوپر ایسی حالت طاری کر لیتی ہے کہ وہ الفاظ ان کی ان کیفیات کے آئینہ دار بن جاتے ہیں۔ صبر اس تصور کے بالکل برعکس معنی کے لیے بولا جاتا ہے، یکسر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ صبر کے معنی ہوتے ہیں کہ ”حصول مقصد میں پیہم ہمت کے ساتھ کام کرتے چلے جانا“ ثابت قدمی سے کرتے چلے جانا کہ اس میں لغزش نہ آنے پائے، اُس کے اندر استقلال ہو، ایسا نہ ہو کہ کہیں ہار تھک کر بیٹھ جائے، دل چھوڑ دے، ہمت ہار دے، مسلسل یہ کچھ کیے چلا جائے۔“ یہ ہے جس کے لیے عربوں کے ہاں یہ لفظ بولا جاتا تھا اور یہ ہے جس کے لیے یہ لفظ قرآن کریم میں آتا ہے۔ آپ دیکھیے کہ یہ الفاظ قوموں کے اوپر جادو کیا کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں قرآن شریف تو سب پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جی! الحمد للہ! میں باترجمہ پڑھتا ہوں۔ بے ترجمہ پڑھتا تو اتنا نقصان نہ ہوتا لیکن باترجمہ پڑھ کر آپ نے یہ کیا کہ صاحب! صبر کرو کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب آپ نے یہ کہہ دیا کہ صاحب! قرآن بھی تو کہتا ہے کہ صبر کرو۔

الصَّبْرُ کا قرآنی مفہوم

عربوں کے ہاں یہ چیز ہے کہ ”کسی مقصد کے حصول کے لیے مسلسل، متواتر، استقامت اور ثبات سے مصروف کار رہنا“ راستے میں کتنی بڑی رکاوٹ کیوں نہ آئے اُس سے اپنے اندر لغزش نہ پیدا ہونے دینا، اپنے اندر کمزوری نہ پیدا ہونے دینا، اُس کو رکاوٹ نہ بننے دینا، وہ اسے صبر کہتے ہیں۔“ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ ان کے ہاں تو ان الفاظ کا مفہوم محسوس طور پہ ہوتا تھا، وہ قوم جو کرتی تھی تو اُس

سے یہ مفہوم واضح ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کسان نہایت اچھا صالح بیج لے جا کر مٹی میں دبا آتا ہے اور مہینوں ہر روز صبح اٹھ کر وہاں کھیت پہ جاتا ہے، سارا دن محنت کرتا ہے، خون پسینہ ایک کر دیتا ہے، شام کو خالی ہاتھ واپس آ جاتا ہے، دوسرے دن صبح پھر اسی طرح سے وہاں چلا جاتا ہے۔ آپ دیکھیے کہ کسان کا اپنے مقصد کے حصول میں یہ جو پروگرام ہے، یہ کس قدر سعی پیہم، مسلسل کوشش، پیہم کوشش، کامقاضی ہے۔ اس میں تھکنا نہیں ہے، ہمت نہیں ہارنا، راستے میں اگر کوئی رکاوٹ آتی ہے تو اُسے دور کرنا ہے۔ وہ کھیتوں میں جا کر کرتا ہی یہ ہے کہ پودوں کے اگنے میں بڑھنے پھولنے میں جو رکاوٹیں ہوتی ہیں، وہ ان کو دور کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ سارا کچھ کرنے کے بعد جب اُس کی یہ محنت شاقہ، مسلسل پیہم کوشش رنگ لاتی ہے یعنی غلے کا ڈھیر لگتا ہے تو اُس غلے کے ڈھیر کو وہ الصبرہ کہتے ہیں۔ کیا بات تھی اس قوم کی! یہ دکان کے اوپر غلے کا جو ڈھیر تھا وہ اُس کو الصبرہ نہیں کہتے تھے۔ کسان کے کھیت میں فصل کٹنے کے بعد جو غلے کا ڈھیر ہوتا تھا اُس کو عرب الصبرہ کہتے تھے یعنی صبر کا نتیجہ۔ یہ اس لفظ کا دوسرا مفہوم ہے کہ لغزش نہ آنے پائے دل ڈول نہ جائے، توازن برقرار رہے، اس سعی پیہم کے اندر رکاوٹوں کا مسلسل مقابلہ کرنا، تاکہ کسی وقت بھی آدمی کے اندر لغزش نہ پیدا ہو جائے۔ پہلے زمانے میں لکڑی کی کشتی ہوتی تھی جس کو لے کر وہ پانی میں نکلتے تھے۔ کشتی کے لیے ضروری ہے کہ اُس کا توازن برقرار رہے، پانی میں اگر ذرا سا بھی اُس کا توازن بگڑے تو کشتی کے ڈوب جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ انہوں نے سواریاں بٹھائی ہیں اور دیکھا ہے کہ توازن صحیح نہیں رہا تو وہ اُس کا توازن برقرار رکھنے کے لیے ایک طرف پتھر رکھ دیتے تھے۔ ہمارے ہاں تاں گئے ہوتے تھے۔ اُن کے پیچھے آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ اتنا بڑا پتھر ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ وہ کشتی میں بھی اتنا پتھر ایک طرف رکھ دیتے تھے تاکہ وہ ڈولنے نہ پائے، اُس کا توازن بگڑنے نہ پائے تو یہ شے یا پتھر جو کسی کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے مدد و معاون ہو، عرب اُس پتھر کو الصابورہ کہتے تھے کہ جس سے کشتی کو صبر آ جائے۔ اب آپ اندازہ لگا لیجیے کہ صبر کے معنی کیا ہیں اور جو کہا ہے کہ **إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ** (2:153) اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے کا مطلب کیا ہے اور یہ بھی کہ یہ کون لوگ ہیں جن کے ساتھ اللہ کی نصرت ہوتی ہے؟ نیز عربی لغت کی رو سے اس کے معنی کیا ہوئے؟

میں نے کہا ہے کہ ترجمے کی دو ہی سندیں ہیں: عربی لغت اور قرآن کریم (تصریف آیات کی رو سے)۔ حضرت جالوت (2:249; 2:249) اور طالوت (2:247; 2:249) کا واقعہ جنگ ہے اور اس جنگ میں طالوت کے یہ لشکر جاتے ہیں۔ ان لشکروں کے متعلق کہا ہے کہ ان کے لشکروں کی دعائیں یہ تھیں: **قَالُوا رَبَّنَا آفِضْ عَلَيْنَا صَبْرًا** (2:250) اے ہمارے نشوونما دینے والے! صبر ہمارے دلوں میں انڈھیل دے، بہت زیادہ صبر عطا کر دے۔ **وَقَدْ ثَبَتْنَا فِتْنًا** (2:250) یعنی ہم میں ثابت قدمی پیدا کر دے۔ یہ الفاظ خود صبر کا مفہوم بتا رہے ہیں، صبر کی تشریح قرآن خود کر رہا ہے۔ ہمارے ہاں بھی ثابت قدمی کا لفظ بولا جاتا ہے اور آگے ہے کہ **انصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ** (2:250) اس طرح سے ہمیں اس مخالف قوم کے اوپر غلبہ عطا کر دے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ

ایسی محنت جس میں آدمی کبھی ہمت ہار کر نہ بیٹھ جائے، کمزوری محسوس نہ کرنے لگ جائے مستقل مزاجی اور ہمت سے کوشاں رہے، صبر کہلاتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ **وَكَاتِلِينَ بِمَا نَبِيًّا فَتَلَ مَعَهُ يَتِيمُونَ كَثِيرٌ (3:14)** یہ بات کہ تمہیں اپنے نظام کے مخالفین کا مقابلہ کرنا ہوگا، کوئی نئی بات نہیں۔ اقوام سابقہ میں بھی یہ ہوا ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ انبیاء کے ساتھ ان کی جماعتیں تھیں اور ان جماعتوں کو مخالفین کے مقابلے میں میدان جنگ میں آنا پڑا، انہوں نے لڑائیاں لڑیں لیکن وہ اور ان کے ساتھیوں کی کیفیت یہ تھی کہ **فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (3:14)** اس خدا کے راستے میں جو بھی واقعات ان کے سامنے آئے، جو رکاوٹیں ان کے سامنے آئیں، ان سے انکے پاؤں میں لغزش پیدا نہیں ہوئی **وَمَا ضَعُفُوا (3:145)** نہ ہی ان میں کمزوری آئی **وَمَا اسْتَكَانُوا (3:145)** نہ ہی وہ تھک کر ہمت ہار کر بیٹھ گئے۔ ان کے لیے کہا کہ **وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ (3:146)** یہ وہ صابرین ہیں جن کو اللہ محبت کرتا ہے۔ یہ صابرین کی تشریح کی جا رہی ہے کہ کتنا ہی بڑا مقابلہ اور مخالفت کی جنگ آزمائیاں کیوں نہ ہوں، ان میں نہ ہی لغزش آئے، نہ کمزوری آئے، نہ انسان دل چھوڑے۔ اور پھر سورۃ البقرۃ میں جہاں یہ الفاظ یا جہاں یہ تشریح آئی ہے، وہ تو اتنی بڑی وضاحت ہے کہ اس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کہا ہے کہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ (2:1)** اے جماعتِ مومنین! صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ خدا سے استعانت طلب کرو۔ صلوٰۃ والی بات تو میں نے عرض کیا ہے کہ میں پہلے کئی دفعہ کہہ چکا ہوں، آج بات صرف صبر پر مرکوز ہو رہی ہیں۔ کہا ہے کہ صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ استعانت طلب کرو۔ **إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (2:153)** اللہ صابرین کے ساتھ ہے۔ کون ہیں یہ جن سے کہا جا رہا ہے، ان کی کیا کیفیت ہے؟ کہا ہے کہ **وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ (2:154)** اس طرح سے میدان جنگ میں مخالفین کا مقابلہ کرتے ہوئے جو جان دیدیتا ہے اُسے مردہ مت کہو۔ **بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ (2:154)** وہ تو زندہ ہیں، مردہ تو تم ہو لیکن تمہارے ذہن کا جو موجودہ شعور ہے اُس کی رو سے تم سمجھ نہیں سکتے کہ ان کو کس قسم کی زندگی عطا ہوتی ہے، بہر حال انہیں مردہ مت کہو، وہ حیاتِ جاوداں سے بہرہ یاب ہوتے ہیں لیکن جس طرح تم اس طبعی زندگی کا ادراک حواس (Senses) کے ذریعے کر سکتے ہو، اس زندگی کا ادراک اس طرح نہیں کر سکتے۔ وہ محسوسات کی دنیا سے باہر کی چیز ہے۔ اس جدوجہد میں بیشتر مواقع ایسے آئیں گے جن میں **وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّرَاتِ (2:155)**۔

یہ شہادت کہ الفت میں قدم رکھنا ہے

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

کٹھن سے کٹھن منزل کو سر کرنے کے لیے پوری دل جمعی کے ساتھ سرگرم عمل رہنا صبر کہلاتا ہے اس راستے کے اندر قدم قدم کے اوپر اس قسم کے مواقع آئیں گے جہاں تمہاری ہمتوں کا تمہارے مقابلہ کرنے کی قوتوں کا ٹیسٹ ہوگا۔ یہ ٹیسٹ خوف سے، بھوک سے، اموال ضائع ہونے سے، جانیں ضائع ہونے سے ہوگا۔ ان تمام چیزوں کے نقصان ہو گئے، اس راستے کے اندر یہ مواقع آئیں گے۔ اس کے بعد ہے کہ **وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ** (2:155) کامیابی کا مژدہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ان مقامات میں صبر سے کام لیتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ صبر کے وہی بنیادی معنی ہیں جو میں نے عرض کیے ہیں کہ مسلسل اور پیہم اپنے مقصد کے حصول میں آگے ہی بڑھتے چلے جانا، کہیں رکنا نہیں، تھکنا نہیں، ہمت نہیں ہارنا، پاؤں میں لغزش نہیں آنے دینا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے کہا کہ **الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ** (2:156)۔ ہمارے ہاں تو مصیبت صرف مصیبت ہی کے لیے آتا ہے۔ عربی زبان میں ہر واقعہ ہر ہنگامی چیز، ہر حادثہ جو پیش آجائے اُس کے لیے لفظ مصیبت آتا ہے۔ کہا ہے کہ جو بھی اس قسم کا واقعہ ہوگا، کوئی ہنگامہ ہو، اس راستے میں نبرد آزمائیاں ہوں، جو کچھ بھی ہو، مختصر جو بھی اس قسم کی چیزیں ہوں جہاں ٹکراؤ ہوگا، سخت ترین مقابلہ ہوگا، جہاں جانیں تک دیدینے والی ہوتی ہیں، ہر قسم کا نقصان ہوتا ہے، تو یہ صبر کرتے ہیں۔

إِنَّا لِلَّهِ کے الفاظ کا قرآنی مفہوم

کہا ہے کہ جو اس طرح سے میدان کارزار میں جنگ کرتے ہوئے اپنی جانیں تک دیدیں، تو ان کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں، تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے کہ وہ زندگی کس قسم کی ہے۔ ان کو قدم قدم کے اوپر مقابلہ آئے گا، قدم قدم کے اوپر آزمائشیں ہوں گی، نقصانات ہوتے چلے جائیں گے۔ وہ مقابلے میں آگے بڑھتے چلے جائیں گے اور ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ جب بھی کوئی سخت ترین مقابلہ آئے گا تو وہ قائل ہوں کہ **إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ** (2:156)۔ آپ کے ہاں یہ اناللہ موت کی خبر کے وقت پڑھا جاتا ہے کہ **إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ** (2:156)۔ عام طور پر یہ موت کی خبر پہ ہی پڑھا جاتا ہے۔ وہ جیسا مرنے کے بعد ہم تعزیت کا خط لکھتے ہیں تو اُس میں کہا جاتا ہے کہ اللہ میاں! صبر کی توفیق عطا فرما، میاں! صبر کرو، صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ جب کوئی چارہ ہی نہیں تو اب اور کرنا ہی کیا ہے۔ اسی طرح سے موت کی خبر کے بعد بھی یہ کہتے ہیں کہ **إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ** (2:156) اس سے کم درجے کی بھی کوئی مصیبت آتی ہے تو اُس پہ بھی عام طور پر یہی کہتے ہیں۔ یہ اس کا صحیح مفہوم نہیں ہے۔

آپ قرآن میں دیکھیں کہ یہ واقعہ کہاں آیا ہے۔ میدان کارزار ہے، مقابلہ ہو رہا ہے، مخالفین مقابلے میں ہر قسم کا حملہ کرتے چلے جا رہے ہیں، ان کو راستے میں روک رہے ہیں۔ اس میں مال، توانائیاں صرف ہو رہی ہیں، حتیٰ کہ جانیں تک اس میں تلف ہو رہی ہیں اور جو

تلف ہو رہی ہیں ان کے متعلق کہا کہ وہ مرنے نہیں رہے لیکن بہر حال کٹ رہے ہیں۔ یہ راستے میں بڑھ رہے ہیں اور مخالف انہیں روک رہے ہیں۔ اور جب مقابلے کی انتہا ہو جاتی ہے تو یہ ان سے کہتے ہیں کہ تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارے اس مقابلے سے تمہاری اس مزاحمت سے تمہارے اس تصادم سے کیا ہم رک جائیں گے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ کیا ہم اپنا رخ بدل لیں گے ہم دوسری سمت کی طرف چلے جائیں گے ہم پیچھے ہٹ جائیں گے؟ تم اگر یہ سمجھتے ہو تو ہمارے متعلق غلط سمجھتے ہو۔ **إِنَّا لِلّٰہِ** (2:156) ہم نے اپنے آپ کو خدا کے اس پروگرام کی تکمیل کے لیے وقف کر دیا ہے **إِنَّا لِلّٰہِ رَبِّ الْعِزَّةِ** (2:156) لو! چلے ہم اُس کی طرف روکو! اگر کوئی روکنے والا ہے آؤ تو سہی۔ کتنا عظیم بلند نعرہ ہے! کیا تم لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ ہم اپنی جانوں کی حفاظت کے لیے مال کی حفاظت کے لیے یا کچھ غنیمت کا مال لوٹنے کے لیے یہ کچھ کر رہے ہیں؟ کیا تمہارے ذہن میں ہمارے متعلق یہ تصور ہے کہ ہم یہ کریں گے؟ تم جانتے نہیں ہو کہ ہم کون ہیں اور کس مقصد کے لیے اس میدان کارزار میں آئے ہوئے ہیں۔ یہ تصادم اس لیے ہو رہا ہے کہ **إِنَّا لِلّٰہِ** (2:156) ہم یہ اپنے لیے کچھ نہیں کر رہے بڑا عظیم نصب العین ہمارے سامنے ہے جس کے حصول کی خاطر ہم یہ کر رہے ہیں اور اس لیے اس راستے میں کوئی رکاوٹ ایسی نہیں ہوگی جس سے ہم دوسری طرف پلٹ کر چلے جائیں منہ موڑ لیں رخ موڑ لیں ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ **إِنَّا لِلّٰہِ رَبِّ الْعِزَّةِ** (2:156) ہمارا ہر قدم اُسی مقصد کی طرف اٹھے گا جو خدا نے ہمارے لیے مقرر کر دیا ہے تم کر لو جو کچھ کرنا چاہتے ہو۔ آگے کہا ہے کہ **أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَواتٌ مِّن رَّبِّہُمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْتَخُونَ** (2:157) یہ ہیں جن کے اوپر خدا اور اُس کے فرشتے تہنیت اور تبریک کے پھول نچھاور کرتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کہا جائے گا کہ صحیح راستے کے اوپر چلنے والے ہیں۔

عزیزانِ من! صابرین کا مفہوم آپ نے سمجھ لیا، دیکھ لیا کہ قرآن کریم کی رو سے صبر کسے کہتے ہیں۔ اور اس لیے یہاں سورۃ لقمن میں یہ لفظ آیا تھا کہ **وَاصْبِرْ عَلٰی مَا أَصَابَكَ** (31:1) جو حادثہ تمہارے سامنے پیش آئے، جم کر اُس کا مقابلہ کرو آگے بڑھتے چلے جاؤ، لغزش نہ آنے پائے، ہمت مت ہارو اپنے اندر کمزوری نہ پیدا ہونے دو۔ اس لیے کہ **إِنَّ ذٰلِكَ مِن عَزْمِ الْأُمُورِ** (31:17) یہ تو بڑی عزیمت چاہتا ہے بڑی ہمت کی بات ہے۔ ان مواقع کے اوپر اس طرح سے جم کر کھڑے ہو جانا اور ہر مقابلہ میں آگے ہی بڑھتے چلے جانا من **عَزْمِ الْأُمُورِ** (31:17) ہے۔ اب آپ سوچیے کہ وہ جو ہمارے ہاں صبر کا مفہوم ہے کہ رونے بیٹھ جانا اور یہ سمجھنا کہ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا، انتہائی بے بسی کا عالم تو کیا قرآن تو اس کیفیت کو **عَزْمِ الْأُمُورِ** (31:17) کہے گا۔ عزم کا لفظ تو آپ نے سنا ہوگا کہ ارادے کی پختگی کو کہتے ہیں۔ عزیمت بھی آپ نے سنا ہوگا کہ بڑی ہمت اور استقلال کو کہتے ہیں جیسے صاحبِ عزیمت یعنی بڑی ہمت اور استقلال کے مالک۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب ”اعمال قرآنی“ میں قرآن پر عمل کرنے کے طریق

جب دین مذہب میں تبدیلی ہوتا ہے تو پھر ہر چیز کا حلیہ بگڑ جاتا ہے اس کا مفہوم بالکل برعکس ہو جاتا ہے۔ اب عزیمۃ کے معنی ہیں تعویذ اور عزائم القرآن کے معنی ہیں قرآن کریم کی آیات جن سے تعویذ لکھے جاتے ہیں اور جھاڑ پھونک کی جاتی ہے اور المعزم کے معنی ہیں جھاڑ پھونک کرنے والا۔ عزیزانِ من! عمل تو آپ جانتے ہیں کہ کسے کہتے ہیں۔ آپ کے ہاں بھنگ پینے والوں کو ”عملی“ کہتے ہیں۔ پھر آپ کو پتہ ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم (1863-1943) کی کتاب ”اعمال قرآنی“ ہے۔ قرآن زور ہی اعمال پہ دیتا ہے سارا قرآن ضابطہ ہی اعمال کا ہے: مما يعملون، مما تعملون۔ اس میں عمل عمل عمل کی پکار ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ اعمال قرآنی میں یہ ہے کہ قرآن کی آیتوں کے تعویذ لکھے ہوئے ہوتے ہیں، ورد لکھے ہوئے ہوتے ہیں، وظیفے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ عملیات تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ کیا ہوتے ہیں یعنی قرآن کی آیتوں کے ورد اور وظیفے جن بھوت اور چڑیلیں نکالنے کے لیے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ آپ اندازہ لگائیے کہ جب قوم کا تصور یا اُس کی ذہنیت بدلتی ہے تو وہ جو قرآن کے الفاظ ہیں ان کا مفہوم کیا رہ جاتا ہے۔ بہر حال یہاں عزم کی بات ہو رہی تھی۔ عزم مستحکم ارادے کا نام ہے جسے عزیمت کہتے ہیں۔

مذہبی دنیا میں عزم کی نوعیت نیز عمالوں اور العزم کا تذکرہ

آپ کو پتہ ہے کہ ہمارے ہاں اب عزیمت کے معنی تعویذ گنڈہ ہیں۔ اب آپ کہیں گے کہ یہ کیسے ہوا۔ وہ ایسے ہوا کہ ”اوہنوں کس کے گنڈہ دیندے نہیں“^① وہ چونکہ بہت کس کے گانڈہ دیتے ہیں تو اسی طرح یہ تعویذ جو ہے کہ جسے بہت سختی سے باندھا جائے تو اس تعویذ کو عزیمت کہتے ہیں۔ جس طرح سے کتابوں کا نام ”اعمال قرآنی“ ہے اسی طرح سے یہ عَزِمُ الْقُرْآنِ کا ترجمہ ہو رہا ہے عزائم القرآن کتابیں بکتی ہیں اور اُس میں تعویذ لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جس طرح سے تعویذ کرنے والوں کو عمال کہتے ہیں اسی طرح سے تعویذ لکھنے والوں کو المعزم^② کہتے ہیں۔

تمدنی زندگی کے سلسلہ میں لقمان کی قابلِ قدر تعلیم

کیا نصائح ہیں جو یہ باپ (القمان) اپنے بیٹے کو کر رہا ہے! اب وہ تمدنی زندگی کی طرف آرہا ہے۔ کہا ہے کہ وَلَا تُصَيِّرْ خَدَّكَ لِالنَّاسِ (31:18)۔ انسان مدنی الطبع (Social Animal) ہے ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ پڑتا رہتا ہے۔ کہا کہ کوئی انسان

① اسے سخت گانڈہ دیتے ہیں۔

② حوالے کے لیے دیکھیے امام راغب اصفہانی کی مشہور تصنیف ”المفردات فی غریب القرآن“۔

انسان کی حیثیت سے تمہارے پاس آتا ہے تو..... تَصَدَّقْ (31:18) کے عام معنی یہی ہیں کہ بے رخی نہ برتو۔ لیکن عربوں کے ہاں اس بے رخی کا عجیب انداز تھا۔ اونٹ کو ایک بیماری لگتی تھی جس میں اس کی گردن مڑ جاتی تھی اور منہ بھی ٹیڑھا ہو جاتا تھا غالباً لقوے کی طرح کی کوئی چیز ہوگی۔ اگر گردن مڑ جائے اور منہ ٹیڑھا ہو جائے تو اس کے لیے ان کے ہاں ایک ہی لفظ صعر تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ جب کسی شخص کا معاملہ اتفاق سے یا اُس کی بد قسمتی سے تمہارے ساتھ پڑ گیا ہے تو وہ تمہارے سامنے آئے یا تمہارے ساتھ بات کرے تو اس طرح نہ ہو جانا جیسا وہ اونٹ ہوتا ہے۔ اور آج تو آپ دیکھیے کہ کسی کے ساتھ معاملہ پڑ جائے ”ایہہ کمیٹی دائوریا ہوندا ہیگا۔“ تسی ایہدے کولوں کچھ لینا نہیں ہوندا اینوں چار پیسے دینے ای ہوندے نیں۔ اوہنوں دیکھو کس طرح اونٹ وانگوں گردن مڑی ہوئی ہوندی ہیگی اے جیوں لقوہ ہویا ہوندا ہیگا اے“۔ کسی کے ساتھ آپ کا معاملہ پڑ جائے پھر دیکھو کہ وہ کیا کرتا ہے۔ ایک دوست نے مجھے کہا تھا کہ میں تو گھر سے نکلتے وقت دعایہ کرتا ہوں کہ یا اللہ! کسی آدمی سے واسطہ نہ پڑ جائے ”کتے کولوں تے میں فیروی وٹ مار کے بچ لاں“ ۷ گا، لیکن آدمی کے ساتھ واسطہ نہ پڑے۔ میں نے کہا تھا کہ

آدمی کو خدا نہ دکھلائے آدمی کا کبھی خدا ہونا

انسان کی عقل مندی کا ثبوت اس کی نفسیاتی کیفیات سے ملتا ہے اور انسانی نفسیات کے مختلف پہلو پہلی چیز یہ ہے کہ آپ کے اچھے بھلے تعلقات ہوتے ہیں ملنا جلنا سب کچھ ہے ویسے جاؤ تو بڑی خوشی سے ملیں گے لیکن ذرا کوئی درخواست لے کر یا کوئی کام کرنے کے لیے کہیں جاؤ تو پھر دیکھیے کہ کس طرح گردن مڑ جاتی ہے اور منہ لقوہ ہو جاتا ہے۔ وہ سیدھے منہ سے بات ہی نہیں کرتے کہ ”کتھے منہ نوں موج نہ آجائے“ ۸۔

آپ دیکھیے قرآن کس طرح روزمرہ کی باتیں بتا رہا ہے کہ ایک دوسرے سے تعاون کی بات ہے، کبھی تمہارا بھی اُس سے کام پڑ جائے گی خوشدلی سے پیش آؤ، خندہ پیشانی سے اس کے ساتھ پیش آؤ۔ اس طرح سے پیش آنے سے انسان کی آدمی مصیبت ہی ٹل جاتی ہے۔ کہا کہ وَلَا تَحْشَوْا الْاَرْضَ قَرَارًا (31:18) ذرا سا اقتدار حاصل ہو گیا ہے تو اب ایسا اکر کر نہ چلو۔ دوسری جگہ ہے کہ گویا تم اس زمین کو پھاڑ دو گے پہاڑ کی بلندیوں سے اوپر تمہارا سر چلا جائے گا۔ تمہیں حاصل کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ کیفیت پیدا ہوگئی۔

① یہ کمیٹی مقرر کیا گیا ہوتا ہے۔ آپ نے اس سے کچھ لینا نہیں ہوتا اسے چار پیسے دینے ہی ہوتے ہیں۔ اسے ملاحظہ کرو کہ کس طرح اونٹ کی طرح اسکی گردن مڑی ہوتی ہے وہی جسے لقوہ ہوا ہوتا ہے۔

② کتے سے تو میں بھر بھی ڈھیلا مار کر بچ رہوں گا (مگر آدمی سے نہیں)۔

③ کہیں منہ کو موج ہی نہ آجائے

انسانی ذہنیت یا اُس کی نفسیاتی کیفیت کے مظاہر اُس کی محسوس حرکات و سکنات ہوتی ہیں۔ جب بھی کسی دوست سے آپ ملتے ہیں تو آپ ذرا بے رنجی برت کر دیکھیے تو آپ کے چہرے سے نظر آ جاتا ہے کہ کس طرح سے ہورہا ہے۔ یہ جو نفسیاتی کیفیات کے مظاہر ہیں جس طرح محسوس علامتوں سے جو چیزیں ظاہر ہوتی ہیں قرآن ان تک بھی پہنچتا ہے۔ اصل میں وہ تو تمہاری ذہنیت اور نفسیاتی کیفیت کی اصلاح کرتا ہے جو اس سے پیدا ہوتی ہے۔ بات کرتا ہے تو ان مظاہر کو سامنے رکھ کر جن کے ذریعے وہ کیفیت آپ کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس لیے کہا کہ **وَلَا تَنْفِسْ فِي الْأَرْضِ مَرَّةً (31:18)** خوشگوار سے پیش آؤ۔

تنگ نظری یا کم ظرفی کی خطرناک بیماری

یہاں (31:18) میں مرحاً آیا ہے۔ اصل میں مرحاً اوجھے پن کو کہتے ہیں اس کو کم ظرفی بھی کہتے ہیں تنگ نگہی بھی کہتے ہیں۔ ایک چیز ہے کہ کسی بات پہ اترا نا، ایک چیز ہے کہ کسی بات پہ خوش ہو جانا۔ انسان اگر کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس سے انسان کے اندر خوشی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور یہ ایک فطری چیز ہے انبساط کا عالم اُس کے اندر پیدا ہوتا ہے اُس کی حرکات و سکنات سے اُس کی نمود بھی ہوتی ہے۔ یہ جو فرحت ہے اس سے قرآن منع نہیں کرتا۔ جہنم میں جانے والوں کے متعلق ہے کہ یہ جو اس طرح سے جن کی کیفیت ہوتی ہے کہ ہر وقت لوگوں سے جلتے بھنے ہوئے ہیں، منہ موڑے ہوئے ہیں اس طرح سے گردن موڑے ہوئے ہیں تو وہاں جانا تو پتہ نہیں کب ہوگا لیکن یہ تو ہر وقت جہنم میں ہوتا ہے ”ہر ویلھے سڑا بلدا رہندا اے“ قرآن نے کہا ہے کہ یہ اہل جہنم کی جو کیفیت ہے اُس کی یہ صورت ہے کہ **ثَلَاثَكُمْ بَعَا كُنْتُمْ تَفَرِّحُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفَرِّحُونَ (40:75)**۔

کسی کے لیے کچھ نہ کرنے کے باوجود تعریف کروانے کی انتہائی خواہش

عزیزانِ من! ایک وہ کام ہیں جو حق کے لیے ہوتے ہیں۔ یاد رکھیے! حق صرف Abstract (غیر محسوس) صداقت کا نام نہیں ہوتا، Abstract Truths (غیر محسوس صداقتیں) جب محسوس شکل میں سامنے آئیں تو انہیں الحق کہا جاتا ہے۔ (40:75) میں کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے کوئی محسوس تعمیری کام تو نہیں کرتے مگر ویسے ہی پھولے نہیں سماتے، اکڑے پھرتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ **يُحِبُّونَ أَنْ يَتَحَفَّظُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا (3:187)** یہ وہ لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ جو کام یہ کرتے نہیں ہیں ان کا

① ہر وقت جلتا بھناتا رہتا ہے۔

② (ان سے کہا جائے گا کہ) تمہارا یہ حشر اس لیے ہورہا ہے کہ تم بغیر کوئی تعمیری کام کیے یونہی اتراتے ہو اور اپنی قوت کے نشہ میں اکڑتے پھرتے تھے (اور) یوں بڑھائی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ (40:56) (پرویز: مفہوم القرآن، ص۔ 1105)۔

ذکر کر کے لوگ ان کی خدمت میں سپاس نامے پیش کرتے رہا کریں۔ گویا کوئی اگر اچھے کام کرتا ہے تو اُس کی تعریف کوئی معیوب چیز نہیں ہے۔ کچھ کیا نہ جائے اور اُس نہ کیے جانے کے اوپر دل کی انتہائی خواہش یہ ہو کہ اُس کی تعریف کی جائے تو یہ تَفَرِّخُونَ فِی الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (40:75) ہوتا ہے۔ یہ جو قرآن نے یہاں کہا ہے کہ وَلَا تَعْمَشْ فِی الْأَرْضِ مَرَحًا (31:18) بغیر تعمیری کام کیے ہوئے یونہی پھولے ہوئے اکڑے ہوئے پھرنا اور اُس کے بعد یہ چاہنا کہ لوگ ان کی تعریف کرتے چلے جائیں تو کہا کہ اپنے اندر یہ کیفیت بالکل نہ پیدا کرنا۔ عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیا نصیحتیں ہو رہی ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ بالتصریح ابھی معلوم نہیں ہے کہ لقمان نبی ہے جو یہ کہہ رہا ہے لیکن بہر حال یہ سارا کچھ خدا کی ہدایت کے مطابق ہے جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اور بڑی گہری تمدنی چیزیں ہیں۔ یاد رکھو کہ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (31:18) خدا مختال اور فخور کو پسند نہیں کرتا۔

خیالی بدگمانی کی کیفیت

مختال یعنی خیال کا لفظ تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ یہ وہی ہے جس کا مادہ (Root) ”خ ی ل“ ہے اس کے معنی ہیں ”وہ شخص جو اپنے خیال ہی خیال میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتا چلا جائے اور فی الحقیقت ویسا نہ ہو لیکن لوگ بھی خیالی طور پر اُس کو ایسا سمجھ لیں“۔ یہ اس مادے کے معنی ہیں۔ اب دیکھیں کہ عرب کیسے سمجھاتا ہے کہ وہ شخص ایسا نہ ہو اور لوگ خیال ہی خیال میں یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بہت شے ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ کھیتوں میں چڑیاں اور طوطے کی ہوئی فصل کو کھانے کے لیے آجاتے ہیں تو کھیتوں میں ایک لکڑی یا بانس کھڑا کر کے اُس کے اوپر کالا کپڑا ڈال دیتے ہیں اس کو انگریزی میں Scare Crow (پتلا) کہتے ہیں۔ وہ ان پرندوں کو صرف ڈرانا ہوتا ہے لیکن اُس کے اندر ڈرانے والی بات کچھ بھی نہیں ہوتی، اُس کی شکل ڈراوے والی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ عرب اس چیز کو الخیال کہتے تھے۔ یہاں کہا ہے کہ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (31:18) یہ پسندیدہ نہیں ہے کہ ایسا تو نہ ہو لیکن لوگوں کو ڈرانے کے لیے شکلیں ایسی بنائی ہوئی ہوں۔ ذرا سی کوئی ہمت کر کے وہ اُس کپڑے کو یوں اتار دے تو نیچے سے نظر آجائے کہ صاحب ہیں کیا۔

تاسجدہ اش کردی خدا است

ان کی خدائی کی حقیقت اتنی ہے کہ تم جب تک انہیں سجدہ کرتے چلے جاؤ گے ان کی خدائی قائم ہے۔

چوں یکہ اندر قیام آئی فنا است

تم کھڑے ہو جاؤ تو اس کی خدائی ختم ہو جاتی ہے۔ ان کی خدائی تمہارے سجدوں سے قائم ہوئی ہے یہ Scare Crow (پتلا) ہے یہ ڈراوے ہیں۔ اپنے خیال میں تم ان کو ان پرندوں کی طرح جن بھوت اور پتہ نہیں کیا کچھ سمجھ لو تو اور بات ہے درحقیقت یہ اس کے سوا کچھ

نہیں ہے کہ ایک لکڑی ہے اور اُس پہ کپڑا پڑا ہوا ہے لیکن اُس نے اپنی شکل ایسی بنا رکھی ہے کہ اس سے ڈر پیدا ہو۔

خیالی طور پر اپنی اما جگہ میں خوش فہمی کے اندر گرفتار شخص کی کیفیت

کہا ہے کہ یہ **فَخْتَالِ فَخُورًا** (31:18) ہیں۔ اردو زبان میں ہمارے ہاں فخر کا لفظ تو اچھے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ یہ چیز قابلِ فخر ہے۔ عربوں کے ہاں بھی بعد میں اچھے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن بنیادی معنی یہ ہیں کہ ایسے گائے بھینس جن کا ”ہوانہ“ تو بڑا سا ہو لیکن وہ پھولا ہوا ہو اور اُس کے اندر دودھ نہ ہو اگر ہو بھی تو یونہی ذرا سا نکلے۔ اسے وہ فخر کہتے تھے۔ ایسا مٹکا جو کچی مٹی سے بنا ہوا ہو لیکن اندر سے خالی ہو بجائیے تو اندر سے بہت زور سے ٹن ٹن کرے لیکن اس کے اندر کچھ نہ ہو۔ جب تک وہ مٹکا خالی ہوتا تھا اُس وقت تک اُس کو عرب فخور کہتے تھے۔

قدم قدم پر اُن گنت بکھرے ہوئے کائناتی حقائق کو سمجھنے کے لیے غور و تدبر ایک گوہر تابدار ہے قرآن نے کہا ہے کہ اگر کسی شخص کو اتفاق سے تمہارے ساتھ کام پڑ گیا ہے تو اُس سے گردن نہ موڑیے، منہ نیڑا نہ کیجیے، کل کو تمہارا بھی کسی سے کام پڑے گا۔ اسی لیے وہ تو الناس کو یہ سب کچھ کہتا ہے۔ یہاں تک تو وہ لقمان کی نصیحتوں کی باتیں ہیں۔ وہاں کہا تھا کہ **وَاتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ** (31:12)۔ حکمت اور غور و تدبر کی چیزیں ہیں، فکر و نظر کی چیزیں ہیں۔ اس حکمت کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ اشیائے کائنات اور نظامِ فطرت پر غور و خوض سے، گہرے تدبر سے، یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے۔ وحی کی رو سے بھی جو کچھ دیا جاتا ہے، میں آگے چل کر ابھی بیان کروں گا کہ اُس میں بھی حکمت ہوتی ہے۔ خارجی کائنات پہ غور و فکر سے ایک چیز پیدا ہوتی ہے۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ کے قصے میں نبوت سے پہلے کے دور میں ان سے یہ کہا گیا تھا کہ **نَرَى اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (6:75) جو انہوں نے کائناتی نظام کے مشاہدات دیکھے تو اُس سے وہ صحیح نتائج کے اوپر پہنچ گئے۔ قرآن نظامِ کائنات پر غور و فکر کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ یہ سارا کچھ لقمان کو اس حکمت کے بعد قرآن نے خود کہا کہ **الْعَمَلُ تَرَوْا** (31:20) کیا تم بھی نظامِ کائنات پہ اس طرح غور نہیں کرو گے دیکھو گے نہیں کہ **اِنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ** (31:20) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، وہ سب تمہارے لیے تابعِ تسخیر کر دیا ہے۔

① وحی کی روشنی میں نظامِ کائنات پر غور و فکر سے صحیح نتائج تک پہنچنے کی یہی دانش نوری تھی جو ہم نے خصوصیت سے لقمان کو عطا کی تھی (پرویز: مفہوم القرآن ص 947)۔

② ہم نے ابراہیمؑ کو کائناتی نظام کا مشاہدہ کرایا تھا (پرویز: مفہوم القرآن ص 304)۔

عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے اتنا عظیم اعلان ہو رہا ہے کہ جس دور میں انسان بڑے بڑے درختوں کے سامنے سجدہ کرتا آیا تھا، بڑے بڑے دریا کے سامنے سجدہ کرتا تھا، پہاڑوں کے سامنے سجدہ کرتا تھا، شیر کے سامنے سجدہ کرتا تھا، اڑدھا کے سامنے سجدہ کرتا تھا، یہ ٹھس و قمر تو پوچھو ہی نہیں کہ اس کے لیے کیا تھے، یہ ان کو معبود سمجھے ہوئے تھا۔ اُس دور میں وہ کہہ رہا ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ ہم نے تمہارے تابع تسخیر کر دیا ہے۔ **وَاسْبِغْ عَلَیْکُمْ نَعْمًا** (31:20) کتنی با فراغت اپنی نعمتوں کی بارش ہم نے تم پہ کر رکھی ہے۔ ارض و سموات کی تسخیر سے خدا کی نعمتیں حاصل ہوگی۔ **وَظَاهِرًا وَبَاطِنًا** (31:20) اگر صرف عرب کے لوگوں کو لیا جائے تو پوچھیے کہ یہ کیسی عجیب چیز آتی ہے کہ جو کچھ اس وقت تمہارے سامنے یہ نعمتیں وغیرہ آگئی ہیں یہ بھی اور جو ابھی زمین کے نیچے چھپی ہوئی ہیں، تیل وغیرہ کی صورت میں وہ بھی۔ یہ تو میں نے ایک عرب قوم کی بات کہی ہے کہ تمہیں کیا پتہ کہ تمہارے پاؤں کے نیچے کس قدر سونے کے سمندر ہیں۔ اسبغ کا لفظ بتا رہا ہے کہ اس فراوانی سے ہم نے اپنی نعمتوں کے دریا بہا دیئے ہیں جو ظاہر بھی ہیں اور باطن بھی ہیں۔ اگر پوری انسانیت کو لیا جائے تو ظاہر کی اُس کی نعمتیں تو اُس کے مقابلے میں شے ہی کچھ نہیں ہیں جو ابھی باطن میں تھیں، غیر مرئی تھیں، Visible (مرئی) نہیں تھیں، دیکھی نہیں جاتی تھیں۔ ایٹم (Atom) کی تو توں کو آپ دیکھیے کہ چاند تک تو پہنچ گئے ہیں اور مریخ تک پہنچنے کے ارادے ہیں اور ابھی تو اُس کا ایک ذرا سا جو ذرہ ہے اُس کی قوت ہی ان کے سامنے آئی ہے۔

تسخیر کائنات کے سلسلہ میں دوسروں کے بالمقابل قرآن کریم کی حامل یہ قوم آخر کیوں دسترس حاصل نہ کر سکی؟

عزیزانِ من! نعمتوں کے بعد ظاہر و باطن کا کہنا بہت بڑی بات ہے۔ یہ خدا ہی کہہ سکتا تھا۔ اور یہ ہیں وہ نعمتیں جن کے متعلق آپ سے کہا ہے اور آپ ہر نماز کی ہر رکعت کے اندر دعا مانگتے ہیں کہ **إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ - صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ** (1:5.6)۔ اور قرآن کہتا ہے کہ یہ نعمتیں تسخیر ارض و سموات سے ہوگی۔ آپ دعا مانگ کر چلے آتے ہیں اور نعمتیں وہ جھین کر لے جاتے ہیں۔ خدا کہتا ہے کہ ہماری کیفیت تو یہ ہے، مگر دوسرے لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ **وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ** (31:20) خدا ہی کے متعلق جھگڑے نکالنے چلے جاتے ہیں۔ نہ علم ہوتا ہے، نہ صحیح راستے پہ چل رہے ہوتے ہیں نہ ان کے پاس کوئی روشن راستہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود مجادلہ کرتے ہیں، جھگڑتے ہیں۔

تحریک طلوع اسلام 50 سال سے مذہب اور دین کے فرق کو واضح کرتی چلی آرہی ہے: پرویز
یہ خدا کے ساتھ جھگڑنا کیا ہے؟ یہ بڑی غور طلب چیز ہے۔ انہیں علم بھی نہیں ہے، کتابِ منیر کی سند بھی نہیں ہے اور ایک ایک چیز کے

اور خدا کو چیلنج دیئے جارہے ہیں۔ **وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْنَا آثًا** (31:21)۔ قرآن میں بیسیوں مقامات پہ یہ چیز آئی ہے۔ یہ اتنی عظیم چیز ہے جو قرآن کہہ گیا ہے۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ جب ان لوگوں سے جو خدا کو قدم قدم پہ چیلنج دیتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ خدا کی نازل کردہ کتاب کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس مسلک پر چلیں گے جو اسلاف سے ہمارے ہاں مسلسل متواتر چلا آ رہا ہے۔ عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ میں قریباً ہر درس میں اور قریباً پچاس سال سے ہر تحریر میں مذہب اور دین میں فرق کرتا چلا آ رہا ہوں اور بتاتا چلا آ رہا ہوں کہ اسلام دین ہے، مذہب نہیں ہے۔ دو لفظوں میں آج سن لیجئے کہ ان میں کیا فرق ہے۔ جب **اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ** دعوت دی جائے کہ خدا کی کتاب کا اتباع کرو تو یہ دین ہے اور اُس کے مقابل میں جو ان کا جواب ہے کہ **بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْنَا آثًا** (31:21) ہم تو اُسی مسلک پہ چلیں گے جو ہمارے اسلاف سے ہمارے ہاں چلا آ رہا ہے تو یہ مذہب ہے۔ ساری دنیا میں مذہب ہے۔ جتنی مذہب پرست قومیں دنیا میں موجود ہیں ان میں سے کوئی قوم بھی ایسی نہیں ہے جو ما انزل اللہ کا اتباع کر رہی ہو ان کے پاس تو ما انزل اللہ ہے ہی نہیں۔ ان کے ہاں اتباع ہی اسلاف کا ہے جس راستے کے اوپر پہلی نسلیں چلی آرہی ہیں اُسی کے اوپر چلے جارہے ہیں۔ نہ علم ہے نہ ہدایت ہے نہ کتاب منیر ہے اور اُس راستے پہ چلے جا رہے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ بڑی اہم چیز ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک تقلید پرست قوموں کی حالتِ زار پر مقلد کی تعریف

قرآن کہتا ہے کہ اس طرح اسلاف کے اتباع کا نام تقلید ہے اور یہ بڑے فخر سے اپنے آپ کو مقلد کہتے ہیں۔ گائے بھینس کے گلے میں ایک بٹا ہوا رسہ ڈال دیتے ہیں۔ اُس سے پکڑ کر پھر اُس کو لیے لیے چلتے ہیں۔ اس کو قلابہ کہتے ہیں اور اس عمل (Process) کو تقلید کہتے ہیں۔ اُس گلے میں ڈلی ہوئی رسی کے زور سے جدھر کوئی کھینچ کر لے جائے اُدھر کی طرف چلے جانا تقلید ہے۔ میں یہاں یہ عرض کر دوں کہ ہمارے ہاں یہ جو لفظ ہے کہ یہ مقلد ہیں اور یہ غیر مقلد ہیں تو غیر مقلد کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ کوئی عقل و فکر سے (Rationally) کسی سند کے اعتبار سے وہ کوئی مسلک اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ دو اصطلاحی الفاظ ہیں۔ مقلد ان کو کہتے ہیں جو آئمہ فقہ میں سے کسی ایک امام کی فقہ کا اتباع کرتے ہیں۔ جو کسی آئمہ فقہ کی تقلید نہیں کرتے بلکہ امام ❶ بخاریؒ کی تقلید کرتے ہیں یعنی انہوں نے

❶ چنانچہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس ضابطہ ہدایت کا اتباع کرو جسے خدا نے نازل کیا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہم تو اسی ڈگر پر چلتے چلے جائیں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن، ص-950)۔

❷ امام محمد اسماعیل بخاریؒ (194-256/60ھ)

اپنی حدیث کی کتاب صحیح بخاری میں جو لکھا ہوا ہے وہ ان کا اتباع کرتے ہیں وہ غیر مقلد کہلاتے ہیں۔ قرآن کریم نے فرق ہی یہ کیا ہے کہ جو ما نزل اللہ کے اوپر چلنے والا ہے وہ ہے جو دین پہ چلنے والا ہے اور جو اتباع مَا وَجَّعْنَا عَلَيْهِ آيَاتٍ ہے جسے وہ مذہب کہہ کر پکارتا ہے۔

تقلید کے مفہوم کو سمجھانے کی ایک دو محسوس اور عملی مثالیں

تقلید کے متعلق ایک محسوس مثال دے کر قرآن نے بات کو واضح کیا ہے۔ کہا ہے کہ وَإِذَا بَيْنَلَهُمُ آيَاتُ اللَّهِ قَالُوا بَلْ نَحْنُ عَلَى الْغَيَاةِ عَلَيْهِ آيَاتٌ (2:217) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی کتاب کا اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہمارے پاس اسلاف کا جو مسلک چلا آرہا ہے ہم اُسی کا اتباع کریں گے۔ یہ کھڑے ہو کر یہ نہیں پرکھیں گے کہ اُولُو كَانَ آيَاتٌ وَهُمْ لَا يَصْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَسْتَتُونَ (2:170) ہمارے پاس یہ راستہ جو مسلسل چلا آرہا کیا وہ عقل و فکر پہنی ہے خدا کی کتاب پہنی ہے صحیح راستہ بھی ہے یا نہیں؟ یہ کھڑے ہو کر اس کو نہیں سوچیں گے بلکہ جس راستے کے اوپر پہلے سے مسلسل چلے آرہے ہیں اُس راستے پہ چلتے جائیں گے۔ کہا کہ وَمَنْ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَتَّقُ بَعَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا نَعَاءً وَبِذَآئِهِ (2:17) تم نے کبھی کسی گڈ ریئے کو یا چرواہے کو دیکھا ہے؟ چرواہے کو آپ دیکھیں گے کہ وہ کچھ الفاظ بولتا ہے جس کے معنی کچھ نہیں ہوتے یعنی ”متا متانتا“ آہا ہوا ہو، تو اس کے جو مویشی ہوتے ہیں وہ اس آواز پہ لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ دعاء و نداء ہے اس بولنے والے کی آواز بے معنی ہے اور سننے والے محض ان الفاظ پہ لگے ہوئے ہیں۔ کہا کہ یہ ہے جسے تقلید کہتے ہیں۔ نہ بولنے والے کو پتہ ہے کہ میں جو الفاظ بول رہا ہوں ان کے معنی کیا ہیں مگر سننے والے ہیں جو ان الفاظ کے اوپر لگے ہوئے ہیں۔ (معاذ اللہ) میں اذان یا کسی چیز کی تنقیص نہیں کر رہا۔ مؤذن جب اذان دیتا ہے کہ ”اللہ اکبر اللہ اکبر“ تو اُسے پتہ نہیں ہے کہ اللہ کو جو میں اکبر کہہ رہا ہوں تو اس کے معنی کیا ہیں۔ جب مؤذن کہتا ہے کہ ”اشھد الا لا الہ الا اللہ“ میں اس چیز کی شہادت دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار اس کائنات میں نہیں ہے تو اس کو اس کا کچھ پتہ نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف الفاظ بولتا ہے۔ جو سننے والے ہیں وہ جب یہ سنتے ہیں تو وہ کہتے ہیں ”با نگل گئی اے تے میں چلیاں ❶“۔

عزیزانِ من! یہ لمبا چوڑا قصہ تو ایک طرف رہا اگر یہ کہیں اللہ اکبر کا مفہوم ہی قرآن کی رو سے متعین کرتا تو اس اعلان کرنے والے کو پتہ ہوتا کہ میں کتنا بڑا انقلابی اعلان کر رہا ہوں سننے والوں کو پتہ ہوتا کہ ہم کس کام کے لیے جا رہے ہیں۔ خدا کی کبریائی کو اس دنیا میں مستحکم اور ثبت کرنا اللہ اکبر ہے۔ اور وہ جو کہہ رہا ہے کہ ”اشھد الا لا الہ الا اللہ“ میں شہادت دیتا ہوں تو شہادت تو دیکھی ہوئی چیز کی ہوتی ہے تو

❶ اذان ہوگئی ہے تو لو میں چلا اب نماز پڑھنے۔

کیا یہ اُس کی شہادت ہوتی ہے کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے؟ نتیجہ اس روش سے یہ ہوتا ہے کہ **صَمَّ بَصْمًا عَمًّی** **فَصَمَّ لَا یَفْهَمُونَ** (2:17) بلانے والے اور جن کو بلایا جاتا ہے دونوں اندھے بہرے گونگے اور عقل و فکر سے کام ہی نہیں لیتے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کی عقل و فکر کی صلاحیتیں ہی مفلوج ہو جاتی ہیں، ان پر مہر لگ جاتی ہیں۔ یہ دلیل ہی یہ دیتے ہیں کہ صاحب! یہ اسلاف سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ کبھی کھڑے ہو کر ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے کہ جس راستے پہ جارہے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط ہے۔ محض اس لیے اس پہ چلتے چلے جانا کہ اس روش کے اوپر پیچھے سے لوگ چلتے آرہے ہیں اس لیے یہ صحیح ہے درخورِ اعتنا نہیں ہے۔

کسی شخص کا بحیثیت مومن خدا کی آیات پر ایمان لانے کا طریق

عزیزانِ من! قرآن کریم تو مومن کی Definition (تعریف) ہی دوسری دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ **وَالَّذِينَ إِذَا تُكْرِوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ** (25:73) مومن انہیں کہا جاتا ہے یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ اور تو اور جب ان کے سامنے خدا کی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں **تَلْعَمُ یُخْرِوا عَلَیْهَا صَعًا وَغَمًّا** (25:73) وہ ان پر بھی اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گر پڑتے۔ مومن خدا کی آیات کو اس طرح آیات اللہ Accept (قبول) کرتا ہے کہ عقل و فکر کی رو سے، غور و فکر سے (Rationally) اپنے آپ کو Satisfy (مطمئن) کرتا ہے کہ یہ صحیح ہے۔ اس طرح سے جب آیات اللہ کی صداقت کو Accept (قبول) کیا جاتا ہے تو اس صورت میں اسے ایمان کہیں گے۔ جو اس طرح سے کریں گے انہیں قرآن مومن کہتا ہے۔ یہ ہے عمل (Process) جسے قرآن نے ایمان (Conviction) کہا ہے۔ قرآن نے جو کہا ہے وہ محکم اصولی، کلیے ہیں، یقین ہے لیکن اس یقین کو کیسے Accept (قبول) کیا جاتا ہے کہ واقعی یہی یقینی ہے؟ اسے کس طرح تسلیم کیا جاتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ اسے آنکھیں بند کر کے، کان بند کر کے نہیں بلکہ آنکھیں کان کھول کر، غور و فکر کی رو سے Accept (قبول) کیا جاتا ہے۔ مومنین کے متعلق یہ بات ہے۔

ایمان لانے کے سلسلہ میں خود نبی اکرمؐ کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد

مومنین کے متعلق سورۃ البقرہ میں جو کہا ہے وہ غور سے سنئے۔ کہا ہے کہ **إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَیْهِ مِنَ رَبِّهِ وَالْقَوْمُ یُنَازِعُونَ** (2:285) مومن تو ایک طرف، رسول بھی اسی طرح سے اس پر ایمان لایا ہے جو ہم نے اس پر نازل کیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مومن وہ ہیں جو خدا کی آیات پر بھی آنکھیں اور کان بند کر کے، اندھوں کی طرح، نہیں گر پڑتے۔ مومن وہ ہے جو ان کو عقل و فکر، غور و تدبر سے Accept (قبول) کرتا ہے۔ قرآن کی پہلے مخالفین کو دعوت ہے، ساری دنیا کو دعوت ہے۔ کہا ہے کہ یہ زندگی کے کچھ اصول ہیں، کچھ نظریے ہیں، ضابطہ حیات ہے جو میں پیش کر رہا ہوں۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ یہ میرے ذہن کی تخلیق نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے ہے

منزل من اللہ ہے۔ لیکن میں تم سے زبردستی نہیں منوانا چاہتا کہ تم بھی مانو کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ کہا کہ میں جو میں پیش کر رہا ہوں اُس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ **بَرٰہَانٌ مِّنْ رَبِّکُمْ** (4:175) تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے یہ دلائل ہیں۔ **اٰتٰی اللّٰہ عَلٰی بَصِیْرَةٍ** (12:108)۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میرا متبع سنت ہو گا وہ بھی یہی کرے گا کہ تمہیں دعوت علی وجہ البصیرت دے گا کیونکہ قرآن کو خدا نے خود ”برہان“ کہا ہے۔ کہا ہے کہ میں براہین پیش کرتا ہوں دلائل کی رو سے پیش کرتا ہوں۔ تم مخالفت کرتے ہو تو دھاندلی نہ کرو بلکہ **هَاتُوا بُرٰہَانَكُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ** (2:11) اگر تم سچے ہو تو تم بھی دلائل پیش کرو۔

مذہب میں تو صرف اسلاف پرستی ہوتی ہے: نہ دلائل و براہین اور نہ فہم و فراست

عزیزانِ من! یہ دین کی باتیں ہو رہی ہیں جبکہ مذہب میں دلیل آتی ہی نہیں ہے۔ جہاں یہ چیز ہو کہ یہ اس لیے صحیح ہے کہ اسلاف سے ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے تو اس میں عقل و شعور و تدبر و فہم اور دلیل کا واسطہ کیا ہے۔ دلیل صرف یہ ہے کہ پہلے سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ قرآن اپنے دعوے کو یہ کہہ کر پیش کرتا ہے کہ میں ہوں ہی ”برہان“ مخالفین سے کہتا ہے کہ **هَاتُوا بُرٰہَانَكُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ** (2:11) برہان لاؤ اگر سچے ہو۔ انہیں بھی لے لیجیے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق ان براہین کو مان لیا کہ ہاں صاحب! یہ ایک کلیہ ہے ایک یقینی اصول ہے جو دیا جا رہا ہے لیکن وہ تو ان سے بھی کہہ رہا تھا کہ یہ بھی اس کو دیکھ کر پُرکھ کر ایمان لائیں گے۔

ہر صحیح فارمولہ اپنے صحیح ہونے کا ثبوت خود پیش کرتا ہے

اب سوال یہ ہے کہ یہ دیکھا اور پرکھا کیسے جائے گا؟ اس کے لیے کلیہ پیش کیا گیا ہے۔ ریاضی میں یہ جو طاق اعداد (Odd Numbers) ہوتے ہیں یعنی 3, 5, 7..... یہ وہ ہیں جو دو پہ تقسیم نہیں ہو سکتے۔ یہ ایک اصول ہے کہ کوئی دو طاق عدد لیجیے تو ان کا مجموعہ ہمیشہ جفت (Even Number) ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی دلیل کیا ہے؟ قرآن نے کہا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ **قُلْ یٰقَوْمِ اٰتٰیوْا عَلٰی مٰکٰنِیکُمْ اِنِّیْ عٰمِلٌ** (39:39) تم سلیٹ پنسل یا کاپی لے کر ایک طرف بیٹھ جاؤ اور میں اپنی طرف بیٹھ جاتا ہوں اور تم طاق ہندسے (Odd Numbers) لیتے چلے جاؤ اور جمع کرتے جاؤ تم کوئی ایک ہندسہ ایسا نکال کر بتاؤ جو میرے اس دعوے پہ پورا نہ اترے۔ نہ نکال سکو گے تو ماننا ہوگا کہ جو میں نے کہا تھا وہ ٹھیک ہے۔ اور وہ اسی طرح سے اپنوں سے بھی کہتا ہے کہ بابا! میں نے جو تمہیں کہا ہے کہ ایسے ہی نہ مان لینا۔ مومن بھی اس طرح سے اس کو علی وجہ البصیرت Accept (قبول) کرتا ہے۔ یہ کوئی لمبی چوڑی بات نہیں ہے ”تم اپنے ہاں اپنے دعوے کے مطابق کام کرو“ میں اپنے دعوے کے مطابق کام کرتا ہوں۔ نہ میں تمہارے پروگرام میں دخل دیتا ہوں نہ تم میرے پروگرام میں دخل دو“۔ **فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ** (39:39) ابھی معلوم ہو جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ مثلث کے دو ضلعوں کا

مجموعہ تیسرے ضلع سے ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں جھگڑے کی کوئی بات ہے، جھگڑے کی بات کیوں کر رہے ہو؟ تم اپنے ہاں مثلث بناتے چلے جاؤ، میں اپنے ہاں بناتا چلا جاتا ہوں، قیامت تک بناتے چلے جاؤ تو کہیں اس میں سقم نہیں پاؤ گے۔ اسے یقینی کہتے ہیں۔ اور یہ ہوتا ہے جو برہان کی رو سے ثابت ہوتا ہے۔ اور برہان ہوتا ہے Pragmatic Test (استحاجی امتحان)۔ اس پر عمل کیا جاتا ہے تو پھر پتہ چلتا ہے ورنہ اگر آپ کہتے چلے جائیں کہ مثلث کے جو دو ضلع ہیں وہ تیسرے سے زیادہ ہوتے ہیں تو اس کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے؛ دلیل صرف یہی ہے کہ ماپ کر دیکھ لو۔

مذہب ہمیشہ دلیل کا دشمن ہوتا ہے

عزیزانِ من! قرآن یادین اپنی ہر بات کو دلیل کے زور سے منواتا ہے۔ کہا ہے کہ **هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ** (2:111) وہ دوسرے سے مطالبہ کرتا ہے کہ دلیل لاؤ۔ مذہب وہ ہے جو دلیل کا دشمن ہوتا ہے؛ دلیل مانگنے والے کے مطابق پہلے ہی فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اس کا ایمان ہے ہی نہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک واقعہ آپ کے ہاں فقہ کی کتاب کے اندر موجود ہے۔ امیہ کے دور (661-750 AD) میں دمشق کی جامع مسجد سب سے پہلی بڑی مسجد بنی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد انجینئرز نے اپنے حساب کی رو سے یہ دیکھا کہ اُس کا رخ قبلے کی طرف نہیں ہے بلکہ ذرا ہٹا ہوا ہے۔ یہ Discussion (بحث) شامی میں موجود ہے کہ رخ ہٹا ہوا ہے۔ ان انجینئرز نے یہ کہا کہ اب یہ جو مسجد ہے اس کو تو سیدھا نہیں کیا جاسکتا البتہ اس کے اندر صفوں کی لائنیں ایسی لگا دی جائیں جن کا رخ صحیح ہو۔ اور اس کے بعد یہ کہہ دیا جائے کہ جو اور مسجد بنے وہ اس صحیح رخ پہ بنائی جائے۔ ادھر ہمارے علمائے کرام بیٹھ گئے جنہوں نے کبھی وہ آلہ ہی نہیں دیکھا ہوگا جس کی رو سے انہوں نے ماپ کے بتایا تھا۔ وہاں جو Discussion (بحث و تمحیص) ہوتی ہے اُس کا مدار یہ ہوتا ہی نہیں کہ آلہ کیا کہتا ہے اور عقل کیا کہتی ہے۔ اُس Discussion (بحث و تمحیص) کے بعد وہ ”علمائے کرام“ اس فیصلے پہ پہنچے کہ اگر ہم نے ان انجینئروں کی یہ بات مان لی تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ اس سے پہلے آج تک اس مسجد میں ہمارے اسلاف جو نماز پڑھتے رہے، ”تے او ساری نمازاں اوت ای سکیاں“^① وہ باطل ہی ہو گئیں کیونکہ وہ غلط رخ پہ پڑھتے رہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اس چیز کو مانیں، انہوں نے ان انجینئروں کے متعلق ہی کہہ دیا کہ یہ غلط ہیں۔ یہ انہیں غلط کہنا زیادہ خیر کی بات ہے۔ اس لیے کہ جسے خیر کہا جاتا ہے وہ اتباعِ سلف کے اندر ہے۔ سواب جس رخ پہ وہ نمازیں پڑھتے چلے جا رہے تھے اُسی رخ کے اوپر نمازیں پڑھی جائیں گی۔ عزیزانِ من! یہ ہے مذہب۔ دین تو قدم قدم کے اوپر کھڑے ہو کر سوچنے کو کہتا ہے کہ دیکھو! رخ صحیح ہے یا نہیں؟

① تو ان کی یہ ساری نمازیں بیوقوفانہ انداز میں باطل ہی ہو گئیں۔

آج ہمارے ہاں ان فتوؤں کو قانونی حیثیت سے تسلیم کیا جا رہا ہے

اس سے پہلے تو یہ بحثیں ہمارے ہاں محض نظری ہوا کرتی تھیں یا فتوؤں تک ہوتی تھیں لیکن اب اس نے ایک عملی اور قانونی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب ہمارے ہاں یہ ایک (Movement) (تحریک) چلی ہے کہ جتنے غیر اسلامی، غیر شرعی قوانین ہیں انہیں اسلام کے مطابق بنایا جائے۔ یہ بڑی مبارک بات ہے، بڑا اچھا اقدام ہے کہ غیر اسلامی قوانین اسلامی بن جائیں لیکن اسلامی بنانے کے لیے جو Discussions (بحثیں) ہو رہی ہیں اُس کے لیے ہر قانون کے متعلق پوچھا جا رہا ہے یعنی دیکھا یہ جا رہا ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے آیا یہ اُس کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں۔ ابھی ہم نے دیکھ لیا ہے کہ جب یہ چیز ہو کہ جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آ رہا ہے اُس کے مطابق جو قانون بنے گا وہ صحیح قانون ہوگا تو اسلاف کے مطابق تو ہمارے ہر فرقے والا اپنے ہاں یہی سند اور دلیل دیتا ہے۔ ہمارے ہاں ابھی دو ہی قوانین بنے ہیں، آپ دیکھیے کہ ان میں کتنا اختلاف ہو رہا ہے۔ اختلاف کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ یہ قرآن کے خلاف ہے بلکہ یہ ہے کہ یہ فلاں کی فقہ کے خلاف ہے۔ اور فقہ تو اسلاف کا مسلک ہے کہ حنفی اس طرح سے مانتے چلے آ رہے ہیں، شافعی اس طرح سے مانتے چلے آ رہے ہیں، شیعہ حضرات اس طرح سے مانتے چلے آ رہے ہیں، اُن کے اسلاف کا یہ مسلک ہے اور ان کے اسلاف کا یہ مسلک ہے۔ کوئی بھی اپنے اسلاف کے مسلک کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس لیے ایک متفقہ علیہ قانون بنانا ہی ناممکن ہو رہا ہے کیونکہ بنیاد اس پر ہے کہ ”جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے اُس میں تبدیلی کرنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہے“۔ تقلید کا سب سے بڑا نقص یہ ہوتا ہے کیونکہ بنیاد اس پر ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے اُس میں تبدیلی کرنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہے۔ تقلید کا سب سے بڑا نقص یہ ہوتا ہے اور میں نے عرض کیا ہے کہ اس دور میں اس نے ہمارے ہاں ایک عملی شکل اختیار کر لی ہے۔

نبی اکرمؐ کی زندگی کے دو سو سال بعد بنائی ہوئی تاریخ کی حیثیت

آج حکومت یا سیاست کے اسلامی نظام کے متعلق یہی دلیلیں ہیں کہ یہ دیکھیے کہ فلاں دور میں قانون کس قسم کا تھا یا فلاں دور میں کس قسم کا تھا۔ یعنی یہ چیز نہیں ہے کہ جو قرآن کریم ہے وہ کیا متعین کرتا ہے یا وہ کیا بتاتا ہے۔ اول تو ہماری تاریخ کی جو کیفیت ہے وہی ظاہر ہے، وہ خود تاریخ کے معیار پر بھی پوری نہیں اترتی۔ نبی اکرمؐ کی زندگی کے دو سو سال بعد بنائی ہوئی ہماری یہ تاریخ، بغیر کسی Previous Written Record (سابقہ تحریری رکارڈ) کے ہے۔ اسی لیے یہ جو چیز آتی ہے کہ صاحب! فلاں دور میں کیا نظام تھا تو وہ ہر دور کا الگ الگ نظام تاریخ میں ملتا ہے۔ اور اگر ملے بھی تو وہ تو اُس دور کے تقاضوں کے مطابق وہ نظام تھا جو کسی نے بنایا ہوگا لیکن اس سارے

کی بنیاد اس پر ہے کہ تَتَّبِعْ مَا وَجَّعْنَا عَلَيْهِ آيَاتٌ (31:21)۔ اب یہاں سے یہ نظر آتا ہے کہ قرآن کریم نے جو یہ بات اُس وقت زمانہ نزول قرآن میں جو اہل کتاب تھے محض ان کے متعلق ہی نہیں کہی تھی بلکہ خود ہمارے متعلق بھی یہ بات کہی ہے کہ یہ امت بھی وہیں چلی جائے گی جہاں اہل کتاب پہلے سے گئے ہوئے ہیں۔ ان سے بھی جب کہا جائے گا کہ بابا! قرآن موجود ہے اُس کے مطابق اُس کا اتباع کرو تو یہ بھی جواب میں یہ کہیں گے کہ بَلْ تَتَّبِعْ مَا وَجَّعْنَا عَلَيْهِ آيَاتٌ (31:21)۔ ہم اُسی مقام پہ آچکے ہوئے ہیں۔

تاریخ کی کسی صحیح بات کی سند کو بھی کتاب اللہ کے ترازو میں تولنا ہوگا

سارے قرآن میں جہاں جہاں آپ دیکھیں تو قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ ان سے کہو کہ اللہ تعالیٰ نے جو نازل کیا ہے اُس کا اتباع کریں۔ ان کا جواب یہ ہے کہ نہیں! جو کچھ ہمارے ہاں اسلاف سے ہوتا چلا آ رہا ہے ہم اُسی کا اتباع کیے چلے جائیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ **أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ** (31:21) خواہ شیطان انہیں اُس راستے پہ ڈال رہا ہو جو جہنم کی طرف لے جائے، یہ آنکھیں کھول کر راستہ نہیں دیکھیں گے بلکہ یہی کہیں گے کہ صاحب! اسلاف کا یہ راستہ ہے، ہم اُسی کے اوپر چلتے چلے جائیں گے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ جب اس کے متعلق کچھ غور و فکر سے کام لیں تو ہر راستہ غلط ہی نکلے، ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ صحیح باتیں بھی ہوں لیکن اُس کی سند یہ نہیں ہے کہ یہ ہوتا چلا آ رہا ہے اس لیے ہم اس کو ایسے ہی مان رہے ہیں۔ اُس وقت بھی سند یہ ہوگی کہ خدا کی کتاب نے ایسا کہا ہے۔ دلیل اُس کی یہ ہوگی کہ ہم نے پرکھ کر دیکھ لیا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ خدا کے نظام کے صحیح ہونے کی دلیل تمہارے پاس عملی ٹیسٹ ہے۔ اس لیے کہا کہ **اصْلَحُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ** (39:39)۔ نظام قائم کر کے اُس کے نتائج بتا دیں گے کہ جو ماننے والے ہیں، انہوں نے صرف اتنا کیا کہ اُس کو مان کر اُس بنیاد کے اوپر ایک عمارت بنانی شروع کر دی، وہ عمارت خود ہٹا دے گی کہ دعویٰ صحیح ہے لیکن وہ بنیاد تو **اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ** (7:7) ہے۔ اور اسی لیے اُس نے کفر اور ایمان کے درمیان مابہ الامتیاز بات ہی یہ کہی ہے کہ **مَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ** (5:44) جو مانا نزل اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے ہیں انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔ اسی سورۃ کی دو آیتیں (45 اور 47) ہیں جن میں ان کو ظالم اور فاسق کہا گیا ہے۔

عقل و شعور سے محروم ہو جانے کی وجہ جواز

قرآن نے جو بڑی بات کہی تھی وہ یہ ہے کہ اگر انسان عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ دے تو اس سے عقل و فکر کی صلاحیتیں ہی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہی تو اس حیوان اور انسان میں فرق تھا۔ انسان کو عقل و فکر و تدبر کی صلاحیتوں سے نوازا گیا تھا۔ اگر انسان اس صلاحیت

● ہم تو اسی ڈگر پر چلتے جائیں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے (پرویز: مفہوم القرآن ص 950)

کے ہوتے ہوئے اس سے کام لینا چھوڑ دے یا آہستہ آہستہ کام لینا چھوڑ دے تو یہ مفلوج ہی ہو جائیں گی۔ اسی لیے تو قرآن کہتا ہے کہ یہ حیوان ہی نہیں **بَلْ هُمْ آفِلٌ** (7:179) بلکہ حیوان سے بھی پست درجے پر آ جاتا ہے کیونکہ حیوان کو تو یہ صلاحیتیں دی ہی نہیں گئی تھیں اس لیے وہ اگر ان سے کام نہیں لیتے ہیں تو وہ تو قابلِ مواخذہ نہیں ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ **لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا** (7:179) ان کو تو سمجھنے، سوچنے، دیکھنے بھالنے کی صلاحیتیں دی گئی تھیں اور یہ ان سے کام نہیں لیتے، اس لیے یہ **كَالْأَنْعَامِ** (7:179) ہی نہیں ہیں **بَلْ هُمْ آفِلٌ** (7:179) بلکہ ان سے بھی گزرے ہیں۔

اگر قدرت انسان کو ارتقائی صلاحیتوں سے نہ نوازتی تو آج اس کا حشر بھی حشرات الارض یا جنگلی

جانوروں جیسا ہی ہوتا

یہ تو اللہ کا احسان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کیا اس نے انہیں تقلید پر نہیں رہنے دیا ورنہ سائنس بتا رہی ہے کہ سب سے پہلے جو تخلیق ہوئی تھی وہ ایک جرثومہ حیات سے آگے بڑھی تھی پھر وہ جو مگر مچھ اور چھپکلیاں تھے اگر اُس اسٹیج کے اوپر آ کر آگے سلسلہ تقلید کا چلتا ”تے اسی تسی کوڑ کڑ لیاں ہوندے“ ① ہیگے، یعنی اگر اسلاف کے راستے پہ چلتے جاتے تو کوڑ کڑلی ② کے آگے کوڑ کڑلی ہی پیدا ہونی تھی۔ وہ تو میں نے کہا ہے کہ اللہ کا احسان ہے کہ اُس نے تقلید کے بجائے ارتقا کا راستہ رکھا کہ اُس نے اُس چھپکلی کو آگے انسان بنا دیا۔ اگر انسان تقلید کے اوپر چلتے تو آپ کے پہلے انسان تو غاروں میں رہا کرتے تھے درختوں کے اوپر رہا کرتے تھے درختوں کے پتوں سے ستر ڈھانپا کرتے تھے اگر وہاں سے تقلید کا راستہ آگے اختیار کیا جاتا تو آپ سوچ لیں کہ میں اور آپ آج کیسے ہوتے۔

عزیزانِ من! زمانے کے تقاضے قدم قدم پر بدلتے چلے جاتے ہیں۔ قرآن تو بتاتا ہے کہ **لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ**

(10:64) یہ صرف اللہ کے کلمات ہیں جن میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ باقی جو ہر شے ہے اُس میں ہر زمانے کے تقاضے کے مطابق تبدیلی ہوتی چلی جائے گی۔ قرآن نے واضح الفاظ میں یہ کہا ہے کہ اسلاف نے جو کچھ کیا ہے **لَهُمَا مَا كَسَبَتْ وَلكُمْ مَا كَسَبْتُمْ** (2:134) جو انہوں نے اچھے کام کیے ان کا کریڈٹ ان کو جاتا ہے۔ ٹھیک ہے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق غور و فکر کیا ہوگا انہوں نے کچھ قوانین بھی بنائے انہوں نے نہیں بھی بنائیں تو ان کا کریڈٹ ان کو جاتا ہے اس کا احترام ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ وہ ان کے لیے ہے

① تو ہم پھر چھپکلیاں ہی چھپکلیاں ہوتے۔

② چھپکلی

لیکن جو کچھ تم کرو گے وہ ہے جو تمہارے لیے ہے۔ **وَلَا تَسْتَلُوا عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ** (2:134) ہم تم سے پوچھیں گے ہی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ ہم سے تو پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا تھا۔ اتباع ما انزل اللہ کا جو ہم بار بار حکم دیتے تھے، ہم تم سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے یہ کیا تھا یا نہیں کیا تھا بلکہ ہم تم سے پوچھیں گے کہ تم نے کیا تھا یا نہیں کیا تھا۔ اس ”پوچھیں گے“ کو ہم نے مرنے کے بعد کی زندگی پر ڈال دیا ہے جب کہ آج ہم سے پوچھا جا رہا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو۔ عزیزانِ من! یہ Negative (منفی) چیز تھی۔ اسے قرآن کریم نے یہاں ختم کر کے آگے Positive (مثبت) دیا ہے۔ کہا ہے کہ **وَمَنْ يُسْلِمْ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ وَإِلَى اللَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ** (31:22)۔

وقت ہو گیا ہے اس کو ہم آئندہ درس پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ سورۃ لقمان کی آیت 21 تک ہم آگے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط

.....

پانچواں باب: سورۃ لقمن (آیات 22 تا 32)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزانِ من! آج نومبر 1979ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ لقمن کی آیت 22 سے ہو رہا ہے: (31:22)

اسلاف پرستی یا اندھی تقلید کے تباہ کن نتائج

اس سے پہلی آیت یعنی پچھلے درس کی آخری آیت جو زیرِ غور آئی، اُس میں دواہم باتیں ہمارے سامنے آئی تھیں۔ اصل میں یہ ایک

ہی بات کے دو گوشے تھے۔ کہا ہے کہ **وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا**

(31:21)۔ ایک ہی مرتبہ یہ آیت نہیں آئی بلکہ بار بار دہرائی گئی ہے۔ اس کا عام ترجمہ تو یہی ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم خدا کی

طرف سے نازل کردہ کتاب کا اتباع کرو اُس کی اطاعت کرو اُس کے قوانین کے مطابق چلو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہمارے اسلاف جس طریقے پہ چلتے آئے ہیں ہم اُسی طریقے پہ چلتے جائیں گے۔ قرآن کریم نے ان کی اس ذہنیت کی اتنی مذمت کی ہے، اسے باعث عذاب بتایا ہے۔ عذاب یہ ہے کہ جہنم کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو سینے میں دل تو رکھتے ہیں لیکن اُس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے، آنکھیں بھی ہوتی ہیں ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، کان بھی ہوتے ہیں ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یعنی بتایا یہ ہے کہ یہ جو مسلک ہے یا یہ جو ذہنیت ہے کہ جس طریق پہ ہمارے اسلاف چلتے آ رہے ہیں، اسلاف سے جو طریقہ ہم نے پایا ہے، کہ ہم اُسی پہ چل کے جائیں گے، یہ کبھی کھڑے ہو کر سوچیں گے نہیں، دیکھیں گے نہیں، پرکھیں گے نہیں کہ کیا یہ صحیح راستہ ہے یا غلط راستہ ہے؟ کہا ہے کہ اس سے ہوتا یہ ہے کہ دو چار نسلوں تک اگر یہ روش متواتر چلی آئے تو اس میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں بالکل مفلوج ہو جاتی ہیں۔ قرآن نے پہلے **كَالْإِنْعَامِ** (7:179) کہا ہے کہ وہ انسانی سطح پہ رہتے ہی نہیں ہیں، حیوان کی سطح پہ رہتے ہیں۔

عزیزانِ من! پہلی چیز تو یہ ہے کہ حیوان کی سطح اسلاف کا راستہ ہے۔ آج بھی بھیڑ اُسی طرح سے وہ کچھ کرتی ہے جس طرح سے دس کروڑ سال پہلے کی بھیڑ کیا کرتی تھی، ہر بھیڑ آگے جانے والی بھیڑ کے راستے پہ چلتی ہے۔ بھیڑ کا میں نے اس لیے کہا ہے کہ ہمارے ہاں ”بھیڑ چال“ محاورہ ہے ورنہ حیوان جتنے بھی ہیں، وہ اپنے اسلاف کے راستے پہ چلتے ہیں لیکن قرآن نے ان انسانوں کے متعلق جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے، دلیل یہ دیتے ہیں کہ ہم تو اسی راستے پہ چلیں گے جس راستے پہ متواتر ہمارے بڑے بوڑھے چلتے آ رہے ہیں، ان کو **كَالْإِنْعَامِ** کہنے کے بعد کہا کہ **بَلْ هُمْ آخِلٌ** (7:179) وہ حیوان سے بھی بدتر ہیں۔ وہ حیوان قابلِ مواخذہ نہیں ہیں کیونکہ انہیں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں دی گئی تھی، ایک متعین راستے پر چلنا ان کی فطرت تھا۔ انسان کی فطرت ہی کوئی نہیں ہے، اسے تو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت دی ہے اور دور راستے دکھائے ہیں۔ کہا ہے کہ **وَبَيَّنَّا الْغَجَّالِينَ** (90:10)۔ حیوانات کو دور راستے نہیں دکھائے گئے۔ اس کے بعد یہ کہ اس کی طرف وحی کے ذریعے سے قوانین خداوندی بھیجے گئے، ہدایت دی گئی اور اس کے باوجود اگر یہ وہ روش اختیار کرنا چاہتے ہیں اور اُسی پہ مصر اور بصر رہتے ہیں جو حیوانات کی روش ہے یعنی جس طریقے پہ پچھلے چلتے آئے ہیں، اسی پہ چلتے جائیں گے تو کہا کہ یہ **كَالْإِنْعَامِ** (7:179) نہیں **بَلْ هُمْ آخِلٌ** (7:179) ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس ذہنیت کی بڑی مذمت کی ہے۔ ما انزل اللہ کے اتباع میں چلنا اُس کی اطاعت کرنا دین ہے۔ یہ ذہنیت کہ جس راستے کے اوپر ہم چلتے آ رہے ہیں اور جو متواتر ہم تک پہنچ رہا ہے ہم اُسی پہ چلتے جائیں گے، مذہب ہے۔ مذہب میں ہوتا ہی یہ ہے کہ سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سلب

① اس کے ساتھ ہی ہم نے اسے وحی کے ذریعے، صحیح اور غلط راستے، ابھار اور نکھار کر بتا دیئے ہیں (انسانی ذرائع علم اور وحی کی روشنی..... دونوں) (پرویز: مفہوم القرآن، ص-1451)۔

ہو جاتی ہے۔ ان کے ہاں توکل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار ہر نئی چیز (یعنی اُس راستے سے ہٹی ہوئی جو چلا آ رہا ہے) گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جاتی ہے۔ قرآن کریم کے اصولوں میں سے یہ ایک بنیادی بات ہے کہ اس نے اس مسلک کی بڑی ہی مذمت کی ہے اور آپ دیکھیں گے کہ اس کا اثر صرف مذہب کے دائرہ تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ جس قوم کی نفسیات یہ ہو جائے اُس کی زندگی کے ہر دائرے میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دائرے کے اندر سفر کرتی ہے۔ کو لھو کا بیل سارا دن چلتا رہتا ہے اور شاید پچاس میل کا سفر طے کر لیتا ہوگا لیکن شام کو وہیں کھڑا ہوتا ہے جہاں سے صبح چلا تھا۔

تقلید پرستی کے باعث قوم صراطِ مستقیم کی منزل سے ہی محروم ہو جاتی ہے

قرآن کریم نے جو صراطِ مستقیم کی ہدایت کی دعا سکھائی، تمنا سکھائی، آرزو سکھائی، مقصد سکھایا تو وہ صراطِ سیدھا راستہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے جو یونانی تصور چلا آ رہا تھا کہ زندگی Cyclic Order (دائری ترتیب) میں چلتی ہے، چکر میں چلتی ہے، آگے نہیں بڑھتی، قرآن نے اس تصور کو کاٹ کر رکھ دیا۔ قرآن تو صراطِ مستقیم، سیدھے راستے پہ چلاتا ہے۔ سیدھے راستے پہ چلنے والے کا جو ہر قدم ہے وہ پچھلے قدم سے آگے بڑھے گا، آگے چلے گا۔ وہ یہ تو نہیں ہوگا کہ وہ سفر کرتا رہے لیکن آگے نہ بڑھے۔ قرآن تو انسانیت کو آگے بڑھانے کے لیے آیا ہے، وہ اس کو ارتقائی منازل طے کرانے کے لیے آیا ہے اور اسی لیے صراطِ مستقیم کے ساتھ اُس نے خدا کو ذی المعارج بھی کہا ہے یعنی سیڑھیوں والا خدا۔ جب اپنے اندر خدائی رنگ رنگنا ہے تو پھر تو سیدھا بھی جانا ہے اور بلند یوں کی طرف بھی جانا ہے اور اگر کیفیت یہ ہے کہ دس ہزار سال پہلے یا ہزار سال پہلے جس مقام کے اوپر ہمارے بڑے بوڑھے کھڑے تھے، اُسی مقام کے اوپر آج ہم کھڑے ہیں تو یہ صراطِ مستقیم نہیں ہے بلکہ یہ Cyclic Order (دائری ترتیب) ہے اور اسی کی مذمت قرآن کرتا ہے۔

ٹیکسلا کے میوزم میں 5 ہزار سال پیشتر رکھی ہوئی اشیاء اور آج وہاں کے گاؤں کی حالت

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ اس کا جو اثر ہے، جو نقصان ہے، وہ مذہب کے دائرے تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ زندگی کے سارے گوشوں کو متاثر کر جاتا ہے۔ کبھی آپ ٹیکسلا گئے ہوں تو وہاں آثارِ قدیمہ کی ایک بستی ہے جو چار پانچ ہزار سال پہلے کی ہے۔ اُس کا ایک میوزیم (عجائب گھر) ہے، میوزیم میں شیلف کے اندر پانچ ہزار سال پہلے جو کچھ اس بستی کے اندر سے روزمرہ کے استعمال کی چھوٹی موٹی چیزیں نکلی تھیں، وہ وہاں انہوں نے لگائی ہوئی ہیں مثلاً عورتوں کے پہننے کے زیورات، ان کے کپڑے، اوزار، ہتھیار، کھانے پینے کی چیزیں، گھر کے اندر کا چولہا، چٹا وغیرہ۔ یہ سارا وہاں انہوں نے رکھا ہے۔ میں نے انہیں دیکھا اور باہر نکلے تو سامنے وہ ٹیکسلا کا گاؤں تھا، اُس بستی میں سے جتنی عورتیں نکل رہی تھیں، انہوں نے وہی کچھ پہن رکھا تھا جو میوزیم کے اندر رکھا ہوا تھا۔ اُس بستی میں لوہار کی دکان پہ گئے

ترکھان کی دکان پہ گئے تو جو اوزار اُس میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں، وہی ان کی دکانوں میں آج بھی ہیں اور چولہا، تو اُچھٹا تو ہمارے گھروں میں بھی وہی تھا جو ٹیکسلا میں رکھا ہے یعنی پانچ ہزار سال پہلے استعمال کی جو چیزیں تھیں وہ آج بھی اسی مقام پہ اسی طرح سے بنتی ہیں۔ دنیا چاند پہ چلی گئی لیکن یہاں ہمارے ہاں توے میں فرق نہیں آیا۔ یہاں ہمارے ہاں وہ جو لکڑی کا گڈا بناتے ہیں وہ بھی وہی ہے جو ٹیکسلا میں رکھا ہوا ہے۔ وہ ترکھان جب گڈا بنا رہا ہوتا ہے تو وہ ساتھ بیٹھا ہوا بوڑھا حقہ پیتے ہوئے کہتا ہے کہ ”اُوئے بے پیرا! تیرے پو نے اتھے مچھل لایا سی یا کیل لائی سی؟“ مچھل لکڑی کی کیل سی ہوتی ہے۔ یعنی مچھل کی جگہ وہاں پہ لوہے کی کیل یا میخ لگاتا ہے تو وہ بوڑھا اُسے بے پیرا اور بے مرشد کہتا ہے۔ پیر و مرشد والے تو وہ ہیں جہاں اُس نے مچھل لگائی تھی یہ بھی مچھل لگائے۔ جب تک یہ اُس کے طریقے پہ چلے گا تو ٹھیک ہے لیکن اگر اُس نے یہاں مچھل کی جگہ میخ لگا دی ہے تو پھر یہ بے پیرا بے مرشد ہو گیا۔ آپ کو معلوم نہیں کہ بے پیرا یا بے مرشد ہونا کتنی بڑی گالی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ

ہوئی لاکھ دنیا ادھر کی ادھر ہے

وہی سنگ در ہے وہی اپنا سر ہے

تقلید پرست قوم کی حالت: گڑ کی ڈلی اور کڑوے تیل کی جستجو شگونوں کے لیے

یہ قوم پتھر کی چٹانوں کی طرح، بتوں کی طرح، مردوں کی طرح اُسی مقام پہ کھڑی ہے۔ ایسی قوم کے افراد می شدہ لاشیں ہوتی ہیں یہ جیتے جاگتے متحرک انسان نہیں ہوتے۔ پھر معاشرت کی زندگی کے اوپر اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ یہ جتنی رسومات ہمارے ہاں ہوتی ہیں وہ وہی چیز ہو رہی ہے جو ہزار سال پہلے ہوتی تھی یا دس ہزار سال پہلے ہوتی تھی۔ کسی شادی بیاہ یا فوتگی کی رسومات آپ دیکھ لیجیے۔ پچھلے دنوں پتہ چلا کہ وہ گڑ کی ڈلی ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ آج کل اول تو گڑ ملتا بھی نہیں ہے ملے بھی تو وہ ویسا نایاب ہو گیا ہے کہ وہ بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ پوچھا کہ کیا وہ گڑ حکیم نے بتایا ہے؟ کہنے لگے کہ نہیں! ”اوشگن اچ دینا ہیگا“۔ تے او تھے گڑ ای دتا جاندا اے۔ او ہدے اچ کھنڈ نہیں دتی جاندا“۔ آپ ان کو لاکھ سمجھائیے کہ صاحب! اس کی بجائے آپ چینی کی بوری دیدیں لیکن وہ یہی کہیں گے کہ ”نہیں! صاحب! اے تے شگنوں دی گل ہوئی ناں۔ چینی دین نال تے بے شگنی ہوندا ہیگی“۔ یہ وہی ہے جسے قرآن بَل تَتَّبِعْ مَا وَجَّهْنَا

① اے او بے پیر و مرشد! سن تیرے باپ نے کیا یہاں مچھل لگایا تھا یا کیل؟

② وہ شگن شگون فال نذرانہ میں دینا ہے۔ وہاں تو گڑ ہی دیا جاتا ہے اس میں چینی نہیں دی جاتی۔

③ یہ تو شگون کی بات ہے۔ چینی دینے سے تو یہ بے شگونی ہو جاتی ہے۔

عَلَيْهِ اَبَاءٌ ۙ (31:21) کہتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں یہی ہوتا ہے اور کبھی آپ حساب لگا کر دیکھیے کہ آپ کی شادی بیاہ یا مرنے جینے پہ حقیقی خرچ کتنا ہوتا ہے اور اس بَل تَتَّبِعْ مَا وَجَّعْنَا عَلَيْهِ اَبَاءٌ نَّالَہُ کتنا خرچ ہوتا ہے۔ دلہن آرہی ہے، دروازے کے اوپر کھڑی ہے تو کہتے ہیں کہ ”نی کوڑا تیل لے آمر جانی۔ اے تینوں کہند اپیاسی“^①۔ یعنی اُس کے لیے کڑوا تیل چاہیے۔ جس گھر کے اندر بجلیاں چلتی ہوں تو اب تو وہاں مٹی کا تیل نہیں ہوتا تو کڑوا تیل کہاں سے ہو۔ دلہن کھڑی ہے تو اُس وقت ڈھنڈیا پڑ رہی ہے اور وہ اندر اُس وقت تک نہیں جاسکتی جب تک وہ کڑوا تیل نہ ہو۔ یعنی یہ چیزیں جو ہیں یہ بڑی گہری ہیں یہ ذہنیاتوں کے اندر چلی گئی ہوئی ہوتی ہیں۔ اگر کہیں ایسا ہو جائے کہ ایک دلہن کو تیل کے بغیر اندر لے جایا جائے تو کہتے ہیں کہ اللہ خیر کرے ”وہٹئی نوں بے شگنوں اندر لے آندا اے“^②۔ عزیزانِ من! یہ محض باتیں نہیں ہیں جو ہمارے ہاں گھروں میں ہوتی ہیں، گھروں میں ہی نہیں باہر معاشرے میں یہ کچھ ہو رہا ہے۔ یہ ساری چیز وہ ہے جو مذہب میں پیدا کی گئی ہے کہ بَل تَتَّبِعْ مَا وَجَّعْنَا عَلَيْهِ اَبَاءٌ نَّالَہُ (31:21)۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج آپ کو کتنی مصیبت پڑی ہوئی ہے۔

احیائے اسلام کے سلسلہ میں کی جانے والی کوشش کی نوعیت

ذرا اوپر کی سطح پر چلیے۔ یہ بڑی خوش کن بات تھی کہ اس دور میں ہمارے ہاں احیائے اسلام کے متعلق کچھ باتیں چلیں، کچھ کوششیں بھی ہوئیں لیکن جتنے لوگ اس کے لیے کوشش کرنے بیٹھتے ہیں، ان کی پہلی تاکید یہ ہوتی ہے کہ آپ غور و خوض کر کے یہ بتائیں کہ اس معاملے کے متعلق امیر کا انتخاب کیسے ہوگا، پارلیمنٹ کا درجہ کیا ہوگا، مشاورت کیسے ہوگی، قانون کیسے بنیں گے۔ اس طے کرنے میں پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ فلاں امام نے اس کے متعلق کیا لکھا ہے۔ یعنی خود تحقیق کر کے نئے سرے سے یہ چیزیں بنانے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں اور تاکید یہ ہو رہی ہے کہ ہزار سال پہلے کی فلاں کتاب میں کیا لکھا ہے۔ سارے جھگڑے اس پہ ہوتے ہیں کہ ابنِ خلدون (732-808/1332-1406) نے یہ کہا ہے، فلاں یہ کہہ گیا ہے۔ اب ان میں آپس میں بیٹھے ہوئے ٹکراؤ ہوتا ہے، اس ٹکراؤ کو سلجھا رہے ہیں:

ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں

① کڑوا تیل لے آؤ۔ یہ تجھے کہہ رہا تھا۔

② دلہن کو بغیر شگون پورے کیے گھر کے اندر لے آئے ہیں۔

3 میں آپ سے کہہ رہی تھی کہ اسے (دلہن کو) بغیر تیل کے شگون کے اندر نہ لاؤ۔ آپ دیکھ رہے ہو کہ کیا ہوا ہے۔

یہ سراسر ما انزل اللہ میں ملے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوششیں اتنی ہیں لیکن Cyclic Order (دائری نظم) کے اندر ہوتی ہیں، دائرے کے اندر ہوتی ہیں؛ نشستن و گفتن و برخاستن، ایک قدم آگے نہیں بڑھ رہا، اس لیے کہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ ہزار سال پہلے ان کے ہاں کی کسی مسلمان سلطنت میں کیا طریقہ رائج تھا۔ اوّل تو تاریخ ہی آپ کی ایسی نہیں جو قابل اعتماد ہو اور اگر ہو بھی تو وہ اُس دور کے تقاضوں کے مطابق اپنے لیے انہوں نے کوئی راستہ تجویز کیا تھا، آج کے زمانے کے تقاضے بدل گئے، آج کے زمانے کے حالات و کوائف بدل گئے ہیں لہذا ان کے مطابق سوچے کہ کیا کرنا ہے۔

ہمارے ہاں کی آسودہ حالی اور تحقیق کرنے کا معیار

عزیزانِ من! یہاں تو مشکل یہ ہے کہ جب یہ دور آتے ہیں تو ان میں تو پھر یہ ڈھنڈیا پڑتی ہے کہ دیکھیے فلاں امام نے کیا کہا، فلاں دور میں کیا ہوا، پہلے دور میں کس طرح سے ہوا۔ یہ سارا کچھ جتنا بھی ہے یہ تو نعل بہ نعل، قدم بہ قدم، ایک ایک قدم اُس کے مطابق ہونا ہے۔ اب یہ ساری تہذیب ہی اُس کے اوپر ہے کہ وہ کیسے ہوتے تھے، کیسے رہتے تھے، کیسے کرتے تھے بلکہ اُس سے آگے جاتے ہیں تو گویا اور بھی سندیں لانی شروع کرتے ہیں۔ ساری زندگی کے اندر تو یہ کچھ ہوتا ہے، کبھی یہ نہیں سوچتے کہ وہ تو ایک مسجدِ نبویؐ جس کے اوپر کھجور کے پتوں کی چھت پڑی ہوئی تھی اور نیچے کچا فرش تھا، وہاں بیٹھ کر یہ سب معاملات سلجھاتے تھے اور آپ Inter Continental میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر اسلاف بننا ہے تو ایسے بنو۔ جو طریقہ آپ اختیار کر رہے ہیں وہ تو اسلاف کے خلاف نہ ہو اور سفر آپ ہوائی جہاز میں کر رہے ہیں، اتنے اتنے بڑے ہوٹلوں میں رہ رہے ہیں، اتنی اتنی بڑی کاروں میں سفر ہو رہا ہے۔ اس میں تو اسلاف کا راستہ یاد نہیں رہتا لیکن یہ کہ تلوار کی لمبائی کتنی ہونی چاہیے، اس کے لیے اسلاف کی تلواریں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ زندگی کے اندر پھر کس قدر تضاد واقع ہو جاتا ہے۔ قرآن صراطِ مستقیم کہتا ہے اور اس کے لیے پھر راستے کے بعد اُس نے آوارہ نہیں چھوڑ دیا بلکہ اُس نے آپ کے لیے ما انزل اللہ ایک کسوٹی دیدی ہے اور اس نے اسی لیے اس کو مکمل بھی کہہ دیا ہے، غیر متبدل کہہ دیا ہے، اس کی حفاظت خود اپنے ذمے لے لیا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے آپ اس کی حفاظت کرتے رہیے، یہ ہمارے تو کسی کام میں آتا نہیں۔ ہم تو بَلِّ تَتَّبِعَ مَا وَجَّعْنَا عَلَيْهِ اٰتًا ۝ (31:21) والی بات کریں گے، وہ کتابیں سنبھال کر رکھیں گے، وہ کتابیں دارالعلوموں کے اندر پڑھائیں گے، اُس پہ دستارِ فضیلت ہم دیں گے۔

① نہیں صاحب! ہم تو اسی ڈگر پر چلتے جائیں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے (پرویز: مفہوم القرآن ص-950)۔

ہمارے دارالعلوموں کے نوسالہ کورس میں قرآنی حقائق کو سمجھنے کے سلسلہ میں بے رخی کی کیفیت آپ کو معلوم ہے کہ ان کے ہاں دارالعلوموں کا نوسالہ کورس ہوتا ہے۔ نوسال کے اس کورس میں آخری سال میں قرآن کریم کی صرف سورۃ البقرہ کی ایک تفسیر پڑھائی جاتی ہے وہ بھی اسلاف کی تفسیر ہے۔ یہ چیز جو ہے میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ قرآن نے بار بار یہ جو کہا ہے تو اس کا تعلق مذہب سے نہیں ہے بلکہ یہ جو ذہنیت ہے یہ جو مسلک ہے یہ جو قوم کے اندر نفسیاتی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ جس طرح سے ہوتا چلا آ رہا ہے اسی طرح سے ہوتا چلا جائے تو اس سے قوم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔

قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ تعلیم کا انداز

قرآن تو انسان کے لیے ارتقائی منازل بتاتا ہے وہ تو صراطِ مستقیم پہ چلاتا ہے دائرے میں نہیں چلاتا۔ اس لیے دین کا مسلک یہ ہے کہ خدا کی کتاب آپ کے پاس آخری سند حجت اتھارٹی، کسوٹی ہے اُسے دیکھیے اور اپنے زمانے کے حالات دیکھیے۔ اور وہ جو قرآن ہے خدائے خیر و علیم نے قیامت تک ساری نوع انسان کے لیے ضابطہ دینا تھا تو اُسے ہونا ہی یہ چاہیے تھا کہ وہ حدود (Limits) مقرر کرتا ہے Boundaries مقرر کرتا ہے لیکن اُس کے اندر کی جزئیات خود نہیں دیتا۔ وہ یہ تو کہتا ہے کہ **أَمَرْتُمْ شُرَآئِیَ بَیِّنَتُمْ** (42:38) باہمی مشاورت سے اپنے معاملات طے کرو لیکن اس مشاورت کی Detail (تفصیل) نہیں دیتا۔ وہ اعدلوا (5:8) کہتا ہے یعنی عدل کرو لیکن وہ یہ نہیں بتاتا ہے کہ اس عدل کرنے کے طریقے کیا ہوں گے Procedure خود متعین کرو۔ یہ طریقے زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے جائیں گے اور وہ (حد و کار) جو غیر متبدل Boundaries Lines ہیں وہ اپنے مقام پہ رہیں گے۔ عزیزانِ من! یہ سمجھنے کے لیے ہاکی یا فٹبال کے میدان کو دیکھیے تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اُس کی جو Boundary Line یا اُس کے لیے جو قواعد و ضوابط مقرر ہوتے ہیں وہ تو اپنے مقام پہ ہوتے ہیں اور اُس کے بعد یہ دونوں ٹیمیں اس باب میں آزاد ہوتی ہیں لیکن اس آزادی میں ایک پابندی ہوتی ہے کہ ان گیارہ کھلاڑیوں کے سامنے ایک نصب العین ہوتا ہے ایک Goal (ہدف) ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر کھلاڑی خواہ وہ دائیں پہ ہے یا بائیں پہ ہے آگے ہے یا پیچھے ہے وہ کہیں بھی ہے لیکن ہر ایک کی توجہ اُس گول کی طرف ہے کہ میں نے گیند وہاں پہنچانا ہے حتیٰ کہ ان کے ہاں جو کیپٹن ہوتا ہے یہ ٹھیک ہے کہ ٹیم کا سربراہ ہوتا ہے تو اُس کے سامنے بھی یہی گول ہوتا ہے کہ میں نے گیند یہاں پہنچانا ہے وہ بھی ان قواعد کا پابند ہوتا ہے جو Boundary Lines (حد کی لائنیں) ہوتی ہیں اندر کی لائنیں بھی ہوتی ہیں۔ خواہ وہ کیپٹن ہے خواہ وہ Player (کھلاڑی) ہے وہ باؤنڈری لائنز جو ہیں وہ ہیں جسے قرآن نے حدود اللہ کہا ہے۔ ان حدود اللہ کو Cross (تجاوز) نہیں کرنا بلکہ وہ کہتا ہے کہ ان کے تو قریب بھی نہ جانا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ذرا زور سے گیند لگ جائے اور

وہ باہر چلا جائے لانسقرب (35: 2) ان کے قریب بھی نہ جاؤ لیکن وہ باؤنڈری لائنز ہیں ان کے اندر آپ کو آزادی بھی ہے اُس میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق آپ سب کچھ خود Practice کیجیے۔ Player (کھلاڑی) کو آزادی ہوتی ہے کہ وہ زور سے ہٹ لگائے یا آہستہ ہٹ لگائے یا ذرا دائیں کو کر دے یا ذرا بائیں کو کر دے تو اُس کو اس کی پوری آزادی ہوتی ہے۔ عزیزان! یہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ غیر متبدل قوانین حدود خداوندی کے تابع رہتے ہوئے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق جزئیات Procedure (طریقہ کار) Process خود طے کیجیے۔ اس پہ جب بھی کوئی قوم آئے گی تو وہ دیکھیے گا کہ کس طرح سے آگے ہی نہیں بڑھتی بلکہ قرآن کہتا ہے کہ وہ تو امام للناس ہو جاتی ہے نوع انسانی کی امامت اُس کے ہاتھ میں آ جاتی ہے۔

وحی خداوندی کی مقرر کردہ حدود کو نظر انداز کرنے کی بنا پر اہل یورپ کی حالت

مشرق جو مذہب زندہ ہے وہ تو دائرے کے اندر (Cyclic Order) جارہا ہے اس میں مَا وَجَّعْنَا لَكُمْ مِنْهَا مَغْرِبَ آفَاقٍ (22: 32) ہے۔ مغرب نے آزادی حاصل کی تو اُس نے حدود ہی توڑ دیں یعنی اُس کے لیے کوئی غیر متبدل حدود ہیں ہی نہیں۔ جب غیر متبدل حدود باقی نہ رہیں تو اُس ہاکی کے میدان کا اندازہ لگا لیجیے جس میں دونوں ٹیمیں ان حدود اور ان قیود کا کوئی خیال نہ کریں اور وہ دونوں Sticks (ہاکیاں) ہاتھ میں لیے ہوئے چلیں تو پھر وہی ہوتا ہے جو اقوام مغرب میں ہو رہا ہے۔ وہاں حدود کے نہ ہونے نے اس قدر خلفشار مچا رکھا ہے کہ آپ خلفشار کی وسعتوں کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ تو تین چار نکتہ پہنچنے کی ہیں حدود اور قیود کو متعین نہیں ہیں تو پھر ظاہر ہے وہی ہوتا ہے جیسے ہاکی کے میدان میں Sticks (ہاکیاں) چلا کرتی ہیں۔

مذہب پرست قوموں کی حالت

جو مذہب پرست قومیں ہیں ان کے ہاں صورت یہ ہے کہ ہزاروں ہزار پانچ ہزار سال پہلے جہاں سے کوئی قوم شروع ہوئی تھی اُسی مقام میں چکر لگ رہا ہے دائرے کے اندر چکر لگ رہا ہے اور ایک قدم آگے نہیں بڑھ رہی ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن بات تو ایسے کرتا ہے جیسے یہ مذہب کی دنیا کی بات ہے لیکن وہ تو زندگی کے ہر گوشے کو ساتھ لیتا ہے۔ اسی لیے وہ بار بار ان قوموں سے یہ کہتا ہے کہ جب یہ کہیے کہ آپ کے پاس جو سند اور حجت اور کسوٹی ہے کیا وہ خدا کی کتاب ہے تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں! اسلاف کا جو مسلک ہے ہم اس پر چلتے چلے جائیں گے اُولَٰئِكَ هُمُ الشَّيْطَانُ يَنۢذِرُهُمۡ اِلَیَّ عَذَابُ السَّعِیۡرِ (31: 21) آنکھیں بند کیے چلے جائیں گے خواہ ان کو شیطان دھکیل کے جہنم میں ہی کیوں نہ لے جائے۔ یہ تو میں جہنم میں ہی تو ہوتی ہیں جو اپنی سوچ سمجھ سے کام نہیں لیتیں اور خدا کی غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے کام نہیں کرتیں جہنم اسی کو کہتے ہیں۔ جہنم کے لیے قرآن میں ایک لفظ جیم ہے جیم اُس مقام کو کہتے ہیں جہاں

کوئی چلنے سے رک جائے۔ آپ سوچ رہے ہیں اور یہاں بڑے فخر سے یہ چیز کہی جاتی ہے کہ ہم تو اُسی راستے پہ چلیں گے، جس پہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ یہ قوم آگے بڑھنے سے رکی ہوئی ہے، حالتِ جمیم میں ہے۔

تقلید پرستی کے برعکس ایک دوسرا مسلک: ایسا سہارا جو کبھی نہ ٹوٹے

اب ہم آج کی آیت پڑھتے ہیں۔ کہا ہے کہ **وَمَنْ يَسْلَمْ وَجْهًا لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ**

الْوُثْقَىٰ ۚ وَإِلَى اللَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (31:22)۔ ایک تو وہ مسلک تھا، وہ ذہنیت تھی کہ خدا کی دی ہوئی اقدار و احکام پہ نہیں بلکہ جس

مسلک پہ چلے آ رہے ہیں، اُس مسلک پہ چلے جائیں گے۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا مسلک ہے اور وہ یہ ہے کہ **مَنْ يَسْلَمْ وَجْهًا**

إِلَى اللَّهِ (31:22)۔ اس کا عام ترجمہ یہی ہوتا ہے کہ جو اپنے وجہ کو خدا کے سامنے جھکا دے ”وجہ“ کا لفظ بڑا ہی جامع ہے۔

مادے^① کے اعتبار سے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ”جو چیز کسی کے سامنے سب سے پہلے ابھر کر آئے“۔ لیکن یہ صرف مادے کے

بنیادی معنی ہیں۔ یہ لفظ زندگی کے نصب العین کے لیے آتا ہے، یہ لفظ Goal (منزل) کے لیے آتا ہے Purpose یا مقصد کے لیے

آتا ہے۔ جس منزل کی طرف راستہ لے جائے اُس کو وجہ طریق کہتے ہیں اور پوری کی پوری Personality (شخصیت) یا ذات کے

لیے بھی یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ جہاں وجہ اللہ آتا ہے تو وہاں اس کے معنی خدا کا چہرہ نہیں ہوتے بلکہ ذاتِ خداوندی ہے۔ انسان کی

Personality (شخصیت) کے لیے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ یہ اتنا جامع لفظ ہے کہ اس میں انسان کے ارادوں سے لے کر اُس کی ہر روش

کے لیے یہ جامع لفظ آجائے گا۔ اگر ہم اسے ”اپنا آپ“ کہیں کہ جو ”اپنے آپ“ کو سپرد کر دیتا ہے تو اس سے کچھ زیادہ بات ہماری سمجھ

میں آ جاتی ہے۔ جیسے ہمارے ہاں پنجابی میں کہتے ہیں کہ ”اپنی وجہ دا حال سنا“^②۔ یہاں وجہ کہا ہے کہ **وَجْهًا لِلَّهِ**

(31:22) اپنے آپ کو جھکا دے اپنے اردوں کو اختیار کو، آرزوؤں کو، تمناؤں کو، اپنے آپ کو اپنی ذات کو، اپنی پرستش کو جھکا دے تو

پہلی یہ چیز ماننے کی ہوگئی، نظریہ ہوگیا، Ideology (نظریہ حیات) ہوگئی، Purpose (مقصد) ہوگیا۔ کہا کہ **وَهُوَ مُحْسِنٌ**

(31:22) اور پھر حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ **فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ** (31:22) یوں

کھینچے کہ اُس نے ایسا سہارا تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں ہے، بہت مضبوط سہارا تھام لیا ہے۔ عروۃ کے مفہوم کے لیے عربوں کی جغرافیائی زندگی

کو سامنے رکھیے، وہ ریگستان ہی ریگستان تھا، سبزے کا کہیں نام نہیں ملتا تھا، ان کے ہاں کہیں چار کھجوروں کے درخت کھڑے ہوں تو وہ ان

① اس کا مادہ (Root) ”وجہ“ ہے۔

② اپنی وجہ کا احوال دو۔

کو جنت کہتے تھے یہ جو ہمارے ہاں باغ میں نالیاں ہوتی ہیں اس کو وہ جنت کہتے تھے۔ ان کا دار و مدار موسیٰوں پر تھا۔ موسیٰ پر زندگی کا مدار ہوا اور وہاں ریگستان میں سینکڑوں میل تک سبزے کا نشان ہی نہیں ہے۔ وہاں اس قسم کے درخت کہ جن کی جڑیں پاتال تک گئی ہوں یعنی کھجور اور بول کے درخت کی جڑیں بہت دور تک جاتی ہیں اور وہاں سے پانی لیتی ہیں۔ ایک تو ان کی جڑیں پاتال تک گئی ہوئی ہوں اور اگلی چیز یہ کہ ان پہ خزاں کا موسم نہ آئے بلکہ بارہ مہینے ان کے پتے سرسبز رہیں۔ جس درخت کی ان کے ہاں یہ کیفیت ہوتی تھی کہ

بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ ①

کسی موسم میں اس کے پتے نہیں جھڑتے تھے اور اُس پہ بھروسہ کیا جاتا تھا کہ یہاں اگر ہمیں چارہ نہیں مل رہا تو وہاں چلیے وہاں یہ درخت ہیں وہاں چارہ ملے گا۔ اس قسم کا جو سہارا ہوتا تھا جو کبھی دغا نہ دے اور کبھی خزاں دیدہ نہ ہو وہ اُس کو عروۃ کہتے تھے۔ جس نے یہ طریق اختیار کر لیا کہ اپنے سامنے منزل مقصود وہ رکھا جو خدا نے متعین کیا ہے اپنی توجہ اُدھر مرکوز کر دی اپنی آرزوئیں اپنے مقاصد اپنے Goal اپنی Destination اس کے لیے مقرر کر دیا تو یوں سمجھ لیجیے کہ اُس کے ہاں ان درختوں کا باغ آگ آیا جن پہ کبھی خزاں نہیں آتی۔ کہا کہ **وَاللّٰہِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ** (31:22) سارے معاملات جتنے بھی ہیں ان کے بارے میں سوچیں مشورہ کریں گفتگوئیں کریں بحث کریں لیکن **عَاقِبَةُ الْأُمُورِ** آخر الامر وہ یہ دیکھیں کہ خدا اس کے متعلق کیا چاہتا ہے۔

اب یہ دونوں روشیں سامنے آگئیں۔ ایک یہ ہے کہ یہ ما انزل اللہ کی طرف نہیں آئیں گے بلکہ **مَا وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَاءَنَا** کی طرف جائیں گے۔ اور دوسری روش یہ ہے کہ یہ اپنے ارادوں تک کو خدا کے احکام کے سامنے جھکائیں گے اور پھر حسن کارانہ زندگی بسر کریں گے تو یہ وہ قوم ہوگی جس کے شجر حیات پر کبھی خزاں نہیں آسکتی۔ یہاں تو صرف الوفاق ہی کہا ہے دوسری جگہ کہا ہے کہ ایسا درخت جو ہمیشہ پھل بھی دیتا رہے۔ دونوں روشیں سامنے رکھ لیجیے۔ یہ دوسری روش ہے زندگی کا صحیح راستہ۔ جو اس پر چلتا ہے وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے **وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزَنكَ كُفْرُہٗ** (31:23)۔

① اقبال: ضرب کلیم، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد 1996ء، ص 38:

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں مجھے ہے حکم اذان لا الہ الا اللہ

② اور جو اس سے انکار کرتا ہے (وہ اپنا نقصان کرتا ہے) تجھے اس کی اس روش سے افسردہ خاطر نہیں ہونا چاہیے (پرویز: مفہوم القرآن، ص 951)۔

نبی اکرم ﷺ کی حساس خیالی اور وحی کا سہارا اور اس کی اقلیم

عزیزانِ من! (31:32) میں کہا ہے کہ اگر کوئی اس روش سے جو خدا نے بتائی ہے انکار کرتا ہے یا اس کے خلاف جاتا ہے تو کہا ہے کہ اے رسول! تمہیں اس سے افسردہ خاطر ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا بات ہے رسول کی بھی! بڑا ناصح مشفق ہوتا تھا بڑا ہمدرد معالج ہوتا تھا۔ کئی مقامات پہ یہ آیا ہے کہ تُو تو اس غم میں اپنی جان گھلا لے گا کہ یہ لوگ صحیح راستے پہ کیوں نہیں چلتے اور اس کے بعد یہ کہا ہے کہ اگر ہم نے انہیں زبردستی صحیح راستے پہ چلانا ہوتا تو اے رسول! تمہاری رسالت کی وحی کی جبریل کی ضرورت ہی کیا تھی۔ حیوانات بھی تو چل ہی رہے ہیں ان کی طرف کوئی رسالت آتی ہے۔ اس لیے تمہیں غمگین ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ گویا رسول کی یہ صورت نہیں تھی کہ یہ اگر اس کو نہیں مانتے تھے تو یہ ڈنڈا ہاتھ میں لے لیتا تھا کہ ”تہاؤی ایسی دی تہی، تہی مندے کیوں نہیں ہیگے“۔ قرآن ان سے کہتا ہے کہ تمہیں افسردہ خاطر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اوبابا! مقدم چیز تو یہ ہے جو ہم کہہ رہے ہیں کہ انسان کا اختیار و ارادہ برقرار رہے جس روش پہ چلے کو ہم کہہ رہے ہیں اُس کا مقصد یہ ہے۔ یہ جو انسانوں کی بنائی ہوئی دوسری روشیں ہیں اس میں ان کے اختیار و ارادے کو سلب کیا جاتا ہے اور یہاں اگر ہماری روش میں بھی تم یہ کہو کہ ان کا اختیار و ارادہ سلب کر کے کسی طرح سے ان کو مار مار کر اس راستے پر چلا دیا جائے تو یہ ہمارا منشا نہیں ہے۔ ان کی ذہنیت اس طرح سے بدلنی ہے کہ **يَعْلَمُ الْكُتُبَ وَالْحِكْمَةَ وَيَرْكَبُ السَّيْرَةَ** (2) کتاب و حکمت سے ان کی ذہنیت کو بدلوان کی نفسیات کو بدللو۔ اس لیے اگر اس کے باوجود یہ اپنی ضد اور ہٹ پہ قائم رہتے ہیں بات سننا ہی نہیں چاہتے اپنے آپ کے اندر تبدیلی پیدا ہی نہیں کرنا چاہتے تو تمہیں اس میں غم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ **إِنَّا مَرْجُومٌ** (31:23) یہ جو اچھاری مجرم بھاگے پھر رہے ہیں یہ بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے ہماری مملکت کی حدود سے یہ باہر جا ہی نہیں سکتے انہوں نے یہیں آنا ہے بھاگے ہوئے مجرم نے یہیں ہماری عدالت میں آنا ہے۔ اس لیے تم کیوں غم کھاتے ہو۔ تھوڑے دنوں کے بعد تھوڑے عرصے کے بعد دیکھ لینا کہ کس طرح سے یہ پابجولاں یہاں تھانے میں کھڑے ہونگے۔ **فَنَنْتَبِئْهُمْ بِمَا عَمِلُوا** (31:23) یہاں ان کا اعمال نامہ سامنے رکھا جائے گا کہ یہ تھا جو کچھ تم کرتے تھے۔ **إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ** (31:23)۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ جس باب میں یہ لفظ علیم آتا ہے اُس کے معنی ہوتا ہے کہ ”اسمیں مسلسل متواتر یہ چیز ہے کہ ہمیں علم ہوتا ہے۔“ یعنی یہ چیز نہیں کہ کسی ایک وقت میں علم ہوتا ہے بلکہ مسلسل متواتر ہمیں علم ہوتا ہے۔ کہا کہ **بِذَاتِ الصُّبُورِ** (31:23) یہی نہیں کہ

● تمہاری ایسی کی تہی تم سر تسلیم غم کیوں نہیں کرتے۔

جو اعمال سرزد ہو جاتے ہیں ان کا ہی علم ہے بلکہ جو سینے میں گزرنے والے ارادے ہیں ہم تو ان کو بھی جانتے ہیں کیونکہ وہاں جب ”وجہ“ کہا تھا تو وہ آرزوؤں اور تمناؤں کے اوپر بھی صادق آتا ہے۔

انسان کی انسانیت اس کے دل میں گزرنے والے خیالات کی ہی پر تو ہوتی ہے

عزیزانِ من! اصل چیز تو وہی ہے جو سینے میں گزرنے والے خیالات ہوتے ہیں انسانیت انہی سے بنتی ہے۔ باقی رہ گیا کہ یہ فوری پکڑے کیوں نہیں جاتے تو کہا کہ ہمارا اصول ہے جو ہم نے بتا رکھا ہے کہ **نَعْتَصِّمُ قَلِيلًا** (31:24) مہلت کا وقفہ ہوتا ہے، جھٹ سے گرفت نہیں کر لی جاتی، ان کو سمجھایا جاتا ہے، وقفہ دیا جاتا ہے، مہلت دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے ارادے سے یہ سب کچھ اختیار کرے جو ہم کہہ رہے ہیں۔ اس کے لیے وقت دیا جاتا ہے کہ اپنے اندر تبدیلی پیدا کرو لیکن اگر یہ نہیں کریں گے تو **ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابٍ غَلِيظٍ** (31:24) پھر ہم گھسیٹ کر ان کو یہاں لے آئیں گے وہ بھاگ نہیں سکیں گے۔ کہا کہ ذرا ان کی طرف آئیے تم ان سے کہتے ہو کہ ہم خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہم تو خدا کو پہلے ہی مانتے ہیں تو یہ کونسی نئی دعوت ہے۔ دنیا میں اب تو کمیونزم کی وجہ سے خدا کی ہستی سے انکار کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا ہے ورنہ باقی یورپ جتنا بھی ہے وہاں وہ لوگ خدا کو مانتے ہیں۔

خدا کو ماننے اور نہ ماننے میں بھی ایک بنیادی فرق ہے

قرآن کریم میں خدا کے ماننے اور ماننے میں بڑا فرق ہے۔ یورپ کا سائنسٹ بھی خدا کو مانتا ہے، یورپ کے عام لوگ بھی مانتے ہیں۔ وہ ایسے مانتے ہیں کہ **God is Creator of Universe**۔ اُس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ خارجی کائنات میں قوانینِ فطرت یا قوانینِ خداوندی کار فرما ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خارجی کائنات میں **Sovereignty** **Belongs to Allah**، اقتدار مطلق اسی کا ہے۔ خدا کو تو وہ مانتے ہیں پھر ان کو خدا کو ماننے کی دعوت کیوں دی جاتی ہے؟ یہی نہیں بلکہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ اور ایران کے مجوسیوں تک خدا کو مانتے ہیں اور یہ تک کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کتاب موجود ہے جو خدا نے ہمارے پیغمبر کی طرف بھیجی تھی۔ انہیں بھی خدا پہ ایمان لانے کی دعوت دی جاتی تھی۔ تو یہ کچھ کیوں تھا؟

عزیزانِ من! یہ بات کئی دفعہ آچکی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ کبھی کسی سے پوچھیے کہ خدا کے ماننے کے معنی کیا ہیں کہ میں خدا کو مانتا ہوں یعنی کیا مانتے ہو۔ تم کہتے ہو کہ میں خدا کو مانتا ہوں اور وہ کہتا ہے کہ میں نہیں مانتا تو تم دونوں میں کیا فرق ہے۔ کہا کہ **أَسْقَاتُ سَعِينُمْ بِأَنْتُمْ وَأَبَاؤُكُمْ** (53:23) یہ کچھ الفاظ ہیں، اصطلاحات ہیں جو تمہارے آباؤ اجداد کی طرف سے چلی آرہی ہیں اور کچھ تم

نے اپنے ہاں گھڑی ہیں۔ ذرا کھڑے ہو کر بتاؤ کہ اس کے معنی کیا ہیں جو تم کہتے ہو کہ میں خدا کو مانتا ہوں۔ خدا کو ماننے والوں کے متعلق کہا ہے کہ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ (31:25) ان سے بھی پوچھو کہ یہ کائنات کس نے بنائی ہے تو یہ بھی کہیں گے کہ خدا نے ہی بنائی ہے۔ کہا کہ یہاں تک ہی کیوں رہتے ہو۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ فانی یوفکون (29:61) جب ہم انسانی دنیا کی طرف آتے ہیں تو وہاں تمہیں کیا موت پڑ جاتی ہے کہ کہتے ہو کہ نہیں صاحب! یہاں تو انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کا فرما ہو گئے۔ گویا خدا کا دائرہ خارجی کائنات تک محدود ہو گیا، تمہاری دنیا میں وہ نہیں آتا اور اب خدا کے ماننے کے یہ معنی ہو گئے۔ خارجی کائنات خدا نے بنائی ہے یا کیسے بن گئی ہے اس بات کو چھوڑیے اسے دیکھیے کہ اس کا انسان کی زندگی کے اوپر کیا اثر پڑتا ہے۔

خدا کے نام پر مسلمانوں کو Exploit (سلب و نہب) کرنے کا ایک خطرناک حربہ

کہا کہ بات یہ ہے کہ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (31:25) اکثریت وہی ہے جو علم کی بنا پہ بات نہیں کرتی بلکہ محض ایک بات چلی آئی ہے اور بس دہرا دی جاتی ہے۔ ان سے پوچھو کہ علم کی بارگاہ سے اس کے کیا معنی ہیں۔ اور پھر جب اس کو Exploit (سلب و نہب) کیا جاتا ہے تو وہ پوچھو ہی نہیں۔ رشیا^① کے خلاف انہوں نے ایک محاذ قائم کرنا تھا اور انہیں یہ معلوم تھا کہ مسلمانوں کے جو مالک ہیں وہ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک ایک بحرِ ذخار ہے۔ یہ اتنی بڑی طاقت ہے اتنی بڑی جغرافیائی پوزیشن ہے یہ کرہ ارض کی بیلٹ ہے یہ یہاں سے وہاں تک ٹھانٹیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ انہوں نے یہ حربہ استعمال کیا کہ روس کے متعلق کہا کہ وہ تو خدا کا منکر ہوا اور مسلمانوں سے کہا کہ "Believers in God unite together" یعنی خدا کے ماننے والو! آؤ ہم اکٹھے ہوں۔ روس کے مقابل میں محاذ بنانے کے لیے خدا کے نام کو Exploit کیا جا رہا تھا۔

تھوڑی سی اجازت دیدیں تو عرض کروں کہ یہ خدا استعمال کیسے ہوتا ہے۔ برہمن بیٹھا ہوا روٹیاں پکا رہا تھا، دو چار پکا کر رکھی ہوئی تھیں، ایک کتا آیا، اُس نے وہ دو چار روٹیاں منہ میں لیں اور لے بھاگا۔ اب اُس نے ادھر ادھر دیکھا کہ وہاں کوئی پتھر وغیرہ نہیں تھا، گنیش^② جی کی مورتی وہاں پاس رکھی ہوئی تھی۔ اُس نے اٹھائی اور زور سے دے ماری اُس کے لگی اُس نے روٹیاں پھینک دیں اور چوں چوں کرتا ہوا چلا گیا۔ اُس نے جا کر روٹیاں بھی اٹھائیں، گنیش جی کو بھی اٹھایا اور اسے کہا کہ ساری عمر تمہاری پوجا کی لیکن کام تم آج آئے ہو۔ ہاں تو روس کے خلاف نعرہ یہ تھا کہ Believers in God unite together^③ خدا کے لیے ہمیں رشیا سے بچاؤ۔

① یہ سابقہ USSR (روس) کی طرف اشارہ ہے۔

② گنیش: شوجی اور پاربتی کا بیٹا جسے ہندو دانا کی اور مشکل کشائی کا دیوتا مانتے ہیں۔

③ خدا کے ماننے والو! آؤ اکٹھے ہو جائیں۔

جب کیا تنگ بتوں نے تو خدا یاد آیا

قرآن انسان سے ارض و سما کے خدا کو ماننے کا مطالبہ کرتا ہے

قرآن کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ **وَالَّذِينَ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (31:22)** یہ کائنات کس نے بنائی ہے تو آگے بڑھ کر کہیں گے کہ خدا نے بنائی ہے۔ ان سے کہا کہ یہ تو **لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (31:26)** ہے۔ تم **مَا فِي السَّمٰوٰتِ** تک ہی کیوں رہتے ہو ارض کی طرف بھی آؤ اس کی Sovereignty out of the Universe ہے۔ (یعنی اس کا اختیار اعلیٰ خارجی کائنات سے باہر بھی ہے۔ وہ ہے **لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (53:31)**۔ ایک لفظ میں ساری بات کہدی کہ یہ سہاوتی خدا تو مانیں گے لیکن ارض کے خدا کو نہیں مانیں گے۔ قرآن نے دوسرے مقام پر نکھار کر بات کر دی کہ **وَبِالْبَيِّنٰتِ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ وَفِي الْاَرْضِ (43:84)**۔ کیا بات ہے قرآن کی! یہ تو ابہام میں رہنے ہی نہیں دیتا ورنہ یہ دو اللہ الگ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور پھر الہ کے معنی بھی آپ نے سمجھ لیے ہیں کہ جب آپ لا الہ الا اللہ کہتے ہیں تو الہ کے کیا معنی ہیں۔ کہا کہ الہ الارض مانو تو پھر خدا کا ماننا ہے، الہ السماء ماننے سے بات نہیں بنتی۔ تمہاری اپنی زندگی میں، تمہاری معاشی زندگی میں، تمہاری سیاسی زندگی میں، انسانی زندگی میں، بھی اسی الہ کو مانو تو پھر اسے کہیں گے الہ الارض، ورنہ یہ بات ہے کہ ہم نے خدا کو مان لیا ہے جو کائنات کا بنانے اور چلانے والا ہے۔

خدا کی ذات اپنی صفات میں لامحدودیت کی حامل ہے، اسے محدود نہیں کہا جاسکتا

کہا کہ **اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (31:26)** وہ تمہارے اس ماننے کا محتاج نہیں ہے، وہ اس سے مستغنی ہے اور جمید ہے۔ تم کہتے ہو کہ خدا کی تعریف ہم بھی گرجوں میں جا کر کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ ہم تمہاری ان چیزوں سے مستغنی ہیں۔ جب تم نہیں تھے کائنات تک نہیں تھی اُس وقت بھی وہ غنی الحمید تھا۔ خدا کی خدائی اور کائنات اور اُس کے قوانین کا تو یہ اندازہ ہی نہیں کر سکتے، اندازہ لگا ہی نہیں سکتے، وہ محدود ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ تم اپنے دائرے کے اندر کی بات کرو۔ **وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرٍ اَوْ اَقْلَامٍ وَ الْبَحْرُ يَظْعَمُهُ مِنْ مَّ بَحْرٍ سَبْعَةٌ اَبْحُرُ مَا نَفِثَتْ كَلِمَتٌ اِلٰهُ (31:22)** خدا کی باتیں ختم ہونے والی نہیں ہیں۔ اگر دنیا بھر کے درخت قلمیں بن جائیں، یہ سمندر اور ان کے ساتھ کئی اور سمندر سیاہیاں بن جائیں اور اس کی باتیں لکھ لگیں تو یہ ختم نہ ہوں۔ یعنی بات اُس نے اتنی کہنی تھی کہ جو لامحدود ہے، وہ محدودیت کے اندر آ ہی نہیں سکتا۔ دنیا بھر کے شجر، ان کے ساتھ سمندر کتنے بھی اور اکٹھے کیجیے تو یہ محدود ہونگے۔ لامحدود محدودیت کے اندر آ ہی نہیں سکتا، محدودیت اپنے ہی دائرے کے اندر اُس کو سمجھ سکتی ہے۔ اسی لیے اُس نے کہا ہے

کہ جو کچھ اپنے متعلق ہم تمہیں بتاتے ہیں وہیں تک رہا کرو اُس سے آگے تم جا ہی نہیں سکتے۔ اور یہ جو سارا کچھ ہے کہا کہ **إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ** (31:27)۔ جہاں وہ اپنے آپ کو عزیز کہتا ہے تو ساتھ ہی اپنے آپ کو حکیم کہتا ہے۔ یعنی غلبہ استبداد کا نہیں ہے، قہر مانیت کا نہیں ہے، فرعونیت کا نہیں ہے بلکہ یہ Rationally (استدلالی) ہے Reason (عقل و فکر) یعنی ہے حکمت پیمانی ہے۔ اور اسی لیے اس کائنات کا سلسلہ اس طرح سے چل رہا ہے ورنہ قہر مانیت کی رو سے یہ سلسلہ یہ نظم و نسق اس انداز سے نہیں چل سکتا۔ یہ تو پوری کی پوری کائنات Infinite (لامحدود) بتادی۔ اس میں تنوع اتنا ہے کہ ایک پتی کے ساتھ دوسری پتی نہیں ملتی۔

کائنات میں وحدت کا محیر العقول سلسلہ نیز سائنسی انکشافات اور وحی کی راہنمائی

اب ایک آیت سامنے آرہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لیے تو کتابیں لکھی جائیں، نصاب میں داخل ہو تو پھر کہیں جا کر اس کے مفہوم کا کچھ احاطہ کیا جاسکے۔ قرآن کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ کائنات ہو یا انسانی دنیا ہو یہ ایک وحدت ہے۔ ہم تو برادری تک ہی رہتے ہیں اور اس میں بھی ہمیں افراد الگ الگ نظر آتے ہیں۔ وہ تصور کچھ اس قسم کا دیتا ہے کہ جیسے پوری انسانیت One invisible whole (ایک ناقابل تقسیم وحدت) ہو۔ الفاظ اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اقبالؒ (1877-1938) صرف یہی کہہ سکتا تھا کہ

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

آج کی سائنس اس پہ آرہی ہے۔ یہ ابھی ابھی جو خبر آئی^① ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام^② کو فزکس (طبیعیات) میں نوبل پرائز ملا ہے۔ بات تو وہ پریکٹیکل ہے اور اتنی بڑی سائنس کی ہے کہ ہم بھی نہیں سمجھ سکتے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ اس سے پیشتر طبیعیات نے یہ کہا تھا کہ یہ چار بنیادی عناصر^③ ہیں جن سے یہ کائنات وجود میں آئی^④ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے اب آگے جو تحقیق کرنا شروع کیا ہے تو ہم اس

① یاد رہے یہ بات نومبر 1979ء کی 9 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

② ڈاکٹر عبدالسلام نوبل پرائز (1926-1996AD)۔ انہیں 1979 میں نوبل پرائز ملا۔

He alongwith Steven Weingberg and Sheldon L.Glasgow (both U.S) developed theory that the electromagnetism and the "weak" force, which causes radioactive decay in some atomic nuclei, are facets of the same phenomenon.

③ شروع میں مٹی، ہوا، پانی، آگ چار بنیادی عناصر (Elements) گنے جاتے تھے حالانکہ آج ان میں سے ایک بھی عنصر نہیں گنا جاتا۔

④ زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب

موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا (چمکست)

طرف چلے جا رہے ہیں کہ یہ بات غلط ہے۔ اصل میں یہ ایک ہی وحدت ہے۔ چنانچہ یہ جو ان کا کارنامہ ہے تو یہ اس کو چار سے Reduce (کم) کر کے دو تک لے آئے ہیں۔ اور آگے ابھی چلے ہوئے ہیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ بات عام درس کے اندر کرنا ذرا مشکل ہے۔ ہاں تو یہ ایک وحدت ہے، وہ وحدت اس قسم کی ہے۔ **خَلَقَكُمْ وَلَا يَعْصِيكُمْ إِلَّا كَفَنَسٍ وَاجِدٌ** (31:2) تمہاری پوری انسانیت کی تخلیق اور اس کی بعثت (نشأۃ ثانیہ) میں نظر تو یہ آئے گا کہ ایک ایک فرد الگ الگ سے ہیں لیکن انسانیت ایک وحدت ہے، یہ تمہاری ساری تخلیق اور بعثت **كَفَنَسٍ وَاجِدٌ** یعنی One Indivisible (ایک ناقابل تقسیم) وحدت ہے۔ عزیزان من! یہ وحدت انسانیت کا جو تصور ہے یہ چودہ سو سال پہلے قرآن دے رہا ہے دنیا میں کہیں نہیں ملے گا۔ ہمارے ہاں تو زیادہ سے زیادہ تعلق برادر ہڈ کا، عالمگیر برادری تک کا ہی آئے گا۔ یہ کہ یہ انسان کی وحدت ہے، آپ کے دل میں زخم ہوا اور میرے قلب میں اُس کی ٹیس پڑے، یہ ہے ناقابل تقسیم وحدت۔ سائنس کے انکشافات انسان کے ذہن کو اس طرف لا رہے ہیں۔

کائنات کو مسخر کرنے کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کی ذہنی سطح کے کارنامے اور قرآن کا ناقابل تقسیم وحدت کا پیغام کبھی آپ نے دیکھا کہ لندن میں ایک کمرے کے اندر بیٹھا ہوا انسان وہاں کچھ باتیں کر رہا ہے، آپ اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اُسی وقت یعنی سیکنڈ کا بھی فرق نہیں ہوتا، کہ وہ تمام کی تمام باتیں اپنے سامنے سنتے ہیں، اس کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے، رنگ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ فاصلے کس طرح سے ختم ہو گئے ہیں یعنی وحدت ہو گئی ہے۔ وہ اور یہ جو ہمارا سیٹ ہے ان دونوں میں کوئی تفریق نہیں رہی۔ اور جو چاند کے اوپر گئے ہوئے ہیں ان کے ساتھ جو رابطہ ہے، یہ کتنی بڑی وحدت ہے۔ مجھے تو یہ واقعہ ہی نہیں بھولتا، میں پھر ہر ادوں، یہ ہمارے ذہنوں میں نہیں آ سکتا۔ ہمارے ذہنوں میں کیا آئے گا کہ غنیمت ہے کہ اب ان کو مصیبت پیش آئی کہ یہ لاؤڈ اسپیکر کو استعمال کرنے لگ گئے ورنہ ان کا پہلے کا فتویٰ موجود ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال حرام^① ہے۔ چاند پہ وہ گئے ہوئے

① یاد رہے جب ہندوستان میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال شروع ہوا تو ”علمائے کرام“ سے اس کے جائز یا ناجائز ہونے کے متعلق فتویٰ مانگا گیا۔ دارالعلوم دیوبند کے بہت بڑے مفتی مولانا محمد شفیع مرحوم (1897-1976) نے ”عبادات مقصودہ“ کے لیے اس آلہ کو حرام قرار دیا۔ انہوں نے الہدایۃ المفیدۃ فی حکم الصنائع الجدیدہ رسالے میں لکھا تھا کہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس آلہ کی ماہیت کیا ہے اور وہ کس طرح کام کرتا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے الیکٹریٹر ہائی اسکول بھوپال کے سائنس ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت فرمایا۔ انہوں نے کہا کہ ”برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم از کم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے“۔ چنانچہ اس تحقیق اہل حق کے بعد مفتی مولانا محمد شفیع مرحوم (1897-1976) نے عبادات کے لیے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو حرام قرار دے دیا۔ (حوالہ پرویز: سلیم کے نام، جلد سوم، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، 1986ء، ص 15 تا 16)۔

تھے ان کا رابطہ یہاں زمین کے اوپر کنٹرول اسٹیشن سے تھا۔ یہاں انہوں نے اس سے وہ جو انجن کے اوپر بیٹھا ہوا تھا بات کی۔ اس نے کہا کہ جی میں ہوں وہ دوسرا نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں پتہ ہے کہ وہ انجن پہ نہیں ہے بلکہ وہ سو رہا ہے۔ اُس نے پوچھا کہ جی! یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ نے میری آواز سے پہچان لیا ہوگا کہ میں وہ نہیں لیکن آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ تم ہو وہ نہیں اور ہمیں پتہ ہے کہ وہ سو رہا ہے تو آپ کو یہ کیسے پتہ ہے؟ انہوں نے کہا کہ اُس کی جو Heart Beating (دھڑکن قلب) ہے اُس کا گراف ہمارے پاس ہے اور یہ اصول ہے کہ سونے والے کی جو Beating (دھڑکن نبض) ہوتی ہے وہ جاگنے والے سے کم ہوتی ہے۔ پچھلے دس منٹ سے اس کی Beating (دھڑکن نبض) میں فرق آ گیا ہے اس لیے ہمیں پتہ ہے کہ وہ سو گیا^① ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وحدت کی طرف کس طرح سے انکشافات چلے جا رہے ہیں۔ اس اعتبار سے یا اس غلط نگاہ سے جی چاہتا ہے کہ کچھ اور بھی ہزار برس ہم جی لیں اور دیکھیں کہ کیا کیا انکشافات ہوتے^② ہیں۔ لیکن کوئی بات نہیں یہاں نہیں تو وہاں جا دیکھیں گے۔ یہاں تو پھر بھی ٹی وی سیٹ خریدنا پڑتا ہے ”اوتھتے متے مفتای ہونا اے“^③۔

عزیزانِ من! جنت میں کوئی چیز نہیں بکتی، کہیں نہیں لکھا کہ وہ خریدی جائے گی۔ کہا ہے کہ **مَا خَلَقَكُمْ وَلَا يَبْعَثْكُمْ إِلَّا كُنُفٍ** **وَاحِدًا** (31:28)۔ کیا ہوگی یہ کیفیت کہ پوری انسانیت One Indivisible Whole (ایک ناقابلِ تقسیم وحدت) ہوگی۔ **إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ** (31:28) بات یونہی افسانے کی نہیں کہہ رہا بلکہ سنتا ہوں، دیکھتا ہوں۔ دیکھ کر کہتا ہوں، سن کر کہتا ہوں کہ تمہاری خلق اور بعثت ایک نفسِ واحدہ ہے۔ کہا کہ تمہیں کیسے سمجھائیں کہ تمہیں تو اختلافات نظر آتے ہیں اور اُس اختلاف کے باوجود وہ اختلاف ہوتا نہیں ہے۔ عزیزانِ من! اب دیکھیے کہ قرآن چودہ سو سال پہلے کے ایک بد کو بھی سمجھا رہا ہے اور اُن سائن (1879-1955) کو بھی سمجھا رہا ہے۔

① دیکھیے: پرویز: امریکہ کے خلا نوردوں کو سلام، طلوع اسلام (8:22)، اگست 1969، ص 4۔

② خلائی سفر کے انکشافات کی مختصر تاریخ دیکھیے کہ

③ وہاں کو مفت ہی ہوگا۔

2. دسمبر 1942 کو ایٹم (Atom) توڑا گیا۔ 4۔ اکتوبر 1957ء میں روس نے اسپٹنک (Sputnik.1) نامی مصنوعی سیارہ پہلی بار خلا میں بھجوا کر ایک عالم کو درطہ حیرت میں غرق کر دیا۔ 28۔ فروری 1959ء میں امریکا نے پہلا مہجر سیارہ خلا میں بھیجا۔ 12۔ اپریل 1961ء میں روس نے پہلا انسان بردار سیارہ خلا میں بھیجا۔ روسی خلا نورد پوری گاگرین (Yuri Gagarin) پہلا انسان تھا جس نے زمین کے مدار (Orbit) کے گرد چکر لگایا اور 21 جولائی 1969ء کو نیل ایلمن آرم اسٹرونگ (Neil Alden Armstrong) پہلا انسان تھا جس نے پہلی بار چاند کی سطح پر قدم رکھا اور برملا پکار کر کہا کہ "That is one small step for a man, one giant leap for mankind" "انسان کے لیے ایک معمولی سا قدم مگر مہم بنی نوع انسان کے لیے ایک غیر معمولی جست"

وقت (Time) کے سلسلہ میں آئن اسٹائن اور برگسان کے انکشافات اور قرآن حکیم کے بیان کردہ حقائق آپ حیران ہو گئے کہ یہ آئن اسٹائن (1879-1955) سے آگے تو بڑھے ہیں لیکن ٹائم کے متعلق وقت کے متعلق آئن اسٹائن کی جو تھیوری ہے اس کا امام برگسان (1859-1941ء) ہے۔ ہم تو وقت کو اس طرح مانتے ہیں کہ جیسے ہم گزرا ہوا کل کہتے ہیں وہ یہ تھا کہ آج سورج ابھی نہیں نکلا تو اُس سے پہلے رات تھی اور اس سے پہلے دن تھا۔ تو ہم نے تو تقسیم کر دیا کہ سورج غروب ہونے تک کل کا دن ہو گیا، کہیں ہم نے کہا کہ رات بارہ بجے سے دوسرا دن شروع ہوا، ہمارے ہاں سورج نکلنے کے بعد دوسرا دن شروع ہوا، پھر یہ جو اگلا دن ہے اس کا ہم نے کچھ نام رکھا، اس کی کچھ تاریخ رکھی۔ تو یہ ہے کہ یہ الگ الگ نظر آتا ہے کہ کل الگ، آج کا دن الگ۔ ان سائنسدانوں نے یہ کہا کہ یہ چیزیں جتنی بھی ہیں یہ تو ہم نے گز کے اوپر گرہوں کے نشان لگا رکھے ہیں، ہم نے اپنی آسانی کے لیے ماپنے کے لیے وہ نشان لگا رکھے ہیں۔ یہ وقت کا جو گز ہے اُس کے اوپر ہم نے دن اور رات کے نشانات لگا رکھے ہیں۔ درحقیقت یہ اس طرح سے تقسیم ہوا نہیں ہے۔ یہ برگسان (1859-1941ء) کی تھیوری (نظریہ) ہے۔ آئن اسٹائن (1879-1955) نے آکر پھر اس کو Prove (ثابت) کیا۔ یہ اس دور کی بڑی بلند تھیوری (نظریہ) گنی جاتی ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ یہ الگ الگ نہیں ہیں، جنہیں آپ دن اور رات کہتے ہو یہ تو تم نے (وقت کے گز پر گرہوں کے) نشان لگا رکھے ہیں۔

یہ پوری کائنات ایک نفسِ واحد کی مانند ہے

عزیزانِ من! قرآنِ اِلَّا كُنْفُسٍ وَاٰیٰتِہٖ (31:28) کہنے کے بعد یہ بات اُس بدو کو بھی اور آئن اسٹائن کو بھی سمجھا رہا ہے۔ کہا کہ الم تر (31:29) کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ الم تر اَنّ اللّٰہ یُوَلِّی الْقِبْلَۃَ فِی النَّعَارِی وَ یُوَلِّی النَّعَارِی فِی الْاٰیِل (31:29) یہ دن اور رات جو تم دیکھتے ہو تو یہ نہیں ہوتا کہ جو دن ہے وہ اتنا سا ہوتا ہے اور وہ کہیں چلا جاتا ہے پھر ایک مسماۃ رات ہوتی ہے اور وہ کہیں سے یوں ابھر آتی ہے پھر وہ کہیں چلی جاتی ہے پھر یہ دن ہوتا ہے اور یہ کہیں سے آ جاتا ہے۔ الم تر اَکٰیہ لفظ ایسے ہوتا ہے کہ کبھی آپ نے دیکھا ہے کہ یہ سایہ کس طرح سے بڑھتا ہے، یہ دھوپ کس طرح سے گھٹتی ہے، کہاں جاتی ہے؟ یہ سایہ جو اس طرح سے بڑھ رہا ہوتا ہے تو یہ دھوپ کہاں جاتی ہے اور جب دھوپ آرہی ہوتی ہے تو یہ سایہ کہاں چلا جا رہا ہوتا ہے؟ ہمارے نزدیک روشنی اور سایہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہ جو دھوپ یا روشنی آرہی ہوتی ہے اور سایہ کہیں جا رہا ہوتا ہے تو نہ وہ آرہی ہوتی ہے اور نہ وہ جا رہا ہوتا ہے۔ ایسی چیز جو اس طرح کسی کے اندر داخل ہو جائے کہ وہ درحقیقت داخل نہ ہو اور ہمیں داخل ہوتی نظر آئے اُس کے لیے و لٰج کا لفظ آتا ہے۔ کہتا ہے دن اور رات میں نہ وہ جاتا ہے اور نہ وہ آتی ہے بلکہ وہ یوں ایک دوسرے کے اندر جاتے ہیں کہ تمہیں نظر آتا ہے کہ جیسے آ جا رہے ہیں۔

یہ کائنات بھی ایک وقت تک کے لیے ہے اور خدا کا قانون الحق ہے

عزیزانِ من! ان لفظوں پہ برگسان (1859-1941) جھوم اٹھا تھا کہ یہ قرآن کے الفاظ ہیں۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ سورج غروب ہو گیا جبکہ وہ تو کہیں غروب ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو ہماری آنکھیں ہیں جو وہاں تک اُس کو دیکھ رہی ہوتی ہیں وہ ہماری بینائی کی حد ہے۔ وہ ذرا سا Curve (خط منحنی) کے نیچے جاتا ہے تو اُدھر والی جو آنکھیں ہیں وہ تو اُس کو دیکھ رہی ہوتی ہیں وہ تو اُسی طرح سے ہوتا ہے یہ کہیں جاتا نہیں ہے کہیں آتا نہیں ہے یہ تو بس **يُولِجُ اللَّيْلُ فِي النَّهَارِ وَ يُولِجُ النَّهَارُ فِي اللَّيْلِ** (31:29) ہے۔ وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کیا کہہ گیا ہے۔ یہ سمجھانے کے لیے کہ یہ اختلافات تمہاری نگاہ کے پیدا کردہ ہیں یا تم نے سمجھنے کے لیے یہ پیدا کر رکھے ہیں ورنہ یہ ایک نفسِ واحدہ کی طرح ہے۔ درخت کی پتیاں تمہیں الگ الگ نظر آتی ہیں۔ خزاں کے موسم میں کوئی پتی نہیں ہوتی، بہا ر آتی ہے تو پھر تمہیں ایسا نظر آتا ہے کہ ایک ایک پتی الگ الگ نکل رہی ہوتی ہے جبکہ وہ پورا درخت One Unit (ایک وحدت) ہوتا ہے۔ دن اور رات یعنی جسے ٹائم (زماں) کہتے ہیں یہ ہمارے ہاں اس وقت فلسفے اور سائنس میں بڑا ہی اہم مسئلہ ہے کہ یہ الگ الگ چیز نہیں ہے **وَسْتَظَرِ الشَّمْسُ وَ النَّقَّارَ** (31:29) اور اس کے اندر جواتنے اتنے عظیم الشان کُڑے ہیں وہ بغیر عمد ترو نہا (13:2) ہیں یعنی بغیر کسی ایسے ستون کے ہیں جنہیں تم کسی طرح سے آنکھوں سے دیکھ نہ سکو وہ اس یہ نہ دیکھے جانے والی کشش سے چلے جا رہے ہیں۔

عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے افلاک کا بطلموسی نظام (Ptolemaic System) تھا اور یہ جو چلنا (Motion) کا تصور تھا، یہ ان کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا وہ زمین کو ساکن مانتے تھے، گھومنے والی مانتے ہی نہیں تھے وہ چپٹی مانتے تھے، گول مانتے ہی نہیں تھے۔ یہ قرآن کے نزول کا وہ دور ہے جہاں وہ یہ کہہ رہا ہے کہ **سَخَّرَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرَ لِّ يَجْرِيَ لِيْ اَجَلٍ مُّسَمًّى** ^① (31:29)۔ یہ ساکن نہیں ہیں یہ سب چل رہے ہیں۔ اس سے یہ ہوا کہ کیا یہ ہمیشہ کے لیے یہ کچھ ہوگا؟ کیا یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی طرح چلتے رہیں گے؟ یہ بھی آپ کے ہاں ایک بہت بڑا مسئلہ آ گیا ہوا ہے۔ اب تو ان مناظروں کی اہمیت نہیں رہی لیکن ہمارے بچپن کے زمانے میں ان کو بڑی اہمیت تھی۔ آریہ سماج مادے کو قدیم مانتی تھی۔ اس پہ بڑے مناظرے ہوا کرتے تھے۔ آج پوری سائنس اس پر آ رہی ہے کہ اسکے اندر Eternity (ابدیت) ہو ہی نہیں سکتی۔ آج تو مادے (Matter) کے وجود سے ہی انکار ہو رہا ہے اب تو صرف Energy (توانائی) (توانائی)

① جو احباب اس موضوع پہ دل چسپی رکھتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب بڑی ہی کارآمد اور پرازمعلومات ہے۔

Hewking, Stephen W. (1989). A Brief History of Time from the Big Bang to Black Holes.

Toronto: Bantam Books.

② چاند اور سورج کو مسخر کر رکھا ہے۔ ان میں سے ہر ایک ایک معیار مقررہ تک کے لیے برابر چلا جا رہا ہے (13:2)۔ (پرویز: مفہوم القرآن ص 952)

پہ آگئے ہیں^①۔ لیکن بہر حال قرآن نے یہ جو کہا ہے کہ **كُلَّ يَجْزِيًا** (31:29) یہ سب چلے جا رہے ہیں مگر **إِلَّا أَجَلٍ مُّسَمًّى** (31:29) ہیں ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ ایک مدت کے لیے ہیں۔ کہا کہ **إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ** (31:29)۔ باتیں ہم باہر کی کر رہے ہیں، بتاتے ہیں یہ رہے ہیں کہ جس طرح سے ہمارا قانون وہاں کار فرما ہے اسی طرح تمہاری زندگی میں بھی کار فرما ہے۔ کائنات کی طرف مت دیکھو اپنے آپ کی طرف دیکھو، ہم تمہاری باتیں کر رہے ہیں۔ ہم یہ سب اس لیے کہہ رہے ہیں کہ **ثَلَاثَ بِلَاقِ الْاَلَةِ هُوَ الْحَقُّ** (31:30) الحق صرف خدا کی ذات ہے، صرف اُس کے قوانین ہیں، ابدیت انہی کو ہے، کسی اور شے کو نہیں ہے۔ جو نظریہ ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آجائے اُسے الحق کہتے ہیں۔ اور وہ الحق ہے یعنی اُس کا دیا ہوا ہر نظریہ ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے۔ **وَإِنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ تَوْبِهِ الْبَاطِلُ** (31:30) اُس کے سوا کوئی بھی تصور اپنے ذہن کے اندر لاؤ، وہ الحق نہیں ہو سکتا، وہ باطل ہوتا ہے، تخریبی ہوتا ہے، مٹ جانے والا ہوتا ہے۔ **وَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ** (31:30) اور وہ الحق تمہاری دنیا میں اُس صورت میں ثابت ہو سکتا ہے کہ تمہاری دنیا اور تمہاری زندگی کے اندر ”علو“ اور کبریائی یا جو حاکمیت اور اقتدار ہے، یہ صرف اُس کی ذات کا ہوگا۔ پھر وہ تمہاری دنیا میں الحق بن کر آجائے گا۔ اور اس کے ان قوانین کے علاوہ کسی اور کے قوانین کو بھی لؤ، وہ باطل ہونگے، مٹ جانے والے ہونگے۔ تاریخ کے اوراق کو دیکھو کہ کتنے کتنے بڑے دسائیر بنائے گئے، ضوابط بنائے گئے، لوہے کی لائوں پہ کندہ کرائے گئے، پتھر کی چٹانوں پر کندہ کرائے گئے۔ وہ ان چٹانوں کے اوپر زمانہ قدیم کی یادگاریں بن کر رہ گئے لیکن قانون زندہ و باقی نہ رہا۔

① سر جیمز جنینس اپنی کتاب The Mysterious Universe (پراسرار کائنات) میں لکھتا ہے کہ یہ تمام مادی کائنات سوائے لہروں (Waves) کے اور کچھ نہیں۔ یہ لہریں دو قسم کی ہیں (1) محصور لہریں (Bottled up Waves) جنہیں ہم مادہ (Matter) کہتے ہیں اور (2) آزاد لہریں جنہیں روشنی (Light) کہا جاتا ہے۔ آئن اسٹائن (1879-1955) کے بقول مادہ چند مربوط حوادث (Inter-related Events) یا متحد خیالات (Condensed Thoughts) کا مجموعہ ہے۔ یہ شے (Thing) ہے ہی نہیں بلکہ عمل (Action) ہے یا حوادث (Events) کی عمارت، برٹینڈ رسل (1872-1970ء) نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ”مادہ (Matter) ایک سہل سا فارمولا ہے جسے اس لیے وضع کر لیا گیا ہے کہ کسی ”مادی“ حادثہ“ کے متعلق بتایا جاسکے کہ یہ کس طرح وقوع پذیر ہو گیا حالانکہ اسمیں مادہ کہیں ہوتا ہی نہیں اور Ouspensky (اوسپنسکی) (1878-1947) کے الفاظ میں یہ محض ایک Condition (حالت) ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں آدمی اندھا ہے تو یہ اندھا پن (Blindness) کوئی مادی شے نہیں بلکہ ایک Condition (حالت) ہوتی ہے۔ (ماخوذ از پرویز: انسان نے کیا سوچا؟ ادارہ طلوع اسلام، کراچی 1956ء، ص 50 تا 51)۔

خدا کے قانون کے الحق ہونے کے سلسلہ میں کشتی کی مثال

زندہ اور پائندہ قانون اُسی کا ہے جو ہمیشہ تک رہے گا۔ الحق وہ ہے اور اُس کے سوا جو بھی ہے وہ باطل ہے۔ یہ ہے **وَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ (31:30)**۔ آپ کو یاد ہے کہ قرآن کریم نے کشتی کی مثال دی تھی۔ کہا تھا کہ **الْم تَرَى أَنَّ الْفُلْكَ (31:31)** ذرا کشتی کو دیکھو تو سہی۔ ایک سوئی پانی میں ڈالو تو وہ سیدھی نیچے چلی جاتی ہے۔ ہزاروں ٹن وزن کا لوہے کا جہاز بط کی طرح پانی کے اوپر تیر رہا ہوتا ہے خالی جہاز نہیں بلکہ بھرا ہوا لدا ہوا ہوتا ہے۔ کہا کہ اگر ایک خاص پیمانے تک اس کا وزن ہو تو وہاں تک وہ تیرتا رہتا ہے تیرتا ہی نہیں رہتا بلکہ موجوں کے تلاطم میں ہچکولے بھی کھاتا ہے۔ اگر وہ وزن ہمارے قانون کے مطابق ہے تو تلاطم یا طوفان اس کا کچھ نہیں بگاڑتا، وہ موجوں کے ساتھ ہنستا کھیلتا ہوا چلا جاتا ہے۔ جو نہی تم نے اس کے وزن میں توازن میں ذرا بگاڑ پیدا کیا تو کہا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ کشتیاں کس طرح سے ڈوبتی ہیں۔ جتنی کشتیاں بھی ڈوبتی ہیں تو تحقیق کے بعد پتہ چلتا ہے کہ چودہ کی کشتی تھی لیکن اُس میں چالیس بٹھادیئے تھے ایک طرف زیادہ بیٹھ گئے تو یہ کیفیت پیدا ہو گئی۔ اُس نے کہا کہ تم تو روز دیکھتے ہو کہ ایسی چیز جو بظاہر محیر العقول نظر آتی ہے کہ لوہے کا جہاز سامان سے لدا ہوا طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے چلا جا رہا ہے بشرطیکہ وہ ہمارے قانون کے مطابق چل رہا ہو لیکن اگر اُس میں تم نے ذرا ادھر ادھر کچھ کیا تو آپ دیکھیے کہ وہ کس طرح سے ڈوبتا ہے۔ جہاز تو ایک طرف رہا، وہ بط جیسی کشتی ڈوب جاتی ہے۔ کہا کہ **تَجْرِىٰ فِى الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللَّهِ لِيَرِيَكُمْ مِنْ آيَاتِهِ (31:31)** بات تو ہم کشتی کی کرتے ہیں لیکن اس سے تمہاری توجہ ہم ایک اور بات کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ یہ جو تمام چیزیں ہیں کہ یہ کشتی کیوں اس طرح سے چلتی چلی جاتی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ قانون کے مطابق اگر اس میں وزن ہے تو وہ ڈولا نہیں کرتی بلکہ سیدھی چلتی جاتی ہے وہ طوفانوں میں بھی اسی طرح سے چلی جاتی ہے اُس میں استقامت ہوتی ہے۔

زندگی کی کشتی کو منزل مقصود تک پہنچانے کے لیے استقامت کے ساتھ خدا کے قانون کو اپنانا ہوتا ہے کہا کہ ہم بات تمہیں کشتی کی مثال سے سمجھا رہے ہیں اور یہ من آیتہ (31:31) ہے یعنی قانون خداوندی کی کار فرمائی ہر گوشے میں نظر آسکتی ہے۔ **إِنَّ فِىْ ذَلِكَ لَآيَاتٍ (31:31)** لیکن یہ آیات جو ہم نے کہی ہیں کہ جس سے تم کسی مقصد تک پہنچ جاؤ گے انہی کو نظر آسکتی ہیں **جَوَافٍ صَبَآرٍ شُكُورٍ (31:31)** ہیں۔ یعنی اس کے لیے بڑے استقامت کی ضرورت ہے۔ کشتی کو تلاطم انگیزیوں کے اندر

① خدا کے اس قانون کی روئے کشتیاں (اور بڑے بڑے جہاز) کس طرح اس کے پیدہ کردہ سامانِ زیست کو لیے سینہ بھر پرواں دواں چلے جاتے ہیں (پرویز: مفہوم القرآن ص 953)۔

سلامتی سے ساحل تک پہنچنے کے لیے بڑی ہی استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر وہ قانون کی پابندی ایک سیکنڈ کے لیے بھی چھوڑ دے تو وہ گھڑام سے ڈوب جاتی ہے اور اگر استقامت سے اُس کے مطابق چلتی چلی جائے تو شکور ہو جاتی ہے یعنی اُس کی محنتیں بار آور ہو جاتی ہے۔ ان باتوں کے اندر ان لوگوں کے لیے نشانات یعنی آیات ہیں جو اس قدر استقامت کے ساتھ ان چیزوں کو دیکھتے ہیں اور اس طرح سے اپنی روش زندگی رکھتے ہیں کہ حوادثِ زمانہ کے کتنے ہی طوفان کیوں نہ آئیں وہ ڈولتے نہیں ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ ان کے ہاں صبوراً اس پتھر کو کہتے تھے جو کشتی میں ایک طرف اس لیے رکھ دیتے تھے کہ اُس کا وزن برابر رہے اُس کا توازن قائم رکھنے کے لیے جو پتھر رکھا جاتا تھا اُس کو وہ صبر کہتے تھے۔ کہا کہ حوادثِ زمانہ سے جن کا توازن نہ بگڑے یہ ہیں جو شکور ہوتے ہیں اور ان کی محنتیں بار آور ہوتی ہیں۔ لیکن یہ قوانین خارجی کائنات میں ہوتے ہیں۔ کیا بات ہے کہنے والے کی! کہ

یا رب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ

با اضطراب موج سکونِ گہر بدہ

اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو نوازا تھا۔ کہتا ہے کہ طوفان آتے رہیں، تلاطم خیزیاں آتی رہیں، موج در موج اٹھتی چلی جائیں لیکن اُس سیپ کے اندر موتی کا جو سکون ہوتا ہے وہ قائم رہے۔

خدا کے قانون کو مسلسل زندگی بھر دھوکا دینے والوں کا انجام

کہا ہے کہ اس سینے میں اس قسم کا دل دیدے کہ حوادثِ ارض و سموات کی تلاطم خیزیوں میں یہ جو دل ہے وہ نہ ڈولے۔ یہ ہے جسے قرآن نے صبر کہا ہے کہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَبِّرُوا** (31:31)۔ وہ نہایت مستقل مزاجی سے فطرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کی اُن تھک محنت بھرپور نتائج مرتب کرتی ہے۔ یہ تو کشتی کی کیفیت ہے کہ اگر قانون کے مطابق اُس کا وزن ہے تو وہ چلے جا رہی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ جب جی چاہے اپنی روش میں تبدیلی پیدا کر لے۔ اگر ایسا ہو تو نظام کائنات ایک دن کے لیے بھی چل نہ سکے۔ اور دوسری طرف انسان ہے جو ایک اصول پر قائم ہی نہیں رہتا، ہر آن بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً تم کشتی والوں کی مثال کو لو۔ کشتی تو ایک اصول کے مطابق چلتی رہتی ہے اور ان میں بیٹھنے والے انسانوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ **وَإِذَا غَشِيَهُمْ مَوَاجٌ كَاسُطَاتٍ لَّهُ الْيَقِينُ** (31:32) اگر کہیں کشتی ہچکولے کھانے لگی اور دیکھا کہ ڈوبنے لگی ہے تو خدا کو پکار رہے ہیں: ”مولا بچالے، علی مولا بچالے“ بارہویں والے بچالے، پتہ نہیں کتنی جماعت والا ہے۔“

جب تنگ کیا تجھوں نے تو خدا یاد آیا

کہا کہ **فَلَمَّا نَجَّسْنَا إِلَى الْبَرِّ فِئْتَهُمْ مَّقْتَحِبَةً (31:32)** لیکن جب کشتی ساحل پہ پہنچ جاتی ہے ”تے کتھوں دا خدا“ تے کتھوں دیاں نذر نذر انیں^①۔ ”میراٹی کا نیل گم ہو گیا، پہلی قبر پہ گیا اور کہا کہ گیارہویں والے! اگر میرا نیل مل جاتا ہے تو میں گیارہ روپے کی نیاز دوں گا۔ آگے چلا گیا۔ سترہویں والا آگیا کہ میں سترہ کا نیاز دوں گا۔ نیاز ماننا چلا گیا۔ ایک نے کہا کہ ”یار! تیرا نیل تے اینیاں پیساں دا نہیں“ تے توں منتاں ڈیڑھ سو روپے دیاں من لیاں ہیکیاں۔ کہن لگا کہ سگئی ہتھ پے جان دے، ساریاں نوں دھوکا دیاں گا^②۔ ”یہاں کہا ہے کہ **فَلَمَّا نَجَّسْنَا إِلَى الْبَرِّ فِئْتَهُمْ مَّقْتَحِبَةً (31:32)** جب وہ بخیریت ساحل پر اتر آتے ہیں تو ان میں سے بعض کی کیفیت تو خیر پھر بھی ایسی ہوتی ہے کہ وہ میانہ روی اختیار کر لیتے ہیں لیکن باقی کھلے بندوں ہمارے قانون سے سرکشی برتنے لگتے ہیں۔ ان کے لیے کہا کہ **وَمَا يَجْعَلْ يَأْتِيَنَا إِلَّا كُلُّ خْتَارٍ كَفُورٍ (31:33)** لیکن یہ کچھ وہی لوگ کرتے ہیں جو محنت سے جی چراتے ہیں اور فریب کاری اور دغا بازی پر ان کا گزارہ ہوتا ہے اور اس طرح چاہتے ہیں کہ قوانین خداوندی پر پردے پڑ رہیں، وہ لوگوں کے سامنے آنے ہی نہ پائیں۔ پھر سن لیں، عزیزانِ من! کہ یہ کون لوگ ہیں جو پھر اس طرح سے انکار ہی نہیں بلکہ ہمارے قانون سے سرکشی برتنے لگ جاتے ہیں۔ ایک تو یہاں کفور آیا ہے۔ کفور کے معنی ہیں کہ ”جو کچھ بھی ہاتھ میں آئے وہ اُس کو ڈھانپ کے رکھے“۔ دوسرا لفظ ختار آیا ہے یہ ختار بڑی عجیب چیز ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ”مسلل دھوکا دیئے چلے جانے والا“۔ اس کے لیے تو ان کے ہاں بہت الفاظ ہیں لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی بھر دھوکا دے کر تھک جانے والا۔ کہتا ہے کہ اُسے ان قوانین پہ آنے سے موت پڑتی ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ لقمن کی آیت 32 تک آگئے 33 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے اور پھر آگے سورۃ السجدۃ شروع کر دیں گے۔

ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم

① کہاں کا خدا اور کہاں کی نیاز اور کہاں کے نذرانے!!

② اے یار! تمہارا نیل تو اتنی رقم کا نہیں ہے۔ تم نے تو 150 روپے کی نیاز دینے کا کہہ دیا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ بس نیل کی گردن میرے ہاتھ آنے دو، سب کو جل دے جاؤں گا۔

چھٹا باب: سورة لقمن (آیات 33 تا اختتام)



عزیزان من! آج نومبر 1979ء کی 16 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورة لقمن کی آیت 33 سے ہو رہا ہے:
(31:33)۔

کسی مشکل حالت میں خدا کو یاد کرنے یا اسے ماننے کی نوعیت

پچھلی آیت میں کہا یہ گیا تھا کہ لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ خدا پر ایمان کا دعویٰ بھی ہے لیکن اُس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ اگر کبھی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں تو پھر تو پوچھیے نہیں کہ کس خشوع و خضوع کے ساتھ خدا کی طرف جھکتے ہیں اُس کا نام لیتے ہیں نیازیں مانتے ہیں سب کچھ کرتے ہیں لیکن جو نبی وہ مصیبت رفع ہو جاتی ہے تو اُس کے بعد پھر کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ اُس نے کہا کہ خدا کا ماننا یہ نہیں ہے۔ قانون کی اطاعت تو ہر حال میں کی جانی چاہیے۔

خدا کو ماننے کے حقیقی معنی دراصل اس کے قانون کے مطابق چلنا ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ ماننے کا جو لفظ ہے اس سے انسان بڑی خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں یا میں خدا کا منکر نہیں ہوں۔ مانتا ہوں کے کیا معنی ہیں؟ ایک کہتا ہے کہ میں مانتا ہوں دوسرا کہتا ہے کہ میں نہیں مانتا تو دونوں میں کیا فرق ہے؟ ماننے کے معنی یہ ہیں کہ میں خدا کے قوانین کو زندگی کا ضابطہ تسلیم کرتا ہوں میں یہ مانتا ہوں میرا ایمان ہے کہ انہی کی اطاعت سے انسان اپنے نصب العین تک پہنچ سکتا ہے۔ خدا کا نہ ماننا یہ ہے کہ میں اُس کے احکام و قوانین کو صحیح نہیں مانتا اور میں اُس کے مطابق چلنا نہیں چاہتا تو

یہ دونوں میں فرق ہو گیا۔ خدا کے قوانین کے ماننے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا ہر عمل، ہر کام، ہر ارادہ، ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے اور وہ اٹل ہوتا ہے، وہ اُن مٹ ہوتا ہے۔ اس کا یہ قانون ہے کہ سکھایا کھانے سے ہلاکت ہو جاتی ہے تو قانون کے ماننے کے بھی یہ معنی ہیں کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ اس قانون کی اطاعت کا یہ نتیجہ نکلے گا اور وہ میرے حق میں یوں تعمیری اور خوشگوار ہوگا۔ اس کے انکار کے معنی یہ ہیں کہ اگر میں اُس کے خلاف چلوں گا، اُس سے سرکشی برتوں گا تو اُس کا نتیجہ میرے حق میں تخریبی ہوگا اور مجھے اُس کا نقصان ہوگا۔ یہ خدا کی بات نہیں انسان کی اپنی بات ہے۔ اُس سے یہ ہوتا ہے۔ اگر کسی کا اس پر یقین ہے کہ اُس کے قوانین کی خلاف ورزی سے میرا یہ نقصان ہوگا تو پھر وہ اس چیز سے احتیاط برتے گا کہ وہ اُس کے خلاف نہ چلے کیونکہ ہر صاحب ہوش انسان اپنے نفع کی سوچتا ہے، نقصان کی نہیں سوچتا۔ یہ تو ہمارے ہاں عام طور پر کہتے ہیں کہ صاحب! یہ تو پاگل ہو گیا ہے کہ اس کو اپنے نفع و نقصان کا بھی خیال نہیں رہتا یعنی جسے اپنے نفع و نقصان کا خیال نہ رہے تو دنیا اُسے پاگل کہتی ہے۔

انسانی زندگی کے لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا قانون پوری نوعِ انسانی کے لیے ہوتا ہے

یہاں خدا کے ماننے یا نہ ماننے کے معنی یہ ہیں کہ میں اگر اُس کے قوانین کے خلاف چلوں گا تو میرا نقصان ہوگا، اُس کے مطابق چلوں گا تو میرا فائدہ ہوگا اور یہ ایک اٹل حقیقت ہے جس کے خلاف ہو نہیں سکتا، میں اس سے بچ نہیں سکتا۔ بچھلی آیت کے تسلسل میں یہ کہا کہ **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ وَأَخْشَوْا يَوْمًا لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَلِيِّهِ وَلَا مَوْلًى شَيْئًا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ** (31:33)۔ یہ قوانین ساری انسانیت کے لیے ہیں، اُس لیے یہاں ساری نوعِ انسانی کو مخاطب کیا گیا ہے، ان میں سے مومن وہ ہوں گے جو ان قوانین کی صداقت اور حقانیت پر یقین رکھتے ہیں اور جو اس کے خلاف جاتے ہیں وہ ہیں جنہیں آپ غیر مومن یا کافر کہیں گے لیکن یہ قوانین ساری انسانیت کے لیے ہیں۔ جس طرح کہ سکھایا ایک مسلمان کھائے یا ایک ہندو کھائے تو اُس کا نتیجہ یکساں ہوتا ہے۔ یہ پوری انسانیت کے لیے ہیں۔ اسی لیے یہاں **يَا أَيُّهَا النَّاسُ** کہہ کر مخاطب کیا ہے کہ یہ پوری انسانیت کے لیے ضابطہ قوانین ہیں۔ یہ جنہیں آپ **Physical Laws** (طبی قوانین) کہتے ہیں، جو طبی زندگی سے متعلق ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ انسانوں کے لیے ہوتے ہیں۔ اسی لیے **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ** (31:33)۔ یہ اتقوا، تقویٰ سے ہے۔

متقی اور تقویٰ کا حقیقی مفہوم

اُس دن میں نے عرض کیا تھا کہ سورۃ البقرہ کی جو دوسری آیت میں **هُتَّىٰ لِلْعَتَّاقِينَ** (2:2) ہے، اُس میں ہمارے تصور کی رو سے تو متقی کا تصور یہی ہے کہ وہ خدا کی عبادت کرنے والا ہے، خدا کے احکام ماننے والا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس سے تو اعتراض پڑتا ہے

کہ جو پہلے ہی متقی ہے، صحیح راستے پہ چل رہا ہے تو اس کے لیے ہدایت اور راہنمائی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہدایت دینے کی ضرورت تو غیر متقیوں کو ہے جو پہلے سے متقی ہے اُس کو ہدایت دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ متقی کا ہمارا تصور ہے لیکن عربی زبان اور قرآن کی رو سے تقویٰ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ”راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنے والا۔“ جو چاہتا ہے کہ زندگی کے راستے کی خطرناک نقصان دہ گھاٹیوں سے بچ کر چلوں وہ متقی ہے اور اُسے یہ کتاب بتائے گی کہ راستہ کونسا ہے جس میں خطرات نہیں آتے۔ بات صاف ہو گئی اور جو یوں بچ کر چلنا ہی نہیں چاہتا جیسا میں نے کہا تھا کہ جو خودکشی کرنے کے لیے دریابہ جاتا ہے اُسے کہنا کہ آگے نہ جانا وہاں پانی گہرا ہے وہ تمہیں ڈبو دے گا تو وہ تو گیا ہی ڈوبنے کے لیے ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ** (31:33) اس کی احتیاط برتو ایسا راستہ نہ اختیار کرو جس میں خطرات ہوں اور اُس میں تمہارا نقصان ہو جائے۔ یہاں پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس کی احتیاط برتو اور ایسا راستہ اختیار نہ کرو جس میں خطرناک گھاٹیاں ہوں۔

خدا کے خشیت و خوف سے ڈرنے کا تصور قرآنی تعلیم کی روشنی میں

اگلی چیز ہے کہ **وَإِخْشَاؤُا يَوْمًا لَا يَجْزِي** (31:33)۔ یہاں **وَإِخْشَاؤُا** آیا ہے۔ **وَإِخْشَاؤُا** تو عموماً خوف کو کہتے ہیں مگر خوف تو عام لفظ ہے دوسرا لفظ خشیت کا ہوتا ہے خشیت باری تعالیٰ بھی ہمارے ہاں بولتے ہیں۔ اس کے معنی بھی ڈرنے کے کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں عام تصور یہ ہے کہ خدا سے ڈرو اور خدا سے ڈرو کا لفظ تو صبح سے شام تک ہم بولتے ہیں۔ وہ مومنوں کے متعلق کہتا ہے کہ مومن وہ ہیں کہ **لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ** (2:277) ان کو خوف ہوتا ہی نہیں ہے۔ وہ جو پھر یہ خوف بتا رہے ہیں خواہ وہ خوف خدا ہی کا کیوں نہ ہو وہ تو پھر بڑا ہی سخت قسم کا خوف ہوتا ہے۔ جہاں اور کوئی خوف کام نہ دے تو وہاں یہ کہتے ہیں ”میاں! خدا توں تے ڈر۔“ خدا کہتا ہے کہ مومن کا منتہا یہ ہے کہ **لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ** (2:277) خوف اور تو رہا ایک طرف حزن بھی نہیں ہوگا وہاں دل کی افسردگی بھی نہیں ہوگی۔ جہاں ہر بات قاعدے قانون کے مطابق ہو تو وہاں ڈرنے کی بات نہیں وہاں احتیاط کی بات ہے۔

اصل بات تو مکافاتِ عمل کی ہوتی ہے ڈر نہیں ہوتا

ڈرا تو مستبد حاکم سے جاتا ہے۔ ڈرو اس سے کہ اگر تم نے سکھیا کھایا تو ہلاک ہو جاؤ گے ڈرو اس سے کہ اگر آگ میں ہاتھ ڈالا تو ہاتھ جل جائے گا ڈرو اپنے اس عمل کے نتیجے سے۔ جسے خدا کا خوف کہتے ہیں وہ خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کے جو تباہ کن نتائج ہوتے ہیں ان کے احساس اور احتیاج کا نام ہوتا ہے۔ وہ ڈرنا نہیں ہوتا ڈر سے تو انسانیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ احتیاط ہے یہ تو خشیت کا لفظ ہے۔

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن سمجھنا ہے تو قرآن کے یہ جو مفردات (Derivatives) میں یہ جو الفاظ ہیں ان کے بنیادی معنی پہلے سمجھیے کہ مادے (Root) کے اعتبار سے عربوں کے ہاں اس کا کیا Concept (تصور) تھا۔ وہ عجیب و غریب قوم تھی، عجیب زبان تھی جو بنائی ہے! قرآن کی حامل یہی زبان ہو سکتی تھی۔

خشیت کا قرآنی مفہوم

یہ خشیت کیا چیز ہوتی ہے کہ جس سے احتیاط برتنے کا کہا ہے؟ عربوں کے ہاں پانی نایاب چیز ہے، کہیں کہیں چشمہ اور چشمے کے کنارے پہ کوئی نخلستان تھا اور وہیں کوئی کھیتی ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں بھی اگر کوئی کسان بڑی محنت سے اپنی کھیتی بوئے، احتیاط برتے اور وہ خشک ہو جائے تو کتنا بڑا نقصان ہے۔ عربوں کے ہاں خشیت اس کو کہتے تھے کہ ہرے بھرے درخت اور سرسبز کھیتی کا اس طرح خشک ہو جانا کہ پھر اُس کے بعد سرسبز ہی نہ ہو۔ کہا کہ اس کی احتیاط برتو، ایسا چلن اختیار نہ کرو کہ تمہاری ہری بھری کھیتیاں اس طرح سے خشک ہو جائیں کہ پھر وہ سرسبز ہو ہی نہ سکیں۔ اگر آپ اسے ڈر کہنا چاہتے ہیں تو سوچ لیجیے یہ اپنے اُس ہونے والے نقصان کا احساس ہے اور اُس کسان یا زمیندار کے لیے اس سے بڑی چیز کیا ہے کہ اتنی محنت کی، اتنی قیمت کا بیج ڈالا، اتنا وقت صرف کیا اور اُس کے بعد کسی بے احتیاطی یا کسی اور وجہ سے کھیتی خشک ہو جائے اور ایسی خشک ہو جائے کہ پھر ہری بھری نہ ہو تو اسے خشیت کہتے ہیں۔ کہا کہ **وَإِخْشَاؤُا يَوْمًا** (31:33) اُس حادثے سے محتاط رہو، احتیاط برتو۔

اعمالِ انسانی کے ظہورِ نتائج کے وقت کو قرآنِ حکیم نے یوم بھی کہا ہے

یوم کے معنی تو دن ہوتا ہے لیکن عربی زبان میں یہ دن ہی نہیں ہوتا بلکہ کسی بات کی نمود کا جو وقت ہوتا ہے وہ بھی یوم ہوتا ہے اور ہزار ہزار پچاس پچاس ہزار سال کا جو مرحلہ ہوتا ہے جسے آپ ٹائم (زمان) کی Age (عمر) کہتے ہیں وہ بھی عربی زبان میں یوم ہی کہلاتی ہے۔ اُس وقت سے ڈرو جو تمہارے اعمال کے نتائج کو محسوس طور پہ سامنے لے آئے۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ اعمال تو بہت پہلے سے نتیجہ خیز ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ ہر عمل جب سرزد ہوتا ہے تو اپنا نتیجہ مرتب کرنا شروع کر دیتا ہے۔ پہلی Stages (منازل) وہ ہوتی ہیں جن میں وہ غائب ہوتا ہے یعنی تمہاری نگاہوں کے سامنے نہیں آتا، محسوس شکل میں نہیں آتا لیکن وہ بن رہا ہوتا ہے۔ اگر تم اس درمیان میں اُس کا ازالہ کر لو، اُس کی تدبیر کر لو، اُس کا علاج کر لو تو وہ رک جاتا ہے۔ اگر یہ نہ کرو تو بڑھتا چلا جاتا ہے اور بڑھتے بڑھتے پھر وہ وقت آ جاتا ہے جب وہ محسوس شکل میں تمہارے سامنے آ جاتا ہے۔ درد شروع ہو جاتا ہے، بخار حرارت کی شکل میں سامنے آ جاتا ہے۔ یہ فوری طور پہ نہیں آتا۔ ڈاکٹر تمہیں بتاتا ہے کہ میاں! یہ تو اتنے عرصے سے شروع ہوا تھا، تم نے لا پرواہی برتی اور تم اسے یہاں اس اسٹیج پہ آج لے آئے ہو۔ یہ جو کسی عمل کے محسوس شکل میں نمودار ہونے کی اسٹیج ہوتی ہے یہ ہے جسے **يَوْمًا لَا يَجْرِي وَالْتَّ عَنْ وَلَدِهِ وَلَا**

مَوْلُودٌ هُوَ جَارٍ عَنِ وَالِدِهِ شَيْئًا (31:33) کہا ہے یعنی یہ حالت کہ کوئی کسی کے کام نہ آ سکے نہ باپ بیٹے کے کسی کام آ سکے اور نہ بیٹا باپ کا ہاتھ بٹا سکے۔

انسان کے لیے اس کی انفرادیت کی اہمیت اور اس کی کیفیت

قرآن کی رو سے اب یہاں انفرادیت (Individuality) شروع ہوتی ہے۔ اسے ذہن میں رکھیے کہ یہ جو انفرادیت ہے یہی ہے جس کا نام انسان ہے۔ ہر فرد Individual (منفرد) ہوتا ہے اپنے عمل کا آپ ذمہ دار ہوتا ہے اور اُسی کو اُس کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ جو آگ میں انگلی ڈالتا ہے اُس کا درد اُسی فرد کو ہوتا ہے۔ ماں باپ بہن بھائی کتنے ہی اُس کے ارد گرد کیوں نہ ہوں؛ بلائیں لے لیں؛ ”بھائیوں ماں اودھ بے صدقے واری جاوے“^①۔ گلے سے لگائے سب کچھ کرے لیکن اُس کا درد اُسی کو ہوتا ہے۔ علاج کیا جائے گا تو اُس درد کو فاقہ ہوگا، شفا ہوگی۔ وہ بھی اُسی کو کرنا ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ انگلی اُس کی جلے علاج ماں اپنا کرائے اور آرام اُس کو ہو جائے۔ ماں بچے کی قریب ترین ہمدرد ہوتی ہے وہ اُس کے درد کے احساس سے تڑپ رہی ہوتی ہے لیکن درد اُس کا نہیں بٹا سکتی علاج بھی اُسی کا ہی ہوگا کسی دوسرے کا نہیں ہوگا۔ اسے Individuality (انفرادیت) کہتے ہیں۔ سائیکولوجی (علم نفسیات) پھر پھر کر دو اڑھائی ہزار سال کے بعد اس پوائنٹ (نکتے) کے اوپر آئی ہے کہ ہر فرد ایک الگ Individual (فرد) ہوتا ہے اُس کی Individuality (انفرادیت) اُس کی فردیت ہوتی ہے۔ جسے آپ ”میں“^② کہتے ہیں تو ہر فرد الگ ”میں“ ہوتا ہے اور قرآن نے جب یہ کہا ہے کہ تم یہاں جتنے جی کرے جتھے بناؤ لیکن ہمارے پاس آؤ گے تو وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فَرْدًا (6:94) تم اپنی Individuality (فردیت) لے کر آؤ گے۔ کہا ہے کہ اُس وقت کی احتیاط برتو جب تمہارے یہ اعمال جو اس وقت غیر محسوس نتائج مرتب کر رہے ہیں اُس وقت ان کا نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آ جائے گا۔ اُس وقت یاد رکھو کہ نہ باپ بیٹے کے کام آ سکے گا نہ بیٹا باپ کے کام آ سکے گا۔ قریب ترین جو رشتہ تھا وہ بتا دیا کہ اس میں کوئی اُس درد کو بٹا نہیں سکے گا۔ احساس کرو اس چیز کا کہ ہری بھری کھیتیاں خشک ہو جائیں گی اور کوئی کسی دوسرے کا درد نہیں بٹا سکے گا۔

خدا کا وعدہ دراصل خدا کا وہ اٹل قانون ہوتا ہے جو کبھی اپنا نتیجہ نہیں بدلتا

کہا ہے کہ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ (31:33) یہ جو قانون ہم بتا رہے ہیں یہ خدا کا وعدہ ہے۔ خدا کا وعدہ یہ ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ ایسا ہوگا یا ہم ایسا کریں گے تو یہ قانون خداوندی ہے۔ یاد رکھیے! اگر ہنگامی طور پر کوئی ایسی بات کہے تو وہ حکم ہوتا ہے لیکن وہی حکم اگر مسلسل

① خواہ ماں اس کے صدقے واری جائے قربان ہو ہو جائے۔

② I- am- ness

متواتر اسی شکل کے اندر قائم رہے تو وہ قانون ہوتا ہے۔ حکم احکام جسے آپ کہتے ہیں وہ عام طور پر بادشاہت میں یا ملکیت میں آتا ہے کہ اب یہ حکم دیدیا دوسرے وقت میں دوسرا حکم دیدیا وہ بدلتا رہتا ہے۔ قانون بدلتا نہیں ہے۔ یہ قانون ہے کہ سکھیا کھاؤ گے تو ہلاکت ہوگی۔ اسی کو الحاق کہا ہے کہ یاد رکھو! وہ قوانین خداوندی حقیقت ہیں وہ Reality (حقیقت) میں ایسے ہیں وہ ہو کر رہے گا وہ اٹل ہیں غیر متبدل ہیں۔ ہم جو کہہ رہے ہیں تو یونہی تمہیں ڈرانے کے لیے نہیں کہہ رہے بلکہ یہ یقینی چیز ہے۔ ان قوانین کی خلاف ورزی کرو گے تو ہری بھری کھیتیاں بھی خشک ہو جائیں گی۔

کسی بات کو واضح انداز میں بیان کرنے کا قرآنی طریق

قرآن ایک چیز کو اُس کے تضاد سے (By Juxtaposition) واضح کرتا ہے اور یہ بھی آج فلسفہ بنا ہے کہ کسی چیز کے تضاد سے کسی چیز کو زیادہ واضح کرنا۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ یہاں قوانین کی خلاف ورزی سے کھیتوں کے خشک ہونے کا کہا ہے اور (14:24) میں اس کے متضاد اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ (14:24) کہا ہے کہ ذرا غور کرو کہ خدا کس طرح مثال دے کر تمہیں بات سمجھاتا ہے۔ یہ ایسی بنیادی چیز ہے کہ اس سے پورا اسلام سامنے آ جاتا ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ (14:24)۔ بنیادی چیز زندگی کا نظریہ ہوتا ہے Concept of Life (تصورِ حیات) ہوتا ہے آئیڈیالوجی ہوتی ہے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں کلمہ کہتے ہیں اور لفظ کلمہ تو ہم روز دہراتے رہتے ہیں مثلاً کلمہ طیبہ لیکن کیا کبھی ذہن میں آیا ہے کہ یہ ہے کیا جو ہم کہتے ہیں؟

کلمہ طیبہ اسلام کی ایک ایسی آئیڈیالوجی ہے جس کی کوئی مثل ہی نہیں

یہ کلمہ نظریہ حیات ہے یہی آئیڈیالوجی ہے۔ یہاں اُس نے کہا ہے کہ جو کلمہ طیبہ ہے اُس کی مثال یہ ہے۔ طیب کے معنی پھل دیدینے والا درخت ہوتا ہے خبیث وہ ہوتا ہے جو درخت پھل نہیں دیتا۔ یہ کلمہ طیبہ جو ہم کہتے ہیں وہ یہ ہے: لا اله الا الله محمد رسول الله۔ اس تصور یا اس آئیڈیالوجی کو جو آپ طیبہ کہتے ہیں تو کیا کبھی اس کا پھل بھی آپ نے آج تک دیکھا ہے؟ اُس کلمہ کا مفہوم ہی ہمارے سامنے نہیں ہوتا تو اُس کا پھل ہمارے سامنے کیا آئے گا۔ کہا ہے کہ كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ (14:24) طیب آئیڈیالوجی کی مثال ایک طیب درخت کی طرح ہے۔ اب جب درخت کے لیے طیب کا لفظ آ گیا تو وہ بات سمجھ میں آ گئی کہ عرب کس درخت کو طیب کہتے تھے۔ یہاں قرآن نے آگے خود بتا دیا ہے کہ طیب درخت کونسا ہوتا ہے۔ کہا کہ اَصْلًا ثَابِتًا (14:24) اُس کی جڑیں زمین میں پاتال تک گئی ہوئی ہوتی ہے اُس کی جڑیں اس قدر محکم ہوتی ہے کہ تیز سے تیز جھکڑ بھی اُس کو وہاں سے اکھیڑ نہیں سکتا۔ یہ ہے قرآن کا دیا ہوا نظریہ حیات۔ آگے کہا کہ اَصْلًا ثَابِتًا وَفَرْعًا فِي السَّمَاءِ (14:24) شاخیں اس کی آسمان میں جھولے

جھول رہی ہوتی ہیں۔ ارض کے اندر مستحکم ہے یعنی اس مادی زندگی کے اندر اُس کی جڑیں ہوتی ہیں اور اُس کی جو پھل لانے والی شاخیں ہوتی ہیں وہ سماء کے اندر ہوتی ہیں۔ اگر ارض کے اندر ہی رہے زمین گیر ہی رہے تو وہ نظریہ زندگی قرآنی نہیں ہے۔ اُس کی شاخوں کو سماء یعنی بلندیوں کی طرف جانا چاہیے۔ شجر طیب کا نتیجہ یہ ہے کہ **تَوْتَجِ اُكْلًا** (14:25) وہ اپنا پھل دیتا ہے **كُلَّ حَبٍ يَابِثٍ رَّيْبًا** (14:25) رب کے قانون کے مطابق نشوونما دینے والے کے قانون کے مطابق وہ اپنا پھل دیتا ہے اور ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے اپنے پمفلٹ^① میں لکھا تھا کہ اسلام چلا ہوا کارتوس کبھی نہیں ہوتا یہ ہر موسم میں پھل دیتا ہے اس میں پھل دینے کی صلاحیت ہے یہ کبھی شجر خبیث نہیں ہوتا۔ ابھی میں عرض کروں گا کہ یہ کس طرح سے پھل دیتا ہے یعنی خود بخود دیئے جائے گا یا خود ہمیں بھی کچھ کرنا ہوتا ہے؟ یہ بات آگے آئے گی۔ اُس نے یہ کہا کہ یہ تو خدا کے قوانین کے مطابق جو زندگی آپ بسر کریں گے خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی نظام کے تابع ہو وہ اُس آئیڈیالوجی کے مطابق ہوگی جس کی مثال اُس درخت طیب کی ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہیں بے حد مضبوط ہیں اور اُس کی شاخیں بلندیوں کی طرف خدا کی طرف چلی جا رہی ہیں وہ ہر موسم میں اپنا پھل دیتا ہے اور اگر اُس کے خلاف جاؤ گے تو سنو! **وَاصْصَبُوا** (31:33) ہری بھری کھیتیاں بھی خشک ہو جائیں گی۔ آپ نے دیکھا کہ اُس نے تضاد سے کس طرح معنی سمجھائے ہیں اسی لیے کہا کہ **اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ** (31:33) یہ ایک حقیقت ہے یاد رکھو! ایسا ہوتا ہی ہے اور ایسا ہی ہوگا۔

انسان ہمیشہ مفادِ عاجلہ سے دھوکا کھاتا ہے

اب کون سی چیز ہے جو انسان کو اس سے بہکاتی ہے؟ کہا کہ **فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الدُّنْيَا** (31:33) یہ دنیاوی زندگی کے قریبی مفاد ہیں جو انسان کو دھوکا دے دیتے ہیں۔ شیطان کے متعلق قرآن نے کہا ہی یہ ہے کہ تمہارے سوائے عمل کو تمہاری غلط باتوں کو یہ خوشنما بنا کر دکھاتا ہے۔ اگر وہ باتیں اُسی شکل میں انسان کے سامنے آ جائیں جیسی وہ ہیں تو پھر انسان دھوکا نہیں کھاتا۔ یہ تو مقدس نگاہ فریب نقاب ہوتا ہے جس سے انسان دھوکا کھاتا ہے وہ انہیں مزین بنا کر دکھاتا ہے۔ ہر بات اپنے فائدے کے لیے کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارے فائدے کے لیے میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں میں تو تمہارے فائدے کے لیے اپنی جان مار رہا ہوں۔ وہ پھر اس کو تمہارے لیے مزین بناتا ہے کہ اس میں تمہارے لیے یہ فائدہ ہے یہ فائدہ ہے۔ یہ جو شیطان کا ان غلط چیزوں کو مزین بنانا ہے یہ ہے جسے کہا ہے کہ دھوکا دیتا ہے اس کے دھوکے میں نہ آ جانا۔ **وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللّٰهِ الْغُرُورُ** (31:33) دیکھنا!! دھوکے دینے والے بہت سے ہوں گے۔ ان کے دھوکے میں نہ آ جانا۔ **اِنَّ اللّٰهَ يَنْتَهِ عَنِ** (31:34) ہر حال میں یہ دیکھنا کہ خدا کا قانون کیا کہتا ہے کیونکہ وہ اٹل ہے وہ حق ہے جبکہ یہ

① اس پمفلٹ کا نام ہے: کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟

شیطان دھوکا دے رہا ہے دھوکے میں نہ آ جانا۔ یہ کہ ان غلط اعمال کے تباہ کن نتائج محسوس شکل میں کب سامنے آئیں گے قرآن نے اس کو ساعت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ گھڑی^① ہے جو ہم کہتے ہیں کہ خدا کرے بڑی گھڑی نہ آئے۔ ہمارے ہاں بھی یہ لفظ اسی کا ترجمہ کیا ہوا ہے۔ ویسے عربی زبان والے ماڈرن انگلش میں ساعت Watch (واج) کو بھی کہتے ہیں۔ الساعۃ یعنی وہ لمحہ وہ وقت جب یہ تباہی محسوس شکل میں سامنے آتی ہے اُسے الساعۃ کہتے ہیں۔

انسانی زندگی نظروں سے تو اوجھل ہوتی ہے مگر ختم نہیں ہوگی

عزیزانِ من! یہ اس دنیا میں بھی ہوتا ہے اور ویسے اس دنیا تو کہنا ہی نہیں چاہیے کیونکہ زندگی ایک جوئے رواں ہے۔ آپ اپنی پہچان کے لیے اس نہر کے نام رکھ لیجیے کہ مغل پورہ کی نہر گلبرگ کی نہر اور فیروز پور والی نہر مگر نہر نہ تو گلبرگ کی نہ مغلپورہ کی اور نہ فیروز پور کی ہوتی ہے۔ یہ تو محض پہچان کے لیے نام ہیں:

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود

زندگی تو مسلسل ہوتی ہے یہ زندگی اور آخرت کی زندگی دو زندگیاں نہیں ہیں۔ الساعۃ یہاں ہو تو یہاں وہ نتائج محسوس شکل میں سامنے آ جائیں اور اس کے بعد مستقبل میں آ جائیں تو بات تو ایک ہی ہے۔ مستقبل تو ہمارے پیمانے کے مطابق ہے۔ یہ وہی ہے جو میں نے کہا تھا کہ وقت کے گز کے اوپر ہم نے گرہیں لگائی ہوئی ہیں۔ زندگی کے گز میں تو گرہ ہوتی ہی نہیں ہے اس میں Future (مستقبل) کا تو سوال ہی نہیں ہوتا۔ الساعۃ وہ ہے کہ جب انسان کے اعمال اپنا نتیجہ غیر مرئی (Invisible) طور پر مرتب کر رہے تھے تو جب وہ نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آتا ہے تو وہ الساعۃ ہے۔ یہ الساعۃ تمہارے اعمال کے مطابق کب آئے گی؟ کہا کہ **إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ السَّاعَةَ** (31:34) اس کا علم خدا کے حساب کے مطابق ہوتا ہے اور اُسی کو اس کا علم ہوتا ہے۔ یہ چیز الساعۃ کے متعلق کہی تھی۔ یہ جو میں نے کہا ہے کہ آہستہ آہستہ وہ نتائج مرتب ہو رہے ہوتے ہیں اور اُس کے بعد ایک وقت آتا ہے کہ جب وہ محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں وہ الساعۃ ہے۔

نتائج مرتب ہونے کے سلسلہ میں دو محسوس مثالیں

اب آگے دو مثالیں ہیں۔ کہا ہے کہ **وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ (31:34)**۔ بارش کو دیکھیے۔ بارش بننا تو بہت پہلے سے شروع ہوا ہوتا ہے

① ”گھڑی کے اس تصور پر مفکر قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے بھی کیا خوب کہا ہے:

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے! (بانگ درا)

جب سورج کی تمازت یا گرمی یا حرارت سمندر سے بھاپ کی صورت میں کشید کر کے پانی اوپر لے جاتی ہے تو وہاں سے اس سلسلے کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ ایک پروسیس (عمل) ہے۔ اُس کے بعد وہ اوپر جاتی ہے پھر وہ بادل بنتی ہے پھر ہوائیں اڑاتی ہیں پھر جہاں ٹھنڈک اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ بھاپ پانی کی شکل اختیار کرتی ہے پانی ہوا سے زیادہ وزنی ہوتا ہے وہ نیچے گرتا ہے۔ کہا کہ یہ بارش جس وقت ہوتی ہے تو یہ اُسی وقت نہیں بن جاتی بلکہ یہ بہت پہلے سے بنی شروع ہوتی ہے۔ اب دوسری مثال لیجیے۔ کہا کہ **وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ** (31:34) رحم مادر کے اندر جنین ایک دن میں نہیں بن جاتا بلکہ وہ تو ایک اولیں جرثومے سے لے کر ایک پورے بچے کی شکل میں بڑی منازل طے کرتا ہے۔ تمہارے سامنے وہ جو بچہ جیتا جاگتا پیدا ہو کر آتا ہے تم تو اس وقت اس بچے کو دیکھ رہے ہوتے ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ کن منازل اور مراحل سے گزر کر یہ محسوس شکل اختیار کرتا ہے۔

آیت یَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے الجھاؤ اور ان کی حقیقت

اس **يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ** آیت کے متعلق ذرا آگے چل کر اسی درس میں بتاؤں گا کہ اس کی وجہ سے کتنے الجھاؤ پیدا کیے جا رہے ہیں، کتنی غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی ہیں۔ کہا ہے کہ **وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا** (31:34) کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا۔ اسی طرح کہا کہ **وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَعُودُ** (31:34) کوئی شخص نہیں جانتا کہ اُس کی موت کہاں واقع ہوگی۔ آگے کہا کہ **إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ** (31:34) خدا ہی ہے جو علیم بھی ہے اور خبیر بھی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس آیت کے متعلق کتنی غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی ہیں۔ اس آیت کے متعلق مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ خدا نے پانچ چیزیں ایسی گنائی ہیں جن کے متعلق کہا ہے کہ ان کا علم صرف خدا کو ہوتا ہے، کسی انسان کو اس کا علم نہیں ہو سکتا۔ اور وہ پانچ چیزیں یہ ہیں: (۱) علم الساعة (۲) بارش کب ہوگی، (۳) جنین، (۴) انسان کل کیا کرے گا، (۵) انسان کی موت کہاں واقع ہوگی؟ کہنے والے تو یہ کہہ کر چلے گئے لیکن ہمارے لیے ایک مشکل پیدا کر گئے۔ آج Scientific Discoveries (سائنسی انکشافات اور تحقیقات) یہاں تک پہنچی ہیں کہ بارش کا جو پروسیس (عمل) ہے یعنی سمندر سے بھاپ بن کر اڑنے سے لے کر آخر تک وہ انہوں نے کمپیوٹر کے ذریعہ سے Calculate (نکالنا) کرنا شروع کر دیا ہے اس سے Exact (صحیح) علم آ جاتا ہے۔ اور وہ تو اب بارش جہاں برسا نا مطلوب ہوتا ہے وہاں برسا بھی دیتے ہیں۔ وہاں تو دو مملکتوں کے درمیان جن کے بارڈر (سرحدیں) قریب قریب ہیں وہاں Theft of Rain (بارش کی چوری) کے مقدمات ہو رہے ہیں کہ ”میرا مینہ چرا کر لے گئے ہیں“۔ پنجابی میں جیسے کہتے ہیں کہ ”ایہہ ساڈا بدل اڑند کے لے گئے نیں۔ اے اگلے

مندیاں نوں پتہ اے کہ بسنت اچ اک تے گڈی کٹی جاندی سی تے اک اژند کے لے جاندے سن ❶۔ ”وہاں یہ چیز ہوتی ہے کہ ”ایہہ ساڈا بدل اژند کے لے گئے نیں“ ❷۔ یعنی میں نے کہا کہ وہاں یہ کیفیت ہے۔ جنین کے متعلق ان کے ہاں کی سائنس اب یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ رحم مادر کے اندر ذرا بچہ بنا شروع ہوتا ہے تو اُس کا سیکس (تذکیر) تک بتا دیتے ہیں کہ بچہ ہوگا یا بچی ہوگی۔ ان حجرہوں میں رہنے والوں کو کیا معلوم کہ دنیا کیا کہہ رہی ہے کہاں پہنچ رہی ہے ان کے کیا تقاضے ہو رہے ہیں۔ مجھ سے پوچھیے کیونکہ وہ سائنسدان میرے پاس آتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ کہو! تمہارے ہاں تو تمہارے خدا کا ان پانچ چیزوں کے متعلق اتنا بڑا دعویٰ ہے کہ ان کا علم صرف خدا کو ہی ہے جبکہ یہ علم آج تو ہمارے سامنے آ گیا ہوا ہے۔

عزیزانِ من! یہ بہت بڑا اعتراض ہے۔ ملا کے نزدیک تو ماتھے کی شکنیں اور منہ کی جھاگ اور آنکھوں کی سرخی کے سوا کوئی جواب ہی نہیں ہوتا۔ ان کے پاس ایک ہی چیز تھی اور وہ کفر کا فتویٰ ہے لیکن قرآن کی حقانیت اس طرح سے تو نہیں منوائی جاسکتی۔ آپ بھی سوچے کہ اگر خدا کا یہ دعویٰ ہو کہ ان پانچ چیزوں کا جو علم ہے وہ صرف خدا کو ہے کسی انسان کو اس کا علم ہو ہی نہیں سکتا تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟

قرآن فہمی کے سلسلہ میں ہماری بد قسمتی، ہماری غلط سوچ ہے

اگر یہ چیز محض کسی مفسر کی تفسیر میں ہوتی تو پھر بھی ہمارے لیے یہ کہنا آسان تھا کہ یہ اُس کا قیاس تھا اور اُس نے یہ بات کہہ دی ہے۔ بد قسمتی ہماری یہ ہے کہ جو کچھ ان مفسروں نے اس میں کہنا تھا انہوں نے قال رسول اللہ پہلے لگایا اور رسول اللہ کی طرف منسوب کر دیا۔ یہ بخاری شریف کی حدیث ہے جس میں یہ کہا گیا ہے۔ آپ اسے غور سے سنئے گا جو میں اب کہہ رہا ہوں کہ قرآن نے یہ نہیں کہا۔ قرآن کہتا ہے کہ **إِنَّ اللَّهَ عَلَّمَ السَّاعَةَ (31:34)** جو الساعۃ ہے یہ خدا کے قانون کے مطابق ہوگی۔ یہ جو بارش اور ارحام ہے اس کے متعلق قرآن نے یہ نہیں کہا کہ اس کا علم صرف خدا کو ہے اور انسانوں کو نہیں ہے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے جو میں آپ سے عرض کر رہا ہوں۔ بخاری شریف کی حدیث کی بنا پر ہزار برس سے ہمارے ہاں یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ پانچ چیزیں ہیں جن کا علم انسان کو نہیں ہو سکتا بلکہ صرف خدا کو ہے۔ آپ قرآن کی آیت نکالے اس میں کہیں یہ نہیں لکھا ہوا۔ وہاں لکھا ہے کہ **يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ (31:34)** وہ اپنے قانون کے مطابق بارش برساتا ہے اور جانتا ہے کہ ارحام میں کیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ تم نہیں جان سکتے۔ وہ بھی جانتا ہے

- ❶ یہ ہمارے بادل کو اُڑا کر لے گئے ہیں۔ یہ اس نئی نسل کے بچوں کو علم ہے کہ بسنت کے موسم میں ایک تو گڈی کاٹی جاتی تھی اور ایک سے ”اُڑا کر“ لے جاتی جاتی تھی۔
❷ یہ ہمارا بدل اُڑا کر لے گئے ہیں۔

تم بھی جان سکتے ہو۔ یہ کہاں کہا ہے کہ اس کا علم صرف خدا کو ہے؟ سوال یہ ہے کہ ایک چیز جو واقعہ کے خلاف جاتی ہے اُس کو چھوڑ دیجیے لیکن قرآن میں یہ نہیں ہے کہ تم نہیں جان سکتے اور صرف خدا کو اس کا علم ہے۔ ہم جو چیز نہیں جان سکتے وہ اگلے دو لفظوں میں آئی ہے اور وہ چیز ہے جو آج کا سائنسدان بھی مانتا ہے اور قیامت تک اُس کو مانے گا۔ اس کے فوراً ہی بعد کہا ہے کہ **وَمَا تَذِيرُ نَفْسٍ مَّآذَا تَكْسِبُ غَدًا** (31:34) کوئی فرد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کل (Future) کو کیا کروں گا۔ یہ ہے وہ چیز۔ اسی طرح آگے کہا کہ **وَمَا تَذِيرُ نَفْسٍ مَّا بَاقِي أَرْضٍ تَعُودُ** (31:34) کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری موت کہاں ہوگی۔ کہیے دنیا بھر کے مفکرین اور سائنسٹ کو کہ اس کو جھٹلا کر دکھائیں۔ جھٹلانا تو ایک طرف رہا، جوں جوں یہ فلسفہ اور سائنس کا لوجی (علم نفسیات) اور آگے بڑھ رہے ہیں ان کی تائید ہوتی چلی جا رہی ہے۔

اختیار و ارادہ کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس کا مستقبل Determine (متعین و مقرر) نہیں ہوتا

اب سوال یہ ہے کہ کوئی کسی کے متعلق یا اپنے متعلق کیوں نہیں بتا سکتا؟ کہ میں ”کل“ کیا کروں گا؟ آپ مچھلی کو خشکی پر رکھیے تو ہر شخص بتا دے گا کہ یہ کہیں ذرا سی چھلاگی تو پانی کی طرف چلی جائے گی۔ انسانی بچہ کدھر ہاتھ مارے گا یہ کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔ یہ اس لیے ہے کہ اسے ذرا سا اختیار و ارادہ دیا جاتا ہے۔ اختیار دینے کے معنی یہ ہیں کہ اُس کا Future Determine (مستقبل متعین و مقرر) نہیں ہوتا، اُس کا مستقبل جامد نہیں ہوتا، طے شدہ نہیں ہوتا۔ اُس کے سامنے ہمیشہ دو Possibilities (امکانات) ہوتی ہیں۔ اب یہ ان میں سے کون سی Possibility (امکانیت) اختیار کرے گا، یہ کوئی نہیں کہہ سکتا، کوئی نہیں بتا سکتا۔

دنیا کا کوئی شخص بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ مکھی اڑ کر کہاں بیٹھے گی

جو صاحب اختیار ہے اُس کے Future (مستقبل) کے متعلق کوئی کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔ صرف اُس کے Future (مستقبل) کے متعلق کہا جاسکتا ہے جو صاحب اختیار نہیں ہے اور ایک روش پر چلنے کے لیے مجبور ہے۔ گوشت اور گھاس رکھا ہوا ہوا اور بکری کو لاؤ تو بچہ بھی کہہ دے گا کہ یہ گھاس کھائے گی۔ یہ اس وجہ سے اُس نے بتا دیا ہے کہ اُس بکری کے لیے کوئی Choice (اختیار انتخاب) نہیں ہے کہ جی چاہے گھاس کھائے اور جی چاہے تو گوشت کھائے۔ وہ تو گھاس ہی کھاتی ہے۔ ”میں نے تو یہ کہا تھا کہ کیا تم انسان کے متعلق یہ کہتے ہو کہ ہم اس کے Future (مستقبل) کا بتا سکتے ہیں؟ اُس نے کہا کہ دس سائنسٹ ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے ہوں، وہ نہایت آسانی سے بتا سکیں گے کہ ہزار برس کے بعد سورج گرہن کس دن، کس وقت، کتنے حصے میں لگے گا اور وہ ان کے ہاں کی Calculation Exact (جمع تفریق ہو بہو صحیح) ہوگی۔ اور انہی کے سامنے اگر میز پر مکھی بیٹھی ہوئی ہو تو وہ دس کے دس بھی زور لگائیں لیکن وہ یہ نہیں

بتا سکیں گے کہ یہ ایڑ کر اس کے بعد کہاں بیٹھے گی۔ ہمارے ہاں منجم ہیں، ستارہ شناس ہیں، فالیں بتا رہے ہیں، نجوم دکھا رہے ہیں۔ زندہ اور صاحب ارادہ کا مستقبل Determine (متعین و معلوم) نہیں ہو سکتا۔ سچ کہا تھا اقبالؒ (1877-1938ء) نے کہ

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

(بالِ جبریل)

ستارے کے متعلق تو انجم شناس ہزار برس پہلے کہہ سکتا ہے کیونکہ وہ خاکِ زندہ نہیں ہے، خاکِ مردہ ہے اسے اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا۔

زندگی کی تمام تر لطف اندوزیوں کا راز انسان کے اختیار و ارادہ کا رہن منت ہے

عزیزانِ من! یہ چیز ہے کہ مستقبل (Future) کے متعلق اور تو اور خود انسان بھی اپنے متعلق Definitely (قطعیت کے ساتھ) نہیں کہہ سکتا کہ میں واقعی کل صبح یہ کروں گا۔ تو خاکِ زندہ ہے، صاحب ارادہ ہے، تو ہر آن اپنا ارادہ بدل سکتا ہے۔ عزیزانِ من! زندگی کا تو سارا لطف ہی اس میں ہے کہ اپنے لیے کل کے متعلق پتہ نہ ہو۔ اگر ہم میں سے کسی کو بھی پتہ چل جائے کہ آئندہ جو میری زندگی ہے اُس میں کیا کیا میرے متعلق ہونا ہے اور کیسے کیسے وہ ہونا ہے تو آدمی ایک دن جی نہیں سکتا اور چیخ مار کر جنگل کو نکل جائے۔ اُس کی یہ بڑی رحمت ہے کہ اُس نے انسان کو اُس کے Future (مستقبل) سے آگاہ نہیں کیا۔ زندگی کی ساری کیفیاتیں اور ساری رنگینیاں، جتنی بھی ہیں، یہ اسی چیز کے اندر ہیں کہ انسان کو Future (مستقبل) کے متعلق پتہ نہیں ہوگا۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا

زندگی کا یہ نشاطِ کار اسی میں ہے کہ کل کا پتہ نہیں ہے۔ اگر پہلے ہی پتہ ہو کہ میں نے امتحان میں فیل ہی ہو جانا ہے تو اُس لڑکے کی مت ماری ہوئی ہے کہ راتوں کو جاگ جاگ کر تختیں کرتا پھرے۔ اور اگر پہلے ہی پتہ ہے کہ پاس ہونا ہے تو سارا دن کرکٹ کھیلتا رہے۔

سعی بے حاصل انسانی زندگی میں رنگینی پیدا کر دیتی ہے

عزیزانِ من! اگر انسان کو معلوم ہو جائے کہ ”کل“ کیا ہونا ہے تو زندگی اجیرن ہو جائے، زندگی گزارنا مشکل ہو جائے، ساری Activities (سرگرمیاں) ساری مشینری بالکل جامد ہو جائے اور کوئی کچھ کرے ہی نہیں۔ یہ انسان کے لیے کتنی بڑی رحمت ہے کہ اُس کے ”کل“ کے متعلق اُس کو کچھ پتہ نہیں ہے۔ ساری دوز دھوپ، جو کچھ اُس مریض بچے کے لیے ہو رہی ہوتی ہے اسی لیے ہوتی ہے کہ یہ پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ کیا بننا ہے۔ میں اپنا واقعہ سناتا ہوں۔ انڈیا اور پاکستان کے درمیان ہاکی کا میچ ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا۔ ویسے

ہی اُس میں ایک دلچسپی ہوتی ہے اور یہ جو چیز ہوتی ہے کہ جب آدمی کسی کی Side (طرفداری) لے کر دیکھنا شروع کرے تو وہ اس جذبہ و انہماک سے اُسے دیکھ رہا ہوتا ہے کہ آنکھ تک نہیں جھپکتا کہ پتہ نہیں سٹروک کس طرف لگ جائے اور مجھے پتہ نہ چلے اور گول ہو جائے۔ میچ ختم ہو گیا پتہ چل گیا کہ پاکستان نے پانچ گول لیے تھے اور انڈیا نے دو گول کیے اور پاکستان تین گولوں کی برتری سے میچ جیت کر وہاں سے چلا آیا۔ اُسی میچ کی ریکارڈنگ جب دو تین دن کے بعد ٹی وی پر چلی تو میں دس منٹ تک بیٹھ کر بھی نہیں دیکھ سکا۔ کیوں نہیں دیکھ سکا؟ کہتے ہیں کہ ”میںوں پتہ اے کی ہونا اے۔“^① جب انسان کو یہ معلوم ہو کہ ابھی دسویں منٹ پہ یہ گول ہونا ہے پھر پندرہویں منٹ کے اوپر انہوں نے کیا تھا اور یہاں سے چٹلی کا رنگی نہیں تھی آخر میں جا کر پانچ ان کے تھے اور دو ان کے تھے۔ اگر آپ کو یہ پتہ ہو تو اُسی میچ کو دیکھنے کو آپ کا جی ہی نہیں کرتا۔

بس ہجوم نا اُمیدی، خاک میں مل جائے گی
وہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

(غالب)

لیکن اگر اُسی سعی کے متعلق معلوم ہو جائے کہ یہ بے حاصل رہی ہے تو کوئی بھی پھر وہ کوشش نہیں کرتا۔ انسان سعی بے حاصل میں ایک لذت محسوس کر رہا ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! اگر ایک گھنٹے کے میچ کے Future (مستقبل) کا آپ کو پتہ لگے تو اُس میں لذت نہیں رہتی۔ اگر آپ کو اپنی زندگی کے سارے میچز کا علم ہو جائے تو زندگی میں کوئی لذت باقی نہ رہے۔ یہ اُس کا کتنا کرم ہے کہ Future (مستقبل) کا علم ہمیں نہیں دیا۔ وہ یہ کہتا ہے کہ **وَمَا تَذِيرُنَّ نَفْسًا مَّاذَا تَكْسِبُ** (31:34) کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل (مستقبل) میں کیا کرے گا اور اگلی چیز ہے کہ **وَمَا تَذِيرُنَّ نَفْسًا يَأْتِي أَرْضٍ تَعُودُ** (31:34) موت کب واقع ہونی ہے یہ بھی اُس کا بڑا احسان ہے کہ یہ معلوم نہیں ہونے دیا ورنہ اگر یہ Definite (یقینی) ہو جائے کہ میری عمر اتنے سال اتنے دن اتنے مہینے اتنے وقت کی ہے اور اُس وقت میں نے مر جانا ہے تو انسان کا جینا دشوار ہو جائے۔ یہ تو خدا کا احسان ہے کہ ہمیں اس کا ذاتی تجربہ ہو ہی نہیں سکتا کہ موت کیا ہے۔ موت کے متعلق متعین طور پر جب علم ہو جاتا ہے کہ اس وقت وہ موت آ جانی ہے تو وہ لحاظ جو درمیان میں ہوتے ہیں وہ انسان پہ کس طرح گزرتے ہیں۔ ذرا سی مثال کی رو سے نظر آتا ہے کہ جو پھانسی پانے والا مجرم ہے اُسے بتایا جائے کہ تمہیں منگل کی رات کو پھانسی دی جائے گی۔ عزیزانِ من! یہ جو جمعہ سے منگل تک کے دن ہیں تو مرنے والا مرنے سے پہلے مر جاتا ہے۔ اس کے لیے موت کا وقت متعین ہو جاتا ہے تو اس کے لیے ایک ایک لمحہ موت کا ہوتا ہے۔

① مجھے معلوم ہے کہ کیا ہونا ہے۔

یہ سک سک کے مرنا غمِ ہجر میں بلا ہے
عزیزانِ من! اگر ہر انسان کو یہ معلوم ہو کہ مجھے کس وقت موت آجانی ہے تو پہلے تو ہم جینے کی لذت ہی کو رو رہے تھے کہ باقی نہیں رہے گی، اس کے بعد تو پوچھو نہیں کہ انسان کے اوپر کیا قیامت گزرے۔ یہ اُس کی بڑی رحمت ہے کہ اُس نے یہ نہیں بتایا۔ زندگی کی ساری Activities (سرگرمیاں) اسی چیز کے لیے ہیں کہ یہ نہیں بتایا۔ اب یہ ہیں وہ دو چیزیں جن کے متعلق کہا کہ کوئی نفس، کوئی انسان، یہ نہیں جان سکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے۔

حضرت صاحب کی پیشین گوئیوں کے بالمقابل قرآنِ حکیم کا ارشاد

آپ کو معلوم ہے کہ یہ چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں کہ کیا کہتے ہو کہ نہیں جان سکتے، حضرت پیشین گوئیاں کرتے ہیں: اگلے سال یہ ہوگا، تمہیں یہ چیز ہوگی، تمہارے ہاں لڑکا ہوگا، سزا ہو جائے گی، یہ کچھ ہو جائے گا۔ اور پھر یہ پیشین گوئیاں کرنے والے عام انسان نہیں رہتے بلکہ یہ مقررین بارگاہِ خداوندی کہلاتے ہیں، اولیائے کرام کہلاتے ہیں۔ اور اُس کے بعد آگے چلیے تو وہ قادیان کے پیغمبر^۱ بن جاتے ہیں جن کا سارا دار و مدار پیشین گوئیوں پہ ہے۔ اب بھی ان کے ہاں ان کے اخبار دیکھیے وہ سارا مدار ہی اس پہ چلتا ہے کہ وہ جو فلاں جگہ زلزلہ آیا ہے تو حضرت صاحب نے سو برس پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ ان کے دعویٰ نبوت کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ ان کی پیشین گوئی پوری ہوگئی۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَمَا تَلْبِسُ نَفْسٌ مَّا لَا تَكْسِبُ غَتًا** (31:34) کوئی نہیں جان سکتا کہ ”کل“ کو کیا ہوگا جبکہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت صاحب نے بتا دیا تھا اور پورا ہو کر رہا۔ عزیزانِ من! سوچئے کہ انہیں کیا کہا جائے گا، مگر آپ کے ہاں انہیں اولیاء اللہ کہا جاتا ہے، مقررین بارگاہِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ وہ اپنے ہاں اس کو نبی تک مانتے ہیں۔ کسی وقت بیٹھ کر سوچئے کہ اس کے بعد جو قرآن نے یہ کہا ہے کہ مستقبل کے متعلق کوئی کچھ نہیں جان سکتا اور پھر موت کے متعلق تو خاص طور پہ کہا ہے۔ لیکن یہ پھر بھی کہتے ہیں کہ انہوں نے پہلے بتا دیا تھا کہ ”سچے کی زندگی میں جھوٹا مر جائے گا“، یعنی ایک پادری تھا اور اُس کے متعلق آپ نے پہلے فرما دیا تھا کہ وہ اتنے دن بعد مر جائے گا تو دیکھیے وہ مر گیا۔ اس چیز کو اچھالتے^۱ ہیں، ایسا کہنے والے کو ولی اللہ ہی نہیں، نبی تک مان رہے^۱ ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ کوئی نہیں جان سکتا۔ اب تو ان کو تو آپ قادیانی کہہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جھوٹا^۱ پیغمبر تھا لیکن آپ اپنے ہاں جنہیں آپ

① یہ اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی (1835-1908 AD) کی طرف ہے جس کی پیشین گوئیوں کا اُن کے قلعین راگ الاپتے رہتے ہیں اور ان کا اخبار بھی۔ ان کی چند ایک پیشین گوئیوں کے لیے دیکھیے:

بڑے بڑے اولیاء اللہ کہتے ہیں، بزرگ کہتے ہیں، حضرت جی کہتے ہیں، ان کے متعلق آپ بھی کچھ مانتے ہیں۔ وہ جب کہہ دیتا ہے کہ ”جا تیرے گھر منڈا ہو جائے گا“ تے کناں خوش ہو کے آجاندے ہیگے نیں کہ حضرت صاحب نے کہہ دتا اے جی! ❶۔ پوچھا کہ جی! حضرت صاحب نے کیسے کہہ دیا؟ کہا کہ جی! وہ جو ہر شخص کی تقدیر کی تختی عرش کے اوپر لٹکی ہوئی ہوتی ہے، یہ اُس کو دیکھ آتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ شخص کچھ نہیں جان سکتے، وہ کہتے ہیں کہ ہم خود نہیں جانتے بلکہ وہ تختی پڑھ آئے ہیں ”او فرشتہ جیہڑا چوکیدار رکھیا ہو یا او ذرا ایوں نوں ہو یا تے اسی جھٹ تختی پڑھی۔“ ❷

عزیزانِ من! یہ قوم ہے اور اسلام کا دعویٰ ہے اور ساتھ قرآن کا دعویٰ بھی رکھے ہوئے ہے یا للعجب!!! ان آیات کے دو معنی نہیں ہو سکتے۔ یہ عام لوگوں کی باتیں نہیں کرتے بلکہ جن کو پہنچے ہوئے لوگ کہتے ہیں ان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ پیشین گوئیاں کرتے ہیں جبکہ قرآن کریم برملا کہتا ہے کہ **وَمَا تَذِيرُنَّ نَفْسًا مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَ مَا تَذِيرُنَّ نَفْسًا بَاقِي أَرْضٍ تُفَوِّتُ اللَّهُ عَلَيْهَا خَبِيرٌ (31:34)** کوئی اشخاص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل (مستقبل میں) کیا کرے گا اور نہ ہی یہ بتا سکتا ہے کہ اس کی موت کس جگہ واقع ہوگی۔ ان کے متعلق تو علیم و خیر صرف خدا ہے۔

عزیزانِ من! پھر سوچئے کہ کیا یہ قوم کبھی اس قرآن پہ آ سکتی ہے؟ بہر حال سورۃ لقمان آج ختم ہوئی۔ ❸

❶ جاؤ! تمہارے گھر لڑکا پیدا ہوگا سن کر کتنے خوش و خرم گھر لوٹ آتے ہیں کیونکہ حضرت صاحب نے یہ کہہ دیا ہے۔

❷ وہ فرشتہ جو چوکیدار رکھا ہوا تھا وہ ذرا ادھر کو ہوا تو ہم نے فوراً وہ تختی پڑھ لی۔

❸ اس کے فوراً بعد (اسی تاریخ کو) سورۃ السجدۃ شروع کر دی گئی تھی۔ اس کے لیے دیکھیے اسی کتاب کے اگلے ابواب۔

سُورَةُ السَّجْدَةِ

پہلا باب: سورة السجدة (آیات 1 تا 4)



عزیزانِ من! سورة السجدة شروع ہوتی ہے ^①۔ یہ 21 واں پارہ ہے اور 32 ویں سورة ہے: (32:1)

لفظ ریب کا قرآنی مفہوم

یہ سورة شروع ہوتی ہے: اَلَمْ تَنْزِلُ الْكِتَابَ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ (2-1:32)۔ یہی کچھ سورة البقرة میں کہا گیا ہے کہ ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ (2:2)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اس میں شک کی کوئی بات نہیں ہے۔ ”شک“ بھی عربی زبان کا ہی لفظ ہے۔ قرآن میں جہاں قرآن کے متعلق آیا ہے وہاں ”ریب“ ہی آیا ہے۔ بعض باتیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ شک ہو یا یقین ہو۔ آپ کے دل پہ اُس کا کوئی اثر نہیں ہوتا جیسے کہ یہ شک کی بات ہے کہ بارش کل ہوگی یا نہیں ہوگی۔ بعض شک ایسے ہوتے ہیں کہ دل پہ چٹ جاتے ہیں جیسے کہ اگر کوئی خبر آئے کہ فلاں جگہ حادثہ ہوا ہے اس قسم کا اسکوٹر تھا اور آپ کا بیٹا کسی اسکوٹر کے اوپر گیا ہوا ہو تو اُس وقت بھی آپ ایک بیم ورجا میں ہوتے ہیں، شک و یقین کے اندر ہوتے ہیں کہ پتہ نہیں وہ ہے یا کوئی اور ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس شک میں اور اُس شک میں کیا فرق ہے۔ یہ شک جس سے دل میں اضطراب پیدا ہو، عربی زبان میں اُسے ریب کہتے ہیں۔ یہاں کہا کہ یہ وہ حقیقت پر مبنی کتاب ہے کہ ایک تو اس میں ہر بات یقینی ہے، کوئی شک ہی نہیں ہے اور اس سے دل کے سارے اضطرابات رفع

① سورة لقمان کے ختم ہونے کے بعد نومبر 1979ء کی 16 تاریخ کو ہی سورة السجدة کا یہ درس شروع کر دیا گیا تھا۔

ہو جائیں گے کوئی الجھن یا اضطراب باقی نہیں رہے گا۔ دوسرا یہ کہ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ (32:2) یہ کسی ایک فرد یا خاندان یا گروہ کا رب نہیں ہے بلکہ کائنات کا رب ہے جس کی طرف سے یہ چیز آرہی ہے۔ اُس نے توربو بیت کا ذمہ لیا ہے۔ اَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ (32:3) یہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے خود ہی اس کو بنالیا ہے خود گھڑ لیا ہے کہتے ہیں کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق ہے۔ حالانکہ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ (32:3) یہ تو الحق ہے اور جو الحق (The Truth) ہے یہ تو کوئی انسان نہیں کہہ سکتا۔ یہ تیرے رب کی طرف سے عطا ہوئی ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ لِنُتَذَرَقَ قَوْمًا مَّا اتَّهَمُوا مِنْ نَذِيرٍ مِنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ (32:3) تو اس کے ذریعے سب سے پہلے اس قوم کو اس کے غلط اعمال کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرے جس کی طرف تجھ سے پہلے کوئی آگاہ کرنے والا نہیں آیا تاکہ یہ زندگی کی صحیح روش اختیار کر لیں۔ اس طرح اس رسول کو یہ الحق دیا ہے کہ یہ قوم جس کے پاس اس سے پہلے کوئی صاحب کتاب نہیں آیا اُس کو صحیح راستہ دکھا دے۔ یہ خدا کی طرف سے دیا گیا ہے۔

نبوت کے سلسلہ میں عربوں کی تاریخ

قرآن میں کئی مقامات میں یہ ہے کہ یہ عرب جن کی طرف رسول اللہ ﷺ آئے تھے اُس سے پہلے ان میں کوئی نبی نہیں تھا۔ ذکر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا آ رہا ہے کہ انہوں نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی۔ حضرت اسماعیلؑ کو وہاں بسایا اور اُس کے بعد عربوں کی ساری تاریخ کے اندر کسی نبی کا ذکر ہی نہیں آتا اور نہ ہی یہ عرب اس کے مدعی تھے ورنہ دنیا کی ایسی قومیں جن کی تاریخ ہی کوئی نہیں ہے وہ بھی کسی نہ کسی کو اپنے ہاں کا ایثار کا اوتار سہی یا نبی سہی کچھ نہ کچھ مانتے ہی ہیں۔ ان سے بات کیجیے تو تاریخ ان کے ہاں نہیں ہے کوئی واقعہ ان کے ہاں کا بتا دیجیے۔ دس ارب سال سے پہلے کی تو بات ہی کوئی نہیں کرتا کہ ہمارا جو مذہب ہے یا دھرم ہے اس کے لیے فلاں بانی تھا فلاں اوتار تھا۔ یہ عرب اس کا دعویٰ ہی نہیں کرتے تھے۔ قرآن نے کہا کہ ان کی طرف یہ رسول آیا ہے اور انہی میں سے ہے حضرت اسماعیلؑ کی ذریت میں سے ہے تاکہ یہ ان کو غلط راستے کے خطرات سے آگاہ کر دے اور صحیح راستے کی راہنمائی کر دے۔ یہ اس خدا کی طرف سے ہے کہ اَللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (32:4) جس نے یہ خارجی کائنات یعنی ارض و سما کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے تخلیق کیا۔ عربی زبان میں سما ہر بلندی کو کہتے ہیں اور ارض ہر پستی کو کہتے ہیں۔

ارض و سما کی اصل حقیقت اور تورات کا بیان، یوم کا مفہوم اور جمعہ کی چھٹی کا معاملہ

یہ جو بلندی اور پستی ہے۔ یہ بھی ہمارے ہاں کے Relative Terms (اضافی اصطلاحات) ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ تم یہی سمجھتے ہو کہ یہ جو تمہاری ارض ہے یہ نیچے ہے یہ سما اوپر ہے جبکہ ہر ارض کا ایک سما ہوتا ہے اور ہر سما کی ایک ارض ہوتی ہے۔ یہ جو ہمیں اوپر نظر آتے ہیں انہیں ہم نیچے نظر آ رہے ہیں، ہم سے نیچے جو ستارہ ہو گا وہ ہمیں آسمان کہے گا، وہ ہمیں فلک نشین کہے گا۔ قرآن چودہ سو سال پیشتر کہتا ہے کہ ہر سما کی ایک ارض ہوتی ہے۔ آگے کہا کہ فِی سِتَّةِ اَیَّامٍ (32:4) یہ سب چھ دنوں میں پیدا کیا۔ اب تورات ہمارے ہاں بھی آگئی۔ اُس میں یہ ہے کہ خدا نے زمین کو سورج کو چاند کو چھ دنوں میں پیدا کیا، دن یہی چوبیس گھنٹے والا جو سورج کے نکلنے سے شروع ہوتا ہے اور اُس کے بعد خدا تھک گیا تو ساتویں دن اُس نے آرام کیا۔ یہ جو Saturday ہے تو یہودیوں کے ہاں اس دن کاروبار نہیں کرتے، یہ چھٹی کو Holiday اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ مقدس دن ہے جس دن خدا نے کام کاج چھوڑ کے تھک کے چھٹی کی ”تے اس آرام نال ستا“^①۔ ان کے ہاں سبت کو کوئی کام نہیں کرتے، سبت کی چھٹی ہوتی ہے۔ ایک دن کی چھٹی کا یہ تصور یہ ٹھیک ہے کہ تمدن میں، معاشرت میں، تو ہو سکتا ہے لیکن یہ قرآن کا Concept (تصور) نہیں ہے۔ اب آپ پوچھیں گے کہ ہم جمعہ کے دن کی چھٹی کا جو کہتے ہیں تو یہ کیا ہے۔ قرآن میں اتفاق سے ایک سورۃ ہے اس کا نام سورۃ الجمعہ ہے۔ اُس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ (62:9)۔ جب جمعہ کے اجتماع کے لیے پکارا جائے کام کاج چھوڑ کر اس کی طرف آ جایا کرو۔ یعنی جمعہ والے دن کام کاج ہو رہا ہے تو اُس کو چھوڑ کر اس کی طرف آنا ہے آگے ہے کہ اِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ (62:10) اور جب صلوٰۃ ختم ہو جائے تو جا کر پھر کاروبار کیا کرو۔ یہاں شریعتِ حقہ آئی، انہوں نے کہا کہ صاحب! تو ار کی جو چھٹی ہے وہ تو Chirsitianity (عیسائیت) کی چھٹی ہے، ہفتے کی یہودیوں کی ہے اور مسلمان کی چھٹی جمعہ کو ہوگی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ چھٹی نہ کرو لیکن یہ کیوں کہتے ہو کہ شریعت کا فیصلہ ہے کہ جمعہ کی چھٹی کرو۔ بہر حال یہاں (ستۃ ایام 32:4) ہے۔ اب یہ جو علم الارض وغیرہ والے جو سائنسدان ہیں وہ Determine (مقرر و متعین) کر رہے ہیں کہ ایام کے معنی Period ہوتا ہے، مراحل ہوتے ہیں، طبقات ہوتے ہیں۔ وہ یہ Determine (مقرر و متعین) کر رہے ہیں کہ یہ مختلف Periods

① تو بڑے آرام و سکون سے سویا۔

ہیں، ادوار ہیں جن میں یہ خارجی کائنات اس شکل میں آئی ہے جس شکل میں آج یہ تمہارے سامنے ہے۔ یہاں خلق کا لفظ ہے یہاں امر کا لفظ نہیں ہے۔

لفظ امر اور خلق کا مفہوم نیز عرش کے سلسلہ میں خدا کے متعلق پیدا ہونے والا تصور

آپ کو پتہ ہے کہ امر اور خلق میں کیا فرق ہے۔ کہا کہ اَللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (32:4) جب یہ ہماری اسکیم اس محسوس شکل میں آئی تھی تو وہاں سے پھر یہ بڑے بڑے طویل المیاد مراحل تھے جن میں سے گزر کر یہ اس شکل میں آئی ہے جس میں تم دیکھ رہے ہو۔ آگے کہا کہ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (32:4)۔ ترجمہ کیا کہ پھر خدا اپنے عرش کے اوپر چلا گیا۔ یہ تورات کا تصور تھا اور ہمارے ہاں بھی خدا کو عرش کے اوپر کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! خدا کا اس قسم کا جو تصور ہے وہ تو Finite (محدود) ہو جاتا ہے۔ آپ اُسے کوئی جگہ بھی بتا دیجیے خواہ سات آسمانوں کے اوپر ہی سہی اُس پہ اگر آپ بٹھا دیجیے گا تو وہ تو محدود ہو گیا۔ یہ تصور غلط ہے۔ وہ Time & Space (زمان و مکان) کی حدود کے اندر نہیں آتا اس لیے اُسے کسی خاص مقام کے اندر Space (مکان) کے اندر محدود نہیں کیا جاسکتا۔ عربی زبان میں عرش کے معنی Controlling Centre ہوتا ہے۔ جس کو آپ اپنے ہاں تخت کہتے ہیں۔ پہلے تو وہ ہوتا ہے کہ سچ مچ کا وہ تخت ہوتا تھا جس پہ بادشاہ بیٹھتا تھا اور نہ جسے Thrown کہا جاتا تھا اُس کے معنی سچ مچ کا وہ تختہ نہیں ہوتا بلکہ وہ مملکت کی اتھارٹی ہوتی ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ اس معنی میں آتا تھا۔ کہا کہ اُس نے یہ سارا کچھ تخلیق کیا اور اُس کے بعد اس نے ان میں قوانین نافذ کیے اور ان پہ جو کنٹرول تھا اُس کو اپنے ہاتھ میں رکھا۔ اس طرح خدا زندہ خدا پائندہ خدا ساتھ چلنے والا خدا ہوا۔

یورپ کے سائنسٹ (سیکولر ازم کے حامیوں) کے نزدیک کائنات کا تصور

عزیزانِ من! Contemporary (عصر حاضر کے) علم کے اوپر بھی نگاہ ہونی چاہیے پھر قرآن سمجھ میں آتا ہے۔ یورپ کے سائنسٹ (سیکولر ازم کو ماننے والے) خدا کو تو مانتے ہیں لیکن ماننے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اُس نے اس کائنات کو بنایا جیسے ایک گھڑی کو بنا دیا جاتا ہے کہ آٹھویں دن جس میں چابی دیجاتی ہے۔ چابی دینے والا جب چابی دیدیتا ہے تو پھر وہ اپنے ہاں جا کر سو جائے یا کاروبار کرے اُس کو گھڑی سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور گھڑی اُس چابی کے زور سے آٹھ دن خود بخود چلتی رہتی ہے۔ یہ بھی یورپ کے سائنسٹ کا ایک نظریہ ہے کہ یہ جو کائنات ہے اُس خدا نے اس کو بنانے کے بعد اس میں اتنی چابی دیدی ہے کہ یہ اب اُس چابی کے زور پر چلتی چلی

جاری ہے اور اس کائنات کے لیے پھر اُس خدا کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ نہیں ہے کہ اُس نے تخلیق کر کے اور چابی دے کے خود کہیں الگ ہو کے جا کے بیٹھ گیا یا سو گیا۔ کہا کہ اَسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (32:4) اس طرح کا سوار کہ جو اپنا بیلنس (توازن) ایسے قائم رکھے کہ اپنے مقام سے ہلے بھی نہیں۔ اس طرح کا کنٹرول یا بیلنس جو ہے اس کائنات کا کنٹرول پھر اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ اس کائنات کی وسعتیں، اس کی گہرائیاں، اس کی پہنائیاں، انسان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتیں۔ یہ تو یورپ کے علم الافلاک والوں سے پوچھو۔ جیمز جینز (James Jeans) کی کتاب "The Mysterious Universe" (پراسرار کائنات) پڑھ کر دیکھیے۔ اس پوری کی پوری کائنات کا جو کنٹرول ہے وہ خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی ذات کے متعلق شفیع المذنبین کے تصور کی حقیقت

جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے تو اُس کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے تمہیں مدد ملے گی، حمایت ملے گی، تم کامیاب ہو سکو گے۔ کہا کہ مَا لَكُمْ مِّنْ ذُوْنِهٖ مِنْ وَلٰیٍّ وَّ لَا شَفِیْعٍ (32:4) یاد رکھو! اُس کے سوا کوئی کارساز نہیں ہے۔ اب یہاں لفظ ”شفیع“ آ گیا کہ کوئی شفیع نہیں ہے۔ ہمارے ہاں شفیع المذنبین کا تصور موجود ہے۔ شافع روزِ حشر کے الفاظ تو آپ نے سن رکھے ہیں، یہ حضور نبی اکرم ﷺ سے متعلق بولے جاتے ہیں، آپ نے شفاعت بھی سن رکھا ہوگا، اس کے معنی سفارش کیے جاتے ہیں اور شفیع اور شافع کے معنی سفارش کرنے والا کیے جاتے ہیں۔ کوئی حاکم جو یہاں کا ہوا اسے Condemn (مذمت) کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ وہ تو سفارش پہ چلتا ہے یعنی جس کی سفارش پہنچ گئی اُس کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔ یہ اس حاکم کے متعلق بدترین عیب ہے۔ پھر سفارش کرنے والے کے متعلق روزِ یہ چیز ہوتی ہے۔ اور سفارش تو عام طور پہ اسی کی ہوتی ہے جس کا حق نہیں ہوتا، اُس کا کام سفارش سے چل جاتا ہے۔ یعنی جب انتہائی طور پہ بگڑا ہوا معاشرہ ہوتا ہے اُس میں یہ چیز ہوتی ہے کہ یہاں تو سب کام سفارش سے چلتے ہیں۔ اب اس طرح سے آپ سوچیے کہ سفارش کرنے والے یا سفارش ماننے والے ان دونوں کا کیا تصور آپ کے ذہن میں آتا ہے اور اگر یہ جو چیز ہے کہ (معاذ اللہ) حضور نبی اکرم ﷺ سفارش کرنے والے ہیں اور خدا ان کی سفارش مان کر ان کو جنت میں بھیج دینے والا ہے تو یہ سارا نظام عدل، یہ قانونِ مکافاتِ عمل کام نہیں کرتا۔ اُس کا کہنا ہے کہ مَنْ یَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ - وَمَنْ یَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهُ (99:7-8) یہ وہ میزانِ عدل ہے جس میں عملِ انسانی کا ایک ایک ذرہ اپنا اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ۔ فَهُوَ فِیْ عِشَّةٍ رَّاٰ ضِیَیَّةً (101:7-8) جس کا تعمیری پلڑا جھکا ہوا ہوگا وہی ہے جس کے حصے میں جنت آئے گی یا

خوشگواریاں آئیں گی، وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ - فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ (9: 101) جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوگا وہ جہنم میں چلا جائے گا۔ یہ سارا کچھ نظامِ عدل جو قرآن کریم نے بتایا ہوا ہے تو یہ سارے کا سارا درہم برہم ہو جاتا ہے اگر یہ چیز ہو کہ مذنبین کی سفارش رسول اللہ ﷺ کریں گے اور خدا یہ سفارش مان کر ان مجرمین اور مذنبین اور جہنم میں جانے والوں کو جنت میں بھیج دے گا۔ یہ ساری چیزیں آپ کی روایات میں لکھی ہوئی ہیں کہ یہ نظامِ عدل، نامہ اعمال، خدا کی عدالت، یہ سارا کچھ فیصل ہو چکے گا، جنت والے جنت میں چلے جائیں گے، جہنم والے جہنم میں چلے جائیں گے اُس کے بعد عدالت کا وقت بھی ختم ہو جائے گا اور وہ حاکم یعنی اللہ تعالیٰ بھی جانے لگیں گے تو وہ جاتے جاتے ادھر ادھر نگاہ ماریں گے کہ شاید کوئی ادھر ادھر کی بات ہو تو وہ وہاں دیکھیں گے کہ ایک شخص وہاں میدان کے اندر ہے اور وہ سجدے میں پڑا ہوا ہے، وہ ٹھہر جائیں گے کہ پتہ لویہ کون شخص ہے، معلوم ہوا کہ وہ حضور نبی اکرم ﷺ سجدے میں گرے ہوئے ہیں۔ پوچھا کہ میرے محبوب! کیا بات ہے آپ کیوں سجدے میں گرے ہوئے ہیں؟ کہنے لگے کہ میری امت جہنم میں ہو اور میں جنت میں چلا جاؤں یہ تجھ سے تو ہو سکتا ہے کہ تیرے بندے جہنم میں جائیں اور آپ عرش پہ بیٹھ جائیں لیکن میں تو یہ نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ بیٹھ گئے، مسکرائے، فرشتوں کو حکم دیا کہ ان کو نکال لاؤ۔ وہاں سے نکالا اور جنت میں بھیج دیا۔ کہا: اب ٹھیک ہے؟ کہا: نہیں جی ابھی سارے نہیں نکلے۔ کہا: اور نکال لو۔ یہ ہے سفارش، یہ ہے جسے حضور کے متعلق کہتے ہیں کہ آپ شفیع المذنبین ہیں اور یہ عقیدہ اس حد تک گہرائی میں گیا ہوا ہے کہ کسی شخص کو بدترین گالی دینی ہو تو اُسے کہتے ہیں کہ تجھے رسول کی شفاعت نصیب نہ ہو۔

لفظ شفیع کا مفہوم

لفظ شفیع کا مادہ ”ش ف ع“ ہے۔ یہ شفیع کا لفظ تو آپ نے سنا ہوگا یعنی وہ جو ساتھ والا مکان ہوتا ہے، تو کسی کے ساتھ جو کھڑا ہوتا ہے اُسے عربی زبان میں شفیع کہتے ہیں۔ عدالت کی زبان میں قرآن کے اندر موجود ہے کہ ملزم جس کا مقدمہ پیش ہوگا اُسے پکڑ کر لانے والے بھی ہونگے اور شہادت دینے والا اُس کا شفیع بھی اُس کے ساتھ کھڑا ہوگا یعنی اُس کی Defence میں جو شہادت دینے والا ہوگا، صفائی کا گواہ۔ قرآن نے اس لفظ کے معنی شہادت کہے ہیں۔ یعنی ہمارے سمجھانے کے لیے وہ عدالت کا ایک نقشہ پیش کرتا ہے، اُس عدالت کے نقشے میں ایک صفائی کا گواہ ہوتا ہے جو ملزم کے ساتھ ہوتا ہے۔ شفیع کے معنی ہیں کہ کسی کے حق میں سچی گواہی دینے والا، شفاعت کے معنی ہیں کہ ملزم کی صفائی میں سچی شہادت دینا۔ اس کے معنی سفارش بالکل غلط ہیں۔ وہ تو سمجھانے کے لیے ہے ورنہ انسان کے ارادوں تک کے اعمال نتیجہ خیز ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ تو یہ کہتا ہے کہ ہر ایک کا اعمال نامہ اُس کی گردن میں لٹکا ہوا ہے، آج وہ پلٹا

ہوا ہے اور ظہور نتائج کے دن وہ کھل کر سامنے آ جائے گا۔ اور وہ یہ نہیں ہوگا کہ کسی کو وہاں عدالت میں کہا جائے گا کہ چارج شیٹ پڑھ کر سناؤ بلکہ اِقْرَأْ كِتَابَكَ (17:14) اُسی ملزم سے کہا جائے گا کہ اپنا اعمال نامہ پڑھ۔ کہیں مرزا اسد اللہ خاں غالب (1869-1797ء) کی طرح تم وہاں یہ نہ کہہ دو کہ

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناحق

آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

انسان سے کہا ہے کہ اِقْرَأْ كِتَابَكَ (17:14) لو! اپنا نامہ اعمال خود پڑھ لو اور اُس کے بعد کہا کہ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (17:14) تمہارا حساب کرنے کے لیے باہر سے کسی محاسب کے بلانے کی ضرورت نہیں۔ خود تمہاری اپنی ذات تمہارے خلاف محاسبہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس لیے آج اپنا فیصلہ بھی آپ ہی کر۔

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لبو پکارے گا آستیں کا

تمہارے ہاتھ تمہارے خلاف گواہی دیں گے، تمہارے پاؤں تمہارے خلاف گواہی دیں گے، تمہاری زبانیں تمہارے خلاف گواہی دیں گی۔ مکافاتِ عمل اور نتائجِ اعمال کا تو حقیقت میں یہ نقشہ ہے۔ قرآن تو بات سمجھانے کے لیے ہمیشہ محسوس شکل میں ایک چیز لاتا ہے۔ اُس نے ہمیشہ عدالت کا نقشہ سامنے پیش کیا ہے کہ عدالت ہے، منصف ہے، ایسا منصف ہے کہ جس پہ کسی کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا، ملزم کو پکڑ کر لاتے ہیں، ملزم کو Defence (دفاع) کا پورا موقع دیا جاتا ہے۔ یعنی وہاں اس طرح سے باتیں قرآن کریم بتا رہا ہے ایسے جیسے کہ خدا پوچھ رہا ہے کہ کیا یہ جو قانون ہے اس قانون کو بتانے والے تمہارے پاس آئے تھے یا نہیں؟ انہوں نے بتایا تھا یا نہیں کہ یہ قانون ہے؟ یعنی خدا تو علیم ہے اور اُس کو سب کچھ پتہ ہے۔ وہاں اُس نے یہ کہہ کر یہ کہا کہ Ignorance of Law is no excuse^① کہ قانون کا علم نہیں تھا اس واسطے اس کو معاف کر دو۔ وہ کہتا ہے کہ پوچھو گا کہ بتاؤ! اس قانون کا علم دینے والے تمہارے پاس پہنچے تھے یا نہیں؟ ان سے کہا جائے گا کہ تم نے یہ بات ان تک پہنچائی تھی یا نہیں؟ بتاؤ کہ جو کچھ تم اپنی Defence (دفاع) میں کہنا چاہتے ہو جو تم کہہ رہے ہو اس کے لیے تمہارے پاس کوئی گواہ ہے؟ یہ ہے جسے وہ کہتا ہے۔ وہ صفائی کا جو گواہ ہے جو اس کے حق میں شہادت دے گا وہ اسے شفیع کہتا ہے یعنی ساتھ کھڑا ہونے والا۔ یعنی وہ ایسے کہتا ہے جیسے جو صحیح صحیح Fair Trial (بے تعصب سماعت) ہے وہ ہو رہا ہے

① قانون سے ناواقف ہونا کوئی بہانہ نہیں ہوتا۔

اُس طرح سے مقدمے کے بعد پھر وہ فیصلہ سناتا ہے۔ اُس میں یہ چیز آتی ہے جسے آپ شفیع یا شافع کہتے ہیں۔ اور یہ اُس نے کہا کہ مَا لَكُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَلِيٍّ (32:4) یہ بھی نہیں ہے کہ وہاں تمہارا کوئی ایسا کارساز آ کر متاثر کر سکے۔ وَلَا شَفِيعٌ (32:4) تمہارے حق میں غلط گواہی دینے والا بھی کوئی نہیں آ سکے گا۔ أَفَلَا تَعْدُّوْهُنَّ (32:4) جو ہم کہہ رہے ہیں کیا وہ بات تمہاری سمجھ میں آئی۔ کہا کہ یہ ہے وہ خدا جس نے خارجی کائنات کو پیدا کیا، پیدا کر کے کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا۔ یہ بات تو خارجی کائنات کی ہے کہ جہاں مکافاتِ عمل کا سوال ہی نہیں ہے، اُن میں سے کوئی شے بھی خدا کے قانون کی خلاف ورزی کی جرأت کر ہی نہیں سکتی کیونکہ اُس میں استطاعت ہی نہیں رکھی گئی، ان کو دور اسے نہیں دکھائے۔

کائنات کے اندر انسان کا مقام بلند ہونے کی وجہ

یہ تو صرف انسان کے متعلق کہا ہے کہ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (90:10) اس کو دو راستے دکھا دیئے ہیں۔ یہ جنہیں دو راستے دکھائے ان کے متعلق اب آگے بات آنی تھی کہ یاد رکھو کہ یہ بات نہیں ہے کہ وہ عرش پہ جا بیٹھا ہے اور تم اب نیچے جوجی میں آئے کرتے رہو تو یہ سوال نہیں ہے۔ عرش کو تم عدالت کی کرسی سمجھو، وہاں وہ متمکن ہے، تمہارا مقدمہ پیش ہوگا اور اگر ذہن میں یہ ہو کہ کوئی بہت بڑا با اثر جا کر حاکم کو متاثر کر دے گا تو سنو! مَا لَكُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَلِيٍّ (32:4) کوئی اس بات کی جرأت نہیں کرے گا کہ تمہارے حق میں آ کر غلط گواہی دے کر تمہارے حق میں فیصلہ کر دے۔ یہ بھی نہیں ہے اور سنو! لَا شَفِيعٌ (32:4) ایسا گواہ بھی وہاں نہیں ہوگا۔ اس طرح سے ایک ایک ذرہ نتیجہ خیز ہوگا۔

عزیزانِ من! سورۃ السجدة کی آیت 4 تک ہم آئے ہیں۔ میں اگلی آیات کی اہمیت کو واضح کر دوں تاکہ آپ انہیں مس (Miss) نہ کریں۔ یوں تو قرآن کی کوئی آیت ہے جو عظیم و جلیل نہیں ہے لیکن بعض آیات کے اندر اُس نے حقائق کو اس طرح سے سمو کر، مرتکز حیثیت میں رکھا ہے کہ وہ کتنے ہی انسانی علم کے شعبے ہیں، کائنات کے کتنے حقائق ہیں، انسان کی ذات سے کتنی معلومات ہیں، جو بعض اوقات ایک ایک آیت کے اندر آگئی ہوئی ہیں۔ ہمارے سامنے اگلی آیت یہ آ رہی ہے بلکہ دو آیتیں آ رہی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ شاید ایک ایک آیت کے لیے ایک ایک درس ہو۔ تو سورۃ السجدة کی آیت 5 سے ہم آئندہ درس لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



دوسرا باب: سورة السجدة (آیات 5 تا 9)



عزیزانِ من! آج نومبر 1979ء کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة السجدة کی آیت 5 سے ہو رہا ہے: (23:5)۔

سورة السجدة کی جلیل المرتبت آیت

جیسا کہ میں نے سابقہ درس کے آخر میں عرض کیا تھا کہ یہ آیت اور اس کے ساتھ ایک اگلی آیت ہے جو بڑی جلیل المرتبت ہے اور ساتھ ہی میں نے کہا تھا کہ یوں تو قرآنِ کریم کی کوئی آیت ہے جو جلیل المرتبت نہیں ہے لیکن بعض آیات میں بڑے بلند حقائق کو سمنا کر چند الفاظ میں مرکوز کر دیا جاتا ہے اس اعتبار سے ان آیات کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ آیت جو میرے سامنے آرہی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اربابِ فکر و نظر کے لیے اور بالخصوص مغرب کے سائنٹسٹ کے لیے اس بات کے ثابت کرنے کے لیے یا ثابت ہونے کے لیے کہ یہ قرآن کسی انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہے، اس کا سرچشمہ واقعی ماورائے ادراک انسانی ہے، یہ ایک ہی آیت کافی ہو سکتی ہے۔ چودہ سو سال پہلے جس زمانے میں قرآن نازل ہوا، اُس زمانے میں عرب میں ہی نہیں، ساری دنیا کے دانشوروں کے ذہن میں یہ بات آہی نہیں سکتی تھی جو اس آیت میں کہی گئی ہے۔ چودہ سو سال پہلے ہی نہیں، ابھی اٹھارویں صدی تک بھی دنیا میں کوئی انسانی فکر یہ بات تصور میں بھی نہیں لاسکتی تھی۔ اُس کے بعد جب سائنس کے انکشافات ہوئے ہیں تو یہ آیت ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آگئی ہے۔ آج جو سائنس کے

انکشافات ہیں وہ اُس کی تصدیق کر رہے ہیں کہ بات یہی تھی جو اس نے کہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو قرآن نے کہا ہے کہ سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاَفَاقِ وَفِي اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَبَيِّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (4:53) ہم عالمِ انسانی میں اور خارجی کائنات میں اپنی چھپی ہوئی حقیقتوں کو بے نقاب کرتے چلے جائیں گے اور ہر حقیقت جو بے نقاب ہو کر سامنے آئے گی وہ اس امر کا ثبوت ہوگی کہ قرآن واقعی حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کے مبنی بر حقیقت ہونے کے لیے یا یہ بات سامنے آنے کے لیے انفس اور آفاق کے اندر جو حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں ان کا منکشف ہونا ان کا Discover (بے نقاب) ہونا بڑی بنیادی شرط ہے۔

انسانی علم کتابِ فطرت لکھتا نہیں ہے بلکہ اسے پڑھتا ہے

اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس کتاب کے حقائق اس طرح سے واضح ہو کر یہ ثابت کریں گے کہ یہ واقعی ایک حقیقت ہے افسانہ نہیں ہے فکرِ انسانی کی تخلیق نہیں ہے۔ اور اس کا ذریعہ انفس اور آفاق میں چھپی ہوئی حقیقتوں کا بے نقاب ہونا ہے۔ کم از کم آفاق کی دنیا میں آج آپ اسی کو Scientific Discovery (سائنسی انکشاف) کہہ لیجیے۔ سائنس ان حقیقتوں کو ایجاد نہیں کرتی بلکہ وہ Discover (بے نقاب) کرتی ہے یعنی اُس کے اوپر جو پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے اُس کو اٹھا دیتی ہے۔ ایف جے شین کے الفاظ میں یہ ہے کہ ہم کتابِ فطرت کو لکھتے نہیں ہیں بلکہ ہم کتابِ فطرت کو پڑھتے ہیں^①۔

صدیوں سے رائج ایک غلطِ العام تصور: ہر چیز پہلے دن سے مکمل شکل میں پیدا کر دی گئی

چودہ سو سال پہلے ہی نہیں اُس سے بھی بہت پہلے تک کائنات کی تخلیق کے متعلق مذہبی کتابوں میں دیکھیے تورات کو یہ پوزیشن حاصل ہے کہ وہ بہت قدیمی ہے دیگر مذاہب کی کتابوں کو بھی لیجیے تو ان سب میں یہی بات سامنے آتی ہے کہ خدا نے کہا ”کن“ جیسا کہ

① F.J. Sheen نے اپنی کتاب Philosophy of Religion (1948) میں لکھا تھا کہ ”سائنس کتابِ فطرت (Book of Nature) کو پڑھتی ہے اسے لکھتی نہیں“۔ لیکن اس کتابِ فطرت کے مطالعہ کرنے والوں کا اعتراف ہے کہ سائنس محض سطح کائنات کی کتاب خوانی ہے اس کی کنہ و حقیقت کا علم اس کے اندر ہے ہی نہیں نہ ہی ہو سکتا ہے چنانچہ ریڈنگ یونیورسٹی کا طبیعیات کا پروفیسر ڈاکٹر جیمز آرٹلڈ کروٹھر لکھتا ہے کہ ”نظامِ فطرت اپنی گہری بنیادی سادگی میں اس قدر تغیر انگیز ہے کہ دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر آخری انسان کے لیے ہی چھوڑ دینا پڑتا ہے“۔ (Mason, F., (Ed): The Great Design (1934), P, 52)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویز انسان نے کیا سوچا؟ طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، 2002ء، ص 89-100۔

ہمارے ہاں ہے کہ کُن کہتے ہی یہ کائنات وجود میں آگئی۔ یعنی جس طرح سے جو چیزیں آج ہمیں نظر آتی ہیں: یہ چاند یہ ستارے یہ پہاڑ یہ دریا یہ درخت یہ مویشی یہ حیوانات اور انسان بھی خدا نے حکم دیا اور یہ سب چیزیں اسی شکل میں پیدا ہو گئیں اور اسی شکل میں اُسی طرح سے پہلے دن سے آج تک چلی آرہی ہیں۔ چودہ سو سال پہلے ہی نہیں بلکہ دو تین سو سال پہلے تک بھی تخلیق کائنات کا تصور یہی تھا۔ یہ آیت بڑی ہی مشکل ہے اور میں کوشش کروں گا کہ آپ کو عام فہم میں الفاظ میں سمجھا سکوں۔

مجھے افسوس یہ ہے کہ میرے بار بار کہنے کے باوجود قرآن کے نسخے آپ کے سامنے نہیں ہوتے، یہ الفاظ دیکھنے نہایت ضروری ہیں اور اگر یہ دونوں ذرائع ابلاغ یعنی کان اور آنکھ دونوں اکٹھے ہو جائیں تو ان کا اثر بڑا گہرا پڑتا ہے۔ آپ صرف کانوں سے سنتے ہیں، آنکھوں سے قرآن کو نہیں دیکھتے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ کچھ دو تین سو سال پہلے تک بھی یورپ کے جو سائنسٹ بھی تھے بلکہ سائنسٹ تو کم ہی تھے مفکر زیادہ تھے ان کے ہاں بھی تصور یہی تھا کہ دنیا میں جتنی چیزیں موجود ہیں وہ اسی شکل میں سامنے آگئیں۔ خود آدمی کے متعلق تو یہ بہر حال تورات میں موجود ہے، دنیا کی ہر کتاب میں موجود ہے کہ خدا نے پہلے ایک آدمی کو پیدا کر دیا اور پھر اُس کے بعد اُس کی پبلی سے عورت کو پیدا کر دیا۔ یعنی آدمی عورت جیسے آج نظر آتے ہیں اسی طرح سے پیدا کر دیئے گئے تھے۔ ساری کائنات کے متعلق یہ چیز چلی آرہی تھی کہ یہ اسی طرح سے پہلے حکم کے ساتھ اُسی شکل میں یہ چیزیں وجود میں آگئیں جس شکل میں یہ آج ہمارے سامنے ہیں۔

دو تین سو سال پہلے خارجی کائنات اور انسان کی تخلیق کے متعلق سائنس کی تحقیق کا آغاز

اسے ذہن میں رکھیے کہ کل تک مذاہب کی دنیا کا یہ علم، فکر کی دنیا کا مسلمہ تھا۔ کوئی دو تین سو سال پہلے اس کے اوپر تحقیقات ہونی

شروع ہوئیں۔ اُس تفصیل میں تو میں نہیں جاسکوں گا۔ یہ بات Discover (بے نقاب) ہوئی جسے Theory of Evolution (نظریہ ارتقا) کہتے ہیں۔ سائنس نے یہ Discover (بے نقاب) کیا کہ یہ جو بھی خارجی کائنات انسانوں سمیت ہے یہ پہلے دن سے اسی شکل میں سامنے نہیں آگئی تھی بلکہ ہر شے کا آغاز بڑی Crude (خام سی) شکل میں بڑے پست درجے میں ہوا یعنی اُس کی ابتدا اس طرح سے ہوئی تھی۔ پھر وہاں سے ہر شے جس کی ابتدا اس طرح کے پست درجے کے نقطہ سے ہوئی تھی وہ ہزاروں لاکھوں سال کی منزلیں طے کرتی ہوئی Evolve کرتی یعنی بنتی اور ابھرتی ہوئی موجودہ شکل میں پہنچی، یہ تخلیق By Revolution (انقلاب سے) نہیں ہوئی

بلکہ By Evolution (ارتقا سے) ہوئی ہے۔ Evolve ہونے یعنی بننے اور ابھرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک شے جو پست درجے کی ہے اُس میں سے کوئی دوسری شے اُس سے بہتر نکلے اور وہ آگے بڑھے اور اس طرح سے رفتہ رفتہ بتدریج مختلف منازل طے کرتے ہوئے وہ آگے پہنچے۔ چنانچہ یہ جو Theory of Evolution (نظریہ ارتقا) تھی ویسے تو ڈارون (Darwin: 1809-82) کی طرف منسوب کی جاتی ہے اُس سے پہلے بھی تھی اور اس کے ساتھی بھی تھے۔ اس کے اوپر اس دوسو سال میں بہت زیادہ کام ہوا ہے۔ ایک ایک شے کے متعلق خود یہ جو ہمارے ہاں کی محسوس کائنات جسے ہم یہ زمین اور اجرام فلکی کہتے ہیں جسے یہ خارجی کائنات کہتے ہیں، گرانقدر تحقیق ہوئی ہے۔ میں کبھی اس طرف آؤنگا تو بتاؤں گا کہ اس کے متعلق بھی تحقیق ہوئی ہے اور وہ کس طرح سے قرآن کی ایک ایک آیت کی تصدیق کیے جاتی ہیں۔

کوئی شے بھی By Revolution (انقلاب سے) وجود میں نہیں آئی

آج وہ اصول ہمارے سامنے آتا ہے جو انہوں نے بیان کیا ہے کہ ہر شے کی ابتدا یعنی آغاز بہت پست ترین نقطے سے ہوا ہے اور پھر وہ شے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی ہزار ہزار سال کا ایک ایک مرحلہ طے کرتی ہوئی Evolve کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہوئی اس مقام تک پہنچی ہے جو ہمارے سامنے ہے جو آج ہمیں نظر آ رہا ہے۔ یوں یہ شے بتدریج یہاں تک پہنچی ہے اس طرح سے یہ شے بنی ہے پہلے ہی دن اسی طرح سے By Revolution (انقلاب سے) وجود میں نہیں آگئی تھی۔ پہلا نقطہ آغاز کیسے ہوا؟ اس کے متعلق نہ سائنس کچھ کہہ سکی ہے نہ کہہ سکے گی لیکن یہاں سے سائنسٹس نے بات شروع کی ہے کہ ہر موجود شے کا نقطہ آغاز جس کو وہ اب تک Discover (بے نقاب) کر سکے ہیں وہ کیا تھا اور پھر وہ مختلف مراحل میں سے جو گزرے ہیں ان مراحل کو بھی Discover (بے نقاب) کرتے گئے ہیں۔ وہاں تو ایک ایک شعبے کے متعلق اس قسم کی ریسرچ ہو رہی ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ ایک ایک سائنسٹس کی پوری عمر ایک کیڑے کی زندگی کے متعلق ریسرچ کرنے میں گزر جاتی ہے ایک ایک پتے کے اوپر ان کی زندگی گزر جاتی ہے۔ فلکیات والے الگ ہیں زمین والے الگ ہیں بائیالوجی والے الگ ہیں یہ تمام شعبے موجود ہیں اور یہ اُس میں اسی چیز کے اوپر لگے ہوئے ہیں کہ کس شے کا نقطہ آغاز کیا تھا اور وہ کن مراحل میں سے گزری ہے اور اس کے بعد اس طرح سے وجود میں آئی۔ یہ ریسرچ کل کی بات ہے اور ہم بات کر رہے ہیں چودہ سو سال پہلے کی کہ جب ساری دنیا میں وہ تصور تھا کہ یہ ساری کائنات ہر شے

آدم تک خدا نے حکم دیا اور اسی شکل میں یہ وجود میں آگئی۔

خدا کی دودنیاؤں کا ذکر: عالم امر اور عالم خلق

آپ کو یاد ہوگا میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ یہ یاد رکھنے کی باتیں ہیں، محض سن کر بھلا دینے کی نہیں ہیں۔ قرآن نے ایک عالم امر کہا ہے اور ایک عالم خلق کہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے بتایا تھا کہ یورپ کا ایک بہت بڑا مفکر ہے اس کا نام Andrew Seth Pringle - Patison (1856-1931AD) ہے۔ اُس نے یہ کہا تھا کہ عربی زبان ہمارے مقابلے میں بڑی Advantageous (فائدہ مند) پوزیشن میں ہے، بلکہ وہ تو مسلمانوں سے کہتا تھا کہ جس زبان میں ان کی کتاب ہے اُس اعتبار سے یہ قوم ہمارے مقابلے میں بڑی Advantageous (فائدہ مند) پوزیشن میں ہے کہ ہماری زبان میں Creation یا تخلیق کے لیے ایک ہی لفظ Creation ہے جبکہ ان کے ہاں اس کے لیے دو الفاظ ہیں: عالم امر ہے اور عالم خلق ہے ^① اور اُس نے کہا ہے کہ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ خود یہ زبان بتا رہی ہے کہ ان لوگوں کا ذہن کہاں تک پہنچا ہوا تھا۔ قرآن نے یہ دونوں لفظ کیوں استعمال کیے ہیں؟ سمجھنے کے لیے تو مثال انسانوں کی ہی دی جائے گی ورنہ یہ کہنا کہ خدا کے ذہن میں یہ تصور تھا، یہ Imagination تھا، سمجھنے کے لیے تو بات انسانوں کی ہے۔ کسی آرکیٹیکٹ نے کوئی چیز بنانی ہو یا تخلیق کرنی ہو تو پہلے اُس کے ذہن میں اُس کا ایک تصور آتا ہے، ایک نظریہ آتا ہے، ایک نقشہ آتا ہے، ایک اسکیم ہوتی ہے جبکہ وہ چیز فی الواقعہ موجود نہیں ہوتی، اُس کی محسوس شکل نہیں ہوتی۔ لیکن اُس کے تمام خطوط اُس کا نقشہ، وہ ساری اسکیم اُس خالق کے ذہن میں ہوتی ہے۔ اب اُس کے بعد جب وہ چیز مکمل کرتا ہے اور پھر وہ ڈرائنگ کے اعتبار سے اپنی اسکیم کو کاغذ پہ بھی لے آتا ہے پھر اُس کے بعد جب وہ اس کی تعمیر شروع کرتا ہے تو یہاں سے وہ تخلیق کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ یعنی کسی اسکیم کا محسوس شکل میں آنے کا جو مرحلہ ہے

① . Pringle - Pattison deplors that the English language possesses only one word, 'Creation', to express the relation of God and the Universe of extension on the one hand, and the relation of God and the human ego on the other. The Arabic language is, however, more fortunate in this respect, It has two words khalq and Amr to express two ways in which the creatine activity of God reveals to us, Khalq is creation, Amr is direction (Iqbal, Allama Muhammad: The Reconstruction of Religious Thought in Islam, (Edited and Annotated by M.Saeed Sheikh), Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 1986, P.82).

وہ ہے جسے تخلیق کہا جائے گا، خلق کہا جائے گا۔ پہلا حصہ جو اس کا ہے وہ عالم امر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی چیز بھی جو قاعدے قانون کے مطابق وجود میں آئے گی اُس کے لیے یہ عالم امر یعنی اسکیم کا جو عالم ہے، نقشہ بنانے کا جو مرحلہ ہے، یہ کتنا اہم مرحلہ ہے۔ اور یہیں سے یہ بات سامنے آجائے گی کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ یہ کائنات By Chance (اتفاقاً) کسی طرح سے وجود میں آگئی۔ تو جو چیز اس طرح سے کسی اسکیم کے ماتحت سوچے سمجھے تصور کے مطابق، تخلیق یا محسوس شکل میں سامنے آئے اُس کو بانی چانس (اتفاقاً) نہیں کہا جاسکتا۔ پہلی چیز تو یہی ہے جو قرآن نے اس تصور کو کہ ہر چیز پہلے ہی دن سے مکمل شکل میں پیدا کر دی کو کاٹ کر رکھ دیا ہے اس لیے کہ

تیرا پتہ نہ پائیں تو لاچار کیا کریں

عالم امر کے متعلق انسانی سوچ کی بے چارگی

کسی چیز کا Beginning (آغاز) ہے، یعنی یہ کہ وہ عدم سے وجود میں کیسے آتی ہے، اس کے متعلق ذہن انسانی کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے ان سائنس دانوں نے یہ کہا کہ Somehow (کسی نہ کسی طرح سے) یہ وجود میں آگئی۔ قرآن 'کسی نہ کسی طرح' سے نہیں کہتا، اس لیے کہ اس کے ہاں ایک عالم امر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ یونہی بانی چانس (اتفاقاً) وجود میں نہیں آگئی بلکہ اس کے خالق نے اس کے متعلق پہلے ایک اسکیم مرتب کی، ایک تصور تھا، ایک نظریہ تھا، ایک نقشہ تھا، پورا ڈیزائن تھا، وہ اس کے سامنے تھا۔ پھر اُس کے مطابق اُس نے اس کی تخلیق کی ابتدا کی، گویا یہ بات بانی چانس (اتفاقاً) نہیں ہوئی بلکہ اُس اسکیم کے مطابق ہوئی۔ ہم اس مقام پہ آج کھڑے ہیں، علم انسانی اس مقام تک آج پہنچا ہے۔

14 سو سال پیشتر نظریہ ارتقا کی وضاحت اور لفظ تدبیر کا مفہوم

اب آئیے اس طرف جو چودہ سو سال پہلے اس کتاب نے کہا ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا (32:4) ارض و سماوات اور اس کے درمیان جو کچھ ہے وہ اللہ نے تخلیق کیا۔ اس سے اگلی آیت یہ ہے کہ یہ جو خدا نے پیدا کیا تو کیا یہ اُسی طرح سے ہے کہ اُس نے کن کہد یا اور ہر شے اپنی اس شکل میں جس میں آج موجود ہے وہ وجود میں آگئی؟ کہا کہ نہیں۔ خلق کے بعد یہ بات جو آگے کہی ہے وہ فوراً کہا کہ یہ تخلیق تو وہ مرحلہ ہے جس میں کوئی شے محسوس شکل پر تمہارے سامنے آتی ہے، بات اس سے بہت پہلے شروع ہوتی ہے۔ اس تخلیق کے لیے خدا نے کیا کیا تھا اور کیا کر رہا ہے؟ وہ تو آج بھی اس سے غافل نہیں ہے کہا ہے۔ کہ يَزِيدُ فِي

الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ (35:1)۔ اس میں تواضاً نے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کیسے وجود میں آئی اور وہ کرتا کیا ہے؟ عزیزانِ من! ایک ایک لفظ پر غور کیجیے گا۔ کہا ہے کہ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يُعْرِجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (32:5)۔ امر تو میں نے آپ کو بتا دیا کہ وہ ایک اسکیم مرتب کرتا ہے۔ تدبیر کا لفظ تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ اس کے عام معنی غور و فکر کیے جاتے ہیں لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ عربی زبان تو بڑی وسیع زبان ہے۔ اُس کی وسعتوں کے اندر سے وہ ایک لفظ کا انتخاب کرتا ہے اور خود اُس لفظ کا انتخاب یہ بتاتا ہے کہ یہ واقعی کوئی انسانوں سے بلند فکر ہے جس نے ان سینکڑوں لفظوں میں سے اس مقصد کے لیے ایک خاص لفظ کا انتخاب کیا ہے۔ عربی زبان میں غور و فکر کے لیے ہزاروں الفاظ تھے قرآن کریم میں اس کے لیے متعدد الفاظ ہیں: فکر، عقل، شعور، علم۔ یہاں تدبیر کا لفظ ہے يدبر الامر (32:5)۔ سنئے اور جھوم جائیے عربی زبان کی وسعت پر اور قرآن کے انتخاب پر۔ یہ جو ”دب ر“ مادہ ہے اس کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی شے کا آخری حصہ کسی شے کا انجام، آخر میں جو چیز آئے۔ تدبیر کہتے ہیں کہ کسی شے کے آخر تک، نقطہ تکمیل تک کی جو پوزیشن ہے اُس کو سامنے رکھ کر شروع سے بات کرنا۔ عزیزانِ من! آپ غور کرتے ہیں کہ قرآن شے کیا ہے!

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

آغاز سے تکمیل تک کے تمام مراحل کو پیش نظر رکھتے ہوئے ارض سے سما کے سفر کی رونداد

لفظ تدبیر سے ساری بات حل ہو جاتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ انجام کار اس شے نے بنا کیا ہے۔ وہی اسکیم کامیاب ہو سکتی ہے جس میں اسکیم بنانے والا یہ دیکھے کہ آخر میں اس نے بنا کیا ہے۔ یعنی وہ ابتدا پر نہ پہنچے بلکہ وہ یہ دیکھے کہ اس نے آخر الامر بنا کیا ہے اور اُسے سامنے رکھ کر پھر اس اسکیم کو چلائے۔ اُس کا جو الامر ہے اُس کی جو تخلیق کائنات کی اسکیم ہے وہ اس کے آخری نقطہ تکمیل کو سامنے رکھ کر اس کی ابتدا کرتا ہے۔ سما کے معنی آسمان اور ارض کے معنی ہم زمین لیتے ہیں تو یہ بھی معنی ہیں لیکن بنیادی طور پر سما بلندی کو کہتے ہیں اور ارض پستی کو کہتے ہیں۔ کہا کہ وہ پہلے ایک تدبیر کرتا ہے اسکیم مکمل کرتا ہے اور وہ اسکیم بلندی کے اوپر طے ہوئی ہوتی ہے لیکن جب وہ اُس کو تخلیق میں لانا چاہتا ہے اُس کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے کہ امر محسوس شکل میں سامنے آجائے تو وہ امر جو سما کی بلندیوں میں طے ہوئی تھی اُس کو ارض سے شروع کرتا ہے پست ترین نقطہ سے شروع کرتا ہے۔ عزیزانِ من! آپ غور فرما رہے ہیں کہ قرآن کیا کچھ کہے چلے جا رہا ہے۔ نقطہ

آغاز سے یعنی وہ پست ترین درجے سے اُس کو شروع کرتا ہے۔ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ (32:5) پھر پست ترین نقطہ سے جو وہ شے آغاز ہوئی ہے وہ اسے بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یہاں لفظ يَعْرُجُ ہے۔ اس کے معنی بلندی کے ہیں لیکن یہاں پھر اس انتخاب کی داد دیجیے اور جھوم جائیے۔ کہا یہ ہے کہ پھر اس نقطہ آغاز سے وہ شے بلندیوں کی طرف چڑھنا شروع کرتی ہے۔ دو باتیں یاد رکھیے! ان میں ایک تو یہ ہے۔ قرآن کریم میں کائنات کے متعلق خود خدا کے متعلق کہا ہے کہ اُس کا یہ جو نظام ہے وہ صراطِ مستقیم ہے یعنی سیدھا راستہ ہے۔

کائنات کو صرف دائروں کی گردش میں محدود کرنے کا تصور فکرِ قرآنی کے خلاف ہے

آپ کو یاد ہوگا میں نے ایک درس میں بتایا تھا کہ حکمائے یونان سے لے کر آخر تک وہ کائنات کے متعلق کہتے تھے کہ یہ Cyclic Order (دائری نظم) میں گردش کر رہی ہے یعنی یہ گردش میں تو ہے لیکن آگے نہیں بڑھ رہی بلکہ کسی ایک ہی چکر کے اندر گردش کر رہی ہے جہاں سے شروع ہوئی ہے آخر میں وہیں آکر پہنچتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ

مِ نَ سِرْدِ خَدَائِ رَا

یہ تو پھر بیکاری بات ہے کہ کسی شے کو گردش دیئے چلے جانا اور وہ آگے نہ بڑھے۔ اُس نے اسی لیے Cyclic Order (دائری گردش) کی بجائے صراطِ مستقیم کہا ہے۔ ایک چیز تو اس میں یہ ہوگئی کہ اُس نے آگے بڑھنا ہے لیکن صرف آگے ہی نہیں بڑھنا بلکہ يَعْرُجُ إِلَيْهِ (32:5) سیدھا بھی جانا ہے اور بلند بھی ہوتے چلے جانا ہے۔ اب اس بلندی کے متعلق لفظ آگیا۔ جیسا میں نے کہا تھا کہ خود لفظ تدبیر میں یہ چیز موجود تھی کہ اُس چیز کا جو نقطہ تکمیل ہے اُس کو سامنے رکھ کر اُس اسکیم کو مرتب کرنا۔ کہا کہ یہ شے اپنے پست ترین نقطہ سے آگے بڑھ رہی ہے لیکن آگے ہی نہیں بڑھ رہی بلکہ يَعْرُجُ إِلَيْهِ (32:5) بلند بھی ہو رہی ہے۔ اور بلندی کے لیے میں نے کہا کہ اس لفظ کا مادہ ”ع ر ج“ سے ہے جس کو ہم عام طور پر عروج کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ سیڑھیوں کی طرح اوپر چڑھنا، بتدریج بلند ہونا، Gradually (درجہ بدرجہ) جانا، درجہ سیڑھی کے ایک ڈنڈے کو کہتے ہیں۔ لفظ عروج جو ہے اُس میں ضروری ہے کہ بلندیوں کی طرف چڑھے لیکن مدارج کی رو سے چڑھے۔ اسی لیے معراج سیڑھی کو کہتے ہیں۔ خدا کے متعلق جہاں اُس نے کہا کہ اِنَّ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (11:56) میرا خدا خود صراطِ مستقیم پہ ہے اُس کے ساتھ ہی کہا کہ وہ ذی المعارج ہے یعنی وہ سیڑھیوں والا خدا ہے۔

ارتقائی منازل کے لیے قدرت کا ایک ایک دن پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے

عزیزانِ من! پوچھو یورپ کے سائنسٹس سے کہ وہ کس طرح ان چیزوں پہ جھومتا ہے! وہ شے سیدھا بھی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ اونچا بھی چڑھتی جاتی ہے، غبارے کی طرح اونچا نہیں چڑھتی یا ہوائی جہاز کی طرح فوراً اونچا نہیں چڑھتی بلکہ وہ بتدریج مراحل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور اوپر جاتی ہے۔ خداذی المعارج ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو رفیع الدرجات (40:15) کہا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جو سیڑھی کا ایک ایک ڈنڈا ہوتا ہے، زینہ ہوتا ہے، اُس کو عرب درجہ کہتے ہیں۔ گویا عروج کے لفظ کے اندر یہ بات آگئی کہ اُس نے بلندیوں کی طرف جانا ہے لیکن بتدریج جانا ہے، یکلخت نہیں جانا ہے۔ Evolution (ارتقا) کے تو معنی ہی یہ ہیں، اُس کے اندر ارتقا تو ہے، اُس میں بلند ہونا تو ہے لیکن وہ جس طرح یکلخت اپنی آخری شکل میں وجود میں نہیں آگئی تھی بلکہ نقطہ آغاز سے وجود میں آئی ہے اور آہستہ آہستہ اُس نے تکمیل تک پہنچنا ہے۔ اسی طرح سے وہ شے اپنی تکمیل تک پہنچتی ہے اسے بلندیوں کی طرف جانا کہا ہے، اُس کا عروج کہا ہے۔ یہ شے یکلخت بلند نہیں ہو جاتی بلکہ بتدریج بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور وہ جو مراحل ہیں فی یوم (32:5) جن میں وہ بتدریج گزرتی ہے یوم کے معنی Period یا مرحلہ یا منزل ہوتے ہیں۔ کہا کہ كَانَ مِقْدَارُهُ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (32:5) وہ ایک ایک مرحلہ تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہے۔ اور دوسری جگہ کہا ہے کہ خَمْسِينَ اَلْفَ سَنَةٍ (70:4) پچاس پچاس ہزار سال کا ایک ایک مرحلہ ہے۔ وہ سیڑھی کا ایک زینہ تمہارے حساب و شمار سے پچاس پچاس ہزار سال کا ہے جس میں یہ شے اس طرح سے بتدریج بلند ہوتی ہوئی اُس نقطے تک پہنچتی ہے جو اس اسکیم میں اس کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔

کسی منزل کے حصول کے لیے Direction (سمت) کی اہمیت

اب اس ارتقا (Evolution) میں بتدریج جانا بھی ہے۔ اس کے لیے لفظ ہے الیہ۔ یہ جو الیہ ہے اس میں Direction (سمت) ہے کیونکہ کسی شے تک پہنچنے کے لیے Direction (سمت) کا ہونا نہایت ضروری ہے، ڈائریکشن (سمت) بڑی اہم چیز ہے۔ Chesterton, Gilbert Keith (1874-1936) کی ایک کتاب ہے: An Essay on Heretics اس نے اس کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ یہ لفظ جس کو ترقی کہتے ہو، جس کو پروگریس کہتے ہو، یہ بے معنی ہو جاتا ہے تاوقتیکہ آپ پہلے ڈائریکشن (سمت) کا تعین نہ کریں اور ڈائریکشن (سمت) بے معنی ہوتی ہے تاوقتیکہ آپ Destiniation یا نصب العین کا تعین نہ کریں۔ یہ ”الی“

”جو ہے وہ ڈائریکشن (سمت) ہے۔ الیہ کی اس ”ہ“ نے بات واضح کر دی کہ یہ وہ نقطہ تکمیل ہے جو اس کے لیے طے کیا گیا تھا۔ یہ اس شے کے آگے بڑھنے اور بلند ہونے کی جو ڈائریکشن ہے اُس نقطہ تکمیل کی طرف ہے۔ یہ اُدھر بلند ہوتی ہوئی چلی جاتی ہے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی لیے ہمارے ہاں ترقی کے لیے لفظ ارتقا کہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ رقی کے معنی بھی بلند ہونا ہے لیکن قرآن نے جو بلندی کے لیے عروج کا لفظ استعمال کیا ہے تو یہ ہے جو صحیح طور پہ اس چیز کو Depict (ظاہر) کرتا ہے کہ اُس نے بتدریج بلند ہونا ہے۔ سائنس کی Discoveries (اکشافات) یہ کہتی ہیں کہ لائف (زندگی) کا نقطہ آغاز (پہلا جرثومہ) جو ہے وہاں سے اس کی تشکیل کا آغاز ہوتا ہے۔ ہزار ہا سال میں کہیں ایک مرحلہ طے ہوتا ہے، یعنی وہ جرثومہ آگے بڑھتا ہے۔ اس آگے بڑھنے کے لیے قرآن کریم نے یہ بات کہی ہے کہ ہر شے کے زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے حرکت اور جدوجہد ضروری ہے۔ حرکت ضروری ہے، سخت کوشی ضروری ہے، اس لیے کہ یہ ارتقا کا کچھ اس قسم کا سلسلہ ہے کہ ہر شے کے راستے میں موانعات آتے ہیں، رکاوٹیں آتی ہیں، مخالفتیں ہوتی ہیں اور ان کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے۔ جو شے یہ ثابت کر دیتی ہے کہ ان ٹکراؤ کے مقابلے میں وہ ان پہ غالب آنے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ زندہ رہتی ہے اور جب راستے میں اُس مانع چیز کو وہ توڑ دیتی ہے تو ایک قدم آگے بڑھتی ہے۔ اسے ارتقا کہتے ہیں۔ یہ جو Evolution (ارتقا) کی تھیوری (نظریہ) ہے، یہ اُس کی بنیاد ہے۔ وہ جو پرانے زمانے کے Fossils (آثارِ متحجرہ) ہیں، جو نیچے زمین میں، برفوں میں، دبے ہوئے پتھر نکلے ہیں، وہ بڑے بڑے عظیم الجثہ جانوروں کے ہیں اور اُس کے بعد وہ اس ہسٹری میں بتاتے ہیں کہ کونسی ایسی تھی، جس میں اس کی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ موانعات کا مقابلہ کر سکے۔ وہ یا تو وہیں ٹھہر کر جامد ہو کر رہ گئی، جسے قرآن نے جحیم یا جہنم کہا ہے اور یا اُس کے اوپر موت وارد ہو گئی۔ یہ جو ان اشیاء کے Fossils (متحجرات) ہیں جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رہی، حرکت جدوجہد اور موانعات کے اوپر غلبہ پانے کی صلاحیت نہیں تھی۔ وہ یا جامد ہو کر رہ گئیں یا ختم ہو گئیں۔ اور جن میں یہ صلاحیت موجود تھی وہ ہیں جو آگے بڑھیں کہ ”اداک ڈنڈا اتے چڑھ گئی“^①۔

ہم نے جیسے علامہ اقبالؒ کو، صرف شاعر مشرق کے الفاظ میں ہی محدود کر رکھا ہے

موضوع کچھ خشک ہوتا جا رہا ہے اس لیے اس میں تھوڑی سی لطافت پیدا کی جائے اور ہمارے لیے تو لطافت اور رعنائیوں کے لیے

① وہ ایک منزل تو آگے بڑھی۔

بڑا ذخیرہ موجود ہے کیونکہ اقبالؒ (1877-1938AD) جو موجود ہے۔ یہ ہماری بد قسمتی تھی کہ ہم اسے صرف شاعرِ مشرق ہی کہہ سکے، ہم اس سے زیادہ اُس کو سمجھ ہی نہیں سکے۔ ارتقا جیسی تھیوری اور شعریت کو ملا کر رعنائی اور لطافت پیدا کرنا آسان کام نہیں ہے۔ آپ پہلے یہ دیکھیے کہ اقبالؒ کے کلام میں کتنی رنگینیاں، رعنائیاں، دلکشاں اور دل فریبیاں ہیں۔ یہ مسئلہ اتنا مشکل ہے کہ میں اسے نثر میں بیان کر رہا ہوں تو کہہ رہا ہوں کہ خشکی پیدا ہو رہی ہے۔ ٹکراؤ، حرکت، حرارت، جدوجہد اور ٹکراؤ کے بعد اگر کامیابی ہوئی ہے تو ایک قدم آگے بڑھنا ہے۔ یہ نظم ارتقاء، باغِ در میں ہے۔ کہا کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغِ مصطفویٰ سے شرارِ یلہی

تعمیری قوتوں اور تخریبی قوتوں کا یہ ٹکراؤ شروع سے چلا آ رہا ہے۔ یہی ارتقاء ہے۔

حیاتِ شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز

سرشت اس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی

یعنی جہاں زندگی ہے تو اس زندگی کی خصوصیت یہ ہے کہ شعلہ مزاج ہے، اُس کے اندر حرارت ہے، یہ غیور واقع ہوئی ہے، بے حمیت

واقع نہیں ہوئی، بزدل واقع نہیں ہے بلکہ شور انگیز واقع ہوئی ہے، اس کی سرشت مشکل کشی ہے، جفا طلبی ہے۔

سکوتِ شام سے تا نغمہٗ سحر گاہی

ہزارِ مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی

کشاکشِ زم و گرما، تپ و تراش و خراش

زخاکِ تیرہ دروں تابہٗ شیشہٗ حلبی

سیاہ رنگ کے پتھر یا ریت کو آئینہ بننے کے لیے ان ان مرحلوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید

میانِ قطرہٗ نیشان و آتشِ غلی

عزیزانِ من! اس کو سمجھنے کے لیے بھی شعریت کی تاریخ سامنے رکھنی پڑتی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ بہار کا موسم ہوتا ہے؛ بارش ہوتی ہے تو ایک قطرہ ایسا ہوتا ہے جو ایک سیپ کے اندر جاتا ہے اور وہ سیپ اُس قطرے کو اپنے اندر بند کر لیتی ہے پھر اُس کے اندر وہ قطرہ ہزار ہزار مراحل گزرنے کے بعد گہر بن جاتا ہے۔ اس نے جو کہا ہے کہ قطرہ نیشان کو شراب بننے کے لیے کتنے مرحلوں میں سے گزرنے کی ضرورت ہے کہ یہ قطرہ نیشان شراب بن جائے۔ یہ پہلے شاعر کا شعر تھا انہوں نے وہاں سے بات لی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ

طاق را سربز کن اے ابرِ نیشانِ بہار

نیسانِ بہار کے بادل! تو یہ جواگور کی بیل ہے اس پہ برس، کھیت میں برسنے سے کیا فائدہ!

قطرہ گرے می تواند چرا گوہر شود

یہ تیرا ایک قطرہ اگر شراب بن جائے تو اس نے موتی بن کر کیا لینا ہے تو وہاں اپنے آپ کو کیوں ضائع کر رہا ہے۔

اِسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام

یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

”مغاں کہ داتہ انگور آب می سازند

ستارہ می شکند‘ آفتاب می سازند“

شراب کو کشید کرنے والے جواگور کے دانے کو توڑتے ہیں تو انگور کے اندر رس ہوتا ہے، مٹھاس ہوتی ہے، نشہ نہیں ہوتا۔ یہ ارتقا کی پچھلی منزل ہے۔ وہ جب تک ٹوٹتا نہیں اگلی منزل میں نہیں پہنچتا، ٹوٹنے کے بعد جب اگلی منزل میں پہنچتا ہے تو وہی اُس کا جو شیرہ ہے وہ شراب بن جاتا ہے۔

آپ غور فرما رہے ہیں کہ فطرت نے اس اقبالؒ کو کیا صلاحیتیں دی تھیں۔ وہ Evolution (ارتقا) کی تھیوری (نظریہ) بیان کر رہا ہے۔ یہ قرآن کی آیت ہے کہ اگر حیات میں حرکت، حرارت، ٹکراؤ، تصادم، موانعات پہ غلبہ پانے کی صلاحیت ہو تو ہر ٹکراؤ کے بعد اگلا قدم پچھلے قدم سے آگے بڑھتا ہے اور اوپر چڑھتا ہے۔ یہ ہے:

مغاں کہ داتہ انگور آب می سازند

ستارہ می شکند‘ آفتاب می سازند

قرآن کہتا ہے کہ **ثُمَّ يَعْرِجْ إِلَيْهِ** (32:5)۔ آپ نے ایک ایک لفظ پر غور کیا کہ تدبر کہا، امر کہا، سماء کہا، ارض کہا، **يَعْرِجْ إِلَيْهِ** کہا۔ الیہ نے Direction (سمت) متعین کی۔ ”الی“ کے معنی ہی ڈائریکشن (سمت) ہوتا ہے۔ اور بات صحیح ہے کہ جب تک سامنے Destination (نصب العین) نہ ہو، منزل متعین نہ ہو، اُس وقت تک سمت بے کار ہے۔ اور Destination (نصب العین) ہو اور اُس کی طرف سمت نہ متعین کی گئی ہو تو پھر بھی آپ وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ صراطِ مستقیم اس لیے ضروری ہے۔ یہ ہے ”الیہ“۔ پہلے لفظ تدبر ہے، تدبر کے معنی ہی یہ ہیں کہ آخری نقطہ تکمیل کو سامنے رکھ کر کسی شے کی ابتدا کرنا۔ یہ الیہ ہے۔ ہر شے اس پروسس عمل اس ذریعے سے اپنے اُس Destination (نصب العین) کی طرف چلی جا رہی ہے، بڑھتی جا رہی ہے، بلند ہوتی ہوئی چلی جا رہی ہے، اس کا ایک ایک مرحلہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہے۔ کہا کہ یہ جو عمل ہے یہ کون کر رہا ہے۔ کہا کہ **ذَلِكَ عَلِيمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ** (32:6) یہاں اس آیت میں چار صفات آگئیں۔ یہ غیب کیا ہے؟ یہ شہادت کیا ہے؟ جو شے بھی نقطہ آغاز سے شروع ہوئی ہے اُس ایک بوند یا نقطے کے اندر وہ شے بننے کی Potentialities (صلاحیتیں) یا ممکنات موجود ہیں جس کے لیے اُس کا آغاز ہوا ہے۔ یہ چیز ابھی مشہود طور پر سامنے نہیں آئی بلکہ اُس کی صلاحیتیں اندر چھپی ہوئی ہیں، مضمحل ہیں۔ اس کو Potentialities (صلاحیتیں) کہتے ہیں جو Actuality (بازر حالت میں) میں ابھی نہ آئی ہوئی ہوں بلکہ اُس میں وہ کچھ بننے کی صلاحیت ہو۔ جب تک وہ صلاحیت مشہود نہیں ہوتی، محسوس طور پر سامنے نہیں آتی اُسے غیب کہا جاتا ہے۔ اس آیت میں کہا کہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کسی شے میں بننے کی صلاحیت کیا ہے اور اُسے شہادت کا بھی علم ہے کہ وہ کیا بن گئی ہے۔ یعنی اس شے نے آخر الامر کیا بننا ہے، یہ بھی اُسے پتہ ہے اور کتنا بن چکی ہے، یہ بھی اُس کو پتہ ہے۔ اس لیے جب اُس کو یہ معلوم ہے کہ یہ جو یہ کچھ بن چکی ہے اس کے لیے یہی نقطہ آخری نہیں بلکہ اس میں بہت کچھ بننے کی ابھی صلاحیتیں ہیں تو وہ اس شے کو وہاں کھڑا نہیں رہنے دے گا بلکہ وہ اُس کو آگے وہاں تک چلائے گا جہاں تک کہ یہ غیب مشہود نہ ہو جائے، غیب شہادت نہ بن جائے۔

لفظ عزیز کے ساتھ رحیم کا استعمال کیوں؟

اس آیت میں کہا ہے کہ **عَلِيمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ** (32:6)۔ یہاں عزیز کے ساتھ رحیم آیا ہے ورنہ عام طور پر حکیم آیا کرتا ہے۔ کہا کہ ذرہ ناچیز کو پہاڑ بنانے کے لیے بڑے غلبے اور قوت کی ضرورت ہے، پھر ان کو اس طرح سے اُس لائن کے اوپر

چلانے کے لیے ارتقا کے راستے کے اوپر آگے لے جانے کے لیے بڑی قوت اور غلبے کی ضرورت ہے تو خدا العزیز بھی ہے لیکن اُس کا غلبہ سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کے لیے ہے اور وہ بھی بغیر کسی قسم کی کوشش اور سعی و تاب کے ہے۔ یہ رحمت ہے کہ ہر شے کو سامانِ نشوونما پہنچاتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر اُس کو اُس ڈائریکشن (سمت) کے اوپر چلانے کے لیے اُس کے پاس قوت بھی موجود ہے۔ یہ اُس خدا کی اسکیم ہے جو اس طرح سے اس کائنات کے اندر کار فرما ہے۔ یہاں تک ہم نظریۂ ارتقا کے اُس حصے تک پہنچے ہیں جو یورپ کے سائنسدانوں کا حال ہی میں Discover (بے نقاب) کردہ ہے۔

انسانی زندگی کی ارتقائی سوچ کے سلسلہ میں ایک غلط نگہی آج پوری نوع انسانی کے لیے عذاب کا باعث بنی ہوئی ہے

اب اس مقام پہ پہنچنے کے بعد انہیں ایک بہت بڑی غلطی لگی اور یہی وہ غلط نگہی ہے جس کی وجہ سے دنیا آج جہنم میں گرفتار ہے۔ نظریۂ ارتقا میں انہوں نے حیوانات کو دیکھا کہ موجودہ شکل میں کوئی حیوان جو موجود ہے وہ اُس کی آخری منزل ہے اُس کے بعد آگے ارتقا نہیں ہے۔ وہ Natural Laws (قوانینِ فطرت) یا جو Physical Laws (طبعی قوانین) ہیں ان کے ماتحت زندہ رہتا ہے زندہ رہنے کے بعد انہی قوانین کے تابع ایک دن ختم ہو جاتا ہے یا مرجاتا ہے اور سلسلۂ ارتقا کی زنجیر کی یہ آخری کڑی ہوتی ہے۔ یورپ کے ان محققین کی یہ غلط نگہی تھی کہ انہوں نے انسان کو بھی انہی حیوانات میں سے ایک حیوان سمجھ لیا سوائے اس کے کہ یہ شکل و صورت یا دماغ میں ان سے ذرا آگے بڑھا ہوا ہے لیکن انہوں نے انسان کو اُسی کیٹیگری (قسم) کے اندر رکھا۔ کہا یہ کہ انسان کی زندگی بھی یہی فزیکل زندگی ہے طبعی زندگی ہے جسم کی زندگی ہے۔ جس طرح سے دوسرے حیوانات عام قانونِ طبعی کے مطابق زندہ رہتے ہیں یہ بھی اُسی طرح سے کھاتا پیتا سوتا ہے افزائشِ نسل کرتا ہے جس طرح سے ایک دن طبعی قوانین کے تابع ان پہ موت آتی ہے تو وہ ختم ہو جاتے ہیں اُسی طرح سے انسان بھی طبعی قوانین کے مطابق زندہ رہنے کے بعد انہی قوانین کے مطابق ایک دن مرجاتا ہے اور اُس کے بعد یہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے وہ غلط نگہی۔ چھوٹے لوگوں کی غلطیاں کچھ چھوٹا سا اثر پیدا کرتی ہیں لیکن یہ جو بڑے بڑے لوگ ہوتے ہیں کہ دماغ ہو بہت بڑا اور گردن ہو ٹیڑھی تو ان کی غلطی کے جو نتائج ہوتے ہیں وہ بڑے ہی ضرر رساں اور تباہ کن ہوتے ہیں۔

انسان کو زندگی گزارنے کے لیے کہا گیا ہے، نہ کہ عمر بسر کرنے کے لیے

ان مفکرین کی بات اتنی سی تھی کہ انہوں نے انسان کو بھی حیوانات کے زمرے میں شامل کر لیا اور اب اُس کے بعد آپ دیکھیے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ انسان کے متعلق کہا کہ یہ صرف Physical Laws (طبعی قوانین) ہیں جن کے تابع اس نے زندگی بسر کرنی ہے، اس سے آگے کچھ بات نہیں ہے، اس نے صرف یہ زندگی جینا ہے اس کے بعد اور کچھ نہیں ہے۔ اب انسان کے لیے زندگی کا نصب العین یا مقصد یا Destiny تو موت ہو گئی۔ اور حیوانات کے مقابلے میں اس کو قوتیں اتنی دیں کہ وہ شیر جواتنی بڑی قوتوں کا مالک درندہ ہے اُس سے بڑا حیوانات میں سمجھیے کہ کوئی صاحبِ قوت نہیں تو وہ بھی ایک وقت میں کسی ایک کمزور حیوان کو چیر پھاڑ سکتا ہے اور کیا کر سکتا ہے لیکن یہ کم بخت (انسان) تو ہیر و شیمہ^① کے اوپر ایک بم گرا دیتا ہے۔ اور وہ تو بات پرانی ہے کہ ایک شہر کو تباہ کرتا ہے اب تو یہ کہہ رہا ہے کہ اگلا بم ایسا بھی آ سکتا ہے جو کہ ارض کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ زندگی ہو عام حیوانوں کی اور قوتیں اس کی یہ ہوں تو آپ سوچ لیجیے کہ پھر آپس میں حشر کیا ہونا ہوا۔ اب یہ ساری قوتیں ایک دوسرے انسانوں کے خلاف صرف ہو رہی ہیں، اس نے صرف ہی یہاں کرنی ہیں، اس کے سامنے اور تو کوئی نصب العین ہی نہیں ہے، اگلی منزل ہی کوئی نہیں ہے، یہاں خاتمہ ہو گیا ہے۔ اتنی قوتوں کا مالک کہ جس کے سامنے اس فزیکل لائف کے آگے کوئی اور منزل ہی نہیں ہے تو اُس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے جو کچھ ہو رہا ہے۔

تہذیبِ مغرب کی تعریف کے متعلق ہمارے ہاں کی پیدا کردہ سوچ کی نوعیت

یہ جسے آپ کہتے ہیں کہ تہذیبِ مغرب تباہیاں لے آئی اور یہ کہ تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی، تو اس تہذیبِ مغرب کے متعلق ہم ہی نہیں، یورپ والے بھی یہی چلا رہے ہیں۔ جب تہذیبِ مغرب کہا جاتا ہے تو ہمارے سامنے تو یہی آتا ہے اور ہمیں وعظوں میں اور منبروں میں بتایا ہی یہ جاتا ہے کہ جی! وہ کھڑے ہو کر پیشاب کرتے ہیں، پتلون پہنتے ہیں، شیو کر لیتے ہیں، شراب پیتے ہیں، ناچ کرتے ہیں، ان کی میمیں اسکرٹ پہنتی ہیں۔ یہ ہمارے ہاں تہذیبِ مغرب کا تصور ہے۔ یہ تہذیب نہیں ہوتی بلکہ تہذیب تو زندگی کے متعلق ایک نظریہ ہوتا ہے جس کے مطابق اپنی زندگی اور معاشرہ اور سیاست اور معیشت تمام عمارتیں استوار ہوتی ہیں۔ یہ تہذیبِ مغرب جس کی تباہیاں ہم گنا رہے ہیں، وہ لائف کا یہ Concept (تصور) ہے کہ انسان کی زندگی بھی ایک حیوان کی

① بحر ہانشو کے ساحل پر واقع جنوبی جاپان کا وہ پہلا شہر جسے اگست 1945ء کی 6 تاریخ کو ایک ایٹم بم گرا کر مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔

زندگی ہے اور طبعی موت مرنے کے بعد اور کچھ نہیں رہتا، یہیں کی زندگی ہے۔ تو Law of Jungle (جنگل کا قانون) تو ہونا ہی ہوا کیونکہ حیوان کی طرح جو ہوا کہ جس کی لالچی اُس کی بھینس۔ یعنی جو بھی کسی طرح سے قوت حاصل کر لے پھر وہ جوجی میں آئے باقی انسانوں کے ساتھ کرتا چلا جائے۔ یہ جو یورپ کا زندگی کے متعلق یہ نظریہ ہے یہ سارے مظاہر اس نظریے کے نتائج ہیں، یہ اس کی شاخیں ہیں۔ یہ ہے اصل شے جسے تہذیب مغرب کی بنیاد کہیں گے۔ یہ اقبالؒ (1877-1938ء) نے 1907ء میں کہا تھا کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

جو شارخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا

30 سال کی عمر میں تہذیب مغرب کے متعلق علامہ اقبالؒ کی سوچ اور لادینیت کی وضاحت

عزیزانِ من! یہ اُس زمانے میں کہا تھا کہ جب یہ 30 سال کا نوجوان تھا۔ یورپ میں اس کی تعلیم ہو رہی تھی، وہاں خود اس تہذیب کا مشاہدہ کر کے اُس نے یہ کہا تھا۔ اُس نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ اسکرٹ پہنتی ہیں اور ناچ کرتی ہیں بلکہ اُس نے دیکھا یہ کہ زندگی کا جو تصور ان لوگوں نے اپنے ذہن میں رکھا ہے اُس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ اپنے ہی خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی اس لیے کہ جو آشیانہ شارخ نازک پہ بنے گا ناپائدار ہوگا۔

اور پھر اس تہذیب کے سارے محاصل کا مشاہدہ کرنے کے بعد کہا:

یورپ از ہمشیر خود بے مل فتاد

یورپ اپنے تلوار سے آپ ہی بے مل ہو گیا

زیر گردوں رسم لادینی نہاد

اب یہاں وہ ایک لفظ ”لادینی“ لایا ہے اور یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ دین کیا ہوتا ہے اور لادینی کسے کہتے ہیں۔ وہ رسم لادینی یہ تھی

درنگاہش آدمی آب و گل است

انہوں نے سمجھا کہ یہ آدمی بھی اسی طرح سے ہے جس طرح پانی اور مٹی سے اور حیوان بنے ہوئے ہیں بس یہی ہے رسم لادینی۔ کہا کہ

کاروانِ زندگی بے منزل است

عزیزانِ من! یہ ہے لادینی۔ اگر منزل متعین ہو تو وہ دین ہوتا ہے۔

خالق کائنات اپنی ہر تخلیق کا آغاز پست ترین سطح سے کرتا ہے اور بلند ترین سطح تک لے جاتا ہے اس کے برعکس قرآن کی یہ اسکیم جو پست ترین نقطے سے شروع ہوئی تھی بڑھتی چلی آرہی تھی قرآن نے اس کے متعلق انسان کی بابت کیا کہا ہے؟ وہ پہلے جو تھا وہ خارجی کائنات کے متعلق تھا کہ وہ اس طرح سے چلی آرہی ہے۔ اور اُس کے بعد جو ”الیہ“ کہا تھا کہ جو اس کے لیے ہم نے نقطہ تکمیل مقرر کیا تھا ہر شے وہاں تک چلی آرہی ہے۔ آم کی گٹھلی کے اندر Potentialities (صلاحیتیں) یہ ہیں کہ وہ ایک پودا اُگے پھر درخت بنے پھر اُس میں خوشے آئیں پھر اُس کے اندر آم لگیں اور جب آم لگ جائیں تو یہ اُس کی انتہا ہے وہ اپنے آخری نصب العین تک پہنچ گئی۔ اسکیم نے یہی اُس کے لیے رکھا تھا۔ شیر کا نصب العین تھا کہ شیر بن جائے شیر کا بچہ پیدا کرے شیر کا بچہ از خود بغیر کسی تعلیم و تربیت کے یا کسی اسکول کالج میں گئے یہ کچھ بن جائے نہ ہی اُس کی طرف کوئی رسول آتا ہے نہ کوئی کتاب آتی ہے بلکہ وہ از خود اپنے نقطہ تکمیل تک پہنچ کر شیر بن جاتا ہے۔ لیکن بس شیر ہی بنتا ہے اس سے آگے کچھ نہیں ہوتا دس لاکھ سال پہلے بھی وہ شیر کا بچہ شیر بن کر ختم ہو جاتا تھا آج بھی وہ وہاں پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اُس کے لیے نقطہ تکمیل ہی یہ ہے۔ اگلی آیت ہے جو بتا رہی ہے کہ دین کیا ہے۔

قدرت نے انسان کو انسانیت کی ایک نئی منزل سے روشناس کرایا

یہ آیت انسان کو حیوانات کے زمرے سے نکال کر ارتقا کی دوسری منزل میں پہنچا رہی ہے۔ کہا ہے کہ اَلَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (32:7) وہ خدا ہے جس نے ویسے تو ہر شے کو موزوں ترین انداز میں پیدا کیا ہے اس کا بہترین حسن و توازن قائم رکھتے ہوئے پیدا کیا۔ یہ بات نہیں ہے کہ اُس نے باقی جو کائنات یا باقی چیزیں تھیں وہ ٹھیکے پہ بنوالی ہیں ”تے آپ او بندا بنزودار ہیا اے (۱)“ کہا کہ اَلَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (32:7) اپنی اپنی جگہ ہر شے ایک احسن تقویم میں ہے ہر شے میں ایک خاص اعتدال ہے اُس کے اندر ایک حسن ہے۔ وَ بَدَا خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ طِیْنٍ (32:7) انسان کی تخلیق کی جو ابتدا ہوئی ہے وہ بھی ان باقی حیوانات کی طرح جمادات سے ہی ہوئی ہے غیر نامی مادے (Inorganic Matter) سے ہوئی ہے بے جان مادے سے ابتدا ہوئی ہے۔ اب میں یہاں بچ کے مراحل نہیں گناؤں گا کہ پھر بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ یہ نظریہ ارتقا بتا رہا ہے اور قرآن نے دیگر مقامات پہ بتایا ہے کہ

جن جن منازل میں سے یہ حیوانات گزرے ہیں انہی منازل میں سے انسان کا بچہ (جنین) رحم مادر تک گزرتا ہے۔ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ. ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَّاءٍ مَهِينٍ (32:7) پھر وہ منازل طے کرتا ہوا اُس کو اس منزل میں لے آتا ہے جہاں اس کی افزائش عورت اور مرد کے اختلاط سے (By Procreation) ہوتی ہے یہ تو حیوانی سطح ہے۔ یہاں سے اس کے بعد گاڑی دوسری پٹری پہ پڑتی ہے یہاں سے انسانیت شروع ہوتی ہے یہاں سے انسان اور حیوان میں فرق شروع ہوتا ہے یہیں سے دین شروع ہوتا ہے یہاں سے وحی اور رسول اور ہدایت کی ضرورت شروع ہوتی ہے۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ. ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَكِينٍ (23:12.13)۔ یہ ساری منازل ہیں۔ اس کے بعد پھر جس طرح سے جنین رحم مادر میں ہوتا ہے یہاں سارے مرحلے گنائے ہوئے ہیں۔ میں ان کو چھوڑتا ہوں کہ یہ حیوانات میں اور انسانی بچے میں مشترک ہیں۔ 1. اور آپ خود وہ بندہ بناتا رہا ہے۔

انسان کے لیے اطوار کی صورت میں تخلیق نو کی نعمت خدائی تو انائیوں کا ایک کرشمہ

یہاں تک اُس کو بنانے کے بعد حیوان کا جو بچہ تھا اُس کو تو اسی چیز پہ چھوڑ دیا کہ یہ اس کا آخری نقطہ تھا۔ انسان کی صورت میں کہا کہ ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ (23:14) یہاں پہنچنے کے بعد اُس کو ایک دوسری طرح کی مخلوق بنا دیا۔ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ (23:14)۔ جیسے وہ اپنے شاہکار کو پیش کرنے کے بعد تھوڑی سی برکت والی بات کہتا ہے، تحسین (Appreciation) والی بات کہتا ہے دوسری جگہ خلق جدید (32:10) بھی کہا ہے۔ اس کے متعلق اس نے یہ کہا ہے کہ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا (71:14) اس کے بعد یہ انسان یکلفت انسان نہیں بن گیا بلکہ یہ درجہ بہ درجہ ہوا۔ اب اطوار کا جو ترجمہ طور ہے بڑا جامع لفظ ہے:

بدلے کچھ ایسے طور سے بے طور ہو گئے

تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہو گئے

خَلْقًا آخَرَ (23:14) کچھ اور ہو گئے۔ یہ ہے جامعیت۔ بتایا نہیں کہ کیا ہو گئے بلکہ یہ کہا کہ کچھ اور ہو گئے۔ أَطْوَارًا یہ ہوتا ہے کہ اگلا جو طور ہے جسے اُس نے طور سے بے طور کہا، انسان کا یہ جو اگلا طور ہے کہا کہ وہ خَلْقًا آخَرَ ہے یعنی تخلیق کا جو پہلا سلسلہ چلا آ رہا تھا یہ اُس سے بالکل مختلف ہے۔ کیسا خوبصورت انداز ہے اس کے کہنے کا کہ یہ کچھ اور ہو گیا۔ آگے کہا کہ ثُمَّ سُئِنُہُ (32:9) یہاں حیوان تک مشترک لانے کے بعد سُئِنُہُ کہا۔ تخلیق کے مراحل میں خدا نے اپنے آپ کو کہا ہے کہ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ

(59:24) یعنی خالق تو جیسا میں نے مثال کے طور پہ بتایا تھا کہ کہار جو چاک پہ بیٹھا ہوا ہوتا ہے اُس کے پاس مٹی کا تھوبہ (تودہ) ہوتا ہے اُس نے اپنی اسکیم کے ماتحت اُس میں سے صراحی بنانی ہوتی ہے یا پیالہ بنانا ہوتا ہے تو ان سب کے لیے وہ اسی قسم کی مٹی ہوتی ہے جو چاک کے اوپر یوں تھب کر رکھ دیتا ہے۔ وہ اُس چاک کو گھماتا ہے اور اس میں سے بہت سی مٹی کو وہ چھانٹتا چلا جاتا ہے تراشتا چلا جاتا ہے خراشتا چلا جاتا ہے الگ کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کو باری کہتے ہیں۔ اس کی تخلیق کا اگلا درجہ الباری ہے اسی کو سنوہ کہتے ہیں کہ جو حشو و زوائد اس میں ہوں ان کو الگ کرتا چلا جاتا ہے۔ الگ کرنے کے بعد وہ المصور ہے یعنی پھر وہ فارم (Form) دیتا ہے جس فارم (Form) میں اس کو لانا مقصود ہوتا ہے یعنی پیالہ بنا دیتا ہے صراحی بنا دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ثَمَّ سَوَّيْتُهُ (32:9) پھر ہم نے اس کے حشو و زوائد کو الگ کر کے ایک خاص اعتدال پہ پیدا کیا۔ اب وہ بات آئی جہاں حیوان سے اختلاف آتا ہے پٹری بدلتی ہے۔ کہا کہ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهِ (32:9) اور اُس میں اپنی توانائیوں کا ایک شمع ڈال دیا۔ اب اس میں ایک خدائی توانائی (Divine Energy) پیدا ہو گئی۔ انسان خدا کی ذات کا حصہ نہیں ذات کے حصے بخرے نہیں ہو سکتے

یاد رکھیے! یہ جو چیز ہے یہ بڑی غور طلب ہے۔ یہ چیز جسے کہتے ہیں کہ انسان کی جو روح ہے وہ روح خداوندی کا ایک حصہ ہے تو یہ بڑا غلط اور قرآن کے خلاف تصور ہے۔ اگر وہ اُس کا کوئی حصہ اپنے میں سے (اُسے ذات کہہ دیجیے یا روح کہہ دیجیے) ذرا ذرا سا بھی انسانوں کو دینا شروع کرتا تو مدت کا ختم ہو چکا ہوتا۔ جس گُل کی کیفیت یہ ہو اگر اُس میں سے ذرا برابر بھی الگ ہو جائے تو وہ ناقص ہو گیا۔ کوئی ذات اپنا کوئی حصہ دوسرے کو نہیں دیتی ذات ایک Indivisible Whole (نا قابل تقسیم وحدت) ہوتی ہے اس کے حصے بخرے نہیں ہوتے وہ اس میں سے کوئی چیز نہیں دیتا۔

لفظ روح کا قرآنی مفہوم انسان کا اختیار و ارادہ ہے یعنی یہ اس کا صاحب مشیت ہونا ہے

یہ جو روح کا لفظ ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے اس کا یہ مفہوم ہی عربی زبان میں نہیں ہے۔ روح ہمارے ہاں Soul یا Spirit کو کہتے ہیں، مر جاتا ہے تو پھر کہتے ہیں کہ روح نکل گئی۔ پھر مسئلہ پیدا ہوئے کہ پھر روح رہتی کہاں ہے۔ پوچھیے نہیں کہ اس پہ پھر کیا کچھ افسانے گھڑے گئے۔ یہ روح اس معنی میں قرآن کے اندر ہے ہی نہیں۔ انسان کی روح کا لفظ ہی قرآن میں نہیں ہے یہ Concept (تصور) ہی نہیں ہے۔ البتہ توانائی (Energy) ہے وہ توانائی جسے قرآن نے روح کہا ہے۔ ایک چیز ہے جو کائنات میں اوپر خدا کو

حاصل ہے اور نیچے کائنات میں انسان کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے اور وہ ہے اس کا صاحب ارادہ و صاحب اختیار ہونا۔ دوسری جگہ یہی کہنے کے بعد کہا ہے کہ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (90:10) ہم نے جو اپنی توانائی میں سے اس کو توانائی بخشی وہ یہ تھا کہ اس کو دو راستے دکھا دیئے۔ حیوانات میں کسی کو دو راستے نہیں دکھائے بلکہ ان کے لیے ایک ہی راستہ متعین ہے وہ اُس پر چلنے کے لیے مجبور ہیں۔ یہ جو مایشتاء یا من یشتاء ہے کہ ہم اپنے اختیار کے مطابق یہ کرتے ہیں، ہم وہ کرتے ہیں تو سارے قرآن میں یہ خدا کے لیے ہے۔ اور نیچے انسان سے کہا گیا ہے کہ اَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ (41:40) تمہاری بھی ایک مشیت ہے محدود دائرے میں ہی سہی ہماری مشیت بڑے دائرے میں ہے اور تمہاری مشیت بھی تمہارے دائرے میں ہے۔ ہم اپنی مشیت کے مطابق کام کرتے ہیں، تم اپنی مشیت کے مطابق کام کرو۔ یہ ہے وہ خدا کی روح جسے کہا جاتا ہے: صاحب مشیت ہونا، صاحب ارادہ ہونا، صاحب اختیار ہونا، دو راستوں میں سے ایک اختیار کرنا اور دوسرے کو چھوڑ دینا۔

انسان کو اختیار و ارادہ کے استعمال کرنے کے لیے حواسِ خمسہ اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت ملی ہے

یہ بہت بڑی چیز ہے جو انسان کو ملی ہے۔ اسے Divine Energy (خداوندی توانائی) کہیے یہ لفظ توانائی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اُس نے یہ جو اپنی توانائی تھی یا جو خصوصیت کبریٰ تھی اُس میں سے کچھ حصہ اس کو دیا۔ اور پھر اس کے لیے یہ کیا کہ وَجَعَلْ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ (32:9) اس کو یہ حواس (Senses) یعنی دیکھنے کی، سننے کی صلاحیتیں دیں۔ دیکھنے اور سننے کی صلاحیتیں تو حیوانات میں بھی تھیں لیکن آگے ایک اور صلاحیت دی جو وَفَخَ فِيهِ مِنْ دُوْحِهِ (32:9) کی خصوصیت تھی۔ سمع و بصر کے بعد کہا کہ وَالْأَفْئِدَةَ (32:9) پھر ایک ایسی شے بھی دی جو فیصلہ کرتی ہے ارادہ کرتی ہے اس کے لیے چوائس ہے فیصلہ کن چیز۔ حیوانات کے سامنے دو راستے نہیں ہوتے اس لیے فیصلے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انسان کے لیے کہا کہ تمہیں سمع اور بصر دیں، یہ حیوانات کو بھی دیں وہ بھی دیکھتے سنتے ہیں لیکن اگلی چیز یہ ہے کہ جو کچھ انسان دیکھتے سنتے ہیں یا باہر سے ان تک جو اطلاعات پہنچتی ہیں تو اس کے بعد وہ ایک فیصلہ کرتے ہیں۔ اس فیصلہ کن قوت کے لیے ہمارے ہاں تو کیا، انگریزی میں بھی اس کے لیے لفظ نہیں ہے کہ یہ فیصلہ کن قوت کیا ہے۔ انہوں نے اس کے لیے ایک لفظ Mind وضع کیا تھا لیکن آگے چل کر اس کا تعلق دماغ سے ہو گیا۔ یہ دماغ کی بات نہیں ہے بلکہ یہ قوت ارادہ ہے۔ قرآن نے تو اس کو نفس ہی کہا ہے ہمارے ہاں اسے ذات کہا جاتا ہے، انگریزی زبان میں Personality کہا جاتا

ہے یعنی کوئی شے جو ان اطلاعات کے بعد اس کے لیے فیصلہ کرتی ہے۔ اور یہی فیصلہ کن قوت ہے جو اس کے لیے Responsibilities (ذمہ داریوں) کا تعین کرتی ہے کیونکہ اس نے خود فیصلہ کیا ہے۔ شیر اگر کسی دوسرے حیوان کو چیر پھاڑ کر کھا جاتا ہے تو وہ گناہ نہیں کرتا یا جرم نہیں کرتا کیونکہ وہ تو اس کی ضرورت کے مطابق ہے اس کی فطرت کے اندر ہے لیکن انسان جب دو راستوں میں سے ایک اختیار کرتا ہے کہ جی چاہتا ہے تو اُس کو شوٹ کر دیتا ہے جی چاہتا ہے تو اُس کو معاف کر دیتا ہے تو یہ خدائی چیز ہے۔ کہا کہ یہ جو فیصلہ کرنے والی چیز ہے یہ ہے جو انسان کو دی ہے۔ اور یہاں پھر ایک نکتہ دیدیا۔ وَ بَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ (32:7) اُسی طرح سے اس کی ابتدا جامد مادہ (Inorganic Matter) سے ہوئی۔ کہا کہ ثُمَّ جَعَلْ نَسْلَهُ (32:9)۔ یہاں یہ تھرڈ پرسن پروناؤن (ضمیر غائب) ہے یعنی غائب کی ضمیر ہے۔ اُس کی نسل پھر اس طرح سے اختلاف سے آگے بڑھائی۔ اور ثُمَّ سَوَّاهُ (32:9) پھر اُس سے حشووز و اندالگ کیے۔ وَ نَفَخَ فِيهِ (32:9) پھر اس میں ہم نے یہ توانائی پھونکی۔

یہ آدمِ خاکی حیوان سے انسان اختیار و ارادہ کی سرفرازی کے بعد بنانا کہ اسے مخاطب کیا جائے عزیزانِ من! جب توانائی پھونکی تو سوچیے سمجھیے اور جھومیے وَ جَعَلْ لَكُمْ (32:9) اور تمہیں ہم نے انسان بنا دیا۔ یہاں (ضمیر غائب) کی جگہ کم (ضمیر مخاطب) آیا ہے ضمیر مخاطب کی آئی ہے یہ سیکنڈ پرسن پروناؤن ہے یعنی اب یہ مخاطب کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ کائنات میں کسی دوسری شے کو خدا نے مخاطب نہیں کیا۔ اس کے لیے کہا کہ جَعَلْ لَكُمْ (32:9)۔ ساری آیتوں میں (ضمیر غائب) چلا آ رہا ہے یعنی تھرڈ پرسن چلا آ رہا ہے کیونکہ یہ ابھی اس قابل نہیں تھا کہ اس کو مخاطب کیا جاتا لیکن اب یہ اس قابل ہو گیا ہے کہ اس کو مخاطب کیا جائے۔ کہا کہ جَعَلْ لَكُمْ السَّمْعَ وَ الْبَصَارَ وَ الْإِنْفِذَةَ (32:9) یہ ہے جو اصل شے ہے۔ اس کو ”کم“ کہہ کے پکارا گیا کہ تم اب مخاطب کے قابل ہو۔

کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ !!

کسی شخص کو تو کہنے سے پہلے اسے اپنی ”میں“ کو ثابت کرنا ہوگا

اگر خدا کسی کو مخاطب کر کے بلائے تو یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ یہ جو چھوٹا سا حاکم ہے اگر اسے ازراہِ تلطیف وہ مخاطب کرتا ہے تو

پھر پوچھیے نہیں کہ وہ کہاں آسمان پہ چڑھتا ہے۔ خدا ”کم“ کہہ کر بلاتا ہے۔ ہم بھی خدا کو مخاطب کرتے ہیں۔ ایک یہودی^① کی کتاب ہے جس کا نام ہے: I & Thou۔ اُس نے کہا ہے کہ تم خدا کو کہتے ہو کہ ”تُو یہ کر“ یعنی مخاطب کرتے ہو۔ اُس نے کہا ہے کہ وہی شخص کسی کو ”تُو“ کہہ سکتا ہے کہ جو پہلے اپنے آپ کو ”میں“ کہے۔ جس کا ”میں“ ثابت نہیں ہے اُس کو حق نہیں ہے کہ دوسرے کو ”تُو“ کہے۔ کائنات کی کوئی شے اپنے آپ کو ”میں“ نہیں کہہ سکتی اس لیے وہ خدا کو ”تُو“ نہیں کہتی۔ انسان یہ کہہ سکتا ہے بشرطیکہ یہ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهِ (32:9) کا حامل ہو۔ اگر اُس کے اندر یہ چیز نہیں ہے اس تو انائی کو وہ Exercise (استعمال) نہیں کرتا وہ صاحبِ ارادہ نہیں ہے اپنے فیصلے آپ لینے کے قابل نہیں ہے تو وہ ”کم“ کہنے کے قابل نہیں ہے اور اُسے حق نہیں ہے کہ وہ خدا کو مخاطب کرے۔

ہماری دعا اس لیے قبول نہیں کہ ہم میں ”میں“ نہیں

ہم لاکھوں کی تعداد میں اُس کو پکارتے ہیں تو وہ کیوں ہماری بات نہیں سنتا؟ اس لیے کہ وہ کہتا ہے کہ پہلے اپنے آپ کو ”میں“ تو ثابت کرو پھر تمہیں ہمیں مخاطب کرنے کا حق پہنچے گا۔ تم ”میں“ نہیں ہو تو ہمیں کیا مخاطب کرو گے۔ اس لیے وہ تمہاری دعا نہیں سنتا۔ میں نے کہا تھا کہ ”الیہ“ سے اُس نے سمت کا تعین کیا ہے۔ اشیائے کائنات کے لیے اُس نے کہا ہے اُس اسکیم کے اندر جو سمت متعین تھی وہ ہے اس کی Destination (نصب العین، منزل) وہ ڈائریکشن (سمت) اُس کو اُس طرف لے جا رہی ہے اور بس وہیں ختم کر دیتی ہے۔

انسان کی منزل انسان کا خدا ہے

انسان کے متعلق کہا ہے کہ ہم تمہیں ڈائریکشن (سمت، نصب العین، منزل) دے رہے ہیں اور تمہاری منزل یہ ہے کہ الیٰ ربک المنتہیٰ (53:42) تمہارا جو منتهی ہے تمہاری جو Destination ہے تمہاری جو منزل ہے وہ خدا ہے۔

شعلہ درگیر زد بر خُش و خاشاکِ من

کہا کہ ایک لفظ جو رومی نے بول دیا ہے تو اس نے دنیا کا خُش و خاشاک میرے سامنے پھونک کر رکھ دیا جب اُس نے کہا:

مرحہ رومی کہ گفت منزل ما کبریا است

مومن اس سے ورے کہیں ٹھہرتا ہی نہیں ہے۔

① اس کا نام ہیومارٹن (1878-1965)

② Thou (کم) Buber Martin: I and Thou (1950)

یورپ کے سائنسٹ ہوں یا اہل تصوف، ان دونوں کی دنیا میں ”میں“ کا اپنا الگ وجود کہیں باقی نہیں رہتا عزیزانِ من! یہاں پھر ایک بڑی چیز آگئی۔ کہا ہے کہ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی (53:42)۔ یورپ کے سائنسٹ نے غلطی کی جو کہا کہ یہ حیوان ہی ہے، موت سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ وہ ایک Extreme End (انتہائی کنارے) پہ چلا گیا۔ ہمارے ہاں کے تصوف نے غلطی یہ کی کہ اُس نے کہا کہ انسان کا منتہی یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو خدا کی ذات میں مدغم کر کے ختم ہو جائے۔ وہاں بھی وہ ختم ہو گیا اور ان کے ہاں یوں ختم ہو گیا۔ ”میں“ یہاں رہی نہ ”میں“ وہاں رہی۔ قرآن نے ”فی ربک المُنْتَهٰی“ نہیں کہا کہ تمہارا منتہا خدا کے اندر ہے بلکہ سمت دی ہے کہ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی (53:42)۔ صفاتِ خداوندی اپنے اندر منعکس کرتے چلے جائیے۔ خدا کے اندر جا کے جذب ہو جانا یا فنا ہو جانا غیر قرآنی تصور ہے، وحدتِ وجود کا تصور تھا، یہودیوں کا تصور تھا، عیسائیوں کا تصور تھا، ہندوؤں کا تصور تھا، ویدانت کا تصور تھا۔ قرآن کا یہ تصور نہیں ہے۔ قرآن کا منتہی یہ ہے کہ

بخود محکم گذر اندر حضورش

مشو ناپید اندر بحرِ نورش

منزلِ مومن

خدا کے سامنے کھڑا ہو کر بھی تُو اپنے آپ کو ”میں“ کہے تو یہ ہے تیری منزل لیکن اُس کی صفات اپنے اندر پیدا کرتا چلا جا کیونکہ اُس نے اپنی ایک روح کا شمع تمہیں دیا ہوا ہے۔

عزیزانِ من! اب یہاں سے مغرب اور اسلام یا قرآن دو مختلف راستوں پر جا پڑے۔ یہاں گاڑی نے یہ وہ کاٹنا بدلا کہ یہ اور رخ پہ جا پڑے اس کی سمت دوسری متعین ہو گئی۔ یہ جو سمت ہے اس میں انسانیت کو اپنی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لیے کیا کرنا ہوگا، کن منزلوں میں سے گزرنا ہوگا؟ یہ سارا کچھ ہے جو قرآن دیتا ہے اسی کا نام الدین ہے اسی کو الاسلام کہتے ہیں۔ اس حصے کو ہم آئندہ درس پر چھوڑ دیتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



تیسرا باب: سورة السجدة (آیات 10 تا 13)



عزیزان من! آج نومبر 1979ء کی 30 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورة السجدة کی آیت 10 سے ہو رہا ہے:

(32:10)۔

تجدید یادداشت

موضوع میں تسلسل ہے۔ تجدید یادداشت کے لیے دو ایک اشاروں میں یہ عرض کر دوں کہ پچھلی آیات میں قرآن کریم نے ایک تو یہ کہا تھا کہ جو کچھ تمہیں کائنات میں انسانوں سمیت نظر آتا ہے یہ ایسا نہیں تھا کہ اسی شکل میں پہلے دن سے یہ وجود میں آگیا تھا بلکہ اس کی ابتدا بڑے پست ترین نقطے سے ہوئی تھی۔ ہر شے اپنی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے موجودہ شکل میں پہنچی اور یہی صورت انسان کی ہے۔ اگلی بات میں نے یہ عرض کی تھی کہ یورپ کے سائنسدان بھی اور مفکرین بھی اس ارتقا میں یہاں تک پہنچے بلکہ اس دور میں تو اس کی ابتداء ہی انہوں نے کی۔ ان کی ایک بنیادی غلطی ہو گئی۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ جس طرح سے باقی حیوانات اور باقی اشیائے کائنات میں ہے مثلاً حیوانات کہ ان کی زندگی طبعی زندگی ہے وہ Physical Laws (طبعی قوانین) کے تابع زندہ رہتے ہیں اور انہی Laws (قوانین) کے مطابق ان کے جسم کی طبعی مشینری چلنے سے جب بند ہو جاتی ہے تو زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسان کے متعلق بھی انہوں

نے یہی سمجھا کہ اس طبعی کائنات میں طبعی زندگی ہے یہ Physical Laws (طبعی قوانین) کے تابع زندہ رہتا ہے اور آخر میں انہی Laws (قوانین) کے تابع اس کی موت واقع ہو جائے گی اور جب موت واقع ہو جائے گی تو انسان کا خاتمہ ہو جائے گا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اس نظریہ زندگی کے ماتحت وہاں جو تباہیاں آرہی ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ زندگی کا اس سے آگے کوئی بلند مقصد نہ ہو اور زندگی Physical Laws (طبعی قوانین) کے تابع چلے، حیوانوں کے مقابلے میں انسانوں میں بے انتہا قوت آئے اور مقصدِ حیات وہی حیوانی زندگی کا ہو تو پھر جو کچھ ہو سکتا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ قرآن نے یہ کہا کہ یہاں پہنچ کر یہ تمہاری غلط نگاہی ہے جو تم سمجھتے ہو۔ انسان ان Physical Laws (طبعی قوانین) کے مطابق تو وہی ہے جو حیوانی زندگی میں ہے لیکن یہ جب وہاں سے آگے بڑھا ہے تو اس ارتقا کے نظریے میں ایک تبدیلی واقع ہوئی ہے اس میں ایک اور چیز بھی ہے جو طبعی زندگی کے قوانین کے تابع نہ وجود میں آئی ہے اور نہ ان کے ماتحت سرگرم عمل ہے اور انسان کی طبعی موت کے ساتھ وہ مرنے بھی نہیں ہے۔ درحقیقت انسان اُس چیز کا نام ہے اس چیز کے لیے قرآن نے ”نفس“ کا لفظ استعمال کیا ہے جسے آپ روح خداوندی کہتے ہیں اقبالؒ (1877-1938) خودی کہہ کر پکارتا ہے اسے پرسنلٹی (Personality) کہتے ہیں انسانی ذات کہتے ہیں۔ اسے کچھ بھی کہہ لیجیے نام کچھ بھی رکھیے حقیقت یہ ہے کہ انسان کی اصل زندگی اُس چیز کا نام ہے اور اس کا طبعی جسم اُس چیز کی نشوونما پرورش تزکیہ اُسے آگے بڑھنے کے لیے ذریعہ کا کام دیتا ہے۔ یہ جو اس کا ذریعہ ہے یہ موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے آپ سفر کرنے کے بعد ٹکٹ گیٹ پہ کھڑے ہوئے ٹکٹر کو دیدیتے ہیں اور آپ باہر آ جاتے ہیں۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ یہ ذریعہ تو ختم ہو جاتا ہے اور جو اصل حیات ہے جسے آپ خودی یا ذات کہتے ہیں وہ آگے چلتی ہے۔ یہ ہے فرق۔ یہ جو فرق تھا اس کو نمایاں طور پر ہمارے دور میں اقبالؒ (1877-1938AD) نے پیش کیا ہے اُس کی ساری عمر اسی پیغام میں صرف ہوئی ہے۔ جہاں بھی آپ دیکھیں گے کہ وہ فرنگ پہ تنقید کرتا ہے، تہذیب مغرب کی تنقید کرتا ہے، ہمیں تندیر دیتا ہے کہ یاد رکھیے گا! اُس تصور میں الجھ کر نہ رہ جانا اسلام یا قرآن دوسرا تصور حیات پیش کرتا ہے۔ اقبالؒ (1877-1938AD) کا جو فلسفہ خودی ہے وہ یہی بات ہے۔ وہ مسلمان سے یہ کہتا ہے کہ تم اس تصور میں اس فریب میں نہ آ جانا جو فرنگ کی تہذیب نے پیدا کیا ہے کہ انسان سوائے اس آب و گل کے اور کچھ نہیں اور کاروانِ زندگی بے منزل ہے۔ یہ تصور غلط ہے یہ اسلامی نہیں ہے یہ قرآن کے خلاف ہے۔ اسی کو سیکولر

(Secular) کہتے ہیں۔ اسلام کا یا قرآن کا تصور یہ ہے کہ زندگی اس زندگی سے آگے چلتی ہے اور اصل میں زندگی تو اسی کا ہی نام ہے۔ یہ یہاں تک تو آپ سمجھیں گے کہ یہ بحث کچھ علمی سی، نظری سی، Theoretical سی، Academic سی ہو رہی ہے۔ یہ بنیادی نقطہ ہے۔ اس دنیا کا نظم و نسق، نظام حیات، اقوام، عالم، تمدن، انسانیت، ان سب کا دار و مدار اس تصور کے فرق پر ہے۔ تصور اگر وہی ہے جو مغرب کا ہے تو یہ دنیا جہنم بنی رہے گی اور جہنم کی آگ کے شعلوں میں تیزی ہوئی چلی جائے گی۔ اگر تصور یہ آئے گا کہ جو قرآن نے دیا ہے تو میں آگے چل کر عرض کروں گا کہ یہ دنیا ہمیں سے جنت بن جائے گی۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ زندگی تو حقیقت میں وہ ہے جو آنے والی ہے۔ ویسے تو سارے قرآن میں حیات بالآخرت، ایمان بالآخرت اسی کا ہی نام ہے۔ ایک آیت میں ان دونوں زندگیوں کے متعلق قرآن نے اس انداز سے فرق کیا ہے کہ انسان جھوم جھوم جاتا ہے۔

قرآن حکیم کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت اس کی تعلیم اور اس کے حقائق ہیں

جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ میرے نزدیک قرآن کا جو منزل من اللہ یا انسانی فکر سے ماوراء سرچشمے سے آتا ہے وہ اس کی معنویت اور اس کی تعلیم اور اس کے حقائق ہیں لیکن جہاں تک اس کے اسلوب بیان اس کے الفاظ کا تعلق ہے وہ بھی کچھ کم معجزہ نہیں ہے۔ عربی زبان کی وسعت اور قرآن کا انتخاب تو میں آپ کو بار بار بتاتا ہوں۔ کہا کہ وَمَا هَذِهِ الْحَيَوةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ (29:64) یہ جو قریبی زندگی ہے جو ہمارے سامنے کی زندگی ہے یہ تو عارضی دلچسپیاں ہیں اس کی کوئی مستقل Value (قدر و منزلت) نہیں ہے یہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ آگے کہا کہ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَانُ (29:64) اصل زندگی جو ہے وہ تو اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ الْحَيَوةُ الدُّنْيَا (29:64) یہاں لفظ حیات ہے اور اس کو آخرت کے لیے کہا ہے کہ یہ لَهِیَ الْحَيَوَانُ (29:64) مادہ دونوں کے لیے ایک ہی ہے۔ وہاں پہلے حیوۃ کہا ہے یہاں حیوان کہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے بتایا تھا کہ عربی زبان میں باب ہوتے ہیں جسے عام طور پر وزن کہا جاتا ہے۔ یہ عجیب و غریب زبان ہے۔ یہ عرب بالکل ان پڑھ لوگ تھے پتہ نہیں یہ کہاں سے یہ باتیں لے آئے تھے۔ وزن ان کے ہاں یہ ہوتا ہے مثلاً ”فَعِیْلٌ“ کے وزن پر ”رَجِیمٌ“ آتا ہے۔ ہر باب کے وزن کے بدلنے سے بنیادی معنی وہی رہتے ہیں لیکن ان معنوں کے اندر تخصیص ہو جاتی ہے، وسعت ہو جاتی ہے، استثنیٰ ہو جاتا ہے اور وہ کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔ حیوۃ عام وزن کے اوپر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس میں حرکت ہو نمود ہو۔ انہوں نے سانپ کو دیکھا کہ اُس کو یوں کیجیے تو زندہ سانپ اس طرح سے پڑتا ہے تو اُس سانپ کو حیات کہتے تھے وہاں سے انہوں نے حیوۃ کا لفظ لیا۔ میری بیٹیو! حیا کا لفظ بھی یہیں سے ہی

ہے۔ توحیۃ تویہ ہوگئی۔ اب ”باب“ بدلا توحیوان ”فَعَلَان“ کے ”وزن“ پہ ہے۔ یہ جو فَعِل کا وزن ہے اُس میں یہ چیز ارتقائی طور پر آتی ہے اُسی طرح درجہ بہ درجہ تسلسل سے قاعدے قانون کے مطابق کہ جو پیچھے سے چلا آ رہا ہے جو چیز اُس کے مطابق ہوگی وہ ”فَعِل“ کے وزن کے اوپر آتی چلی جائے گی۔ اور اگر کہیں کسی جگہ کسی شے کے اس ارتقا کے اندر Emergence (فجائیت) ہوگی کہ اُس کڑیوں کو توڑ کر اُس کے خلاف کوئی یکا یک نمودار ہو جائے تو یہ ”فَعْلَان“ کے وزن پہ ہوگا۔ یہ آج کی جو Evolution (ارتقا) کی تھیوری والے مغرب والے ہیں انہوں نے خود یہ چیز کہی ہے کہ Evolution (ارتقا) کی جو کڑیاں ہیں وہ کڑی در کڑی چلی آتی ہے لیکن درمیان میں آ کے کہیں ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شے ایسی نمودار ہو جاتی ہے جو پچھلی کڑیوں کی پیدا کردہ نہیں ہوتی، ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کیسے ہو جاتی ہے اس کا نام Emergent Evolution (فجائی ارتقا) رکھا ہے اور اس پہ بڑا Work (کام) ہو رہا ہے کہ معلوم کیا جائے کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ ابھی تک یہ طے نہیں پایا کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ تو ایک تو Progressive Evolution (درجہ بہ درجہ ارتقا) ہے کہ جو درجہ بہ درجہ چلی آ رہی ہو اور اُس میں کسی مقام پر Emergent Evolution (فجائی ارتقا) آتی ہے کہ جو یکخت نمود میں آ جاتی ہے۔ یورپ کے یہ سائنسٹ اس مقام پہ پہنچے ہیں۔ یہ Progressive Evolution (فجائی ارتقا) اور Emergent Evolution (بندرتج ارتقا) ان کے ہاں دونوں الگ الگ سائنسز ہوگئی ہیں:

اگر یہاں کی زندگی زندگی ہے تو اس کے بعد کی زندگی زندگی کی زندگی ہے

عزیزانِ من! یہ جو ”فَعْلَان“ کا وزن ہے کہ کوئی چیز جو ایمر جنسی کے طور پر ہنگامی طور پہ نمودار ہو جائے اور پچھلی کڑیوں کا لازمی اور Physical (طبعی) نتیجہ نہ ہو بلکہ اُس کے خلاف کوئی چیز یونہی نمودار ہو جائے تو وہ الفاظ ”فَعْلَان“ کے وزن پر آئیں گے۔ حیوان ”فَعْلَان“ کے وزن کے اوپر ہے۔ یعنی یہ الْحَيَوَةُ الدُّنْيَا تو Physical Laws (طبعی قوانین) کے تابع چلی آتی ہے اس کے بعد ایک زندگی شروع ہوتی ہے جو Emergent Evolution (فجائی ارتقا) کے تابع آئے گی اور وہ ہے جو اصل حیات ہے۔ وہ فرانسیسی ڈاکٹر مورس بکائے^① جس کا میں ذکر کیا کرتا ہوں اس کی کتاب ہے: The Bible, The Qur'an & Science (بائبل، قرآن اور

① Dr, Maurice Bucaille (1911.1989) Bucaille, Maurice: The Bible, The Qur'an And Science, Islamic Book Service, Lahore, 1998.

سائنس)۔ یہ مقام ہے جہاں آکر وہ جھوم اٹھتا ہے کہ کیا زبان ہے، کیا کتاب ہے۔ وہی مادہ ہے محض اس کے ”باب یا وزن“ کے بدل دینے سے وہ اتنا بڑا مسئلہ حل کر کے رکھ دیتا ہے۔ کہتا ہے یہ تو حیات ہی ہے اور وہ جو اس کے بعد کی ہے کہ إِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَانُ (29:64) وہ Emergent Evolution (فجائی ارتقا) سے ایک زندگی آتی ہے۔ اور وہ زندگی زندگی کہلانے کی مستحق ہے۔

قرآن نے کہا ہے کہ لو کانوا یعلمون (29:64) اگر تم علم کی بارگاہ سے پوچھو گے تو پھر یہ بات سمجھ میں آئے گی کیونکہ یہ کفر اور اسلام میں بنیادی فرق ہے، سیکولر ازم میں اور قرآن میں بنیادی فرق ہے۔ اس لیے میں اس کو زیادہ وضاحت سے بیان کر رہا ہوں کہ بات ہماری سمجھ میں آئے کہ ان دونوں کے اندر یہ فرق ہے کیا؟ آگے چل کر میں عرض کروں گا کہ عملی زندگی پر اس کا کیا فرق پڑتا ہے۔ ابھی تو یہ دیکھیے کہ علمی دنیا کے اندر یہ چیز ہے جو قرآن نے چودہ سو سال پیشتر بیان کی ہے۔ آج ان کے ہاں سائنسی انکشافات Scientific Discoveries ہوئی ہیں کہ یہ کس طرح اُس کے مطابق ہوتا چلا آ رہا ہے۔

قرآن کے حقائق کو سمجھانے کے لیے اقبال کا اسلوب

ہمارے ہاں اقبالؒ (1877-1938) نے اس چیز کو اپنی شاعری میں اپنے پیغام کا موضوع بنایا۔ اصل میں اسلام اور کفر میں یہی مابہ الامتیاز ایک چیز ہے، اسی کو موضوع بنانا چاہیے تھا۔

میں یہاں اتنا عرض کر دوں کہ میں جو اکثر و بیشتر قرآن کی آیات کی وضاحت میں اقبالؒ (1877-1938) کا شعر لے آیا کرتا ہوں تو اس میں شبہ نہیں کہ اقبالؒ کی فکر سے میں نے بھی اپنے ہاں کی جو بھی بصیرت حاصل کی وہ اس سے متمیز ہے۔ اس لیے کہ ہمارے دور میں اگر نگاہ پیچھے تک دوڑائیں تو صدیوں تک بھی جیسی گہری نگاہ قرآن پہ ان کی تھی وہ بہت کم کہیں اور ملے گی۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ وہ جو کچھ قرآن سے سمجھا اُس کو آگے سمجھانے کا اسلوب ان کو فطرت نے عطا کیا تھا اُس کی مثال نہیں ملتی۔ شاعری کو انہوں نے ان حقائق کی وضاحت کے لیے اختیار کیا تھا کہ ایک تو ہمارا مشرق والوں کا مزاج کچھ واقعی شاعرانہ ہوا ہے، شاعری سے بات میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ دوسری چیز یہ تھی کہ جو Abstrat Truth (بسیط حقائق) ہوتے ہیں جو غیر محسوس حقائق ہوتے ہیں مثلاً نظریہ ارتقا تو اب یہ ایک بہت بڑا Truth (حقیقت) ہے لیکن محسوس طور پہ بات سمجھ میں نہیں آتی لہذا ان چیزوں کو تشبیہات کے ذریعے سمجھایا جاتا ہے اور تشبیہ

محسوسات کے ذریعے دی جاتی ہے۔ تو جیسی جتنی برجستہ وہ تشبیہ ہوگی ویسا ہی عمق سے وہ حقیقت یا وہ Truth سمجھ میں آجائے گا۔ یہ انداز قرآن نے خود اختیار کیا ہے۔ سورۃ آل عمران کی پہلی آیتوں میں آپ دیکھیے، اُس نے کہا ہے کہ قرآن کی آیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک محکمات ہیں اور ایک متشابہات ہیں۔ محکمات تو قوانین ہیں احکام ہیں۔ ان کو تو انہی الفاظ میں بیان کیا جانا چاہیے تھا ہر لفظ کا وہی معنی جو حقیقت میں ہے لیکن حقائق کو اس طرح سے بیان نہیں کیا جاسکتا بلکہ حقائق کو تشبیہات کے ذریعے سمجھایا جاسکتا ہے۔ قرآن نے تو اس قسم کے حقائق کو بیان کیا ہے اور خود قرآن میں بھی تشبیہات کے ذریعے ان کو بیان کیا ہے۔

محکمات اور متشابہات کی اصلیت اور ان کی اہمیت

محسوسات سے تشبیہ دیجاتی ہے تو بات جلدی سمجھ میں آتی ہے۔ اس زندگی میں ہمارا ذہن ہماری فکر محدود فکر ہے، یہ محسوسات کی خوگر ہے اُسی سے زیادہ اچھی طرح بات سمجھ میں آتی ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) نے قرآن کے ان حقائق کو تشبیہات کے ذریعے سے واضح کیا اور وہ تشبیہات اتنی خوبصورت ہوتی ہیں اور اتنی سہل الفہم ہوتی ہیں کہ وہ بات کرتا ہے تو کھٹ سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ مثلاً یہ بات کہ یہ زندگی بھی ضروری زندگی ہے لیکن اصل حیات اس کے بعد آ کر شروع ہوتی ہے۔ اقبالؒ کے ہاں فرنگ، تہذیب مغرب یا خالی عقل اور اس کے مقابلے میں عشق، یہ جتنی چیزیں وہ کہتا ہے وہ یہی بات سمجھانے کے لیے ہے کہ ان کا تصور حیات سیکولر (Secular) ہے، وہ صرف Physical Life (طبعی زندگی) پہ Believe (یقین) کرتے ہیں۔ قرآن کا تصور حیات اس سے آگے چلتا ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک یہ زندگی اُخروی زندگی کا دیباچہ ہے

قرآن اس زندگی کو بھی اہمیت دیتا ہے لیکن جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ ہمیں منزل تک پہنچنا ہوتا ہے تو گھوڑے کو طاقتور اور توانا رکھنا بڑا ضروری ہوتا ہے، وہ منزل تک پہنچانے کا ذریعہ ہے لیکن وہ مقصود بالذات نہیں ہے۔ قرآن نے بھی یہ کہا ہے کہ الحیوۃ الدنیا بھی ہے لیکن زندگی کہلانے کی مستحق وہی ہے جو اس کے بعد شروع ہونے والی زندگی ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) کہتا ہے کہ

ز میں خاکِ درِ میخانہ ما

فلک یک گردشِ پیانہ ما

زمین محض ایک ذریعہ ہے، اصل مقصد تو مے خانہ ہے، مے خانے کی مٹی نہیں ہے۔ آپ اُس مے خانے میں جا کر مٹی کو نہیں چاٹتے۔

اسی طرح فلک ہمارے پیالے کی ایک گردش ہے، اصل مقصد نہیں ہے۔ کائنات ایک ذریعہ ہے، اصل مقصد نہیں ہے۔

حدیث سوز و سازِ ما دراز است

جہاں دیباچہ افسانہ ما

(اقبال: پیام مشرق)

ہمارے سوز و ساز کی جو داستان ہے وہ بڑی دراز ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ یہ تو ہمارے افسانے کی کتاب کا دیباچہ ہے، یہ تو Preface ہے۔ اب آپ نے دیکھا کہ بات کیسے سمجھ میں آئی۔ سمجھ میں بھی آئی اور دل سے واہ واہ بھی نکلی۔ سمجھ کے معنی یہ ہیں کہ بے ساختہ واہ واہ نکلتے۔

جہاں دیباچہ افسانہ ما

کتاب کا مضمون سمجھنے کے لیے دیباچہ بھی بڑا ضروری ہوتا ہے لیکن اگر کوئی صرف دیباچہ پڑھ کر رکھ دے اور آگے چلے ہی نہیں تو اس نے کتاب کو خاک پڑھنا ہے۔ وہ تو اصل کتاب کو سمجھنے کے لیے ایک پہلی اسٹیج ہوتی ہے:

جہاں دیباچہ افسانہ ما

میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ اقبالؒ (1877-1938) کی ساری عمر اسی چیز میں گزری ہے، ان کا سارا پیغام اس پہ ہے۔ اس کے اوپر تو کتابوں کی کتابیں لکھی جائیں۔ بہر حال میں نے یہی انداز اختیار کیا ہے۔ میری کتابوں میں آپ دیکھیں گے کہ وہاں کہیں کوئی قرآن کی بیان کردہ مشکل Abstract truth (غیر محسوس صداقت) کوئی حقیقت آتی ہے تو وہاں اقبالؒ کا کوئی شعر، کوئی قطعہ میری مشکل کو حل کر دیتا ہے اور زبان سے واہ واہ نکلتی ہے۔ یہی چیز ہے جس کو وہ کہتا ہے کہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن

قدم اٹھاؤ! یہ مقام انتہائے راہ نہیں

(اقبال: ضربِ کلیم)

راستہ تو یہ بھی ہے اسی سے ہی جانا ہے۔ اب دیکھا کہ انتہائے راہ کہہ کر کیا بات کر دی! یہ جو یہاں موت واقع ہوتی ہے اس موت

کے بعد ہوتا کیا ہے؟ ایک تشبیہ اور سن لیجیے:

بگوشم آمد از گردوں دم مرگ

موت کے وقت میرے کان میں آسمان سے ایک آواز آئی۔ یہ موت جو ہے بظاہر خاتمہ نظر آتا ہے

شگوفہ چوں فرو ریزد برے ہست

درخت کا شگوفہ گر پڑتا ہے تو اس کے پیچھے پھل ہوتا ہے۔ اس شاخ کو رونا نہیں چاہیے کہ تیرا شگوفہ گر گیا ہے کیونکہ اس کے گرنے کے

بعد تو اس پہ پھل آتا ہے۔ زندگی کو شجر حیات کا شگوفہ کہا اور اصل حیات کو شگوفہ گرنے کے بعد پھل کہا۔ شگوفہ گرے نہیں تو پھل ہی نہیں آتا،

اُس کے گرنے سے ہی پھل ہوتا ہے۔ اور گرنے سے نقصان نہیں ہوتا۔ اگلی منزل شگوفے سے آگے ہوتی ہے لیکن شگوفے کے بغیر پھل

نہیں آسکتا اور اس کے گرنے سے پہلے نہیں آسکتا اور اس کے گرنے سے ماتم شروع نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو اس چیز کی علامت ہے کہ پھل

نکلا ہے۔

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسمان کے لیے

جہاں ہے تیرے لیے، تو نہیں جہاں کے لیے

خودی کی ذات کی نشوونما کے لیے انسان کا یہ جسم ایک ذریعہ ہے۔

انسانی جسم اور انسانی ذات کی پرورش اور نشوونما کے الگ الگ پیمانے ہیں

مقام پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن

نہ سیرِ گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے

(اقبال: بال جبریل)

اب یہاں اقبال (1877-1938) نے کہا ہے کہ ”مقام پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن“۔ Physical Laws (طبعی قوانین)

کے تابع، طبعی نظریہ ارتقا کے ماتحت جسم کی ہی نشوونما ہوتی ہے Physical (طبعی) غذاؤں کے ذریعے سے جسم کی پرورش ہوتی ہے لیکن

یہ جو دوسری شے ہے جسے خودی کہا گیا ہے قرآن کہتا ہے کہ اس کی پرورش اقدار یا Values کے ذریعے ہوتی ہے۔ اب یہ اقدار یا

Values کیا چیز ہے۔ دین جب مذہب میں بدلتا ہے تو الفاظ وہی ہوتے ہیں لیکن ان الفاظ کی حقیقت بدل جاتی ہے۔ یہ ہماری اگلی نسل نے تو دیکھا ہی نہیں ہوگا کہ گھی کسے کہتے ہیں۔ بہر حال ہماری زندگی تو اُس گھی کھانے میں ہی گزری ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ اسے گھی کہتے تھے آہستہ آہستہ اُس کے بعد کچھ اور بنا شروع ہوا پہلے تو وہ بناس پتی کہلایا بناس پتی ہندی میں Vegetable (سبزی ترکاری) کا ترجمہ ہے۔ یہ Vegetable (سبزی ترکاری، نبات) سے کوئی چیز بنی۔ اب اس Vegetable کے ساتھ انہوں نے Vegetable (سبزی ترکاری، نبات) گھی کا لفظ استعمال کر لیا۔ اب گھی وہ بن گیا۔

خدا کا دین مذہب میں کچھ اس طرح بدلا جس طرح بناس پتی یا ڈالڈا کو گھی کی شکل میں بدلا ہے اب یہاں سے حق و باطل کی آمیزش شروع ہوئی۔ وہ Vegetable (سبزی ترکاری، نبات) سے جو بنتا تھا وہ گھی نہیں تھا، گھی ہمارے ہاں ایک اور چیز تھی وہ فطرت کی دی ہوئی ایک چیز تھی وہ گائے بھینس کے دودھ میں ملی ہوئی ایک روغنیت ہوتی تھی وہ مکھن ہوتا تھا اور مکھن کو گرم کرتے تھے اور اس میں سے ایک شے نکلتی تھی اس کا نام گھی تھا۔ پہلے تو یہ Vegetable (گھی) ہی شروع ہوا اب اُس کے ساتھ اُس کی آمیزش شروع ہوئی۔ یعنی پہلے تو یہ مذہب تھا اور اب آمیزش شروع ہوئی تو صلوٰۃ کو نماز کہنا شروع کیا۔ اُس وقت تک بھی جو ڈالڈا (گھی) تھا وہ کچھ پست درجے کی چیز تھی بازار میں کوئی لینے بھی جاتا تھا تو ایسے ڈھانپ کر چوری چوری لاتا تھا جیسے اسمگل کیا ہوا ہو کسی کو پتہ نہ چلے کہ ڈالڈا (گھی) آیا ہے۔ بچوں کو تاکید کی جاتی تھی کہ بیٹا! باہر کسی کو نہ بتانا کہ ابا ڈالڈا (گھی) لائے ہیں۔ آہستہ آہستہ انہوں نے پھر یہ کہا کہ صاحب! یہ ڈالڈا بنا سیتی ہے۔ اس کے بعد جس سے شرم آتی ہے یہ بیچ سے ہی نکل گیا اور اس کا نام ہی گھی ہو گیا۔ اب یہ گھی ملز کھلاتی ہیں یہ خالص ڈالڈا آپ کے ہاں گھی کہلاتا ہے جس کے لانے سے آپ کو شرم آتی تھی۔ اور اب وہ ڈالڈا گھی ہی ہو گیا بلکہ گھی ہو گیا اور اب بنا پتی بھی اس کو کوئی نہیں کہتا سب گھی ہی کہتے ہیں۔ اب یہ گھی ہو گیا ہے۔

اب آپ سوچیے دین اور مذہب میں فرق۔ اگر کتاب میں کسی نے لکھا ہوا ہو کہ جو گھی ہے وہ انسان کو بڑی توانائی دیتا ہے تندرستی دیتا ہے صحت دیتا ہے اُس کے یہ یہ خواص ہیں یہ یہ خوبیاں ہیں اور گھی ہو یہ جو ڈبے سے نکلتا ہے اس کے کھانے سے تو انسان کو الٹا پدق ہو جاتی ہے۔ اب یہ جو کتاب کا پڑھنے والا ہوگا وہ یا تو کہے گا کہ یہ کتاب میں غلط لکھا ہے کیونکہ ہم نے تو گھی کو کھا کر دیکھا ہے۔ ہزار سمجھائیے کہ بابا! یہ گھی نہیں ہے۔ وہ کہے گا کہ صاحب! دیکھیے ڈبے کے اوپر گھی لکھا ہوا ہے اور ہم بازار سے گھی کہہ کر لاتے ہیں اور اماں ہمیں پکا کر

بھی دیتی ہے۔ عزیزانِ من! دین اس طرح سے مذہب بن جاتا ہے کہ جو کچھ قرآن میں دین کے متعلق لکھا ہوا تھا وہ موجودہ مذہب کے متعلق ہم چسپاں کرتے ہیں تو وہ اس پھٹ ان نہیں ہوتا۔ یہ کھی نہیں ہے یہ بناس پتی ہے۔ خالص کھی جو ہے وہ واقعی جسم میں توانائی دیتا ہے کھی حلال کی کمائی سے خرید کر لائیے یا چوری کا کھی لائیے تو کھی کے خواص وہی ہوتے ہیں۔ طبعی طور پہ دونوں کے خواص و اثرات ایک ہی ہوتے ہیں۔

اگر انسانی صحت کے لیے غیر متبدل طبعی قوانین ہیں تو انسانی ذات کے لیے بھی غیر متبدل اقدار ہیں آپ نے غور فرمایا کہ جہاں تک Physical Laws (طبعی قوانین) کا تعلق ہے وہ اس میں فرق نہیں کرتا کہ آپ کھی اپنے پیسے سے خرید کر لائے ہیں یا چوری کر کے لائے ہیں۔ یہ اپنے پیسے کا کھی اور چوری کے کھی کا فرق جو پڑتا ہے وہ انسان کی ذات اور خودی پہ پڑتا ہے جسم پہ نہیں پڑتا۔ قانون یہ ہے کہ جس طرح سے خالص کھی جسم کو توانائی اور صحت دیتا ہے یہ اپنی کمائی سے لایا ہوا کھی بھی اسی طرح انسانی ذات کو توانائی بخشتا ہے۔ اسے Value کہتے ہیں۔ یعنی اپنی کمائی سے جو خریدنا ہے یہ Physical Laws (طبعی قوانین) کی بات نہیں، یہ طبعی ترازو میں نہیں تولا جاسکتا کہ اس میں اور اس میں کیا فرق ہے۔ میں عام الفاظ میں سمجھا رہا ہوں ورنہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ”اقدار“ کیا ہیں۔ کھی کا خالص ہونا Physical Law (طبعی قانون) ہے، جسم کو توانائی بخشتا ہے کسی طریقے سے کھی کو لائیے اس کے اثرات و خواص وہی ہونگے۔ لیکن Value یہ ہے کہ اگر کھی چوری کا یا دوسرے کے استحصال سے یا دوسرے کی محنت کی کمائی کے نچوڑ سے آپ لے آئیں گے تو جسم کی پرورش تو ہو جائے گی لیکن آپ کی جو ذات ہے اُس میں اضمحلال اور کمزوری واقع ہو جائے گی۔ اور اگر یہی کھی آپ اپنی کمائی کا، اپنی محنت کا، دوسرے کی محنت کا استحصال کیے بغیر لے کر کھائیں گے تو جسم کی پرورش بھی صحیح ہو جائے گی اور انسان کی ذات کی پرورش بھی صحیح ہو جائے گی۔ یہ جو چیز ہے اسے اقدار کہتے ہیں یہ Laws (قوانین) ہوتے ہیں اور یہ وحی کے ذریعے سے ملتے ہیں منزل من اللہ ہوتے ہیں ان کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی کا علم ہوتا ہے۔ Physical Laws (طبعی قوانین) تو اس کائنات کے اندر ہمیں مل جاتے ہیں Scientific Discovery (سائنسی انکشاف) سے ان کو معلوم کیا جاسکتا ہے لیکن یہ جو Values (اقدار) ہیں یہ وحی کے ذریعے ہی ملتی ہیں۔ Values (اقدار) عام قوانین کے ذریعے سے بھی پیدا نہیں کی جاسکتیں نہ ان کا Injection کسی کے اندر کیا جاسکتا ہے۔

انسانی ذات کی نشوونما کا تمام تر انحصار قرآنی اقدار پر منحصر ہے

آپ یہ چیز تو قانون کے ذریعے سے کر سکتے ہیں کہ کسی دوسرے کی چوری نہ کریں لیکن آپ قانون کے ذریعے سے کسی کو اس پہ آمادہ نہیں کر سکتے کہ آپ کی محتاج کی بھی مدد کریں۔ اس کا تعلق Values (اقدار) سے ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ اس دنیا میں جو زندگی ہے اُس زندگی کے معنی یہ ہیں کہ صحت کے لیے گھی کا خالص ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ تو مومن اور کافروں کے لیے یکساں ہے ”سردار جسونت سنگھ پہلوان گھیو کھائے گاتے تاں وی بے ساڈا بھولو کھائے گاتے تاں وی او گھیو دوواں اچ اکو ای اثر کرے گا“^①۔ لیکن جو چوری کا کھائے گا اور جو اپنی محنت کا کھائے گا اس کا اثر اس کے آگے جا کر ہوگا۔ اس دنیا کی زندگی یہ ہے کہ یہ جتنے طبعی قوانین زندگی کی پرورش و آسائش کے لیے ضروری ہیں تو وہ سامان بھی اس کے لیے ضروری ہے وہ بھی ہونا چاہیے لیکن جو اقدار ہیں جو آپ کو وحی کے ذریعے ملی ہیں قرآن کے اندر ہیں ان اقدار کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں وہ ساتھ رکھیں۔ گھی خالص تلاش کریں یہ صحت کے لیے بڑی ضروری چیز ہے لیکن اپنی کمائی کا لائیں کیونکہ یہ بات انسان کی خودی کی پرورش کے لیے بڑی ضروری ہے اور ذات نے ہی آگے چلنا ہے۔

اب بات یہ ہوگئی کہ یہ جو Present (موجودہ زمانہ) ہے جو سامنے ہے اسے عربی زبان میں ”الدنيا“ کہتے ہیں۔ یہ بھی بڑا ضروری ہے۔ قرآن کریم میں دعا ہے کہ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً (2:201)۔ پہلی دعا یہ سکھائی گئی ہے لیکن بات یہیں ختم نہیں کی گئی۔ اگلی چیز جسے آپ Future (آنے والا وقت) کہتے ہیں اسے عربی میں آخرت کہتے ہیں۔ طبعی موت کے بعد جو زندگی آگے چلتی ہے وہ ہے جسے Future (آنے والا وقت) کہتے ہیں۔ اُس زندگی کی جو پرورش ہے اُس کی جو نشوونما ہے اُس زندگی کے جو حسنات ہیں وہ ہیں وبالْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201)۔ وہ آپ کے ہاں اقدار کے ذریعے سے ہوگی۔ اب یہ ہوا اسلام یعنی اس دنیا کے طبعی ذرائع سامان کو نہایت خالص عمدگی کے طریقے سے حاصل کرنا اور اس کے حاصل کرنے میں اور اس کے استعمال کرنے میں اقدار کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ اب آپ کو معلوم ہے کہ مغربی تہذیب اور مغربی نظریہ حیات کے تابع اقدار نہیں آتیں۔ اس لیے ان کا ذریعہ یہ ہے My Country, right or wrong رائٹ آر رائٹ (صحیح یا غلط) کا تصور اقدار سے ہے۔ My Country فزیکل چیز ہے۔ مجھے

① اگر پہلوان سردار جسونت سنگھ کھائے گا تو بھی اور اگر ہمارا بھولو پہلوان کھائے گا تو بھی وہ گھی دونوں میں ایک ہی اثر مرتب کرے گا۔

② میرا ملک میری مملکت، صحیح یا غلط جو بھی ہے بہر حال یہ ”میری“ ہے۔

اپنی مملکت کی، مجھے اپنی قوم کی فکر کرنی چاہیے، مجھے اپنی ذات کی فکر کرنی چاہیے، مجھے اپنی کرسی کی فکر کرنی چاہیے تو یہ ساری فزیکل لائف (طبعی زندگی) ہے۔ اس کی پرواہ نہیں ہے کہ وہ کس طرح سے حاصل ہوا اور کیسے حاصل ہو۔ اس چیز کا تعلق اقدار سے ہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ بات جو پہلے بالکل نظری سی نظر آتی تھی محض Academic سی نظر آتی تھی اس کا زندگی کے اوپر اور دنیا کے نظام پہ کتنا بنیادی اثر پڑتا ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ اس دنیا میں اس انداز سے رہے یہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن اقدار ہر وقت انسان کے سامنے رہیں۔ یہ ہوئی مومن کی زندگی۔

ذات کی نشوونما کے لیے قرآنی اقدار کی کہانی اقبالؒ کی زبانی

اسے اقبالؒ ایسے سمجھاتا ہے:

مانندِ سحرِ صحنِ گلستاں میں قدم رکھ

رات کی تاریکیوں کے بعد وہ نمودِ سحر وہ کہکشانِ روشنی وہ ایک مرمریں سا غبار اس سے ہر چیز میں زندگی کی نمود ہو جاتی ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ اس دنیا کے اندر کیسے زندگی بسر کر:

مانندِ سحرِ صحنِ گلستاں میں قدم رکھ

آئے تیر پا گوہرِ شبنم تو نہ ٹوٹے

ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش، و لیکن

ہاتھوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھوٹے!

(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

سحر کے ہاتھوں سے دامنِ افلاک چھوٹ ہی نہیں سکتا، اس کی نورانیت کا منبع اور مرکز تو وہی افلاک ہوتا ہے وہ وہاں کا سورج ہوتا ہے وہ وہاں کی روشنی ہوتی ہے۔ اگر اُس سے اپنا تعلق منقطع کر لے تو سحر کی نورانیت باقی نہیں رہتی۔ سحر آتی اس طرح سے ہے کہ گوہرِ شبنم اس کے آنے سے ٹوٹتا ہی نہیں ہے:

ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش، و لیکن

ہاتھوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھوٹے!

یہ مومن کی زندگی ہے: ”ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش“۔ یہاں تک دونوں برابر ہیں: یورپ کا Materialist یا جسے آپ مادہ پرست کہتے ہیں اور مردِ مسلمان۔ یہاں تک یہ دونوں ایک سے ہیں۔ لیکن ”ہاتھوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھوئے“۔ یہ اختصاص ہو گیا مردِ مومن کی زندگی گا۔

یورپ کی مادہ پرست سوچ اور مومن کے نزدیک تسخیرِ کائنات کی سوچ میں ایک بنیادی فرق ہے عزیزانِ من! ”مانندِ سحرِ سخنِ گلستان میں قدم رکھ“ سحر کی تشبیہ میں ساری باتیں آگئیں۔ یہ ہے عروج۔ اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسانی خودی کے اندر انسانی ذات کی جو نشوونما ہوتی ہے وہ ہے عروج جو قرآن کے لفظ میں ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ (32:5) ہے۔ اب آگئے ہم اس کی طرف۔ میں نے کہا تھا کہ جو ”الی“ ہے وہ بذاتِ Significant ہے اس کی بڑی اہمیت ہے وہ ڈائریکشن (سمت) دیتا ہے کہ اب ارتقا کی Direction (سمت) کونسی ہوگی۔ طبعی زندگی کا جو ارتقا ہے اس کی ڈائریکشن (سمت) Sound mind in sound body (متوازن جسم میں متوازن دماغ) میں ہے۔ یورپ کے یہ مادہ پرست یہاں تک ہی گئے تھے۔ اس کے بعد ڈائریکشن (سمت) یعنی الیہ کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ إِنَّ إِلَهِي رَبِّكَ الْمُتَتَّبِعِي (53:42) تمہارا جواب نصب العین ہے تمہاری جو Destination ہے وہ یہ ہے کہ تم نے اس زندگی کے بعد اُس طرف آگے جانا ہے۔ یہ ہے عروج۔ میں نے کہا تھا کہ یہاں لفظ عروج استعمال ہوا ہے اس میں بلندی کے معنی ہیں لیکن یہ وہ بلندی ہے جس کی طرف بتدریج جایا جائے جیسے سیڑھیاں چڑھتے ہیں۔ معراج کے کہتے ہی سیڑھی کو ہیں۔ کہا ہے کہ درجہ بدرجہ ارتقائی طور پر اوپر چڑھتے جاؤ إِنَّ إِلَهِي رَبِّكَ الْمُتَتَّبِعِي (53:42) اُس طرف تمہارا رخ ہونا چاہیے۔ یہ ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاٰجِعُوْنَ ﴿1﴾ (2:156) یہ خدا بن جانا نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف جانا ہے۔ یہ بندہ مولا صفات ہونا ہے یہ صفاتِ خداوندی کا حدِ بشریت کے اندر اپنے ہاں منعکس کرتے جانا ہے۔ ان صفاتِ خداوندی کو اقدار کہتے ہیں۔ ”چھوٹا جیہا رب بن جانا“۔ یہ چیز وہ Destinition (منزل) ہے وہ منبع ہے وہ مرکز ہے جس کی طرف رخ کرنا اوپر کی طرف جانا اور پھر ابھرتے ہوئے چلے جانا ہے:

① ہمارا ہر قدم اسی کی طرف اٹھے گا (9:59)۔ وہی ہمارا مقصود و مقصدی ہے اور ہم ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کریں گے (پرویز: مفہوم القرآن ص 57)۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارِ مہِ کامل نہ بن جائے

(اقبال: بال جبریل)

اجازت دیں تو ایک غزل کا شعر عرض کروں۔ ہمارے ہاں کے بعض غزل گو شاعر بھی بعض اوقات بڑی بڑی حقیقتیں بیان کر جاتے ہیں۔ مجھے وہ تشبیہ اس اعتبار سے پسند آئی کہ اُس میں عروج والی بات ہے اور اُس مرکز کی طرف جانے والی بات ہے۔ وہ مرکزِ حسن و زیبائی منزل ہے اُس کی طرف عروج سے اوپر جانا ہے:

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن!
بھولتا ہی نہیں عالم تیری انگڑائی کا!

(عارف بٹالوی: تراش، اتحاد پریس، لاہور، ص 371)

بات خالص غزل کی ہے لیکن اس کے اندر جو معنی پیدا کر گیا ہے وہ کسی کسی کا کام ہے۔
اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن!
بھولتا ہی نہیں عالم تیری انگڑائی کا!
وہ تو انسانی خودی کی انگڑائیاں ہیں جو اس مرکز کی طرف مائل پرواز ہوتی ہیں۔

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلمان کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تُو ہے

(اقبال: بانگ درا)

عزیزانِ من! اسے قرآنِ کریم کی ایک آیت کے اندر بیان کیا گیا ہے۔ عظیم آیت ہے اور کوئی آیت عظیم نہیں ہے۔
ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جائیں جاست

وہ تو حسن پیکر ہے سر سے پاؤں تک حسن کا مجسمہ ہے۔ جہاں بھی جا کر نگاہ نکلتی ہے وہ کہتا ہے کہ تمہارے کچھ جانے کا یہی مقام ہے۔

کائنات کی وسعتیں لامحدود ہونے کے باوجود محدود ہیں

قرآن نے کہا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَاَنْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْا اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (55:33)۔ قرآن ارض اور سما اس Outer Universe (خارجی کائنات) کے لیے استعمال کرتا ہے اس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ علم الافلاک والوں سے پوچھیے۔ وہ کہتے ہیں کہ صاحب! ان کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کے باوجود وہ کہتے ہیں کہ کائنات محدود ہے اس کی آخری حد کا تصور نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ ہے محدود۔ اور محدود ہی نہیں وہ اسے Expanding Universe کہتے ہیں کہ یہ بڑھتی ہوئی چلی جا رہی ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کی حدود کیا ہیں۔ قرآن اسے اقطار کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (55:33) سے اگر تم آگے جانے کی استطاعت رکھتے ہو تو آگے بھی جاسکتے ہو لیکن لَا تَنْفُذُوْا اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (55:33) اس کے لیے خاص قوت کی ضرورت ہے اور وہ قوت تمہیں وحی خداوندی کی رو سے مل سکتی ہے۔ وہ فرانسیسی ڈاکٹر مورس بوکائے (Mourice Buccaille: 1911-1989) جس کا میں ذکر کیا کرتا ہوں ان آیتوں پر آکر وہ وجد میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ اپنے دور کے تمام سائنسدانوں اور مفکرین سے پکار کر کہتا ہے کہ خدا کے لیے بتاؤ کہ چودہ سو سال پیشتر یہ باتیں کونسا فکر انسانی کہہ سکتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر اقطار کے معنی حدود سے آگے کے نہ بھی ہو لیکن یہ جو Space (خلا) کے Conquerer (تسخیر کرنے والے) ہیں یہ عرب کی حدود سے اور ان کے ہاں کی Atmosphere (فضا) کی حدود سے تو یہ بھی آگے چلے جا رہے ہیں۔ اور یہ تو اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے بھی آگے کی بات کہہ رہا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ چیز سلطان یعنی ایک خاص قوت سے ہے۔ سلطان مبین قرآن ان اقدار کو کہتا ہے جو وہ وحی کے ذریعے دیتا ہے۔

① Eddington, Sir, Arthurs: The Expanding Universe (1933)

Eddington, Sir, Arthus S: The Expanding Universe, Cambridge University Press, 1946

(Total page 130)

② اس کی اس کتاب کا نام ہے: The Bible, The Qur'an, And Science

قرآنی زبان کی بلاغت کی ایک مثال

ڈاکٹر مورس بوکائے (1911-1989) سے کہا ہے کہ آگے جانے سے پہلے دو ایک چیزیں ضروری ہیں۔ کہا ہے کہ ان استطعتم (55:33)۔ اس میں بھی ایک شیرینی ہے جو میں بیان کیا کرتا ہوں۔ اس آیت میں ”إن“ آیا ہے ”إن“ حرف شرط ہے جسے ”اگر“ کہتے ہیں کہ اگر تم میں یہ استطاعت ہے کہ تم چلے جاؤ۔ انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ ”If“ ہوگا۔ عربی زبان میں جو حرف شرط ہیں وہ بہت سے ہیں ”یہ“ ”إن“ اکیلا ہی نہیں ہے۔ اگر یہ کرو جب کہا جا رہا ہے اگر وہ ممکن ہے تو اس کے لیے اور لفظ ہے اور اگر بین بین ہے کہ ہو بھی سکتا ہے نہیں بھی ہو سکتا تو اور حرف شرط ہے اور اگر ناممکن ہے تو اور حرف شرط ہے۔ اوہ میرے اللہ! یہ قوم اور یہ زبان! ”إن“ وہاں آتا ہے جو ان کے نزدیک بظاہر ناممکن ہو لیکن درحقیقت ہو سکتا ہے۔ یہاں ان استطعتم ہے۔

آگے نکلنے کے لیے لفظ نفذ کا استعمال کیوں؟

عزیزانِ من! قرآن یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ جو شرط کے حروف ہیں ان میں سے بھی یہ جن کے جولایا ہے تو اس کے معنی ہیں 'It is possible' اور نہ یہاں وہ حرف ”لو“ لاتا۔ اور ساتھ لفظ نفذ آیا ہے۔ عربی زبان میں ’آگے نکل جانے‘ کے لیے سینکڑوں الفاظ تھے۔ نفذ کے معنی ہیں کہ ”کسی چیز میں چھید کر کے آر پار ہو جانا جیسے تیر کسی چیز کو چھید کر کے اگلی طرف آر پار ہو جائے۔“ اسے نفذ کہتے ہیں کہ اس ارض و سماوات کے اندر سے بھی تمہیں نکل کر جانا ہوگا:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

انہیں بھی Conquer (تسخیر) کرنا ہوگا۔ عزیزانِ من! سوچئے کہ قرآن ایک لفظ کے اندر کیا کہہ جاتا ہے! اگر وہ باہر سے چلا جائے یا یونہی ان کو چھوڑ کر چلا جائے تو یہ لفظ نہیں آئے گا۔ یہ لفظ آئے گا جب وہ ان کو چھید کر ان میں سے آر پار چلا جائے گا۔ یہ جو Physical Universe (طبعی کائنات) ہے یہ اس میں سے چھید کر کے پار جانے والی بات ہے۔ لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطٰنٍ (55:33) لیکن اقدار کے ذریعے سے جو طاقت آئے گی تو پھر یہ صورت ہوگی۔ یہ آپ کے ہاں کی جو Physical Universe (طبعی کائنات) ہے اس میں سے اس کو چھید کر پار نکل جانا ہے۔ اور أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ تک تو یہ ستاروں کی دنیا ہوئی وہ تو اس

① یہ ممکن ہے۔

سے آگے جاتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے اس^① نے کہا ہے کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

حصولِ منزل کے لیے پروگرام کے ساتھ عشق ہونا ضروری ہے

سلسلہ ارتقا میں ہر اگلی کڑی تک پہنچنے کے لیے مخالف قوتوں کے ساتھ تصادمات نہایت ضروری ہوتے ہیں، ٹکراؤ ضروری ہوتا ہے اور ان ٹکراؤ کا مقابلہ وہی کرتا ہے جس کی منزل اُس سے آگے ہو اور اُس منزل تک پہنچنے کے لیے اُس کے دل کے اندر عشق ہو۔ اُسی صورت میں وہ ٹکراؤ مول لے گا، ورنہ جہاں اُس کے سامنے ٹکراؤ آئے گا وہ کہے گا کہ ”کی لو ہڑاے مینوں پتھراں نال ٹکر لین دی، ٹھیک اے اتھے پے جاندے آں چنگے بھلے ہیگے آں“^②۔ لیکن جسے اپنی منزل کے ساتھ عشق ہو گا وہ پھر اس ٹکراؤ کی پرواہ نہیں کرے گا، ٹکراتا چلا جائے گا، بڑھتا چلا جائے گا۔ اس کے لیے منزل کے ساتھ مقصد کے ساتھ، نصب العین کے ساتھ، محبوب کے ساتھ، عشق کی ضرورت ہے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یہاں بھی ایک امتحاں ہے اسے پاس کرو گے تو اگلی کلاس میں جاؤ گے اور اگلی کلاس منتہی نہیں ہے، ابھی تو تم F.A ایف اے میں پہنچے ہو:

قناعت نہ کر عالمِ رنگِ دبو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تُو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکان اور بھی ہیں

[اقبال: بال جبریل]

① یہ اشارہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877.1938) کی طرف ہے۔

② ان پتھروں سے ٹکراؤ کی مجھے کیا ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے، یہیں لیٹے رہتے ہیں اچھے بھلے تو ہیں۔

یہ ہے اَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی (53:42)

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلمان کی

انسان کی ارتقائی حدود کی اگلی منزل کے متعلق برگسان کا نقطہ نظر

یورپ کے مفکرین بھی اب اس پہ پہنچ رہے ہیں۔ برگسان (1859-1941) ان کے اندر خاص فکر کا فلاسفر تھا۔ اُس نے خودی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ انسانی ارتقا کی اگلی منزل انسان کا ان حدود سے آگے بڑھ جانا ہے جو مادی فطرت نے اس کے اوپر اس وقت عائد کر رکھی ہیں۔ اس کی کتاب کا نام ہے: "The Two Sources of Morality & Religion"۔ Physical Universe (طبعی کائنات) کے جو Distances (فاصلے) ہیں وہ تو میلوں سے ماپے جاتے ہیں۔ یہ جو نئی زندگی ہے اُس کا ایک نیا سفر ہے اس کی ایک نئی منزل ہے تو وہ جو فاصلے ہیں وہ تو ان چیزوں سے نہیں ماپے جاتے، وہ تو محسوسات کے دائرے سے آگے بڑھ جانے والی بات ہے۔

خدا کا قُرب حاصل کرنے کے لیے اس کے قانون کے آگے جھکنا ہوگا

عشق کی منزلیں میلوں اور گزروں سے نہیں ماپی جاتیں اس سے جو حرارت پیدا ہوتی ہے وہ تھرما میٹر سے معلوم نہیں کی جاتی بلکہ اس کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ یوں تو نظر آتا ہے کہ کہیں بہت آگے ہے لیکن وہ جو اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی (53:42) ہے وہ تو کہتا ہے کہ میں تو تمہاری شررگ سے بھی قریب ہوں۔ آپ نے غور فرمایا۔ قُرب کی یہ کیفیت ہے زندگی کی اور منازل ابھی اتنی طے کرنی ہیں۔ کہا ٹھیک ہے میں تو یہاں ہوں لیکن تُو مجھ سے دور ہے آؤ تمہیں قریب آنے کا طریقہ بتاؤں۔ وَاسْجُدْ (96:19) ان اقدار کے سامنے جھک جاؤ۔ وَاقْتَرِبْ (96:19) اور میرے قریب آ جاؤ۔ ان دو لفظوں میں سارا پروگرام ہے۔ میں تو موجود ہوں لیکن وَاسْجُدْ کے بغیر ممکن نہیں۔ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4) جہاں بھی ہو میں وہاں موجود ہوں لیکن تم میرے قریب نہیں ہو۔ اُس کا طریقہ یہ ہے کہ واسجد (96:19) ان اقدار کے سامنے جھکتا چلا جا، ان کی اطاعت کیے چلا جا۔ وَاقْتَرِبْ (96:19) میں دور نہیں ہوں بس صرف تیرے جھکنے کی دیر ہے تو میرے بہت قریب ہو جائے گا۔

تُو اے اسیرِ مکاں! لا مکاں سے دور نہیں

وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

یہ ہے خلاصہ علم قلندری کہ حیات
خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں
فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا، یہ مقام آسماں سے دور نہیں

[اقبال: بال جریں]

خدنگ تیر کو کہتے ہیں، خدنگِ جستہ اُس تیر کو کہتے ہیں جو کماں سے نکلا ہوا جا رہا ہو۔
اب آپ دیکھتے ہیں کہ میرا آپ کا اور اس درخت کا یا پول کا Distance (فاصلہ) ماپنے سے کتنا ہے؟ یہ میری نگاہ کا ایک رشتہ
ہے جو کہیں محسوس نہیں ہوتا، کہیں نظر نہیں آتا، وہ اس سے اتنا قریب ہے کہ یہ دور ہی نہیں۔ وہ جس کا رشتہ برابر ہے، ہمیں پتہ ہی کچھ نہیں کہ
وہ رشتہ ہے کونسا!

یہ ہے خلاصہ علم قلندری کہ حیات
خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں

یہ ہے وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (96:19) ایک سجدہ کر اور قریب آجا۔

خدا انسان کو جیسا بنانا چاہتا ہے قرآن اس کو وہ کچھ بنادیتا ہے
عزیزانِ من! یہ ہے جسے آپ اسلام کا نظام، قرآن کا نظام، مسلمان کی زندگی، مومن کی زندگی کہیں گے۔ وہ جو قرآن کے متعلق اُس
نے کہا ہے اُس نے ایک مصرع میں سمنا کر رکھ دیا ہے کہ قرآن کرتا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ
آنچه حق می خواهد آن سازد ترا
جس طرح خدا چاہتا ہے کہ تُو بن جائے تو قرآن تمہیں اس طرح کا بنادیتا ہے۔

اب ہم عملی زندگی پہ آگئے کہ یہ سارا کچھ جو ہم نے بیان کیا ہے: یہ بلند نصب العین، زندگی کی اگلی منزل، عروج، بتدریج بڑھتے چلے
جانا، یہاں زندگی ختم نہیں ہوتی اور یہ سب کچھ اقدار کے ذریعے ہوگا۔

مومن کے لیے قضائے اکبر بھی کچھ حیثیت نہیں رکھتی

اب قرآن نے اپنے ہاں جتنے بھی اصول، قوانین، احکام، ڈائریکشن (ہدایات) جو کچھ دی ہیں وہ سب اقدار (Values) ہیں۔ زندگی کا جو اگلا سفر ہے وہ Values (اقدار) کے زور پر آگے چلتا ہے۔ وہ جو قرآن نے سلطان کہا تھا کہ اگر یہ پیدا ہو جائے تو تم اقطار السموات والأرض (55:33) سے بھی آگے نکل سکتے ہو تو وہ ان اقدار کی پیروی سے ہوگا۔ یہ ہے واسجد (96:19)۔ ان کی اطاعت سے انسان کی ذات میں اتنی نشوونما پیدا ہو جاتی ہے اتنی پختگی پیدا ہو جاتی ہے کہ اُس کے بعد موت بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑتی۔ قرآن نے کہا ہے کہ قضائے اکبر یعنی موت کا سخت ترین جھٹکا بھی مومن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، یہ تو صرف اس کے جسم کا کچھ بگڑ رہا ہوتا ہے مومن تو اس سے اور آگے ہوتا ہے۔

زندگانی ہے صدف قطرہ نیساں ہے خودی

وہ جو میں نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں ایک چیز چلی آتی ہے کہ بہار کے موسم میں بادل آتا ہے، اُس سے بارش ہوتی ہے، اُس کا ایک قطرہ سمندر کی سیپ اپنے آپ کو کھول کر اپنے اندر لے لیتی ہے اور پھر بند ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس سیپ کے اندر وہ پانی کا قطرہ گہر بن جاتا ہے، اس کی نشوونما اس طرح سے ہوتی ہے کہ وہ گہر بن جاتا ہے۔ بننا تو مادی سیپ کے اندر ہے لیکن وہ بننا ایسے ہے کہ وہ صدف سمندر کی تلاطم خیز موجوں کے طوفانوں سے مسلسل ٹکراتی چلی جاتی ہے اور گہر اس کے اندر پرسکون بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔

یا رب درون سینہ دلِ باخبر بدہ

با اضطراب موج سکونِ گہر بدہ

انسانی خودی کا قطرہ جب گہر کی شکل اختیار کر جائے تو پھر وہ حیاتِ جاوید سے ہم کنار ہو جاتا ہے عزیزانِ من! یہ جو باہر کی زندگی کے اضطراب ہیں جسے آپ دیکھ رہے ہیں کہ مومن ان کے اندر ہوتا ہے کہ ہر قسم کے ٹکراؤ، ہر قسم کی مخالفتیں، ہر قسم کے تصادمات اور تراجمات ہوتے ہیں، یہ ساری چیزیں ہوتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تو سمندر کی موجیں ہیں تمہاری جو صدف ہے، وہ تو اس سے متاثر ہونی چاہیے اور وہ ہوتی ہیں لیکن اس کے اندر تمہارا جو قطرہ گہر ہے، وہ تو پرسکون ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ اگر وہ قطرہ اب گہر بن گیا ہے تو اس کے بعد وہ سیپ پھٹتی ہے اور پھر وہ گہر بھی سمندر میں آ جاتا ہے تو یہ جو اضطراب ہے وہ اس گہر کا کچھ نہیں بگاڑ

سکتا کیونکہ اب وہ پختہ ہو گیا ہے:

زندگانی ہے صدف، قطرہ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تُو موت سے بھی مرنہ سکے

[اقبال: ضربِ کلیم]

یہ پختگی اقدار کی اطاعت سے ہوتی ہے قرآن کی اطاعت سے ہوتی ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہ جو آپ کے ہاں کی خارجی کائنات کی یا معاشرے کے نامساعد حالات کی تلاطم خیزیاں ہیں، اگر وہ قطرہ نیساں اس صدف کے اندر ہے تو یہ اس کا کیا بگاڑ سکتی ہیں، کچھ بھی نہیں۔ اب اگلی آیت پہ آجائیے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ کہنے کو تو ابھی اتنا کچھ باقی ہے لیکن ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔

انسان کے ہر عمل کا نتیجہ اس کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے

یہ جو اس چیز سے انکار کرتے ہیں کہ موت کے بعد بھی انسان کی زندگی آگے چلتی ہے وہ کہتا ہے کہ یہ انکار محض کوئی فلسفیانہ بات نہیں ہے جس پہ وہ انکار کرتے ہیں۔ اس نے کہا یہ ہے کہ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پہ پڑتا ہے۔ جو اقدار کے مطابق اعمال ہوتے ہیں ان سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے، نشوونما یافتہ ذات آگے بڑھتی ہے اور اس کی جو اگلی منزلیں ہیں وہ جنت کے مناظر ہیں۔ یہ ساری تشبیہات ہیں۔ جو ان اقدار کے خلاف جاتے ہیں، اس سے ان میں اضمحلال اور انتشار واقع ہوتا ہے قرآن اس کو Disintegration کہتا ہے۔ اس کے بعد ان دونوں میں جو فرق ہے کہ یہ ذات جو اس طرح سے Disintegrate (مضمحل) ہوئی آگے جاتی ہے وہ ہے جسے جہنم کی زندگی کہتے ہیں۔

اگر انسان اپنے ہر عمل، یہاں کے مکافات یا اپنے اُس عمل کے نتیجے جسے آپ قانون کی سزا کہتے ہیں، کا کچھ انتظام کر لے تو وہ اسے کے عواقب سے بچ سکتا ہے۔ انسان کے بہت سے اعمال ایسے ہیں جو محسوس شکل میں سامنے آتے ہی نہیں ہیں، مثلاً آپ کی اس چیز کی نیت کہ جہاں کہیں بھی آپ ملیں تو آپ کا گلا کاٹ دوں گا، اب اتفاق ایسا ہے کہ آپ ایسی جگہ ملتے ہی نہیں ہیں تو یہ نیت قانوناً جرم نہیں ہے اس سے آپ کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر رہے، آپ کسی گرفت میں ہی نہیں آ سکتے، آپ پہ مقدمہ ہی نہیں چل سکتا، کوئی سزا ہی نہیں مل سکتی لیکن وہ کہتا ہے کہ اس کا اثر تمہاری ذات پہ پڑتا چلا جاتا ہے۔ اگر یہاں قانون شکنی ہو اور محسوس شکل میں سامنے بھی آ جائے تو ہو سکتا ہے کہ آپ پولیس کی گرفت میں نہ آئیں، کچھ ایسا رسوخ پیدا کر لیں کہ سفارش لے آئیں، مجسٹریٹ کے ہاں جائیں تو وہاں بھی یہ کچھ ہو سکتا ہے کہ سزا نہ مل سکے، قید میں بھیج دیا جائے تو جیل کے ساتھ مل جائیں گے۔ یعنی یہاں کی قانون شکنی سے بہر حال آدمی سزا سے بچ سکتا ہے اور روز سارے رونا ہی اس چیز کا روتے ہیں کہ صاحب! جو یہاں دیانتداری اور ایمانداری سے زندگی بسر کرتا ہے اس کا تو جینا حرام ہو جاتا ہے۔ اور انہیں دیکھیے کہ یہ اسمگلر، چور اور بلیک کرنے والے، یہ سارے پنپتے جاتے ہیں۔ یہ یہاں کے قانون کی بات ہے کہ گرفت میں نہیں آئے۔

وہ کہتا ہے کہ جس کا ایمان یہ ہو کہ ان تمام چیزوں کا اثر میری ذات پہ پڑتا ہے یعنی یہاں کوئی بھی مجھے نہ دیکھے، کوئی بھی مجھے نہ پکڑے، کوئی بھی مجھے سزا نہ دے لیکن اس کے باوجود اس کا نتیجہ مجھے بھگتنا ہے، اس سے مفر نہیں ہے۔ یہاں زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہو کہ جو مر جاتا ہے وہ یہاں کے قانون کی حدود سے بالا ہو جاتا ہے، اُس کے بعد کوئی جرم اس پہ عائد نہیں ہوتا۔ وہ یہ ایمان رکھتا ہے کہ موت کے بعد ہی تو اصل میں گرفتاری ہوتی ہے اور وہاں سے چھوٹ نہیں سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ اصل یہ چیز ہے کہ جو نظریہ ہم نے دیا ہے، یہ محض کوئی Academic سی چیز نہیں ہے کہ اسے مان لیا تو کیا اور اسے نہ مانا تو کیا۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی زندگی پہ اس کے معاشرے پہ نظام انسانیہ پر اس کا بڑا گہرا اثر ہے۔ اگر وہی Physical Law (طبعی قانون) والا تصور حیات ہے تو اس کے بعد ایک فرد بھی جتنی قوت حاصل کر لے، جتنی فریب کاریاں، شاطرانہ عیاریوں کی ترکیبیں سوچ لے، وہ کامیاب ہوتا چلا جائے گا۔ جس کے ہاتھ میں قوت ہوگی، جس کی لاٹھی ہوگی اس کی بھینس ہوگی۔ محض قوت کے زور کے اوپر جو جی میں آئے کرتا چلا جائے۔ ایک قوم دوسری قوم کے خلاف جو جی میں آئے کرتی چلی جائے، کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کو روک سکے لیکن جس کا ایمان ان اقدار کے اوپر ہوگا وہ خلاف اقدار بات تنہائی میں

بھی نہیں کرے گا، وہ کسی محنت کش کی محنت کے پسینے کا ایک قطرہ بھی اپنے استعمال میں نہیں لائے گا۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب

خون جگر و دھیتِ مرغانِ یار تھا

[غالب]

انتظامی امور کے سلسلہ میں مملکتِ اسلامیہ کے سربراہ کی حیثیت نیز مکافاتِ عمل کی اہمیت

مومن یہ بات جانتا ہے جو حضرت عمرؓ (581-644/45AD) سے پوچھی گئی تھی کہ خلافت کسے کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا تھا کہ میں تو زیادہ جانتا ہی نہیں ہوں اتنا ہی جانتا ہوں کہ یہ پوچھا جائے گا کہ لیا کہاں سے تھا اور دیا کدھر تھا؟ یہ جو چیز ہے یہ ہے اصل شے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو اس چیز کا انکار کرتے ہیں تو یہ ان کے من کا چور ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ وہ قانونِ مکافاتِ عمل کا سامنا نہیں کرنا چاہتے، وہ اس عدالت کو ہی نہیں مانتے، وہ اس حکومت کو ہی نہیں مانتے، اس قانون کو ہی نہیں مانتے۔ کہا ہے کہ وَقَالُوا ۚ اِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ۚ اِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ (32:10) کہتے ہیں کہ وہ مر مر اگئے، مٹی سے مٹی مل گئی تو معاملہ ختم ہو گیا۔ وہ کہہ رہا ہے کہ یہ محض ایک فلسفیانہ نظریہ نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ ان کا من کا چور ہے۔ بَلْ هُمْ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ كَفُرُونَ (32:10) وہ قانونِ مکافاتِ عمل کا سامنا نہیں کرنا چاہتے اور اسے فلسفیانہ معذرتوں کے اندر چھپا رہے ہیں۔ سامنا نہیں کر سکتے اس سے بچنا چاہتے ہیں، جی کو چر رہے ہیں کہ کہیں یہ چیز نہ ہو۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ (32:11) ان سے کہو کہ طبعی زندگی (Physical Life) کے لیے ایسی طبعی قوتیں (Physical Forces) مسخر کی ہوئی ہیں جو آہستہ آہستہ تمہارے جسم کے اندر اضمحال پیدا کیے چلی جا رہی ہیں۔ وہ جو ہم ملک الموت کہتے ہیں یعنی موت کا فرشتہ، وہ کہیں الگ سے نہیں آتا، وہ تو ساری زندگی تمہارے اوپر سوار ہوتا ہے۔ تم ذرا اسی بد پرہیزی کیے چلے جاتے ہو تو موت کا وہ فرشتہ تمہیں اتنا ہی موت کے قریب لیے چلا جاتا ہے۔ وہ تمہیں By Ordinance نہیں مارتا بلکہ By Law (بذریعہ قانون) مارتا ہے۔ وُكِّلَ بِكُمْ (32:11) وہ ساری زندگی تمہارے اوپر سوار ہوتا ہے۔ موت کیا ہوتی ہے؟ یہ کہ شراب کی تندی اور تیزی اور نشہ ختم ہو جائے اور باقی پانی رہ جائے تو اسے موت کہتے ہیں۔ وہ

فرہیت موت تو عمر بھر تمہارے اوپر سوار رہتا ہے۔ کہا ہے کہ ثُمَّ اِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ (32:11) اس کے بعد اگلی منزل وہ آتی ہے کہ تمہیں ہماری عدالت میں حاضر ہونا ہے۔ کہا کہ وَلَوْ تَرَىٰ اِذِ الْمُنْجَرِمُونَ نَاكِسُوْا رُءُوسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا ابْصُرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوقِنُونَ (32:12) اے سننے والے! اگر کہیں تُو اس منظر کو دیکھ سکتا کہ وہ جو عدالت میں کشاں کشاں لائے جائیں گے اور وہاں اعمال نامہ گردن میں لٹکا ہوا ہوگا اور ان سے کہا جائے گا کہ خود ہی پڑھو اور جب اُسے پڑھیں گے تو ندامت کے مارے زمین میں آنکھیں گڑ جائیں گی۔ کیفیت یہ ہوگی کہ انکار ہی نہیں ہو سکے گا۔ نظر آ جائے گا کہ اب اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

گزر رہا ہو وقت، خواہ ایک سیکنڈ ہی کیوں نہ ہو، واپس نہیں آیا کرتا

وہی مثال کے طور پر یا تشبیہاً جہنم کے شعلے نظر آ رہے ہونگے۔ کہیں گے رَبَّنَا ابْصُرْنَا وَ سَمِعْنَا (32:12) یا اللہ! جو چیزیں وہاں یوں کہی جا رہی تھیں ہم نے اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ لیا، اپنے کانوں سے سن لیا۔ اِنَّا مُوقِنُونَ (32:12) ہم ایمان لائے اس بات کے اوپر کہ واقعی تم نے ٹھیک کہا تھا جو وہاں کہا تھا۔ فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا (32:12) بس ایک دفعہ واپس بھیج دو پھر دیکھ ہم کتنے اچھے اچھے کام کرتے ہیں۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ زندگی کی نندی جو آگے بڑھ جاتی ہے وہ پیچھے نہیں لوٹا کرتی۔ ٹائم تو کہتے ہی اس کو ہیں جو واپس نہ آ سکے:

میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

[غالب]

خدا تعالیٰ کی طرف سے ایمان لانے کے لیے انسان پر کوئی جبر نہ ہوگا

کہتا ہے کہ یہ وقت کی بات ہے، پیچھے لوٹنے والی بات نہیں ہے۔ پوچھا یہ جائے گا کہ کیا تم تک یہ باتیں پہنچی تھیں یا نہیں، سمجھائی گئی تھیں یا نہیں سمجھائی گئی تھیں؟ تم کس قدر اکڑ کر اس سے انکار کرتے تھے اب اُس کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر کہتے ہو کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر عذاب کو یوں آنکھوں سے دکھا کر ہی ایمان لانے والے بات ہوتی تو یہ تو جبراً ایمان ہے، یہ علی وجہ البصیرت یا بطیب خاطر ایمان نہیں ہے۔ اس قدر Terrorise کرے اس قدر خوفزدہ کرے عذاب کو سامنے دکھا کر اگر ہم نے تم سے ایمان لوٹا

ہوتا تو وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا (32:13) ہمیں اتنا بڑا پرویس کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ ہم یہ کچھ کرتے وہاں جہنم لاتے، تمہیں سامنے دکھاتے کہ دیکھو! یہاں ساڑ ساڑ کیسے پڑ رہی ہیں اور اس کے بعد تم کہتے کہ ہاں ہم ایمان لاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ایمان ہوتا ہی نہیں ہے کیونکہ یونہی وہ جہنم کا شعلہ بجھا، تم نے پھر ویسا ہی ہو جانا تھا۔ اگر ہمیں اس طرح سے کسی کو ایماندار بنانا ہوتا تو کیا مشکل تھا، ہم سب کو پیدا ہی مومن کرتے۔ کہا کہ عذاب دکھا کے جو ایمان لانے والی بات ہے وہ ایمان ہوتا ہی نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ وَلَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (32:13) ہم نے انسان کو قوت ارادہ دی ہے، انتخاب کی استطاعت دی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کو یہ سارے سمجھنے کے ذرائع دیئے۔ اور اس کے بعد یہ اس کی مرضی پہ چھوڑ دیا کہ ان ذرائع کو استعمال کرنے کے بعد جو جی میں آئے اپنی اس ذات کی نشوونما کرتا ہوا آگے بڑھ جائے اور جس کے جی میں آئے خود اپنی جہنم کی زندگی اختیار کر لے۔

قرآن کی اس قدر واضح تعلیم کے برعکس ہمارے ہاں کے تراجم کی ایک مثال

اب یہاں جو کہا گیا ہے اس کا آپ ترجمہ پڑھیے تو قرآن کی ساری تعلیم دگرگوں ہو جاتی ہے۔ ترجمہ آپ کو یہ ملے گا کہ اب یہ بات نہیں جیسا تم کہہ رہے ہو بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ہم نے تو جن وانس سے جہنم کو بھرنا تھا سو بھر دیا۔ ہم سے بغیر پوچھے ہوئے یہاں بھیج دیا، وہ اس لیے بھیج دیا کہ وہاں ایک جہنم بنایا ہوا ہے ”اوہدے لئی بالن نہیں لہذا“ جیل خانے جو بنڑاتے تے جے اسی قیدی نہ بھیجے تے فٹے منہ والی گلے اے ①۔ عزیزان من! سوچے کہ اس قرآن کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ایک اور جگہ ہے کہ وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (7:179)۔ اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ہم نے انسانوں کی اکثریت کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ جہنم میں بھیج دیں۔ یعنی ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا۔

اس سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد

کہا کہ تمہیں ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جن کی روش تمہیں بتا دے گی کہ یہ تو ہیں ہی جہنمی۔ وہ کیا روش ہے جو تمہیں بتا دے گی؟ اس کے لیے کہا کہ وَلَهُمْ أَذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَانُوا لَنَا عَامًا بَلْ هُمْ أَصْلٌ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (7:179) یہ وہ لوگ

① اس کے لیے ایعدہ نہیں ملتا۔ اب جو جیل خانے بنائے ہیں تو پھر اگر ہم قیدی نہ بھیجتے تو یہ ٹیٹ لعنت والی بات ہی ہوتی۔

ہیں کہ ہم نے انہیں آنکھیں دیں لیکن یہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، کان دیئے لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے، سمجھنے کے لیے دل دیا، دماغ دیا لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے، اُولَئِكَ كَانُوا لَنَا نَعَامٌ (7:179) یہ تو حیوان ہیں بلکہ حیوان نہیں بَلْ هُمْ أَضَلُّ (7:179) ان سے بھی گئے گزرے کہ ان کو تو یہ اختیار و ارادہ نہیں دیا ہوا تھا۔ اُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (7:179) یہ وہ ہیں جو اپنے مقصدِ حیات سے اور یہ جو ذرائعِ حیات دیئے ہوئے ہیں ان تمام کی طرف سے انہوں نے غفلت برتی ہوئی ہے۔ یہ ہیں جن کی روش تمہیں بتا دے گی کہ یہ واقعی جہنمی ہیں۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ لَا مَلْسَنٌ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (32:13) یہ ہیں وہ لوگ جن سے جہنم بھری جائے گی۔ یعنی عقل و فکر سے کام نہ لینے والے، سوچ اور سمجھ سے کام نہ لینے والے یہ ہیں وہ لوگ جن کی روش تمہیں بتا دے گی کہ یہ جہنم کے ہیں۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ السجدة کی آیت 13 تک آگئے۔ 14 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



چوتھا باب: سورة السجدة (آیات 14 تا 19)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزانِ من! آج دسمبر 1979ء کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ السجدة کی آیت 14 سے ہو رہا ہے: (32:14)۔

تجدیدِ یادداشت

سابقہ آیات میں کہا یہ گیا تھا کہ جو لوگ قوائینِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں وہ یہاں تو اپنے آپ کو بہت بڑا پھنے خاں سمجھتے ہیں لیکن جب یہ اُس عدالت میں حاضر ہونگے تو کہا ہے کہ اے مخاطب! تُو اگر اُس نقشے کو سامنے لائے کہ یہ اپنے جرائم کی فہرست کو خود اپنے سامنے دیکھ کر خود اسے پڑھ کر خود اس کا اعتراف کر کے اس قدر ندامت سے سر جھکائے ہوئے ہونگے، اس قدر شرمندگی اور بے بسی کا عالم ہوگا تو اس وقت کہیں گے کہ اے خدا! ایک دفعہ پھر دنیا میں واپس بھیج دے پھر تُو دیکھ کہ ہم کس طرح اچھے کام کرتے ہیں۔ ان سے کہا جائے گا کہ تمہیں وہیں بتا دیا گیا تھا کہ زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں لوٹتا، اسے یا تو آگے بڑھنا ہے یا ایک مقام پر رک جانا ہے یہ پیچھے نہیں لوٹتا۔ اس وقت ان سے کہا جائے گا فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا اِنَّا نَسِينُكُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (32:14) تمہیں بہتری یاد دہانی کرائی گئی بار بار تمہیں انداز کیا گیا Warning (تنبیہ) دی گئی اس کے باوجود تم

نے قانونِ مکافاتِ عمل کی اہمیت سے بے اعتنائی برتی، تم نے کچھ پرواہ ہی نہیں کی، اسے اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ سنجیدگی سے غور کیا جائے کہ انسان کے ہر کام کا ایک نتیجہ مرتب ہوتا رہتا ہے۔ بار بار تمہیں اس کی یاد دہانی کرائی گئی اور ہر بار تم نے اس سے نافرمانی برتی۔ وہاں لا پرواہی برتی تو پھر آج کیفیت یہ ہے کہ نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا اِنَّا نَسِينُكُمْ (32:14)۔

قرآن حکیم نے اپنی تعلیم کو کئی جگہ مجازی طور پر بھی پیش کیا ہے

مجازی انداز میں تعلیم کو پیش کرنا زبان کی بلاغت ہوتی ہے اور عربی زبان میں جیسا آپ کو معلوم ہے کہ ایک ہی لفظ کے معنی Shades کے اعتبار سے بدلتے جاتے ہیں۔ پہلی تو یہ چیز ہے کہ بار بار تم سے کہا اور تم نے اس سے بے اعتنائی برتی۔ اور پھر یہ لفظ آیا ہے کہ تم نے کسی کی حفاظت کی طرف سے بے پرواہی برتی تو آج پھر ہم تمہیں حفاظت نہیں دے سکتے، ہم تمہیں محفوظ نہیں رکھ سکتے، ہم تمہیں پناہ نہیں دے سکتے۔ یہ حفاظت میں لینا اور جہنم میں بھیجنا وغیرہ قرآن مجازی طور پر استعمال کرتا ہے ورنہ یہ تو ہر عمل کا فطری نتیجہ ہے جو انسان کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس واسطے اب تو تم نے جو کچھ کیا تھا اس کی سزا بھگتی ہی ہوگی اس سے مفر نہیں ہے۔ بار بار تمہیں کہتے رہے اور تم نے اس حقیقت کو کچھ اہمیت ہی نہیں دی، سنجیدگی سے اس کے اوپر غور ہی نہیں کیا، اس کو تسلیم ہی نہیں کیا۔

قرآنی قوانین کو عملی طور پر دل و جان سے تسلیم کرنے والوں کی خصوصیات

کہا ہے کہ اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِالْإِسْلَامِ الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ [15:32] تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (32:15:16) وہ لوگ جو تو انین خداوندی کو حقیقت تسلیم کر لیتے ہیں، یہاں ان کی چند ایک خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ چند ایک کیا قرآن تو جہاں ایک خصوصیت بھی بتاتا ہے، وہ منفرد ہوتی ہے، اس میں انفرادیت ہوتی ہے، وہ لوگ باقی انسانوں سے ممتاز حیثیت لیے ہوئے نظر آ جاتے ہیں۔ مومن کی تو شان ہی یہی ہے:

مومن بالائے ہر بالا ترے

غیرت او بر نہ تابد ہمسرے

[اقبال]

قرآن مومن کے جو وصف بتاتا ہے اس میں تو غیر مومن یا کوئی بھی دوسرا اس کے ہمدوش بھی نظر نہیں آتا چہ جائیکہ اس سے کہیں آگے یا اونچا نظر آئے۔ کہا ہے کہ اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا (32:15)۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ ان کے سامنے جب قوانین خداوندی کو لایا جاتا ہے تو وہ ان کے سامنے جھک جاتے ہیں، سجدہ ریز ہو جاتے ہیں، سر تسلیم خم کر لیتے ہیں۔

تصریف آیات کی روشنی میں قرآن حکیم کا کوئی مقام بھی مشکل نہیں رہتا

اس مقام پہ میں عرض کروں کہ میں جو بار بار کہا کرتا ہوں کہ قرآن کریم تصریف آیات سے سمجھ میں آتا ہے یعنی ایک بات وہ ایک جگہ کہتا ہے اس کی وضاحت دوسرے مقام پہ کرتا ہے، کہیں اُس میں اضافہ کرتا ہے، کہیں اُس میں استثنیٰ کرتا ہے۔ اس کے سمجھنے کا طریقہ اُس نے خود کہا ہے کہ تصریف آیات میں ہم باتیں بیان کریں گے۔ کوئی موضوع، جو تمہارے سامنے ایک مقام پہ آئے، یہ دیکھو کہ قرآن کریم کے دوسرے مقامات میں اس کے متعلق کیا کہا گیا ہے۔ یہ تمام مقامات آپ سامنے رکھ لیں گے تو ساری بات واضح ہو جائے گی۔ عزیزانِ من! قرآن کا کوئی مقام مشکل نہیں رہتا بشرطیکہ جو طریق اس نے بتایا ہے اس کے مطابق اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ یہ وہ چیز ہے جسے ہمارے ہاں تبویب کہتے ہیں یعنی Chapterwise ہونا یا Subject (مضمون) کے اعتبار سے یا موضوع کے اعتبار سے کسی چیز کا باب باب کرنا۔ اور یہ تھی وہ دشواری کہ ہر ایک اس کو کہاں عمر بھر کی محنت سے کرے گا بہر حال میں نے تو اپنے اس جنون کے تابع یہ سب کچھ کیا کیونکہ مجھے قرآن سے عشق ہے۔ میری جو کتاب ”تبویب القرآن“ ہے اس کا یہی موضوع ہے۔ اس میں دو تین ہزار عنوانات ہیں۔ ایک عنوان کے تابع قرآن نے جہاں جہاں کچھ کہا ہے اس کے سارے حوالے دیئے ہوئے ہیں۔

قرآنِ تعلیم کے مطابق آیاتِ خداوندی پر علی وجہ البصیرت ایمان لانا ہوگا

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے۔ یہاں (32:15) میں کہا کہ مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ جب ان کے سامنے قوانین خداوندی آتے ہیں تو وہ فوراً جھک جاتے ہیں ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ اب ذہن میں یہ چیز آئی کہ ایسی ہی خصوصیت بتائی ہے کہ جو نبی ان کے سامنے قرآن کی وہ آیتیں پیش کیں یا قرآن کے قوانین پیش کیے تو بغیر سمجھے، بوجھے وہ فوراً ان کے سامنے جھک گئے۔ یہاں تو صرف خَرُّوا سُجَّدًا (32:15) ہے لیکن تصریف آیات کے ماتحت دوسرا مقام دیکھیے۔ وہاں آیا ہے کہ وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخْرُوا عَلَيْهَا ضُمًّا وَعُغْمِيَانَا (25:73) ان کے سامنے اور تو اور آیاتِ خداوندی بھی

پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان کے سامنے اندھے بہرے گونگے بن کر نہیں جھکتے۔ دنیا کی اور کوئی چیزیں باتیں اصول قوانین قواعد اور انسانوں کی باتیں تو ایک طرف رہیں خدا کے قوانین اس کی باتیں اور اس کی آیات ان کے سامنے لائی جاتی ہیں تو وہ اندھے بہرے ہو کر ان کو نہیں تسلیم کر لیتے۔ ہمارے ذہنوں میں یہ تو ہے کہ

بے خطر کوڈ پڑا آتش نمرود میں عشق

وہ کہتا ہے کہ مومن کی صفت یہ ہے خصوصیت یہ ہے کہ اور تو اور خدا کے قوانین اور آیات بھی اس کے سامنے آئیں تو ان پہ بھی وہ اندھا بہرا بن کر نہیں جھکتا بلکہ غور و فکر اور علم و بصیرت کی رو سے اس کو تسلیم کرتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے عقل اور علم اور بصیرت اور فہم اور تدبر اور تفکر کو یہ اہمیت ہے کہ خدا کی آیات کو بھی وہ اندھا بہرا بن کر تسلیم نہیں کرتا۔ اور اطمینان تو اسی ایمان سے ہوتا ہے جو علی وجہ البصیرت لایا جائے۔ جس بات کو علم و بصیرت کی رو سے سمجھا جائے وہاں سے پھر کوئی شخص اس کو چھڑا ہی نہیں سکتا اس کے پاؤں میں لغزش آ ہی نہیں سکتی کیونکہ اس نے یونہی جذبات کے طور پر اندھا بہرا بن کر اس کو تسلیم نہیں کیا ہوتا بلکہ اس نے علی وجہ البصیرت سب کچھ جانتے بوجھتے دیکھتے بھالتے اعتراضات کو سامنے رکھ کر جب وہ اس طرح سے یقین کے درجے پہ پہنچ جاتا ہے کہ واقعی الحق یہی بات ہے پھر وہ ان کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ ہے مومن کا شعار یہ ہے مومن کی خصوصیت۔ اب جو یہاں آیا کہ اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا (32:15) تو یہاں تو اتنا ہی تھا کہ جب ان کے سامنے آیات خداوندی آتی ہیں تو وہ جھک پڑتے ہیں سر تسلیم خم کرتے ہیں سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ اس میں اس بات کا احتمال تھا کہ بغیر سمجھ بوجھ ہی کیونکہ خدا کا فرمان ہے اس واسطے ان کے سامنے وہ جھک جاتے ہیں لیکن اس نے دوسرے مقام پہ واضح کر دیا کہ مومن خدا کی آیات کے سامنے بھی اندھا بہرا بن کر نہیں جھکتا۔ قرآن کریم میں حضور اکرم ﷺ کی زبان سے کہلوا یا گیا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اَدْعُوْا اِلٰی اللّٰهِ عَلٰی بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنْ اَتَّبَعَنِیْ (12:108) ہم جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں تو علی وجہ البصیرت دعوت دیتے ہیں۔ میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علی وجہ البصیرت دیتا ہوں۔ اور آگے ہے کہ اَنَا وَ مَنْ اَتَّبَعَنِیْ (12:108) میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میرا اتباع کرے گا اس کا بھی یہی شیوہ ہوگا کہ وہ علی وجہ البصیرت تمہیں اسلام کی طرف دعوت دیگا۔ اس لیے جو دعوت علی وجہ البصیرت دے گا تو پھر جو سامنے مخاطب ہے وہ بھی اس کو علی وجہ البصیرت مانے گا۔ مومن کہا ہی اسے گیا ہے جو خدا کے کلام پر اس کی تعلیم پر علی وجہ البصیرت ایمان لائے۔

ایمان لانے کے سلسلہ میں ہماری حالت

عزیزانِ من! سوچئے تو سہی کہ ہم میں کتنے ہیں جو اس طرح سے ایمان لائے ہیں۔ ہم تو ایمان لائے ہی نہیں ہیں، مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے اور اس فارم کے خانے میں اسلام لکھ دیا، بس اتنا ہی ہے جو ہم کرتے ہیں۔ وہ تو ایمان لانے والے جو ہیں ان کے متعلق یہ کہتا ہے کہ اندھے بہرے بن کر یہ نہیں مان لیتے۔ اور ہماری زندگی میں تو ایمان لانے کا یا ایمان سے انکار کرنے کا یہ Occasion (موقعہ) ہی کبھی نہیں آتا۔ ایمان یہ نہیں ہے کہ از خود جیسا کوئی انسان ہے وہ مسلمان ہو جاتا ہے بلکہ یہ تو ہونا پڑتا ہے۔ ہر پیدا ہونے والا بچہ، ہر انسان جو دنیا میں آتا ہے وہ از خود مومن نہیں ہوتا، وہ کافر بھی نہیں ہوتا، وہ صرف انسان ہوتا ہے۔ آپ حیران ہو گئے کہ جو میں کہنے لگا ہوں کہ قرآن تو کفر کا لفظ بھی Verb (فعل) کے معنی میں استعمال کرتا ہے کُفِرَ کہتا ہے یعنی جس نے کفر اختیار کیا۔ پیدائشی جو کچھ ہوتا ہے وہ تو انسان نہیں ہوتا وہ تو حیوان ہوتا ہے۔ اب اُسے خود یہ بننا پڑتا ہے۔ انکار کرتا ہے یا سرکشی برتا ہے تو کُفِرَ ہے، یکفرون ہے۔

انسان کو کافر بننا پڑتا ہے اور ایمان لانا پڑتا ہے

عزیزانِ من! قرآن کی یہ چیزیں بڑی غور طلب ہیں کہ یہ Verb (فعل) کیوں استعمال کرتا ہے کہ وہ کفر کرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ ایمان لاتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جو بات تھی کہ میں اللہ کو مانتا ہوں تو مانتا ہوں والی بات تو ہے ہی نہیں بلکہ ایمان لاتا ہوں۔ ایمان کس طرح لانا ہے: علی وجہ البصیرت، سوچ سمجھ کر، علم و بصیرت کی رو کر، چھان پھٹک کر، ٹھوک بجا کر پھر حقیقت کو حقیقت ماننا ہے اس کو ایمان لانا کہتے ہیں۔ یہ لایا جاتا ہے از خود کوئی مومن نہیں ہوتا کوئی کافر نہیں ہوتا۔ اور لایا جاتا ہے تو صُمْ بُکُمْ غُمُی (2:18) نہیں یعنی اندھے بہرے بن کر نہیں۔ پہلی چیز تو مومن کی صفت یہ بتائی۔ دوسری چیز یہ ہے کہ سَبِّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (32:15)۔ پہلی چیز جو قرآن نے افتتاحیہ میں یا Preface میں کہی ہے وہ ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (1:1) جو حمدیت ہے وہ خدا کے لیے ہے اور اس لیے وہ مستحقِ حمد و ستائش ہے کہ وہ رب العالمین ہے یعنی وہ کائنات کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے۔ حمد اور ستائش کا حقدار وہ ہے جو ربوبیتِ عالمینی کا ذمہ دار ہے۔

لفظ ربوبیت کا قرآنی مفہوم

ربوبیت کا عام لفظی ترجمہ تو نشوونما کیا جاتا ہے۔ نشوونما صرف اتنی ہی نہیں بلکہ رب کہتے ہی اسے ہیں جو کسی شے کو اس کے نقطہ آغاز سے اس کی تکمیل تک پہنچائے، جو کچھ اس نے بنا ہے وہ بنا دے اور ان تمام مراحل میں اس کے لیے وہ کچھ بننے کے سامان اور اسباب اور ذرائع مہیا کرتا چلا جائے۔ اُسے رب کہتے ہیں۔ پہلی چیز اس نے یہ بتادی کہ اور تو اور خدا بھی مستحق حمد و ستائش ہے تو اس لیے کہ وہ ربوبیتِ عالمینی کا ذمہ دار ہے۔ کسی ایک فرقے، کسی ایک گروہ، کسی ایک خاندان کا نہیں بلکہ تمام کائنات کا رب ہے۔ عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے، وہ یہ کچھ کرتا ہے تو پھر وہ کہتا ہے کہ وہ مستحق حمد و ستائش ہے۔ جو یہ نہیں کرتا اسے حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی تعریف کرائے۔ اس کے مقابلے میں وہ کچھ اور لوگوں کا ذکر کرتا ہے کہ يُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا (3:187) وہ چاہتے ہیں کہ ان باتوں کے لیے ان کی تعریف کی جائے جنہیں وہ کرتے نہیں ہیں۔ یہاں پہلی چیز تو یہ ہے کہ کچھ کرنے کے صلے میں کچھ تعریف ہوگی اور کرنا ہے ربوبیت۔ یہ ہے بنیادی چیز۔ مومن کیا کرتے ہیں؟ سَبِّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (32:15) خدا کی یہ جو ربوبیت کی ذمہ داری ہے یہ انسانوں کی دنیا میں انسانوں کے ہاتھوں سے پوری ہوتی ہے۔ اب ہمارے ہاں تو آسانی ہوگئی کہ

جو غم ملا اُسے غم جاناں بنا دیا

قرآنی تعلیم کے برعکس مذہب کی دنیا میں قرآن حکیم کے لفظ ”سبح“ کا مفہوم

جو بھی لفظ آیا اُس کو مذہب کی دنیا میں لے آئے اور آپ کو معلوم ہے کہ جب قرآن کریم کی تلاوت کے وقت خروا سجدا کا لفظ آتا ہے تو لوگ سجدے میں گر جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں بعض مقامات ایسے ہیں جہاں کہتے ہیں کہ تلاوت کرتے ہوئے اگر وہاں پہنچو تو قرآن کو ایک طرف رکھ کر سجدہ کر لیا جائے تو خدا کا یہ حکم پورا ہو گیا۔ یہاں سے اٹھ کر کم از کم مسجد میں جا کر سجدہ کر دیا۔ جسے قوانین خداوندی کے سامنے سر بسجود ہونا کہتے ہیں، سر تسلیم خم کر دینا کہتے ہیں، اس کے سامنے جھک جانا کہتے ہیں، ان کو تسلیم کر لینا کہتے ہیں، یہ ہے سجدہ۔ ابھی میں عرض کرتا ہوں لفظ آگے آتا ہے جس میں وضاحت کی ہے: سَبِّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (32:15) کا ترجمہ کر دیا کہ خدا کی حمد کی تسبیح کرتے ہیں۔ نماز تو پڑھ لی، اُس کے بعد آپ کو پتہ ہے کہ پھر اس تسبیح کے فریضے سے کیسے عہدہ برآ ہوا جاتا ہے؟ اس طرح

کہ 33 مرتبہ سبحان اللہ 33 مرتبہ الحمد للہ 34 دفعہ اللہ اکبر پڑھ لیا تو تسبیح ہوگئی اس طرح دوسرا فریضہ بھی ادا ہو گیا۔ نہ کبھی زبان عربی سے پوچھا نہ کبھی قرآن سے پوچھا کہ یہ بات کیا ہے۔ وہ دانوں والی تسبیح لی جو اسلامی ہے ہی نہیں یہ بدھوں کے ہاں سے عیسائیوں کے ہاں آئی عیسائیوں کے ہاں سے ہمارے ہاں لے لی۔ سبح کے معنی ہوتے ہیں کہ ”کسی مقصد کے حصول کے لیے اس طرح سے دوڑ دھوپ کرنا جیسے گھوڑا چاروں پاؤں سے یا تیراک دونوں ہاتھ یوں زور سے مارتا ہے“۔ یہ لفظ بنیادی طور پہ گھوڑے کی اس قسم کی چال کے لیے ہے۔ سبح کے معنی ہیں کہ کسی مقصد کے حصول کی خاطر پوری پوری توانائیوں سے تگ و دو کرنا جسے آپ دوڑ دھوپ کہہ سکتے ہیں۔ کیا بات تھی ان عربوں کی! انہوں نے دیکھا کہ گھوڑے کی یہ چال ہے یا تیراک کی یہ کیفیت ہے کہ اس میں آدمی یا گھوڑا Extreme End (انتہائی سرے) تک جاتا ہے تو انہوں نے کہا کہ کسی مقصد کے حصول کے لیے یہاں تک جا کر جو کوشش کی جائے وہ سچ ہوتی ہے۔ تسبیح کے معنی یہ ہیں کہ مسلسل یہی کچھ کرتے چلے جانا۔

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

مردِ مومن کی سعی و کوشش اور اس کی کبریائی کے مقامِ بلند کی کیفیت

عزیزانِ من! مسلمان کیا! زندہ رہنا ہی آسان نہیں ہے۔ وہ تو ہم کبھی خیال ہی نہیں کرتے۔ ”سبح“ تو سانس لینا ہے یعنی کسی مقصد کے حصول کے لیے پوری پوری توانائیوں سے ساری زندگی تگ و دو کرنا پڑتا ہے اور پورا پورا سانس لینا پڑتا ہے۔ وہ جو دمے کا ایک مرض آ جاتا ہے جس میں پورا سانس نہیں آتا بلکہ آدھا سانس آتا ہے تو دیکھیے کس طرح سے زندگی اور موت کے درمیان آدمی لٹک رہا ہوتا ہے۔ وہ ”سبح“ کی پوری پوری کوشش کرتا ہے اور ساری عمر کرتا ہے۔ وہ ہے انسان کی Physical Life (طبعی زندگی) کے اندر ”تسبیح“۔ اور یہ ادھر اس کی انسانیت کی زندگی ہے اُس میں اقدارِ خداوندی کی اطاعت اور اتباع میں اس طرح کوشش کرنا کہ اس میں پوری پوری توانائی صرف ہو جائے یہ انتہائی درجے کی کوشش و سعی سے کام لینا اور مسلسل کام لینا ہے۔ یہ ہوا سب حوا۔ یہ کاہے کے لیے ہے؟ بِحَمْدِ رَبِّہُمْ تاکہ دنیا یہ بات دیکھ لے کہ واقعی یہ وہ جماعت ہے جو خدا کی اس ذمہ داری کو یوں پورا کرتی ہے۔ اور حمد کے معنی تو آپ کو میں نے بتائے تھے کہ اس کے معنی تعریف کرنا نہیں ہے جسے عربی میں مدح کہتے ہیں یا انگریزی میں Praise کہتے ہیں یہ تعریف کرنا بھی نہیں ہے یہ مدح اور ستائش بھی نہیں ہے۔ یہ حمد ہے حمد کی بنیادی چیز یہ ہے کہ کسی چیز کا اس قدر دلکشی سے تجلیل لیے

محسوس شکل میں ایسے سامنے آنا کہ بے ساختہ زبان سے واہ واہ واہ نکلے۔ اس شے کے لیے جو بے ساختہ لفظ نکلتا ہے اس کو حمد کہتے ہیں۔ یہ مومنین کی خصوصیات بتائی جا رہی ہیں کہ خدا کی وہ جو ربوبیت اور تربیت کی ذمہ داری ہے اُسے اس انداز سے سرانجام دیں، ان کا نظام اس قسم کا بنے کہ کوئی دیکھنے والا جب اس کو دیکھے تو بے ساختہ زبان پہ آئے کہ واہ واہ کیا نظام ہے اور کیا یہ انسان ہیں اور کیا کچھ یہ کر رہے ہیں! کہا کہ سَبِّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ (32:15)۔ یہ بڑا عجیب نکتہ ہے۔ آپ حضرات میں سے جو سائیکولوجی کے اسٹوڈنٹ ہیں وہ اس پہ زیادہ توجہ دیں گے۔ سجدًا تو جھک جانا ہے۔ یہی کافی تھا کہ وہ اس کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ اگلی چیز یہ کہی کہ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ (32:15) اس کے عام معنی یہ کیے جاتے ہیں کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔ یہ جو کبریا ئی ہے اس کے بغیر تو مومن مومن ہو ہی نہیں سکتا، کبریا ئی کو اپنی انتہائی شکل میں جو حق حاصل ہے وہ تو خدا کا ہے۔ لیکن خدا کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرنے والوں، اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے والوں کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ اَنْتُمْ الْاَعْلَوْنَ (3:139) یعنی انسانی دنیا کے اندر بلند ترین درجہ جو ہے وہ انہیں حاصل ہے۔ خدا سے نیچے ان سے اونچا، ان سے بڑا، ان سے زیادہ کبریا ئی کا مالک، کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ جو کبریا ئی ہے یہ تو مومن کی صفت ہے۔ قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ جو غیر مسلم ہیں، کبھی مومنین کے اوپر غالب آ جائیں۔

جماعتِ مومن کی پہچان الاعلون کے سوا کچھ اور ہے ہی نہیں

عزیزانِ من! غور کیجیے کہ یہ ایک خاص جماعت ہے جن کا یہ ذکر ہو رہا ہے، یہ نوے کروڑ نہیں ہیں، جو رو رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، جدھر سے دیکھو آواز آرہی ہے کہ وہ مار گئے، وہ لے گئے، اُس نے تباہ کر دیا۔ وہ کہہ رہا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ غیر مسلم ان مومنین کے اوپر کبھی غالب آ جائیں۔ لہذا یہ جو ہمارے ہاں کبر نفس اور تکبر کو اتنا مذموم قرار دیا گیا ہے کہ یہ تو شیطان کرتا ہے۔ زندگی کا سب سے بڑا مقصد یا قربِ خداوندی یا مقرب ہونا یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو، میں کو مار دے، نفس کشی سب سے بڑی روحانیت ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ ایک طرف تو مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ دنیا میں ہر قسم کی کبریا ئی اور بلندیاں انہیں حاصل ہوگی:

مومن بالائے ہر بالا ترے

غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

یہ قرآن کے الفاظ کا ترجمہ ہے۔ مومن ہر بالا سے بالاتر ہے، اس کی غیرت تو ہمسر کو بھی برداشت نہیں کر سکتی چہ جائیکہ کوئی اس سے اونچا ہو۔ یہ قرآن کے الفاظ اعلون (35:47; 139:3) کا ترجمہ ہے۔ کیفیت تو مومن کی یہ بتائی۔ اور یہاں ہے کہ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ (15:32)۔ کبر یا ئی یا جسے آپ کبر کہتے ہیں وہ ان میں نہیں ہوتا۔ خَرُّوا سُجَّدًا (15:32) آیا ہے اور یہیں سے تو معنی واضح ہو جاتے ہیں کہ وہ قوائم خداوندی سے سرکشی نہیں برتتے بلکہ ان کے سامنے جھکتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ وہ دنیا میں باقی اقوام کے مقابل میں ہو جا لکھ مسیت داہیں تاکہ ”جیہڑا آوے او توں لنگ دا جاوے یعنی کنڈے جناوی نہ رڑ کے“^①۔ یہ جو چیز ہے کہ ”خودی خدا داویر“ یہ ساری چیزیں آپ کے ہاں یہ جو دوسروں کے ہاں سے لیا ہوا تصوف ہے یہ ساری اس کی تعلیم ہے۔ یہ اس قوم کے سامنے بڑی سازش ہے۔

انسان کی اپنی پہچان اس کی ’میں‘ سے وابستہ ہے

یہ جسے آپ خودی کہتے ہیں، اپنے ہاں اس کا ترجمہ ذرا ”میں“^② کر لیں تو کچھ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ یہ کیا ہے۔ جب آپ کہتے ہیں کہ ”میں“ نے اس کو پکڑا تو آپ کا ہاتھ اس کو پکڑ رہا ہوتا ہے تو یہ ”میں“ کیا ہے؟ جسے آپ کہتے ہیں کہ ”میں“ نے وعدہ کیا ”میں“ نے اس کا یہ کام کرنا ہے دس برس پہلے ”میں“ نے اس سے یہ کہا تھا ”آج بھی ”میں“ یہی کہہ رہا ہوں۔ تو یہ ”میں“ کیا ہے؟ یہی ”میں“ ہی تو وہ چیز ہے جس سے آپ آپ ہیں، میں کہنا چھوڑ دیجیے تو آپ کی اپنی ہستی ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہاں تصوف کی تعلیم یہ ہے کہ میں دے گل تے چھری“^③۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بکری میں میں کرتی ہے اور اس کو ذبح کر دیتے ہیں۔ یعنی جو ”میں“ کو ختم کرنا ہے یہ ہے آپ کے ہاں کا تصوف یعنی آپ کی شخصیت ختم ہو جائے۔ ”میں“ ہی باقی نہ رہے تو پھر اور کیا باقی رہیں گے۔ حیوان ”میں“ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے شاید اگلی^④ دفعہ آپ سے کہا تھا کہ جٹرٹن جی۔^⑤ (1874-1936ء) کا وہ قول ہے:

One who can not say I, can not say thou.

① جو آئے اسے روندنا چلا جائے یعنی وہ کانٹے جیسی لسک بھی نہ رکھے۔

② I amness

③ ”میں“ کے گلے پہ چھری (پھیر دو)۔

④ دیکھیے اسی کتاب کا دوسرا باب، نومبر 1979ء کی 23 تاریخ کا درس ص-17۔

⑤ Chesterton, Gillert Keith: An Essay on Heretics

”جو میں نہیں کہہ سکتا وہ خدا کو نہیں پکار سکتا“۔ میں تو بڑی چیز ہے۔

بندہ مومن خدا کے آستانے کے سوا کہیں کسی اور کے سامنے نہیں جھکتا

یہاں یہ چیز جو قرآن نے کہی کہ یہ جو اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے، یہ ”میں“ کے خلاف نہیں تھا، دوسری یہ چیز کہی کہ ان میں کبریائی نہیں آتی۔ یہ تو اس کی صفت ہی یہ تھی۔ قرآن نے اس میں کیا فرق کیا؟ سائیکولوجی والے اس کو ذرا سمجھیں۔ ایک ہوتا ہے Self (سلف) ایک ہوتا ہے Ego (ایگو)۔ دونوں ہی ”میں“ ہوتے ہیں۔ سائیکولوجی میں تو اس میں فرق ہی نہیں کیا جاسکتا کہ وہاں اقدار کا Values کا خدا کے قوانین کا تصور ہی نہیں ہے۔ اس میں قرآن فرق کرتا ہے۔ Self وہ ہے جو ایک آستانہ خداوندی کے سامنے جھک کر ساری دنیا کے مقابلے میں اونچا ہو جاتا ہے۔ یہاں جھک جا اور خدا کے قریب ہو جا، چھوٹے پیمانے پر رب بن جا، کبریائیاں ساری تمہارے حصے میں آجائیں۔

تیرے سنگِ در نے بدل دیا ہے یہ پتلیوں کو فراز میں

کہ ہزاروں سجدے جھلک رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

یہ ہے کہ جہاں ”میں“ کو جھکانا کہتے ہیں، میں کو جھکانا پڑتا ہے۔ اس کے آستانے کے اوپر جھکاؤ، اس جھک جانے میں ساری دنیا کی سرفرازیاں آجائیں گی۔ کہا کہ ہر جگہ سرفرازیوں کے ساتھ چلتا جا۔ وہاں جب اُس آستانے کے اوپر آ تو پھر وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ (32:15) وہاں اس طرح سے تکبر سے نہ گذر، وہاں یہ سرکشی اختیار نہیں کر۔ مومن کہیں اور نہیں جھکتے، صرف وہاں خدا کے قوانین و اقدار کے سامنے جھکتے ہیں، باقی دنیا میں کہیں نہیں جھکتے۔ ہر جگہ کبریائی ان کے حصے میں آتی ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ ”اللہ اکبر“ کہتے ہیں۔ یہاں نیچے اپنے آپ کی جو کبریائی ہے اس سے انکار نہیں ہے۔ اسے اُس جھکنے کے اندر کبریائی میسر ہوتی ہے۔

Ego (ایگو) میں اور نفس یا خودی میں فرق

اب Ego (ایگو) اُسے کہتے ہیں جو کہیں نہ جھکتا ہے۔ انسان کی Personality (شخصیت) یا نفس یا خودی اُسے کہتے ہیں جو اس کے سامنے جھک کر ساری دنیا سے اونچا ہو جائے۔ سجدے میں اور استکبار کے اندر یہ فرق ہو گیا۔ اگر یہ وہاں بھی نہیں جھکتا تو یہ استکبار ہے، تکبر ہے، شیطنت ہے۔ ابلیس کے متعلق کہا تھا کہ ابلی و استکبر (2:24)۔ اختیار کی کیونکہ اس کے Ego (ایگو)

نے اُسے کہا کہ جھکنا نہیں ہے۔ یہ ابلیسیست ہوگئی، یہ شیطننت ہوگئی۔ جو مومن ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ ساری دنیا کے آستانوں سے وہ سرفراز نہ گزر گیا کسی کے سامنے نہیں جھکا۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِنْ دُونِ اللَّهِ (3:79) دنیا میں کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے خواہ اس کو قانون سازی کے اختیارات ہیں خواہ اس کے پاس حکومت کی لگام کیوں نہ ہو خواہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو کہ کسی دوسرے انسان سے کہے کہ میرے سامنے جھکو مِنْ دُونِ اللَّهِ (3:78) وہ کہے گا کہ صرف خدا کے سامنے جھکو وہ اکبر ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے جہاں یہ Ego (ایغو پندارِ نفس) Personality (شخصیت) بن جاتا ہے۔ Personality (شخصیت) وہ محکم خودی ہے جو اقدارِ خداوندی کے سامنے جھک کر اپنے اندر علواً پیدا کرتی ہے۔ Ego (ایغو پندارِ نفس) وہ ہے جو قوت کے بھروسے کے اوپر اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔

ایسا استکبار جو بغیر الحق ہو وہ شیطننت ہے

قرآن کریم نے مختلف مقامات میں اس کے متعلق کہا کیا ہے؟ اُس نے علواً یا استکبار کو یہ نہیں کہا کہ یہ معیوب ہے یا جرم ہے بلکہ علواً بغیر الحق یا استکبار بغیر الحق غلط ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم سے زیادہ قوت کس کے پاس ہے۔ یعنی جو محض Physical Power (طبعی قوت) کے اوپر اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگ جائے تو یہ استکبار ہے، یہ دنیا کے اندر شیطننت ہے اور جو انسانی خودی میں محکمیت پیدا کرتا چلا جائے اس کا مقام بلند کرتا چلا جائے یعنی خدا کے سامنے جھکتا ہوا اس کی اقدار کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہوا اس کو بلند کرتا چلا جائے تو یہ وہ استکبار ہے جو مومن کا حق ہے، یہ بغیر الحق نہیں ہے۔

روزِ قیامت غیر مسلموں کے متعلق ان کے نیک اعمال کی جزا کا سوال

عزیزانِ من! ایک اور ریفرنس (حوالہ) لے لیجیے۔ مکافاتِ عمل کی بات آرہی ہے، قیامت سمجھ لیجیے، یوں سمجھیے کہ ان کو جہنم میں بھیجا جا رہا ہے۔ ذہن میں یہ اعتراض عام طور پر آیا کرتا ہے کہ جی، بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو مسلمان نہیں ہوتے یا اسلام نہیں لاتے حتیٰ کہ خدا کو

① یہ اشارہ قرآن کریم کی ان آیات کی طرف ہے:

(ل) وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (3:138) (ب) فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلَامِ وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ (47:35)

بھی نہیں مانتے اور اچھے کام کرتے ہیں یا نیک کام کرتے ہیں تو کیا ان کے نیک کام کا ان کو اجر نہیں ملے گا؟ اب ایک شخص حیاتِ آخرت کو مانتا ہی نہیں ہے اور بقول ان کے نیک کام کرتا ہے۔ وہ آخرت کی زندگی کو مانتا ہی نہیں ہے۔ قرآن نے کہا کہ اس کیلگری کے جو لوگ ہیں انہیں جب جہنم میں بھیجے گئیں گے تو وہ کہیں گے کہ یا اللہ! ہم نے تو بہت اچھے اچھے کام بھی کیے تھے، اُن کا بھی تو ہم کو یہاں بدلا ملنا چاہیے۔ وہ (مرزا اسد اللہ خاں) غالب (1869-1797) تو اور طرح سے کہتا تھا:

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد

یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

وہ کہیں گے کہ یا اللہ! ہم نے اچھے اچھے کام بھی کیے تھے تو ان کا بدلا تو ماننا چاہیے کیونکہ تو عادل ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تم اسی دنیا کی زندگی میں Believe (یقین) کرتے تھے، اُس سے آگے تو نہیں۔ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا (46:20) جس زندگی میں Believe (یقین) کرتے تھے، اُس زندگی میں اس کا اجر تمہیں مل گیا ہے۔ جو حیاتِ آخرت میں Believe (یقین) نہیں کرتا اور اچھا کام کرتا ہے تو اس سے پوچھو کہ تم کیوں یہ کام کرتے ہو تو اس کے پاس اس کیوں کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ اور وہ جو اندر من کا چور ہے یعنی جو Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) ہے وہ تو اس کی جزا، اس کے صلے کے بغیر نہیں کرتا۔ اس صلے کے بغیر تو آدمی کوئی کام کر ہی نہیں سکتا جب تک پہلے دل کے اندر ایک آرزو نہ پیدا ہو اور کوئی صلہ جزا نہیں تو دنیا میں تعریف کرانا تو بڑی چیز ہے اور سب سے بڑی جزا یا صلہ تو یہ ہوتا ہے۔ قرآن نے اس کی دکھتی ہوئی رگ پکڑ لی کہ تم اسی زندگی میں Believe (یقین) کرتے تھے، اسی زندگی میں تمہیں اس کا اجر ملا۔ آخرت کی زندگی پہ تو تم Believe (یقین) ہی نہیں کرتے تھے اس لیے یہاں آ کر اس کا اجر تم کیسے مانگتے ہو۔ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (46:20) تم دنیا میں بڑا بنتے تھے، استکبار تھا، سرکشی برتتے تھے اس کو تکبر کہہ لیجیے یہ بغیر الحق تھا۔ قرآن نے حق کی یہ شرط ساتھ لگا دی کہ اگر استکبار حق کے لیے ہے تو وہ مومن کی شان ہے، اس کے بغیر وہ مومن ہو ہی نہیں سکتا اور اگر حق کے بغیر استکبار ہے تو یہ ہے جو جہنم کی علامت ہے۔ یہ ہے جسے Ego (ایگو) کہیں گے۔

ضد اور اصول پرستی میں فرق یعنی بغیر الحق استکبار کا نتیجہ فرعونیت ہے

ضد میں اور اصول پرستی میں ایک فرق ہوتا ہے۔ اصول پرستی بھی بظاہر آپ دیکھیں تو ضد ہی ہوتی ہے کہ صاحب! میں تو اس اصول کا آدمی ہوں، میں اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اور اسلام تو ایسے اصول دیتا ہے جن میں وہ پک بھی نہیں رکھتا، توڑنا تو ایک طرف رہا۔ وہ کہتا ہے کہ شدت سے اس کے اوپر عمل کرو، کاربند رہو، جم کے رہو۔ اس میں استقامت ہوتی ہے، لوچ نہیں ہوتی، مفاہمت نہیں ہوتی، مدافعت نہیں ہوتی۔ عام الفاظ میں یہ بہت بڑا ضدی ہوتا ہے۔ ”میں یہ اصول نہیں چھوڑ سکتا“ میں مفاہمت ہی نہیں کر سکتا۔ یہ ہے وہ چیز کہ جو حق کے اوپر ہے وہ مفاہمت کر ہی نہیں سکتا:

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے

شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

یہ تو Compromise (مفاہمت) کر ہی نہیں سکتا تو کیا اس کو ضدی کہیں گے۔ اس ضد کے بغیر تو دنیا میں حق پنپ ہی نہیں سکتا۔ حق پرست کو تو بڑا ضدی ہونا پڑتا ہے۔ لیکن ویسے ضدی ہونا تو ایک عیب ہے اور یہ کوئی ضد ہے جو عیب ہے۔ یہ ضد بغیر الحق ہے یعنی غلط بات کے اوپر اڑ کر بیٹھ جانا۔ یہ ہے جو قرآن نے بار بار کہا ہے کہ جو بغیر الحق استکبار ہے، یہ ہے شیوہ شیطنت۔ وہ قوم عاد کے متعلق بتایا کہ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (41:15) یہ استکبار قوت سے حاصل ہوتا تھا۔ یہ اس کے لیے شیطان نے Explanation (وضاحت) دیا تھا کہ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ (7:12) میرے پاس آگ ہی آگ ہے۔ آگ تو تخریب ہے، جلادینے والی چیز ہے، اس میں تعمیر تو نہیں ہے۔ اس کے پاس بڑی قوت ہے لیکن قوت تخریب کے لیے استعمال کرتا ہے، جلانے کے لیے استعمال کرتا ہے، بھسم کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس سے یہ جو بات پیدا ہوتی ہے تو قوت ہی اس کے معنی ہیں۔ وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ انہوں نے کہا کہ مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (41:15) قوت ہی قوت ہے، اندھی قوت ہے یعنی یہ اپنے ہی جذبوں کی تسکین کے لیے، اپنے ہی مفاد کے حصول کے لیے، Sadism (ایذا پسندی) کے ماتحت، کمزوروں اور ضعیفوں کو کچلنے کے لیے، صرف اپنی Satisfaction (طمأنیت) کے لیے ہے۔

دلی طور پر کسی بات کو تسلیم کرنے کے باوجود اپنی انا کے بت کی پوجا کرنا

یہ جو اس عمل سے ”میں“ پیدا ہوتی ہے یہ شیطنت ہے۔ یہ ہے علوا بغیر الحق اور یہ ہے اُبی و استکبر و کَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ (2:34)۔ بعض مقامات ایسے ہیں جنہیں قرآن نے عجیب انداز سے بیان کیا ہے۔ وہی جو میں نے ضد کی بات کہی ہے۔ کہا کہ ایسے بھی لوگ ہیں کہ دل ایک بات کو تسلیم کرتا ہے کہ یہ بات تو ٹھیک ہے یہ کہتا تو ٹھیک ہے لیکن اس کے باوجود نہیں مانتے۔ وہ اس لیے نہیں مانتا کہ راستے میں Ego (ایغو، پندارِ نفس) کھڑا ہو جاتا ہے وہ ”میں“ نہیں ماننے دیتی۔ آپ نے دیکھا کہ یہ ”میں“ کس معنی میں آئی ہے اور اس کا مظاہرہ تو روز ہوتا ہے۔ دل مان رہا ہے لیکن یہ ”میں“ نہیں ماننے دیتی یہ ہے شیطنت والی ”میں“ یہ ہے Ego (ایغو، پندارِ نفس) جو راستے میں آ گیا ہے۔ قرآن کریم نے فرعون کے متعلق کہا ہے کہ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (27:14) دل سے تو وہ قائل ہو گیا تھا کہ موسیٰ! جو بات کہہ رہا ہے یہی سچی ہے لیکن وہ جو ”میں“ کا استکبار تھا اور وہ جو کمزوروں کے اوپر ظلم کرنے میں لذت مل رہی تھی وہ اسے تسلیم نہیں کرنے دیتی تھی۔ یہاں سے پتہ چل گیا کہ علوا جو قرآن نے کہا ہے وہ کیا ہے۔ حالانکہ مومن کو تو اعلان (3:138) کہا ہے یعنی علوا کا بلند ترین درجہ۔ اس علوا میں اور اس علوا میں کیا فرق ہے؟ وہ حق کا جھنڈا لے کر اس کو بلند کرتا ہے اور اس طرح سے اس کے صدقے میں خود بلند ہو جاتا ہے۔ اور یہ استکبار ہے۔ اسے قرآن نے ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (27:14) کہا ہے یعنی کمزوروں پر ظلم کرتا چلا جاتا ہے اور اپنے ذہن میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ استکبار۔

زعمِ باطل انسان کی صلاحیتوں کو غیر شعوری طور پر مفلوج کرتا رہتا ہے

قرآن ایک مقام پہ دو الفاظ لایا ہے غور کیجیے اور جھوم جائیے کہ کیا کیا چیزیں کہہ جاتا ہے! کہا ہے کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ (2:206)۔ اس آیت میں قرآن دو الفاظ لایا ہے: اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ (2:206)۔ عام طور پہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ عزت کے معنی عربی زبان میں قوت ہوتی ہے، عزیز صاحبِ غلبہ کو کہتے ہیں۔ کہتا ہے کہ جب ان سے یہ کہا جائے کہ قوانینِ خداوندی کی حفاظت کرو، نگہداشت کرو ان کے مطابق چلو ان کا اتباع کرو اس کے سامنے جھکو تو اخذت کہتا ہے۔ ایک چیز ان کو پکڑ لیتی ہے یعنی وہ جو اپنے اندر اپنی قوت کا اپنے غلبے کا زعمِ باطل ہوتا ہے وہ چیز ان کو پکڑ لیتی ہے۔ پکڑ لیتی ہے کہ نہ جھکنا۔ کہا

کہ بزعیم خویش یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری قوت ہے۔ کہا کہ یہ بالاثم ہے۔ اثم کے معنی ہوتا ہے اضمحلال، مضحل ہو جانا، کمزور ہو جانا۔ کہا کہ یہ اس طرح سے جو قوت کے زعم میں ان قوانین سے سرکشی برت کر غریبوں اور کمزوروں پہ ظلم کرنا ہے انہیں پتہ نہیں کہ جسے یہ عزت یا قوت سمجھ رہے ہیں یہ آہستہ آہستہ ان میں اضمحلال پیدا کر کے کمزوری اور عذاب الہون کی طرف لیے چلی جا رہی ہے۔ ہون کے معنی بہت کمزور ہو جانا ہوتا ہے۔ یہ جھوٹی عزت ہے، یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم بہت بڑے مقام پہ پہنچ گئے ہیں۔ ان کو پتہ نہیں کہ یہ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ (2:206) ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی۔ دو لفظوں میں ساری بات واضح کر گیا کہ اپنے ذہن میں یہ اس کو بڑی قوت سمجھتے ہیں، بڑا اختیار سمجھتے ہیں کہ ہم نے یہ کر لیا لیکن ان کو معلوم نہیں ہے کہ اس قسم کے غلط مقاصد اور آرزوؤں کی تکمیل یا حصول کے لیے غریبوں اور کمزوروں کے اوپر زیادتی اور ظلم کرنے سے تم اس کو قوت کہہ رہے ہو، یہی تو وہ چیز ہے جو انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ یہاں اثم آیا ہے، درحقیقت یہ اضمحلال ہے، قوت نہیں ہے۔ کہا ہے کہ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ (2:206) یہی لوگ ہیں کہ انجام کار جن کے لیے جہنم ہوگی۔

عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ بات بڑی ضروری تھی اور شاید کچھ خشک بھی تھی، آئیے اسے تھوڑا سا تر کریں۔ میں نے کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ”میں“ کا Self کا تقاضا یہی ہے کہ وہ کسی کے سامنے نہ جھکے لیکن ایک مقام وہ آ جاتا ہے، ایک آستانہ وہ آ جاتا ہے جہاں جھکنے کا نام بھی حقیقت میں عزت ہے، وہ ذلت کا جھکنا نہیں ہے، وہ اقدار (Values) کا اتباع ہے، اس کی اطاعت کرنا ہے، وہاں جھکنا ہے۔ دونوں چیزیں سامنے رکھنی چاہئیں کہ کہیں اور نہیں جھکنا لیکن وہاں ضرور جھکنا ہے اور وہاں اگر نہیں جھکا ہے تو اپنے ذہن میں آپ کتنی ہی قوت سمجھ لیں کہ حاصل ہو گئی ہے، قرآن کہتا ہے کہ آخر الامر وہ ذلت اور انتہائی درجے کی مسکنت ہے، ہر مقام کے اوپر سرفرازی نہیں ہے۔ اس کے برعکس ایک مقام وہ ہے جہاں جھکنا ہے، اس جھکنے کے اندر ذلت نہ محسوس کرو، وہاں تمہارا Ego (ایگو) تمہارے راستے میں حائل نہ ہو جائے۔ اس جھکنے کے اندر حقیقت میں سرفرازی ہے۔ اس خشک موضوع کے بعد ایک غزل کا شعر ہے اور میں نے کہا ہے کہ یہ لوگ بھی بعض اوقات ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ عام طور پر نہیں کہی جاسکتی۔ جگر غزل گو شاعروں میں اچھا مقام تھا۔ ایک جگہ ایک چیز کہہ گیا ہے اور ایک اصطلاح وہ استعمال کر گیا ہے۔ معلوم نہیں آپ احباب اس اصطلاح کو شاید Appreciate (پسند) نہ کریں لیکن میں تو اس پہ جھوم جاتا ہوں۔ یہ چیز ہے کہ ایک مقام کے اوپر جھکنا درحقیقت سرفرازیوں کا موجب ہوتا ہے۔ مقام ایسا آتا ہے اور آنا چاہیے جہاں انسان جھک جائے اور وہاں جھکنے میں ذلت محسوس نہ کرے بلکہ فخر محسوس کرے۔ کہا کہ:

تیرے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا
تجھے اے جگر مبارک یہ شکستِ فاتحانہ

عزیزانِ من! اس کے دروازے کے اوپر جھکنے میں جو تم شکست سمجھتے ہو تو حقیقت میں یہ شکستِ فاتحانہ ہے۔ یہ ہے واسجد
واقترِب (96:19) جھک جا اور آ! میرے گلے سے مل جا۔ یہ شکستِ فاتحانہ ہے۔ بلکہ پھلے انداز میں ایک اور نے بھی یہ بات کہی
ہے۔ کہا ہے کہ

ہار جانے میں انا کی بات تھی
جیت جانے میں خسارہ اور ہے

ایسے مقام بھی ہیں جہاں جیت جانے میں خسارہ ہوتا ہے۔ یہ بات جگر نے مبہم رکھی تھی اور غزل میں یا شعریت میں خوبصورتی یہی
ہوتی ہے کہ اس میں Suggestiveness (ایمانیت) ہو، کھل کر بات نہ کہی گئی ہو بلکہ ایک اشارے میں بات کہے اور انسان
خود وہاں پر پہنچے۔ اس نے جو کہا ہے بات کھل کر کہی کہ جیت جانے میں خسارے کی بات کہی ہے لیکن اس کی جو بات ہے کہ ”تجھے اے جگر
مبارک یہ شکستِ فاتحانہ“ یہ ایمانیت والی بات ہے۔ یہ ہے حقیقت میں اسلام۔ اسلام کے معنی ہی جھک جانا ہے، عام الفاظ میں انا کی
شکست ہوتی ہے اور یہی تو اس کی فتح ہوتی ہے۔ خَرُّوا سُجَّدًا..... وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ (32:15) دو ٹکڑے ملائے اور دیکھیے
کہا کہ یہ جو تمہارا جھک جانا ہے یہ وہ مقام تھا جہاں اگر تم جھکتے نہیں اور اسی طرح سر اونچا رکھتے تو شکست تھی۔ جھک جانا کہ جسے عام
معنوں میں شکست کہو گے تو حقیقت میں یہی تو تمہاری فتح ہے۔ مومن کی صفات یہ ہیں کہ وہ دنیا میں کسی کے سامنے نہیں جھکتا لیکن ایک
آستانِ ایسا بھی آتا ہے جہاں سراٹھا کر نہیں چلتا بلکہ جھکتا ہے۔ اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَ
سَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ (32:15)۔ مومن کے یہ شعار ہیں۔ اور آپ نے سائیکولوجی والوں کے نقطہ نگاہ
سے بھی دیکھ لیا کہ Personality (شخصیت) اور Ego (ایگو، پندارِ نفس) میں کیا فرق ہے۔ قرآن یوں باتیں بیان کر جاتا ہے۔

ایک رات میں ہزار ہزار نفل اور عمر میں نولاکھ مرتبہ قرآن حکیم کے ورد کی حقیقت

عزیزانِ من! اب آگے مومن کی Definition (تعریف) آئی۔ کہا کہ تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ

رَبَّهُمْ خَوْفًا وَ طَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (32:16)۔ عام ترجمے میں آپ دیکھیے تو وہی آپ کے ہاں تصوف کی شریعت آجائے گی کہ ان کے پہلو بستروں سے الگ ہو جاتے ہیں، وہ ڈرتے ہوئے طبع کے ساتھ اپنے خدا کو بلاتے رہتے ہیں۔ یہ جتنے بڑے بڑے اولیاء اللہ ہیں ان کے متعلق خصوصیت سے یہ بتایا گیا ہے کہ وہ راتوں کو عبادت میں مشغول رہتے ہیں، سوتے نہیں ہیں۔ تو جب سوتے نہیں تو پھر وہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں، نفل پڑھتے رہتے ہیں، ایک رات میں ہزار ہزار نفل پڑھتے ہیں۔ کبھی پوچھا ہی نہیں کہ دو نفل میں کتنا وقت لگتا ہے اور ہزار میں کتنی تو سہی کہ کتنا ٹائم ہوا۔ ڈیرہ غازی خان کے پاس ”نولکھ ہزاری“ ایک بابا ہیں۔ ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی عمر میں نولاکھ مرتبہ قرآن شریف ختم کیا تھا۔ مجال ہے جو یہ قوم حساب کر لے ”حساب تے لالے آں نوں اونداسی ایناں نوں کاہنوں اونڑا“^①۔ وہ جو گاؤں کا ”لالہ“ ہمارے ہاں کے زمیندار سے حساب کیا کرتا تھا، وہ ایک دفعہ سو روپیہ قرضہ لے لیتا تھا تو ساری عمر نہیں چھوٹتا تھا۔ یہاں کہا ہے کہ راتوں کو یہ سوتے نہیں، عبادت کرتے رہتے تھے، نفل پڑھتے رہتے تھے، قرآن شریف پڑھتے رہتے تھے۔ یہ جو ساری رات جگاتے ہیں، وہ یہی ہیں جو ولی اللہ بناتے ہیں۔

نبی اکرمؐ کے متعلق خدا تعالیٰ کا ارشاد

نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآن میں خدا نے یہ کہا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (73:1)۔ اس کا ترجمہ انہوں نے مکملی والے کر دیا۔ خیر یہ اور جگہ بتاؤنگا کہ منزل کیا ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ . فَمِ الْبَلِّ اِلَّا قَلِيْلًا (73:1-2) ٹھیک ہے رات کو بھی کچھ کام کاج کرنا ہوتا ہے، پروگرام کے متعلق کچھ تدبیریں کرنا ہوتی ہیں لیکن تھوڑے سے وقت کے لیے سونا نہایت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ رسول اللہؐ سے یہ کہہ رہا ہے۔ یہ ساری رات جگا کر ان کو ولی اللہ بنا رہے ہیں۔ کہا ہے کہ ہم یہ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ سارا دن جو تم نے کام کرنے ہیں وہ تو بڑا پروگرام ہے، وہ تو اُسی صورت میں تو کر سکتے گاہ کہ تو رات کو سولے۔ ”تے جناں نے دن نوں سارا دن سونا ہووے تے رات نوں جاگنا ہويا“ یا اُلواے کرداے یا اُلواے کرداے“^②۔ نبی اکرم ﷺ سے بڑی ہستی مقرب بارگاہ الہی کون ہو سکتی تھی۔ خدا ان سے یہ کہہ رہا ہے۔ اور جو میں یہ بتاؤں کہ یہ منزل کی صورت میں کیوں کہہ رہا ہے تو یہ ایک بڑی چیز ہے، گرانقدر ہے۔

① حساب تو ہندوؤں کو آتا تھا، انہیں کاہے کو آنے لگا۔

② جنہوں نے سارا دن سونا ہو اور ساری رات جاگنا ہو وہ تو یا اُلویہ کام کرتا ہے یا یہ اس کام کو کرتے ہیں۔

ضر میں لگانے والوں کے برعکس راتوں کو کم سونے والوں کی عملی زندگی کی کیفیت

بہر حال یہ جو چیز ہے کہ صاحب! مومن یہ ہیں کہ بستر سے ان کے پہلو الگ رہتے ہیں؛ خدا کو پکارتے ہیں؛ خَوْفًا وَ طَمَعًا۔ یہ مومن کی کیا چیز ہے کہ جو سوتے بھی کم ہیں۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولٰٓئِی الْاَلْبَابِ (3:190) ارض و سماء کی تخلیق میں، لیل و نہار کے اختلاف میں اللہ کے دیئے حقائق کو سمجھنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں لیکن ان کے لیے ہیں جو عقل کی انتہا پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ (3:191) یہ وہ لوگ ہیں جو قوائین خداوندی کو سامنے رکھتے ہیں: قِیَمًا وَ قُعُوْدًا وَ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ (3:191) کھڑے چلتے، لیٹے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (3:191) تخلیق ارض و سماء کے اوپر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ یہاں وہ بات آئی کہ کھڑے بیٹھے لیٹے یہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہے وہ جس کے لیے کہا ہے کہ بستر کے ساتھ ان کے پہلو الگ ہو جاتے ہیں۔ یہ کھڑے بیٹھے لیٹے یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (3:191) کرتے ہیں۔ ”ضر باں نہیں لاندے رہندے“^①۔ اور اتنی تک و تاز کے بعد اتنی تحقیق اور تفتیش اور تجسس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (3:191) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے یہ سلسلہ کائنات یونہی باطل نہیں پیدا کیا۔ مومن یہ کرتے ہیں اس مقصد کے لیے ان کے پہلو بستر سے الگ رہتے ہیں۔

قرآنی تعلیم کے برعکس دنیاۓ تصوف کے نزدیک کائناتی نعمتوں کی قدر و منزلت

یورپ کے ریسرچ اسکالرز سے پوچھو کہ ان کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ یعنی ایک ایک نکتہ لیے ہوئے، بیٹھے ہوئے، لیٹے ہوئے، کھڑے ہوئے، غور کرتے رہتے ہیں۔ چل رہے ہیں افریقہ کے صحراؤں میں، آسٹریلیا کے جنگلوں میں۔ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (3:191)۔ عزیزانِ من! یہ تو قرآن نے مومنین کی صفات بتائی تھیں۔ کون لے گیا ہم سے لوٹ کر یہ سب کچھ اور ہم کہاں رہ گئے ہیں؟ کہا ہے کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (3:191) ہم نے یہ سلسلہ کارگہ کائنات کو بلا مقصد پیدا نہیں کیا، تخریب کے لیے پیدا نہیں کیا۔ کہا کہ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (3:191) تو اس سے بڑا بلند ہے کہ اتنا بڑا کارگہ کائنات

① (دل پر) ضر میں نہیں لگاتے رہتے۔

ہو اور اس کو بلا مقصد ہی پیدا کر دے۔ جو اس سے ایسا سمجھتا ہے وہ جہنمی ہے۔ تصوف والے کہتے ہیں کہ دنیا ایک لاش ہے اور اس کے چاہنے والے کتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تَدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ (3:192) اے نشوونما دینے والے! تو نے تو یہ سلسلہ کار گہہ کائنات نشوونما دینے کے لیے پیدا کی ہے۔

کائنات کے تخلیقی مقصد کو پیش نظر نہ رکھنے والوں کی حالت زار

جو یہ سمجھتا ہے کہ یہاں یہ دنیا، یہ کائنات باطل ہے، تخریب کے لیے ہے، بے مقصد ہے، نفرت کے قابل ہے، وہ جہنمی ہے۔ کہا ہے کہ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ (3:192) وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو کر رہتا ہے۔ جن قوموں نے اس کائنات (Physical World) کی فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کیا بلکہ انہیں قابل نفرت سمجھا تو اخزیبتہ وہ ذلیل و خوار ہیں۔ اور اگلی بات ہے کہ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ (3:192) خود ذلیل و خوار ہوتے ہیں اور دنیا میں سچے معنوں میں ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ جو محتاج ہے اس کا کوئی دوست کیسے ہو سکتا ہے۔ ان کے برعکس وہ لوگ بھی ہیں جو يَذْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَ طَمَعًا (32:16) خدا کو پکارتے ہیں، پروگرام سامنے ہے، کبھی یہ خوف ہوتا ہے کہ اس کے اندر بعض چیزیں خطرات کی نہ آجائیں تو وہاں بھی وہ خدا کے قوانین کو دعوت دیتے ہیں کہ یہاں کیا کرنا ہے۔ جب خوشگوار نتائج سامنے آتے ہیں تو طمعاً وہاں وہ اس چیز کے اوپر اتارتے نہیں ہیں کہ یہ ہماری کارگیری سے یہ کچھ ہوا ہے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو صرف Discover (بے نقاب) کیا ہے ان چیزوں کو بنایا تو نہیں ہے۔ یہ دونوں گوشے ہیں۔ ان دونوں میں وہ خدا کے قوانین کو دعوت دیتے ہیں، پکارتے ہیں۔ کائنات کی قوتوں پہ غور و فکر کیا، ان کو مسخر کیا، اتنا بڑا پروگرام ہے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، اس میں منہمک رہتے ہیں۔ یہ سارا کچھ کرنے کے بعد یہ سب کچھ حاصل کیا۔ کہا کہ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (32:16) ہم انہیں ان کے اس سعی و کاوش کے نتیجے میں جو کچھ دیتے ہیں وہ خود ہی اس کو سنبھال کر نہیں بیٹھ جاتے اور یہ بھی نہیں ہے کہ وہ صرف اپنے ہی قبیلے یا اپنے ہی خاندان یا اپنی قوم یا اپنے ملک تک محدود رکھیں بلکہ عالمگیر انسانیت کے کھلا رکھتے ہیں۔ اسی لیے اُس نے لفظ يُنْفِقُونَ استعمال کیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے اور میں کئی دفعہ بیان کر چکا ہوں کہ انفاق کے معنی ہوتے ہیں ”کھلا رکھنا“، یعنی جسے ضرورت ہو لے لے۔ قرآن میں ہر جگہ لفظ ہی انفاق آیا ہے۔

عربوں کے ہاں رزق اپنے اندر وسیع تر مفہوم کی شکل میں استعمال ہوتا ہے

کہا ہے کہ **وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (32:16)**۔ رزق عربوں کے ہاں بڑا جامع لفظ ہے۔ نشوونما کے لیے خواہ وہ انسان کی جسمانی نشوونما ہو یا اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہو یا اس کی ذات کی نشوونما ہو ان کے لیے جو کچھ بھی سامان اور وسائل اور اسباب اور ذرائع جو دیئے جائیں ان کے لیے ان کے ہاں لفظ رزق آتا ہے۔ اور بھی لفظ آ سکتے تھے لیکن ان کے ہاں رزق میں خصوصیت یہ ہے کہ جس چیز کی جس وقت ضرورت ہو اُسے اُس وقت جو دینا ہے یہ رزق کہلائے گا۔ بچے کی کھیر کا جو وقت ہے اُس وقت آپ اُسے دیں گے تو اسے تو وہ رزق کہیں گے۔ اگر اُس کا وقت آپ نے ملا دیا ہے اور کسی دوسرے وقت میں دیتے ہیں تو عربی زبان کے اعتبار سے اس کو رزق نہیں کہتے۔ کیا بات ہے اس قوم کی اور کیا بات ہے قرآن کی! دینا اس طرح سے اور ہر ضرورت کے بروقت دینا کہا کہ **وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (32:16)** وہ اسے ہر ایک کے لیے کھلا رکھتے ہیں۔

رزق کی دوسروں کے لیے کھلا رکھنے پر اجر کی تفصیل لا منتہا ہے

کہا کہ یہ ہیں مومن جو یہ کچھ کرتے ہیں۔ اس طرح کا پروگرام ہے جس کے لیے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ اس کے بدلے میں ہم کیا دیتے ہیں؟ کہا کہ کیا بتائیں کہ ہم کیا دیتے ہیں!! جو ہم نے آج دینا ہے وہ تو تمہاری سمجھ میں بھی نہیں آ سکتا۔ کہا کہ **فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ (32:17)**۔ قرۃ اعین کہا ہے جسے ہم آنکھوں کی ٹھنڈک کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی مائیں کہا کرتی تھیں کہ بچہ ”تینوں دیکھ کے تے اکھاں اچ ٹھنڈ پے جاندی اے“^①۔ کہا کہ آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان ہم نے ان کے لیے رکھا ہے آج تو کسی کی سمجھ میں بھی نہیں آ سکتا کہ وہ کیا ہے اس لیے آج جو سمجھو گے تو اپنے شعور کی موجودہ سطح تک ہی سمجھو گے اور اس کے بعد کی جو زندگی ہے وہ تو تمہارے شعور کی موجودہ سرحد سے آگے کی زندگی ہے۔ جو آگے کی زندگی کی چیز ہے اس سرحدِ ادراک کے اندر اس کو کیسے بیان کریں کیونکہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ قرآن میں ہے کہ **لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا (50:35)** وہاں جو مانگو گے ملے گا جو چاہو گے ہوگا۔ یعنی اس کے بعد اور چاہیے کیا۔ اس کے بعد ہے کہ **وَلَدَيْنَا فِيهِ مَزِيدٌ (50:35)** ہمارے پاس اس

① تجھے دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔

سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ کہا کہ تم جو مانگو گے، تم جو چاہو گے وہ تو اپنے اسی محدود ذہن کے مطابق چاہو گے اور ہم تو تمہیں اس سے بھی آگے دیں گے۔ کہا کہ ہمیں پتہ ہے کہ تمہاری جو مانگ اور آرزو ہے وہ تو تمہارے محدود ذہن کی ہے، وہ تو محدود ہے اور وہاں تو یہ محدودیت ختم ہوگی اس کے لیے کہا کہ وَلَدَيْنَا فِيهِ مَزِيدٌ (50:35) ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔ کیا بات ہے اس خدا کی! اس کے بعد یہ کہا کہ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (32:17) ہم تمہارے اوپر کوئی احسان نہیں کریں گے، تم نے تو یہ دن بھر محنت کی ہوگی، شام کو تمہیں اس کی مزدوری دیں گے۔ دیں گے ایسی جو تم سوچتے تھے کہ آج اُس سے ملے کیا ہوا ہے کہ شام کو دس روپے ملیں گے۔ تو دس نہیں بلکہ کچھ اور بھی ملے گا۔

عزیزانِ من! یہ جتنی لذت اس سے اوپر کچھ ملنے میں ہوتی ہے، وہ بڑی چیز ہوتی ہے۔ اور یہاں کہا کہ احسان نہیں بلکہ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (32:17)۔ جو کیا ہے یہ اس کا صلہ ہے۔ اس کے بعد کہا کہ اب دیکھو کہ ایک گروہ ہم نے وہ بتایا تھا، جو اس مقام سے ہمارے آستان سے سرکشی سے نکل جاتا ہے اور اپنے آپ کو بڑا قوت والا سمجھتا ہے۔ ایک وہ ہیں جو یہاں پہنچتے ہیں اور یہ سب چیزیں ملتی ہیں۔ کہا کہ أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا (32:18) کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ پھر خود ہی کہا کہ لَا يَسْتَوُونَ (32:18) یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ کئی مقامات ہیں جہاں قرآن نے کہا ہے کہ اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہو سکتے، تاریکی اور روشنی برابر نہیں ہو سکتی، زندہ اور مردہ برابر نہیں ہو سکتے، جاننے والا اور نہ جاننے والا برابر نہیں ہو سکتے۔ اَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ جَنَّاتُ الْمَأْوٰی نُزُلًا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (32:19) ایمان و عملِ صالح کا نتیجہ جنت ہیں، باغات ہیں۔

جنت مومن کا کوئی آخری مسکن نہیں

اب میں کیا عرض کروں کہ ماویٰ کیا ہوتا ہے! یہ وہی ہے جیسے کہتے ہیں کہ بابا! تم تو اپنے ہی گھر میں آگئے ہو، ماویٰ اپنے ہی گھر میں آنے کو کہتے ہیں۔ اور اس کے اندر اگلی بات یہ ہے کہ جنت بھی آخری مقام نہیں ہے۔ ماویٰ تو ایسے ہے کہ جیسے اپنے گھر میں آگئے ہو لیکن یہاں صرف رات بسر کرنے کے لیے رہا جائے، صبح اٹھ کر اور آگے چلنا ہے۔ جنت بھی سلسلہ ارتقا کا آخری مقام نہیں۔ آگے

بات بڑی دلچسپ ہے کہ تم اپنے ہی گھر میں آگئے یہ سب کچھ ہم نے تمہیں دیا۔ کہا کہ یہ کوئی ایسے خیال نہ کر لینا کہ تم پہ کوئی احسان کیا ہے۔ یٰوَسْمٰوٰتُ لَا (41:32) ہے۔ تم تو ہمارے مہمان ہو، مہمان کو جو دیتا ہے وہ احسان نہیں کرتا۔ یہ چیز عزت کی آئی لیکن یہ سمجھ لو کہ یہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کے لیے چلتے ہوئے آگئے ہو، دروازہ کھلا اور تم مہمان بن گئے۔ یٰوَسْمٰوٰتُ لَا یَعْمَلُوْنَ (32:19) ہے۔ بات ساری عمل کی ہے۔

قرآن حکیم کو سمجھنے اور سمجھانے کی تخلیقی کاوشوں کی ایک جھلک

عزیزانِ من! سورۃ السجدة کی آیت 19 تک آگئے بات آگے بھی چلے گی لیکن مجھے آپ سے دو تین منٹ لینے ہیں۔ میں پہلے یہ عرض کر دوں کہ بہر حال اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے، اپنے متعلق کچھ کہنے میں، کچھ لکھنے میں، ہمیشہ کوئی چیز میرا ہاتھ پکڑ لیا کرتی ہے، دامن گیر ہو جایا کرتی ہے لیکن بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنا تعارف نہیں ہوتا بلکہ ایک وسیع چیز آتی ہے اس کا تعارف ہوتا ہے۔ میں درس دیتا ہوں اور یہ میری زندگی کا مشن ہے، مقصد ہے، جنون ہے: قرآن کریم کا سمجھنا اور اس کو سمجھاتے چلے جانا۔ اسے سمجھانے کے مختلف طریقے ہیں ایک ان میں سے درس بھی ہے، یہی چیزیں تحریر کے ذریعے سے بھی آتی ہیں۔ قرآن کے سمجھانے کے لیے میں نے ”لغات القرآن“ مرتب کیا ہے یعنی عرب جس طرح سے الفاظ کے معنی لیتے ہیں، وہ لیے ہیں، میں نے ”لغات القرآن“ کی روشنی میں سارے قرآن کریم کا مفہوم متعین کیا ہے^①۔ میں نے تشریف آیات کے ذریعے انسائیکلو پیڈیا ”تبویب القرآن“ مرتب کیا ہے۔ یہ تقاضا بڑھتا چلا گیا کہ صاحب! قرآن کی تفسیر شروع سے آخر تک مسلسل یہ بھی دیتے چلے جائیے۔ ”مطالب الفرقان“ کے نام سے یہ سلسلہ شروع کیا۔ اس کی دو جلدیں پہلے شائع کیں۔ پہلی جلد میں تو سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرہ کی صرف 29 آیتیں آئی ہیں۔ یہ ساڑھے چار سو صفحات کی کتاب ہے۔ آپ سوچ لیجیے کہ اس میں کیا کچھ نہیں آگیا۔ وہ جیسے ایک درس میں آپ دیکھتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ آ جاتا ہے۔ اس کی دوسری جلد شائع ہوئی وہ سورۃ البقرہ کی 30 آیت سے 112 آیت تک پہنچی۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے یہ تیسری جلد بھی آگئی ہے۔ اس میں سورۃ البقرہ ختم ہوگئی۔ گویا تین جلدوں میں سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرہ مکمل آگئی ہیں۔ یوں تو کہنے کو کہیں گے کہ

① اس کا نام ”مفہوم القرآن“ ہے۔

صاحب! یہ ایک سورۃ کی تفسیر ہے۔ اس کے آخر میں میں نے ایک انڈکس (اشاریہ) دیا ہے۔ اُس انڈکس (اشاریہ) میں آپ دیکھیے میرا خیال ہے شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جو آپ کے ذہن میں آئے اور اس کے اندر آپ کو نہ ملے۔ وہ انڈکس (اشاریہ) ان تین جلدوں کا ہے۔ گویا ان تین جلدوں میں اتنا کچھ آ گیا ہے کہ اسلام کے متعلق، زندگی سے متعلق، جو بھی اہم مباحث آپ کے ذہن میں آئیں گے وہ ان میں آپ کو مل جائیں گے۔ اور ابھی تو سورۃ البقرہ ختم ہو گئی ہے۔ زندگی جوئے رواں است رواں خواہد بود، یار زندہ صحبت باقی۔ یہ ابھی مکمل ہو کر آئی ہے۔

عزیزانِ من! ہمارے ہاں ایک اور سلسلہ بھی ہے۔ میں نے ایک طرح ڈالی اور کامیاب رہا کہ اسلام کے متعلق جو کچھ بھی سنو، پڑھو، اس کے متعلق سوچو اور سوچنے کے بغیر اس کو تسلیم نہ کرو۔ یہ کامیابی ہوئی اور سوچنا شروع کیا اور جب سوچنا شروع کیا تو جس چیز کا نام اسلام تھا جو ہمارے ہاں مروج ہے اس نے تو قدم قدم کے اوپر شکوک شبہات اعتراضات کی، یہ ساری چیزیں ابھریں۔ یہ چیزیں پیدا ہوئیں تو میں نے سمجھا کہ ہمارا فریضہ یہ بھی ہے کہ ان کے اعتراضات کا جواب دیا جائے، شکوک کو حل کیا جائے۔ یہ اس طرح سے استفسارات یا سوالات آنے شروع ہوئے۔ ان کا جواب ہم ”طلوع اسلام“ میں شائع کرتے چلے گئے۔ اس کے بعد یہ تقاضا ہوا کہ یہ بڑی مفید چیز ہے ان کو کتاب کی شکل میں لے آئیے۔ وہ ہم کتاب کی شکل میں لائے اور اس کا نام تھا ”قرآنی فیصلے“۔ آہستہ آہستہ وہ چیزیں جمع ہوتی گئیں اور ہم ان کو جلدوں میں شائع کرتے چلے گئے، اس کی بھی تین جلدیں شائع ہو گئیں۔ اور اس کے بعد پھر اس کی چوتھی جلد بھی آ گئی۔ اسی فہرست میں آپ دیکھیے گا کہ کیا کیا چیزیں ہیں، کس کس قسم کے اعتراضات ہیں اور قرآن اور علم و بصیرت کی روشنی میں کس کس قسم کے ان کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ میں نے جو ان فہرستوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ کے گھروں میں یہ چیز ضرور ہونی چاہیے۔ بچوں کو ان کے متعلق کچھ سمجھانا ہو، بالخصوص اسکول میں جب ان بچوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ کپڑا بچھاؤ اور کھجور کی گٹھلیوں کے اوپر سوالا کھ مرتبہ یہ پڑھو اور تم امتحان میں کامیاب ہو جاؤ گے تو میری چھوٹی سی بچی نے کہہ دیا کہ مس! تم تو کہتی تھی کہ تم ٹیوشن لو پھر تم کامیاب ہو گی اور اب تم کہتی ہو کہ گنگلیں گننے سے پاس ہوتے ہیں تو پھر میں ٹیوشن کیوں لوں۔ بچی آ کر پوچھتی ہے کہ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے۔ آپ کے گھروں میں یہ بچے پوچھتے ہیں، قسم قسم کے سوالات

کرتے ہیں جن کے جوابات مذہب کی دنیا میں نہیں ہیں۔ اس قسم کی چیزیں ان کتابوں کے اندر آگئیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔ میں نے یہ تعارف ضروری سمجھا ویسے آپ کو معلوم نہیں ہو سکتا کہ ان میں کیا چیز ہے۔ یہ بڑی مفید چیزیں ہیں، میری زندگی میں ان کو لے لیجئے بعد میں بھی یہ چیزیں آتی رہیں گی۔

عزیزانِ من! آج ہم سورۃ السجدة کی آیت 19 تک آگئے۔ آگے آیت 20 میں بات جہنم کی آئے گی۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔ آپ کا شکریہ۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط



پانچواں باب: سورة السجدة (آیات 20 تا اختتام)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عزیزانِ امن! آج دسمبر 1979ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورة السجدة کی آیت 20 سے ہو رہا ہے: (32:20)۔

دنیا بھر کے مسلمانوں کی حالت اور یہودیوں کی تباہی کے لیے دعاؤں کا سلسلہ دراز

سابقہ آیات میں دو گروہوں کا تقابل چلا آ رہا تھا۔ ایک جنہیں اہل جنت کہہ کر پکارا گیا ہے، دوسرے جنہیں جہنمی کہا گیا ہے۔

اور کہا گیا کہ مومن اور فاسق دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے، ان کی زندگی ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔ یعنی مسلمان اور غیر مسلم ایک جیسے نہیں

ہو سکتے، مومن اور کافر ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ ٹھیک ہے جس زمانے میں مومن ہوتے تھے اُس زمانے میں ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ صحیح

تفسیر یہ تھی جو قرآن نے کہا تھا کہ مومنین پر کفار کبھی غالب نہیں آ سکتے۔ آج اتنا سا حصہ تو صحیح ہے کہ مومن اور کافر ایک جیسے نہیں ہو سکتے لیکن جو اگلا نکل رہا ہے اس میں کچھ فرق آ گیا ہے کہ جو کفار ہیں وہ مومن پر کبھی غالب نہیں آ سکتے۔ یہ حصہ تو ٹھیک ہے کہ ایک جیسے نہیں ہیں لیکن ذرا خصوصیت الٹ گئی ہے کہ یہ ان کے اوپر کبھی غالب نہیں آ سکتے۔ ساری دنیا میں جہاں دو مسلمان ملیں تو ان کا ایک ہی رونا ہوتا ہے کہ مسلمان تباہ ہو گئے، اقوامِ یورپ نے ان کو ختم کر دیا، وہ چڑیا جتنی ایک مملکت جس کے متعلق یہ تیرہ سو سال سے کہتے آ رہے تھے کہ یہودی مغضوب علیہ ہیں، ان کی کبھی مملکت قائم نہیں ہو سکتی، انہوں نے ایسی مملکت قائم کر کے دکھائی ہے کہ تیس سال سے عرفات کے میدان میں جہاں یہ کہتے ہیں کہ ہر دعا قبول ہوتی ہے وہاں بیس بیس لاکھ لکڑ رو کر دعائیں مانگتے چلے آ رہے ہیں کہ یا اللہ! اسرائیل کو تباہ کر دے لیکن اسرائیل ہے کہ محکم سے محکم تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ بات تو ٹھیک ہے کہ مومن اور کافر ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ قرآن بھی ہم پڑھتے چلے آ رہے ہیں یہ آیتیں بھی ہمارے سامنے آ رہی ہیں بس اس کے بعد یہ ہے کہ بہر حال ان آیتوں کا ثواب تو ہوتا ہی ہے۔ اہل جنت کے متعلق تو قرآن نے کہا تھا کہ جنت میں یوں گھیسے جیسے اپنے گھر میں تم آ گئے ہو، تکلف کی بھی ضرورت نہیں ہے اور عزت کے اعتبار سے یہ کہا تھا کہ نُزُلًا (41:32) ایسے آئے جیسے کسی کے ہاں مہمان آتا ہے۔ خدا کے نزدیک یہ بڑا مقام ہے جیسے کوئی مہمان کسی کے گھر میں آ گئے۔ اور اس کے بعد مہمان اور اس میں کچھ فرق کرنا ضروری سمجھا، قرآن کہیں سے نکلنے ہی نہیں دیتا۔ کہا کہ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (32:17) لیکن یاد رکھو! یہ عمل کے نتیجے میں ایسا ہوگا ”ایویں ناں پروہنے بن کے آ جانا کہ چلو موج لگی ہوئی، ہیگی اے سویاں تے لبن گیاں ناں کھان نوں“^❶۔

جہنم میں جہنمیوں کی بے بسی کی کیفیت

وہ کہتا ہے کہ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (32:17) وہ عزت و تکریم تو ہوگی کہ جیسی مہمان کی ہوتی ہے لیکن یہ جو مہمانی ہے یہ اس کی قیمت تو پہلے ادا کی جائے گی، پھر اس کے بعد مہمانی ہوگی۔ اس کے مقابلے میں اہل جہنم ہیں جن کو فاسق کہا تھا۔ ان کے لیے کہا کہ وَ أَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ (32:20)۔ جو فاسق ہیں ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ آگے ایک چیز آئی ہے کہ انسان کانپ جاتا ہے۔ کہا ہے کہ كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا (32:20) جہنم کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ اہل جہنم اس زندگی سے

❶ ایسے ہی مہمان بن کر نہ آ جانا کہ چلو بھئی! موج ہوئی، کھانے کو سویاں تو ملیں گی ہی۔

تنگ آ کر اگر چاہیں گے کہ وہاں سے نکل ہی جائیں تو ان کو دھکے دے کر وہیں واپس لوٹا دیا جائے گا۔ ہمارے ہاں تو ان تمام آیات کی عملی تصویر کو قیامت پر اٹھا رکھا ہے کہ وہاں یہ ہوگا۔ پھر انہوں نے ہمیں جنت کا بھی وہ نقشہ دیدیا اور جہنم کا بھی دیدیا، سروے کر کے دیدیا، انہوں نے تو حوض کوثر کی لمبائی چوڑائی بھی بتائی ہوئی ہے، یہ بھی بتایا ہوا ہے کہ وہاں جو آنخورے ہونگے وہ کتنی تعداد میں ہونگے۔ بہت کچھ Detail (تفصیل) میں بتایا گیا ہوا ہے۔

جہنم کا ذکر ہو یا جنت کا، یہ سب کا سب تمثیلی طور پر ہی بیان کیا گیا ہے

جہنم کے متعلق بھی اس طرح سے بڑی تفصیل ہے۔ ان کے ذہن کے اندر تصور کچھ ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک بہت بڑا گڑھا ہو اور اس میں بہت سی لکڑیاں جلا رکھی ہوں، شعلے ہوں اور اس کے اندر کسی کو ڈالا جائے۔ اب وہاں سے نکلنے کی بات بھی اسی طرح سے ہے، تفصیل میں وہ ایسا ہی ہے کہ جیسے وہاں سے کوئی دیوار کے اوپر اس طرح سے ہاتھ رکھ کر اوپر چڑھتا ہے اور جب آخر میں جا کر وہ اوپر ہاتھ پڑ جاتا ہے تو وہاں فرشتے موجود ہوتے ہیں، وہ ان کا ہاتھ وہاں سے کچل کر پھر نیچے ڈال دیتے ہیں۔ وہ ہزار نکلتا چاہیں گے لیکن نکل نہیں سکیں گے۔ قیامت اور اس کی جنت اور جہنم کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ سارے تمثیلی انداز ہیں۔ ہم نے سابقہ درس میں وہ آیت (32:17) دیکھی ہے کہ کوئی شخص جان نہیں سکتا کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے ہم نے کیا رکھا ہے۔ اور جہنم کے متعلق تو کہا ہے کہ اس کی آگ دلوں کو لپیٹ لے گی۔ قرآن اس قسم کے اشارے کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس کے متعلق صحیح اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ کیا ہوگا کہ تم عالم محسوسات میں ہو اور وہ دنیا اس سے آگے کی دنیا ہے لیکن اس نے بتایا یہ ہے کہ یہ جنت اور جہنم یہاں سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں کی جنت اور یہاں کا جہنم ہے، وہ تو ہمارے سامنے ہے۔

انسان نے کرہ ارض پر ہی لکیریں نہیں کھینچیں بلکہ پوری انسانیت کو ہی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے

یہی جو آیت ہے تو شاید اُس زمانے میں اس کی صحیح تاویل سمجھ میں نہ آ سکتی ہو لیکن آج تو ہمارے سامنے ہے۔ خدا کی یہ دنیا (کرہ ارض) پہ اس نے آدم کے متعلق کہا تھا کہ تمہارے لیے مُسْتَقَرٌّ وَ مَتَاعٌ اِلٰی حَبِیْنِ (7:24) ہے یعنی مستقر کرہ ارض بنی آدم کا ہے۔ پورا کرہ ارض انسانوں کا مستقر ہے، رہنے کی جگہ ہے جہاں جی چاہے رہیں۔ پورا کرہ ارض پورے انسانوں کے لیے ہے۔ مگر انسانوں نے کرہ ارض کے اوپر لکیریں کھینچ لیں اور اب ان لکیروں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ لکیروں کے اندر Geographical

Territories (جغرافیائی حدود) کے اندر جو ایک سلطنت ایک مملکت قائم ہوتی ہے اس لکیر سے ادھر والا نہ ادھر جاسکتا ہے نہ اس لکیر کے اندر والا باہر آسکتا ہے۔ یعنی اب نوع انسانی کے لیے ارض یا پوری زمین مستقر نہیں ہے بلکہ وہ جو لکیریں کھینچ دی گئی ہیں اس کے اندر رہنے والا بنی آدم اس کے لیے وہی خطہ ارض جو ہے وہ مستقر ہے اور اگر لائن سے ذرا آگے چلیے تو ایک نئی زمین شروع ہوتی ہے اور وہاں کے انسان کے لیے مستقر وہی ہے۔ گویا اس طرح سے تقسیم کیا ہے۔ تقسیم تو زمین کو کیا ہے لیکن درحقیقت انسانوں کو تقسیم کیا ہے۔ قرآن نے پوری نوع انسان کو ایک عالمگیر برادری بنایا تھا؟ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (2:213) آج انسان کی سیاست نے اس کی مفاد پرستیوں نے اس عالمگیر انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے:

قیامت ہے کہ انسان نوع انسان کا شکاری ہے

اور پھر ایک لکیر یا دائرے کے اندر بسنے والے انسان دوسرے انسانوں کے ابدی دشمن چلے آ رہے ہیں۔ My Country, right or wrong کا سوال پیدا ہو گیا ہے۔

ہجرت کا تصور

ایک بات جو میں کہہ رہا تھا کہ قرآن کریم میں اس زمانے میں ہجرت ایک بڑی اہم چیز تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر کسی ایک خطہ زمین میں حالات تم پہ تنگ آجائیں، نامساعد ہوں، وہاں کی زندگی گزارنا تمہارے لیے مشکل ہو جائے تو وہاں پاؤں توڑ کر مت بیٹھے رہو۔ خدا کی زمین بڑی وسیع ہے دوسرے خطہ ارض میں چلے جاؤ جہاں کے حالات مساعد ہوں۔ چنانچہ انبیائے کرام کے ضمن میں آپ دیکھیں گے کہ وہاں ہجرت کا مقام آتا ہے، قریب قریب ہر نبی کے سلسلے میں آتا ہے۔ جہاں وہ ہیں وہاں حالات ناسازگار ہوتے ہیں تو وہ وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ چلے جاتے ہیں جہاں حالات سازگار ہوں۔

خدا کی زمین کا انسانوں کے ہاتھوں ہی تنگ ہو جانے کی ایک سبق آموز مثال

عزیزانِ من! آج کا انسان تو اس لکیر سے پار قدم نہیں رکھ سکتا۔ یہ ساری پابندیاں آپ کے ہاں ہیں یعنی پاسپورٹ کی پابندیاں، ویزے کی پابندیاں، ٹیشٹوں کی پابندیاں۔ اور ایک خطہ زمین کسی کے لیے کتنا ہی اذیت ناک جہنم کیوں نہ بن جائے اگر وہ اس

① اس کے لیے دیکھیے اسی کتاب کا چوتھا باب اور ”رزق کی دوسروں کے لیے کھلا رکھنے پر اجر کی تفصیل لا منہا ہے“ کا عنوان۔

سے نکلنے کا ارادہ کرے گا تو قرآن کہتا ہے کہ اَعْبُدُوا فِيْهَا (32:20) دھکا دے کے وہیں لوٹا دیا جائے گا کہ تم اس جہنم سے نکل کر کہیں نہیں جاسکتے۔ قرآن کریم نے ایک واقعہ میں اذیت کی شدید ترین شکل یہ کہی تھی کہ اس پر زمین تنگ ہو گئی۔ اب ہر خطہ زمین میں بسنے والے انسان کے اوپر زمین تنگ ہو گئی ہے۔ کوئی دس سال ادھر کا ذکر ہے 1970ء کی بات ہے کہ یوگنڈا یا کینیا افریقہ وغیرہ کی جو ریاستیں تھیں وہاں نئے قوانین بنے تھے اور وہ جو وہاں کے غیر ملکی تھے یعنی ہندوستانی بھی بہت گئے ہوئے تھے اور پاکستانی بھی وہاں بہت تھے تو ان پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا۔ یوں تو معلوم نہیں کہ وہاں کے ہر ایک پر کیا گزرتی ہوگی۔ ایک واقعہ ایسا تھا جس نے انگلستان میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ وہاں کی زندگی سے تنگ آ کر ایک ہندوستانی لڑکی کسی طرح سے چوری چھپے ایک جہاز میں بیٹھ گئی جو انگلینڈ آتا تھا۔ جب وہ انگلینڈ کے ائر پورٹ پر پہنچی ہے تو وہاں اسے روک دیا کہ تمہارے پاس تو ویزا نہیں ہے تم قانوناً نہیں آ سکتیں، ملک میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں سے وہ لڑکی کسی اور جہاز میں کہیں بیٹھی، نو دن وہ اسی طرح سے مختلف ملکوں کے جہازوں میں جاتی رہی، ہر ائر پورٹ کے اوپر اس کو دھکا دے کر لوٹا گیا۔ اس میں لکھا یہ تھا کہ اس سارے دوران میں اس نے ستر ہزار میل کا فاصلہ طے کیا۔ واپس پھر وہیں کینیا جانا پڑا اور انہوں نے قید کر لیا۔ ہندوستان کے اخباروں نے اس کے اوپر بہت کچھ لکھا تھا کہ تمہاری کالونیز ہیں تمہاری آبادیاں ہیں وہاں کے لوگ وہاں کے مظالم سے تنگ آ کر تمہارے ہاں پناہ لینے کے لیے آتے ہیں اور تم بھی ان کے اوپر راستے مسدود کرتے ہو۔ ان کے ہاں پارلیمنٹ میں بھی شور مچا تھا کہ ان Rules (قواعد) میں کوئی ترمیم کرو کہ کوئی پناہ لینے والا انسان کہیں آئے تو اس کو تو پناہ ملنی چاہیے لیکن اس کی بڑی سخت مخالفت ہوئی۔ Rules (قواعد) میں اس قسم کی Relaxation (رعایت) نہیں کی گئی۔ اس کا آخری بیان تھا کہ مجھے آٹھ دن ہو گئے ہیں کہیں سے کوئی ڈبل روٹی کا ٹکڑا ملتا ہے تو میں کھا لیتی ہوں، میں آٹھ دن سو نہیں سکی کہ رات کو سونے کے لیے بستر نہیں تھا، یہ ساڑھی جو پہن کے چلی تھی وہ اس وقت تک میرے بدن کے اوپر ہے اور کیفیت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی ملک مجھے اپنے اندر نہیں آنے دیتا۔ اور وہاں کے مظالم کی جو وہ داستان سناتی تھی کہ خود کشی کر لینا منظور ہے لیکن وہاں نہیں جاسکتی۔

رب کریم نے انسانی اختیارات کو وسیع تر کرنے کے لیے کرہ ارض کو مستقر بنایا تھا

کہا کہ كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيْهَا (32:20)۔ میں نے اسی آیت کے تابع یہ کچھ لکھا تھا۔ اس

زمانے میں تو یہ ایک لڑکی کا قصہ سامنے آیا تھا اب تو یہ روزمرہ کا قصہ ہے۔ یہ ویتنام کی طرف کے جو علاقے ہیں، روزیہ قصے سننے میں آتے ہیں کہ وہاں کے لوگ وہاں کے مظالم سے تنگ آ کر چوری چھپے بھاگتے ہیں، کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں، وہ کشتیاں کسی بندرگاہ پہنچ جاتی ہیں تو کسی بھی بندرگاہ کے اوپر ان کو اترنے نہیں دیا جاتا۔ اور بعض مقامات میں تو ان کی کشتیوں کو سمندر میں ڈبو دیا جاتا ہے۔ کئی کئی دن وہ لوگ سمندر میں کشتیوں میں ہزاروں کی تعداد میں رہے۔ وہ ملک قبول نہیں کرتا، یہ ملک قبول نہیں کرتا، فلاں ملک نے کہا ہے کہ ہم تو اس میں سے بیس آدمی لے سکتے ہیں، کسی نے کہا کہ سولے سکتے ہیں۔ نوع انسانی کے لیے بنی آدم کے لیے کرۂ ارض مستقر بتایا گیا تھا۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ مارے مارے پھر رہے ہیں تاکہ کوئی ایسا خطہ زمین مل جائے جہاں ہمیں پناہ ملے۔ ان کو یا تو ڈبو دیا جاتا تھا اور یا اس کے بعد جھکیل کے وہیں واپس اسی ملک کے اندر بھیجا جاتا ہے۔ کسی ایک جگہ کے ستائے ہوئے انسان کو آج دنیا میں کسی انسانوں کی بستی میں پناہ نہیں مل سکتی۔

انسان کی اس میکاؤلی سیاست نے پوری دنیا کو ایک وسیع جہنم میں تبدیل کر رکھا ہے

عزیزانِ من! اس سے زیادہ درد انگیز کوئی اور نقشہ بھی ہوگا جو قرآن نے کہا ہے کہ کُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا (32:20) انسان اپنے ہاتھوں سے اس کرۂ ارض کو اس قسم کی جہنم بنا لے گا کہ وہاں کیفیت یہ ہو جائے گی۔ اور آج ہر انسان کی یہاں یہ کیفیت ہے، کوئی شخص بھی اپنے ملک سے ان حدود و قیود کو توڑتے ہوئے نکل نہیں سکتا۔ جو مظالم اس کے اوپر گزرے اس سے مفر نہیں ہے، کہیں جا ہی نہیں سکتا۔ میں تو جب یہ خبریں پڑھتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں کہ یا اللہ! تیرے ان انسانوں کے اوپر بیت کیا رہی ہے جن کے لیے تو نے الارض کو مستقر کہا تھا۔ اور ارض کو واسطہ کہا تھا کہ یہ زمین بڑی وسیع ہے۔ اس زمانے میں یہ زمین وسیع ہوگی کہ ابھی اس میکاؤلی سیاست کی گرہیں اس قدر مضبوط نہیں ہوئی تھیں، جغرافیائی Territory (علاقہ) کے ماتحت ابھی حصے نہیں بانٹے گئے تھے اور اگر ملکیتیں قائم بھی تھیں تو ان میں یہ قیود اور یہ پابندیاں نہیں تھیں کہ ایک مملکت کا انسان دوسری جگہ جا ہی نہیں سکتا۔ یہ تو قرآن تھا جس نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا تھا کہ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا (3:96) تمام نوع انسانی کے لیے یہ خطہ زمین ایسا ہے جہاں ہمارا نظام قائم ہوگا جو اس میں آجائے گا اس کو امن نصیب ہو جائے گا۔ یہ اس زمانے کا اعلان تھا کہ کوئی تو خطہ زمین ایسا ہو کہ اس میں جو داخل ہو جائے اس کو امن مل جائے۔ بات تو بہت آگے بڑھے گی۔ ہم آپ میں سب کو معلوم ہے کہ یہ تو کسی ایک لڑکی، رجن دیوی،

کا قصہ نہیں بلکہ بڑی بڑی ہستیاں دنیا کے اندر ماری ماری پھرتی ہیں، مگر انہیں اس کرۂ زمین پر کہیں ایک دن کے لیے پناہ گاہ نہیں ملتی۔ قرآن کہتا ہے کہ کُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ (32:20) کیفیت یہ ہوگی کہ تم اس کی تکذیب کرتے تھے کہ ہم جو غلط نظام بنا رہے ہیں اس کے نتیجے میں کوئی عذاب نہیں ہوگا، کوئی سزا نہیں ہوگی، کسی قسم کی اذیت نہیں ہوگی، تکلیف نہیں ہوگی۔ مگر آج اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے زنداں میں تم اس طرح سے گرفتار ہو :

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس

خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیار

(اقبال: ضرب کلیم)

جنتی معاشرے میں کسی مجرم کو ذلیل نہیں کیا جائے گا تا کہ اس کی انسانیت پامال نہ ہو

یہ ثوابت اور سیار ستارے ہوتے ہیں، بعض اپنے مقام پہ جے ہوئے ہوتے ہیں ملتے نہیں ہیں جیسے کہتے ہیں کہ قطب ستارہ ہوتا ہے اور بعض سیارے ہوتے ہیں جو ادھر سے ادھر چلتے رہتے ہیں۔ افرنگ یعنی مغرب والوں کو انہوں نے سیار کہا اور خاور کہا، مشرق والوں کو ثوابت کہا ہے کہ یہاں جمود ہے وہاں حرکت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جمود والے ملک ہوں یا حرکت والے ملک ہوں، سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں محبوس ہیں۔ کسی اور نے ان کو قید نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے آپ کے لیے قید خانے بنا رکھے ہیں۔ ہر ملک کا ایک قید خانہ ہے جس کے بارڈر کو آپ کر اس نہیں کر سکتے۔ سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس: کُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ (32:20)۔

عزیزانِ من! جنت کی زندگی اس کرۂ ارض کے اوپر تو یہ نظام خداوندی ہے جو قرآن کی رو سے ہوتا ہے۔ وہاں انسانوں کی تفریق ان لائوں کی بنا پہ ان لکیروں کی بنا پہ نہیں کی جائے گی، لکیریں کھینچنے ہی نہیں دی جائیں گی۔ کرۂ ارض ہوگا اور بنی آدم ہوگا۔ وہاں تفریق تو ایک ہی ہوگی کہ شریف انسان کون ہے اور بد معاش انسان کون۔ جسے ہم بد معاش یا مجرم کہتے ہیں اس کی بھی کیفیت یہ نہیں ہوگی کہ اس کو ذلیل و خوار کیا جائے گا بلکہ اس کی ذہنیت کا علاج کیا جائے گا کہ جس کی وجہ سے وہ جرم پہ آمادہ ہو جاتا ہے یا جرم کرتا ہے لیکن

انسان ہونے کی حیثیت سے وہ ہوگا جو قرآن نے کہا ہے کہ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (17:70) ہر انسان انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔ مجرم کی انسانیت بھی واجب التکریم ہوتی ہے البتہ اس کا جو جرم ہے وہ سزا کا، مواخذے کا، طالب ہوتا ہے۔ جیسے انسان جب بیمار ہوتا ہے تو انسان تو وہ رہتا ہے وہ ایک بیماری ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کو درد ہو رہا ہے، دکھ ہو رہا ہے، تکلیف ہے اذیت ہے، کمزور ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ انسان ہوتا ہے۔ قرآن کسی انسان سے اس کی انسانیت کو نہیں چھینتا۔ یہ لباس نہیں ہے کہ ایک اتارا اور دوسرا پہن لیا۔

دنیا بھر کے ستم ظریف انسانوں کے لیے قرآنی نظام کی طرف سے اعلان ضمانت

انسان بنی آدم ہے بنی آدم رہتا ہے اور واجب التکریم رہتا ہے۔ کرہ ارض پر پھر وہ لکیریں نہیں کھینچنے دیتا۔ وہاں جو اس نے اس زمانے میں اعلان حریم کعبہ کے متعلق کہا تھا تو یہ اصل میں کعبہ کی بات نہیں تھی بلکہ جو اسلامی نظام قائم ہوا تھا اس نظام کا اعلان تھا کہ جو شخص بھی اس نظام کے تحت پناہ لینے کو آجائے گا، اسے امن مل جائے گا۔ یہ انسانیت کے لیے کتنی بڑی ضمانت ہے۔ دنیا بھر کا ستایا ہوا انسان جسے یہ کہا جائے کہ اگر تم یہاں آ جاؤ تو تمہیں یہاں پناہ مل جائے گی۔ امن مل جائے گا، کتنی بڑی ضمانت ہے۔ یہ اس نظام کی پہلی خصوصیت ہوگی جو خدا کے بتائے ہوئے اقدار کے مطابق کہیں قائم ہوگا۔

ابتدائی طور پر بیماری کی شکل میں درد کے چھوٹے چھوٹے جھٹکے بھی ایک رحمت ہے

اُن سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ سزا جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ یہ بھی تمہارے اپنے اعمال کے نتیجے میں ہی ہے۔ بیماری جو آتی ہے تو وہ باہر سے کسی کے چپت مارنے سے نہیں آتی بلکہ وہ خود ہی اپنی بد پرہیزی سے آتی ہے۔ یہاں عجیب بات کہی ہے۔ کہا ہے کہ وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَذْنَىٰ ذُوْنَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (32:21) قوموں کی زندگی کے اندر ہمارا یہ قانون نہیں ہے کہ کسی نے پہلی دفعہ بد پرہیزی کی ہو تو اس پہ موت وارد ہو جائے۔ یہ تو میں یا افراد بھی جو بد پرہیزیاں کرتے ہیں تو اس میں پہلے تھوڑا تھوڑا کہیں درد ہوتا ہے، نزلہ ہو جاتا ہے، زکام ہو جاتا ہے، کھانسی آتی ہے، پھر ہلکی سی حرارت بھی ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان بد پرہیزیوں کے نتیجے میں یہ چھوٹی چھوٹی تکلیفیں بھی آتی ہیں۔ پہلے تو یہ چھوٹی چھوٹی آتی ہیں اس لیے کہ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (32:21) یہ اس بد پرہیزی سے باز آ جائیں۔ یہ خود ڈاکٹروں کی یا طب کی تشخیص کے مطابق بھی انہوں نے کہا ہے کہ یہ جو درد ہے یہ تو

بہت بڑا Message (پیغام) ہے یہ خدا کی طرف سے رحمت ہے۔ درد نہ ہو تو انسان کبھی محسوس ہی نہ کرے کہ میرے اندر کوئی چیز بگڑ گئی ہے نہ ہمیں ڈاکٹروں کو پتہ چلے کہ اس کو ہوا کیا ہے۔ یہ تو بہت بڑی Indication (علامت) ہے بہت بڑی Warning (تنبیہ) ہے۔ اسے قرآن نے الْعَذَابِ الْاٰذْنٰی (32:21) کہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی سی تکلیفیں ہم دیتے ہیں تاکہ تم اس سے متنبہ ہو جاؤ کہ واقعی کوئی غلط روش ہم نے اختیار کی ہے غلطی ہو گئی ہے بد پرہیزی ہو گئی جس کی وجہ سے صحت پہ اثر پڑا ہے۔ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (32:21) تاکہ یہ واپس وہاں سے لوٹ آئیں اور صحیح راستے پہ آجائیں۔

قوموں کی زندگی میں بھی پہلے ہی جھٹکے سے قوم کو تباہ نہیں کر دیا جاتا بلکہ ان کو یہ چھوٹی چھوٹی وارننگ دی جاتی ہیں کہ اب بھی باز آ جاؤ اب بھی صحیح روش اختیار کرو۔ جب وہ نہیں سنتیں اور اپنی غلط روش میں بڑھتی چلی جاتی ہیں تو پھر وہ آخری جہنم آ جاتا ہے جہاں سے پھر نکل نہیں سکتا۔ کہا کہ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنتَقِمُوْنَ (32:22) انہیں تو چھوڑ دیجیے کہ جن تک خدا کی یہ ہدایات اس کے قوانین اس کی تعلیم اس کا پیغام پہنچا ہی نہیں ہے وہ لوگ تو حیوانی سطح پہ ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ یہ لوگ جن تک یہ پیغام پہنچ جائے وارننگ دیدی جائے بات بتادی جائے واضح کر دیا جائے کہ یہ یہ چیزیں تمہارے لیے مضر صحت ہیں اور اس کے باوجود اَعْرَضَ عَنْهَا (32:22) وہ اعراض برتیں۔ عزیزانِ من! آپ سن رہے ہیں یا سوچ رہے ہیں کہ یہ کن لوگوں کی بات ہو رہی ہے؟ یہ تو امت مسلمہ کی بات ہو رہی ہے جن کے سامنے یہ قوانین آ گئے ان کو سنا دیا اور وہ وارث قرار دیدے۔ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا (32:22) پھر انہوں نے اعراض برتا۔ یہ وہ قوم ہے جس کے کہا ہے کہ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ (32:22) یہ وہ مجرم ہیں آگے مُنتَقِمُوْنَ (32:22) کہا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ہم ان سے انتقام لیتے ہیں۔ یہ غور طلب نکتہ ہے کہ آیا خدا کے متعلق انتقام لینے کا تصور صحیح بھی ہے؟

خدا تعالیٰ کی ذات کے متعلق انتقام لینے کا تصور صحیح نہیں ہے

اس ترجمے سے خدا کے متعلق کچھ اچھا Impression (تاثر) قائم نہیں ہوتا۔ انتقام کا لفظ ہمارے ہاں برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے انتقام میں انسانی جذبات ہوتے ہیں جس کے اندر کچھ ذاتی بدلہ لینا ہوتا ہے۔ انتقام وہی لیتا ہے کہ کسی نے کسی کو اذیت پہنچائی ہو اور وہ اس کا ذاتی بدلہ لے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خدا پھر ان سے انتقام لیتا ہے تو اس کی رو سے تو واضح ہو جائے گا کہ خدا کو کچھ

نقصان پہنچایا تھا اور اس کے بعد پھر وہ کہتا تھا کہ اچھا ”ساڈے محلے دی تے آئیں گا کدی“^①۔ (معاذ اللہ) یہاں تو خدا کا بس نہیں چلتا اور جب وہ مر جاتا ہے تو پھر اس کے محلے میں جاتا ہے تو پھر وہ قبر سے ہی عذاب کو شروع کر دیتا ہے۔ اور پھر جیسا میں نے عذاب کے متعلق کہا ہے کہ مولوی صاحبان جس طرح ”کچی چیاں وٹ کے دسدے“^② نہیں، وہ انتقام کا صحیح جذبہ ہوتا ہے، وہ خود اپنے سامعین سے انتقام لے رہے ہوتے ہیں۔ ”اوسا ہڈے کولوں انتقام لیندے نیں تے اونوں کہندے نیں کہ اللہ میاں اے کرن ڈیا بیگا“^③۔ خدا اور انتقام (معاذ اللہ)۔

قرآن حکیم کی تعلیم کے مطابق انتقام کا صحیح مفہوم

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کریم کے ان ترجموں نے، اور تو اور رہا، خدا کا تصور بھی ہمارے ذہنوں کے اندر بڑا غلط سا کیا ہوا ہے۔ یہ ڈکٹیٹر کا تصور ہے، جابر کا ہے، مستبد کا ہے، پھر انتقام لینے والے کا ہے۔ بنیادی طور پہ یہ لفظ ہے کہ یہ مویشی چرانے والے یا بھیڑیں چرانے والے جو ہیں، ان کو کہیں آپ نے دیکھا ہوگا۔ یہ بھیڑ بکریوں کا چرانا بڑا ہی دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے، ایک کو ادھر لائیے، دو ادھر کو نکل جاتی ہیں۔ اُس گڈریئے کی حالت پہ رحم آتا ہے کہ وہ بکریاں اگر دن میں پچاس میل چلتی ہیں تو اس کو سو میل بھاگنا پڑتا ہے۔ وہ کرتا یہ ہے کہ وہ جو ادھر بھاگتی ہے اس کو پھر ادھر لاتا ہے، ادھر بھاگتی ہے تو پھر ادھر صحیح راستے پہ لاتا ہے۔ عزیزان! عربی زبان میں یہ جو اس طرح سے راہ گم کردہ یا سرکش بھیڑ بکریوں کو دوبارہ صحیح راستے پہ لاتا ہے، اسے انتقام کہتے ہیں۔ اب جو خدا نے کہا کہ ہم منتقم ہیں کہ یہ جو کچھ کرتے ہیں جسے تم دیکھتے ہو کہ کچھ تھوڑی سی سزائیں کہتے ہو، یہ سزا کا سوال نہیں ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ یہ جو صحیح راستہ درمیان کا ہوتا ہے، اس کو چھوڑ کر جو کچھ ادھر نکل جاتی ہیں تو ان کو گھیر کر ہم ادھر لاتے ہیں، پھر جو ادھر نکل جاتے ہیں تو پھر ہم ادھر لاتے ہیں کہ درمیان راستے میں چلیں، تو وہ خطرے سے محفوظ رہ جائیں۔ یہ سارا کچھ جو ہے ہم اس لیے کرتے ہیں۔ مجرم اسے کہا جو اس صحیح راستے کو چھوڑ کر دوسری طرف نکل جائے اور انتقام یہ ہے کہ اس کو گھیر کے وہاں صحیح راستے کراؤ پر باقی ریوڑ کے ساتھ ملا دیا جائے۔ کہا کہ ہمارا یہ پروسیس

① پھر ہمارے محلے میں بھی تو کبھی آؤ گے (وہاں تم سے نہٹ لیں گے)۔

② غصے میں غڑاتے ہوئے لال پیلے ہو کر، ناک بھوئیں چڑھاتے ہوئے بتاتے ہیں۔

③ وہ ہم سے انتقام لینے ہیں مگر اسے کہتے ہیں کہ یہ کچھ اللہ میاں کر رہا ہے۔

اس لیے ہے لیکن جو بکری خود ہی دوڑ کر جنگل میں چلی جائے اور بھیڑ یا اس کو کھا جائے تو پھر اس کو کیا کیا جائے۔ مُنْتَقِمُونَ (32:22) اور قرآن فوراً اس کی تاریخی شہادت پیش کر دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَائِهِ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَآءَ يَلْ (32:23)۔ یہ نئی بات نہیں جو ہم کہہ رہے ہیں۔

تاریخی لحاظ سے قرآن حکیم کا انداز بیان

قرآن کا انداز یہ ہے کہ جب بھی کوئی واضح ہدایت دیتا ہے، جب بھی وہ کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ صحیح روش کا یہ نتیجہ نکلے گا، غلط روش کا یہ انجام ہوگا تو وہ فوراً تاریخی شہادت پیش کرتا ہے۔ اور تاریخی شہادت میں وہاں جہاں قرآن کا نزول ہوا، وہاں یہ قریب ترین یہودی یعنی بنی اسرائیل تھے ان کی داستان بڑی عبرت آموز تھی، کہاں شوکتِ داؤدؑ اور سطوتِ سلیمانیؑ اور کہاں یہ Wandering Jews، یعنی دنیا میں کہیں ٹھکانہ ہی بیچاروں کا نہیں تھا، چھت ہی نہیں ملتی تھی، خانہ بدوش تھے، قرآن ان کی مثال ہمیشہ دیتا تھا کہ دیکھو تو سہی۔ یا عا د و ثمود کی بستیوں کی مثال دیتا تھا کہ حجاز اور عرب کے قریب ترین تھیں۔ کہا کہ اس سے پیشتر موسیٰؑ کو بھی ہم نے ضابطہ ہدایت دیا تھا، بنی اسرائیل کی طرف وہ ضابطہ ہدایت آیا تھا۔ اس میں بھی یہی کہا تھا، ساری تعلیم کی لم یہی ہے۔

خدا سے ملاقات کا قرآنی مفہوم اور ذکر سے مراد

کہا کہ فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَائِهِ (32:23)۔ وہ جو میں نے کہا ہے کہ ترجمے میں یہ بات آتی ہے کہ خدا کے ساتھ تمہاری ملاقات ہوگی اس پہ تم شک نہ کرو۔ یہ ملاقات کا سوال نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ قانونِ خداوندی کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ کہا یہی گیا تھا کہ تمہیں قانونِ مکافاتِ عمل کا سامنا کرنا پڑے گا، اس کو نظر انداز نہ کرو۔ یہ جسے خدا کا ذکر کہتے ہیں، اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ قانون کو ہر وقت اپنے سامنے رکھو۔ ”تے اک ایہہ جیہڑا ہو“ حق ہوندا ہیگا اے کہ نہ آپ سوندے نیں، تے نہ لوکاں نوں سون دیندے نیں“^①۔ کہا یہ کہ تم اس چیز کی تکذیب نہ کرو، اس میں شبہ نہ کرو کہ جو قانونِ مکافاتِ عمل ہے وہ ایک زندہ حقیقت ہے، اس میں شبہ ہی نہ کرو۔ یہی بات بنی اسرائیل سے کہی گئی تھی۔

① ایک یہ جو ”ہو حق“ ہوتا ہے وہ کرنے والے نہ خود سوتے ہیں نہ لوگوں کو سونے دیتے ہیں۔

اقتصادیات پر یہودی اور بنیا کا قبضہ اور ان کے قبضے میں مسلمان کی جان

وہاں مسلمانوں کے شدید ترین مخالف یہودی تھے۔ نہ ان کی سلطنت تھی، نہ مملکت تھی، نہ قوت تھی اور نہ رہنے کا ٹھکانہ تھا۔ اب سوال ہوگا کہ پھر مخالفت کس بات کی تھی؟ شروع سے ہی یہ جسے Jews (یہودی) کہتے ہیں یہ ہر قوم کی اقتصادیات اپنے ہاتھ میں رکھ لیتے تھے۔ مدینے میں یہ یہودی بستے تھے اور لوگوں کی جو معاشی زندگی تھی، وہ ساری یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔ مار پڑتی تھی، جوتیاں کھاتے تھے، نکالے جاتے تھے لیکن ان کے پاس یہ ایک ایسی تکنیک تھی، اور یہ تکنیک یہاں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتی، کم از کم ہم یا میں تو تقسیم سے پہلے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ہمارے ہاں بھی یہ جو Jews یا یہودی ہیں، یہ بنیا کی شکل میں ہوتے تھے، یہ ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں۔ سارے گاؤں میں ایک بنیا دوکاندار ہوتا تھا، اسے لالہ جی کہتے تھے۔ قومی اعتبار سے مسلمان ان کو کہیں اپنی خاطر میں نہیں لاتے تھے، ان کو ”ہندو کراڑ“ کہتے تھے، ان کو ذلت سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ مقابلے میں کبھی سامنے نہیں آتے تھے۔ وہ اتنے بڑے گاؤں میں جہاں اتنے اتنے بڑے طرے باز بستے تھے وہاں ایک لالہ ہوتا تھا اور اتنی سی کنیا (Cottage) میں اس کی دوکان ہوتی تھی۔ اس کی دوکان نام کے لیے ہوتی تھی۔ سارے گاؤں کے جو چھوٹے اور بڑے تھے، اس کے ہاتھ میں ان کی جان تھی۔ یہ وہی ہے، جو قبائل (1877-1938ء) نے کہا تھا کہ

فرنگ کی رگِ جاں بچہ، یہودی میں ہے

تو فرنگ کی رگِ جاں بچہ، یہودی میں تھی۔ یہ مسلمان بچارے کیا تھے؟ کچھ بھی نہیں۔ ایک لالہ کے ہاتھ میں سارے گاؤں کی جان تھی۔ ساری زمینیں اس کے پاس یوں تو گروی ہوتی تھیں اور ویسے وہ ان زمینوں کا مالک ہوتا تھا۔ اس ریونیو کے رجسٹر میں اس لالہ کا نام بھی کہیں نہیں ہوتا تھا اور گاؤں بھر کی زمینوں کا مالک بنا ہوا ہوتا تھا۔ بس کسی ایک نے دس روپے دیئے، سمجھ لیجیے کہ پشتوں تک بچہ، یہودی کے اندر اس کی رگِ جاں آ جاتی تھی۔ یہ کیفیت تھی۔ مخالفت اتنی تھی لیکن قرآن کی کشادہ ظرفی دیکھیے، اس نے کئی مقامات میں کہا ہے کہ اس قوم کے اندر اچھے افراد بھی ہوتے تھے جنہوں نے اس ہدایت پر جو ہم نے موسیٰ کو دی تھی، کی پیروی کی، ان کی کیفیت یہ تھی کہ وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يُّهْدُونَ بِاَمْرِنا لَمَّا صَبَرُوا وَ كَانُوا بَايِنًا يُّؤْفَوْنَ (32:24) انہوں نے مصیبتیں جھیلیں، مشقتیں اٹھائیں، استقامت سے کام لیا، اس ہدایت پر چلے تو جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً (32:24) ہم نے ان کو امام بنادیا۔

لفظ امام کا حقیقی مفہوم

ائمہ امام کی جمع ہے، امام لیڈر کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ کہا کہ ہم نے ان کو اور قوموں کا بھی امام بنادیا، لیڈر بنادیا۔ عزیزانِ من! وہی بات پھر دہراتا ہوں کہ اس قوم کی زبان کے اوپر بھی جانیے اور ذہنیت کے اوپر بھی جانیے اور پھر یہ دیکھیے کہ ان کے نزدیک امام کا تصور کیا تھا، خصوصیت کیا تھی۔ یہ لفظ تو صبح سے شام تک ہم سینکڑوں بار بولتے ہیں اس لیے کہ امام تو ہمارے ہاں وہ امام مسجد ہی رہ گیا ہے۔ باہر امام کا لفظ لیڈر کے معنوں میں آتا ہے ہمارے ہاں تو استعمال نہیں ہوتا، وہاں ہوتا ہے۔ کوئی بھی جو لیڈر کرتا ہے یا لیڈر میں جو بھی چیزیں ہیں ان کو ذہن میں رکھیے کہ اس قوم کے نزدیک یہ لیڈر تھا اس کی خصوصیت یا اس کا مقام کیا تھا۔ امام کا لفظ بھی جوام سے ہے ام کے معنی ماں ہیں کہ جس کا تعلق رعایا کے ساتھ ماں جیسا ہو وہ لیڈر ہو سکتا ہے۔ کیا قوم تھی! دنیا میں جاہل ترین خطہ اس کو گنا جاتا ہے۔ کوئی حکومت وہاں قائم نہیں ہوئی تھی، کوئی مملکت نہیں تھی، کوئی تہذیب نہیں تھی، تعلیم نہیں تھی، خواندگی تک کی بھی کیفیت یہ تھی کہ مکہ میں نزولِ قرآن کے وقت سترہ آدمی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ عزیزانِ من! آپ دیکھیے کہ اس قوم کے اندر لیڈر کا تصور کیا ہے۔ آج اگر یہ تصور یعنی صرف لفظ امام جو ہے، وہ اپنے حقیقی معنوں کے اندر عام ہو جائے تو دنیا جنت بن جائے۔ جسے آپ لیڈر کہتے ہیں، امام کہتے ہیں، وہ ماں کا درجہ رکھتا ہو۔ ٹھیک ہے امام لیڈر بھی کرتا ہے، جیسے ماں بچے کو لیڈر کرتی ہے۔ سارا کچھ بچے کو سمجھاتی ہے، سکھاتی ہے، تربیت دیتی ہے، تعلیم دیتی ہے، سیدھے راستے کا بتاتی ہے، آگ سے بچاتی ہے، ڈوبنے سے بچاتی ہے، مریچوں سے بچاتی ہے۔ یہ سارا کچھ وہ کرتی ہے لیکن جلاد کی طرح نہیں کرتی بلکہ ماں کی طرح کرتی ہے۔ پھر وہ اس کی پرورش کرتی ہے، نشوونما کرتی ہے، دعائیں دیتی ہے، خوبصورت بچہ ہوتا ہے تو ماتھے پہ تھوڑا سا سرمہ لگاتی ہے کہ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ یہ ہے امام۔ یہ جنہیں ہم Followers (مقلبین) کہیں گے تو یہ امت کا لفظ بھی انہوں نے ماں سے لیا ہے اور اس میں سے جو امام بنتا ہے وہ بھی ماں سے لیا ہے۔ ایک ہی مادہ سے وہ یہ الفاظ بناتے چلے جاتے ہیں۔ اور پھر قرآن کا انتخاب ہے۔ قرآن نے یہ زبان منتخب کی اور یہ صحیح ہے کہ اس زبان کے سوا کسی زبان میں بھی یہ حقائق نہیں آ سکتے تھے۔

عزیزانِ من! وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن کو سمجھنا ہے تو پہلے قرآن کے ان الفاظ کے معنی عربی زبان کے مادے کے اعتبار سے دیکھیے تو سارا قرآن سمجھ میں آ جاتا ہے۔ سوچیے تو سہی کہ اگر امام کے معنی ان کی زبان کے اعتبار سے دیدیے جائیں اور جہاں جہاں

قرآن نے اس کو استعمال کیا ہے وہاں دیکھا جائے تو لیڈر کی کتنی خصوصیات ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔ لیڈر کی خصوصیات نہیں بلکہ اس پورے نظام کی خصوصیات جس میں اس قسم کا لیڈر ہوگا۔ وہ کس طرح سے لیڈر بن گئے تھے؟ اس کے لیے کہا کہ پہلی شرط یہ ہے کہ کُنُونًا بِأَيْشِنَا يُؤْفَنُونَ (32:24)۔ اس کو ہمارے ان قوانین کی اہمیت کا یقین محکم ہو۔ یہی نہ ہو کہ وہ کہیں کسی کتاب میں لکھا ہے اور وہ اس کو Mechanically (میکانگی طور پر) Objectively (معروضی انداز سے) نافذ کر رہا ہے یا Introduce کر رہا ہے۔ پہلے تو ان کی محکمیت پر خود یقین محکم ہو پھر اس یقین محکم کے بعد اسے نافذ کرے یعنی اسے بچے کی پرورش اس کی نشوونما کے متعلق قوانین قواعد کی محکمیت پر یقین کامل ہو پھر وہ ماں بنے پھر ماں بن کر وہ ان بچوں کی پرورش تربیت تعلیم نشوونما کرے ان کو سیدھے راستے پہ چلائے ان کو خطرات سے بچائے۔ اور جب وہ بچے نشوونما پا کر اپنے فیصلے خود کرنے کے قابل ہوں تو پھر ان کے حق میں بس دعا ہی کرے۔

مسلمانوں میں باہمی اختلافات کے سلسلہ میں ایک غلط روایت کی تشہیر

آپ کے ہاں پتہ ہے کہ پھر کس طرح سے دھوکے دیئے جاتے ہیں، مقدس فریب دیئے جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے بار بار کہا ہے کہ اختلاف خدا کا عذاب ہے، رو سیاہی کا موجب ہے۔ رسول اللہ سے فرمایا کہ جو لوگ اس میں اختلاف کریں تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے وہ جہنم کے لوگ ہیں۔ اب جب یہاں ان لوگوں سے کہا گیا کہ صاحب! یہ مولوی صاحبان جو آپس میں مختلف فرقے بنائے ہوئے ہیں اور سر پھٹول ہوتی ہے اور یہ اختلاف تو عذاب بتایا ہوا ہے تو کہا کہ نہیں، وہ جو خدا نے کہا ہے وہ یہودیوں کے متعلق کہا ہے۔ مسلمانوں کے متعلق تو رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ میری امت کا جو اختلاف ہے، وہ رحمت ہے۔ یہ تو یہودیوں کا اختلاف ہے جو عذاب ہے۔ اور اسے حضور نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے یہ صریح فرقہ بندی شرک ہے۔ کہا ہے کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ . مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ (32:31-30) دیکھنا کہیں مومن ہونے کے بعد مشرک نہ ہو جانا یعنی کہیں فرقوں میں نہ بٹ جانا۔ پھر ہر فرقے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (32:30) وہ کہتا ہے کہ میں تو جنتی ہوں باقی سارے جہنمی ہیں۔ اور وہ اسی میں مگن رہتا ہے۔

صدیوں سے موجود باہمی اختلافات مٹانے کا علاج قدیل آسمانی کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتا

میں بیس برس تک یہاں کہتا رہا کہ قرآن کی اس آیت کے متعلق ان لوگوں سے پوچھو جو مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں کہ کیا

جواب دیتے ہیں۔ کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر درمیان میں ایک نے کان میں خناس پھونکا، اس نے کہا کہ صاحب! یہ تو فرقتے ہیں ہی نہیں، یہ تو مکاتب فکر ہیں۔ یہ دیوداس نہیں یہ تو عبدالرحمن ہے۔ ایک مسجد کے اندر اونچی آئین کہنے والا دوسری مسجد میں جا کر نماز پڑھ لے تو قتل تک نوبت آ جاتی ہے، مسجدوں میں تالے پڑ جاتے ہیں، پولیس آ جاتی ہے، مقدمے دائر ہوتے ہیں۔ یہ سارا کچھ ہو رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تفرقہ تو ہے ہی نہیں، یہ تو فکری اختلاف ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ قرآن نے کہا ہے کہ ان کی یہ حالت اس لیے ہوئی کہ کَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (32:25) ان کا جو اختلاف ہے اب مٹائے تو مٹ نہیں سکتا کیونکہ وہ جو اختلاف مٹانے والی خدا کی کتاب تھی، وہ تو انہوں نے پس پشت ڈال دی، وہی اختلاف مٹا سکتی تھی کہ اپنے اپنے اعتقادات اور مسالک کو الگ کر کے کہیں کہ ہمارے درمیان سند قرآن ہے، جو یہ کہے گی ہم سب کو منظور ہے۔ پھر تو اختلاف مٹ سکتا ہے اور اس پہ جو مذہب پرست طبقہ ہے، وہ خدا کی کتاب پہ کبھی نہیں آیا کرتا۔ قیامت میں یہ اختلاف مٹیں گے۔ اور انہوں نے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے جی! قرآن نے خود کہہ دیا ہے کہ یہاں تو اختلاف مٹ ہی نہیں سکتے، 'یہاں سنی' شیعہ، وہابی، اہلحدیث، دیوبندی اور بریلوی ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ اختلافات یہاں نہیں، قیامت میں جا کر مٹیں گے۔ پوچھو کہ وہاں جا کر مٹ جائیں گے تو اس کا فائدہ کیا ہوگا۔

زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا نتیجہ اور قیامت کا مفہوم

یہاں پھر وہی چیز جو میں نے عرض کی ہے کہ یہ قیامت اور آخرت اور یہ ساری چیزیں جتنی بھی ہیں، یہ انہوں نے وہاں آخرت پہ اٹھا رکھی ہیں کہ یہاں کی زندگی کے اوپر ان کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان چیزوں کا ہم پہ کوئی اثر ہی نہیں ہوتا کہ اس زندگی سے ان کا تعلق ہی کچھ نہیں ہے۔ قرآن اس کا تعلق یہاں کی زندگی سے شروع کرتا ہے۔ پھر وہی عربی زبان کا قاعدہ آ گیا۔ یہ جسے آپ قیامت کہتے ہیں، یہ قیام سے ہے، قیام سے تو آپ سمجھتے ہیں کہ کھڑے ہو جانا ہے۔ یہ اس کے آگے جو ایک ”و“ لگی ہے، اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ”یکفخت کسی چیز کا ہو جانا“۔ کہا کہ تنگ ہونے کے بعد پھر یکفخت ایک انقلاب آتا ہے۔ وہ وقت ہوتا ہے، جب پھر ان کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے اور سارے اختلافات سیدھے ہو جاتے ہیں۔ صدر اول کے بعد جو یہ امت مسلمہ بنی تو ان کے باقی قوموں کے ساتھ جتنے ٹکراؤ ہوئے ہیں یہ قیامت تھی۔ ان قوموں کے لیے ایک قوم جو ان کے نزدیک سب سے زیادہ کمزور تھی، جسے وہ کسی خیال وھیان میں بھی نہیں لایا کرتے تھے، میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ایرانی عربوں کے ساتھ جنگ نہیں کرتے تھے، کہتے تھے کہ اس قوم کے ساتھ لڑائی کرنا

ہمارے لیے باعثِ ننگ ہے۔ یہ قوم جن کی کیفیت یہ تھی یہ جو کھڑی ہوئی ہے تو یہ کوئی بتدریج ایسا نہیں ہوا کہ محسوس ہو کہ اب یوں ہو گیا بلکہ یہ قوم یکلخت کھڑی ہوئی ہے۔ ایرانیوں کو، رومن کو، عیسائیوں کو، حیرت تھی کہ یہ قوم کس طرح سے کھڑی ہو گئی۔ یہ ان کا جو اس طرح سے کھڑا ہونا تھا اس نے ایران میں اور عیسائیوں کے رومن ایمپائر کے اندر قیامت برپا کر دی۔ یہ ہے وہ قیامت۔ اگلی آیت نے تو بات واضح کر دی کہ یہ وہ قیامت نہیں ہے جو یہ اگلی دنیا والی کہتے ہیں۔ کہا کیا اس سے بھی یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ قیامت کیا ہوتی ہے؟ **أَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ (32:26)** کیا اس سے بھی یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی جو ہم کہہ رہے ہیں؟ کہا کہ **كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسْكِينِهِمْ (32:26)** جن بستیوں میں چلتے پھرتے ہیں، کیا ان کے کھنڈرات ان کو نہیں بتا رہے کہ قیامت کیا ہوتی ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! کہا ہے کہ **يَمْشُونَ فِي مَسْكِينِهِمْ (32:26)**۔ ان کے اڑے ہوئے مکانوں کے کھنڈرات میں یہ لوگ چلتے پھرتے رہتے ہیں۔

عزیزانِ من! یہ مرنے کے بعد والی قیامت تو نہیں ہے، قرآن تو شہادت پیش کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ **أَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ (32:26)** کیا اس سے بھی ان کی سمجھ میں بات نہیں آتی کہ جن قوموں کی بستیوں کے کھنڈرات میں یہ چلتے پھرتے ہیں ان کی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ان پہ کیا قیامت گزر گئی؟ کہا کہ **إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ (32:26)** جو ہم کہہ رہے ہیں اس میں بات سمجھنے کے لیے بہت بڑی نشانیاں ہیں، ان کے کھنڈرات قیامت کی نشانیاں ہیں، اس قیامت کی کہ جس میں پھر اختلاف مٹا کرتے ہیں۔ لیکن کہا کہ **أَفَلَا يَسْمَعُونَ (32:26)** بات تو یہ ہے کہ دل کے کانوں سے سنیں تو پھر بات سمجھ میں آتی ہے ورنہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

سلطنتِ عباسیہ کے دور میں مذہبی اختلافات کی ناگفتہ بہ حالت کے باعث ہلاک و اور چنگیز کی چڑھائی عزیزانِ من! یہ کسی قوم کا باہمی اختلاف اور تفرقہ یا فرقہ بندی تو سخت ترین قسم کا اختلاف ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بھی کسی قوم کے اندر جو اختلاف ہے تو وہ کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ جہنم کی زندگی ہوتی ہے کہ جس کا جی چاہے ان کے اوپر قیامت برپا کر دے، ان کے خلاف اٹھ کر کھڑا ہو جائے وہی تباہ کر دے گا۔ یہ ساری ہلاک و اور چنگیز کی جو داستانیں آپ کے سامنے ہیں وہ اسی طرح سے ان کے خلاف اٹھ کے کھڑے ہوئے تھے۔ یہ یونہی نہیں تھے کہ یہ لوگ اچھی بھلی محکم سلطنت کے اوپر چڑھائی کر دیتے تھے۔ جب ہلاک و بغداد^① میں

① ہلاک و خاں نے 656ھ بمطابق 1258ء میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی مستعصم باللہ کو قتل کر کے سلطنتِ عباسیہ کا خاتمہ کر دیا۔

آئے ہیں جس دور میں سلطنتِ عباسیہ تھی تو اس زمانے میں ان کے اندر جو مذہبی فرقہ بندی اور اختلافات تھے اس کی تاریخ پڑھ کر دیکھیے کہ ان کی حالت کیا ہو چکی ہوئی تھی۔ ان کے بیسیوں فرقے تھے، ٹکراؤ تھا، اختلاف تھا، افتراق تھا۔ یہ سب کچھ ان کے اندر ہو چکا ہوا تھا۔ جب یہ کچھ ہوا تھا تو

جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

سلطنتِ عباسیہ (750-1258AD) کے علاوہ مغلیہ سلطنت اور مسلمانوں کی ہزار سالہ ہسٹری کا سیاہ دور مذہبی فرقہ بندی کا ہی ثمر ہے

ان کی یہ کیفیت تھی۔ خود ان کے اندر بیٹھے ہوئے ان کے وزیرِ اعظم نے وہاں ہلاکو کے ساتھ ساز باز کر کے اُسے دعوت دی تھی۔ ان کے ہاں اس قدر فرقہ بندی، اس قدر اختلافات تھے۔ آپ کے ہاں جو مغلیہ سلطنت آخریں آ کر تباہ ہوئی ہے جہاں بھی آپ کے ہاں کی سلطنتیں تباہ ہوئی ہیں یہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد یہ مسلمانوں کی جو سلطنت ترکی تھی اس میں کس قدر اختلافات، کس قدر تفرقات تھے۔ کہا کہ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ عربوں جیسی قوم کس طرح ہمارے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی اور انہوں نے کیسے قیامت برپا کر دی۔

حضرت عمر فاروق ♦ کی عدالت میں ہرمزان کا حقائق پر مبنی بیان

تجدیدِ یادداشت کے لیے میں پھر اس واقعہ کو دہراؤں جو ہرمزان نے حضرت عمرؓ (581-644/45ء) سے کہا تھا۔ عزیزان! من! ایران جیسی مملکت کہ ہزاروں سالوں سے ان کی تہذیب کا ڈنکا بج رہا تھا، وہ قوم آدھی دنیا کی مالک تھی۔ عربوں کے ساتھ جنگ کرنا باعثِ ننگ سمجھتے تھے۔ اور اس کے بعد جب یہی عربوں کی قوم اٹھی ہے تو اس نے قیامت برپا کی ہے۔ اور چیزوں کو چھوڑیے کہ سارا کچھ کیسے فتح کیا، ان کا جوشہنشاہ بزدل گرد تھا، وہ جان بچانے کے لیے مارے مارے پھرتا تھا، بالآخر ایک رات ایک پن چکی میں جا کر اس نے پناہ لی اور پن چکی والے کو معلوم ہوا کہ یہی بادشاہ ہے اس نے شاید اس کے دادایا چچا وغیرہ کسی کو قید کیا ہو گا یا اس کے لباس یا چہرے مہرے سے اسے پہچان لیا ہوگا۔ اس نے پن چکی میں بادشاہ کو قتل کر دیا۔ وہاں کا گورنر ہرمزان جب گرفتار ہو کر حضرت عمرؓ (581-644/45ء) کے سامنے آیا ہے تو حضرت عمرؓ نے یہ کہا کہ ہرمزان! آخری وقت میں ایک بات بتاؤ کہ تم وہ ایرانی تھے کہ ہم عربوں کے ساتھ جنگ کرنا بھی باعثِ ذلت سمجھتے تھے، یہ آج کیا ہے کہ تمہیں ہتھکڑیاں لگی ہوئی ہیں، تمہارا ملک ان عربوں نے فتح کر لیا

ہے، پانچولاس یہاں انہی عربوں کے سامنے تم کھڑے ہوئے Change (تغیر) کیا آیا ہے؟ یہ عرب بھی کوئی اگلی نسل نہیں، وہی نسل ہیں۔ تم ایرانی بھی اگلی نسل نہیں وہی نسل ہو۔ ابھی کل ہی کی بات ہے۔ یہ فرق کیسے آگیا؟ عزیزانِ من! وہ لوگ تھے جو ان چیزوں کو پہچانتے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ عمر! بات تو بڑی سادہ سی اور سیدھی سی ہے اس میں کوئی زیادہ فلسفیانہ نکتہ داریاں نہیں ہیں۔ اس سے پہلے ایرانیوں اور عربوں کی جو لڑائی ہوتی تھی تو ایک طرف ہم ایرانی ہوتے تھے اور دوسری طرف تم عرب ہوتے تھے۔ ہم یقیناً عربوں سے بالادست تھے اور ہمیں فتح ہوتی تھی۔ اب جو ہم میدان میں آتے ہیں تو ایک طرف ایرانی تنہا ہوتا ہے دوسری طرف عرب اور ان کے ساتھ ان کا خدا ہوتا ہے تو ان دو کا مقابلہ ہم کیا دنیا میں کوئی قوم نہیں کر سکتی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ یوں سمجھو کہ **أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ وَانْفُسُهُمْ (32:27)**۔ دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری بنجر زمینیں پڑی ہوئی تھیں، روئیدگی کا نشان تک نہیں ہے، گھاس کی پتی تک نہیں ہے۔ ہم پانی بھرے ہوئے بادل کہیں سے لا کر اس زمین پر برس دیتے ہیں اور اس زمین سے لہلہاتی ہوئی کھیتیاں ابھرتی ہیں، تم بھی کھاتے ہو تمہارے مویشی بھی کھاتے ہیں۔ دیکھتے ہو کہ یہ کیسے ہوتا ہے؟ ہمارے ابرو گوہر بار کے ایک چھینٹے سے یہ تبدیلی ہوتی ہے۔ اس قوم کو وہی آسمان کی بارش مل گئی ہے، اس بنجر سے تم دیکھو کہ کس قسم کی کھیتیاں ابھرتی ہیں۔ کیا خوب سمجھانے کا طریقہ ہے! تم یہ ناممکنات میں سے سمجھتے تھے کہ بنجر زمین میں سے کچھ ہوگا لیکن اس کا ممکن بنانا ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔ ایک ابرو گوہر بار آتا ہے، بارش برسا دیتا ہے، وہی زمین اتنا کچھ سونا اگلنے لگ جاتی ہے۔ کہا یہ ہوتا ہے جب وہ قوم زندہ ہوتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ

ہاتھوں سے تیرے دامنِ افلاک نہ چھوٹے

وحی کے ذریعے قرآن حکیم کا آخری پیغام ہی انسانیت کا آخری سہارا ہے

قرآن کہتا ہے کہ اپنا رشتہ اور تعلق بادلوں کے ساتھ قائم رکھو، پھر تمہاری زمینیں لہلہاتی کھیتیاں دیں گی۔ کہتا ہے کہ **أَفَلَا يَبْصُرُونَ (32:27)** یہ تو بصیرت سے کام لیں گے تو جب بات سمجھ میں آئے گی۔ کہا کہ **وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْفَتْحُ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ (32:28)** یہ کہتے ہیں کہ تم کہتے تو کئی دنوں سے چلے آ رہے ہو کہ یہ ہوگا اور وہ ہوگا۔ ہمارے ہاں فتح تو Victory (فتح) ہی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس کا تو متبادل لفظ ہی دوسرا نہیں ہے۔ شکست کے مقابلے میں یہ لفظ ہمارے ہاں استعمال ہوتا

ہے۔ فتح کے معنی کسی دوسری قوم کے اوپر غالب آ جانا یا ان کی مملکت کو اپنے زیرِ گلوں کر لینا ہی نہیں ہے۔ فتح کے معنی ہوتا ہے دروازوں کا کھل جانا۔ یہ قوم اس لفظ کو ایسے استعمال کرتی تھی کہ راستے میں جو رکاوٹیں ہوں جو آگے نہ بڑھنے دیں ان رکاوٹوں کا ہٹتے چلے جانا۔ یہ اس کو فتح کہتے تھے۔ یہ کسی قوم کو ملک کو فتح کرنا نہیں ہے ان کو مغلوب بنانا نہیں ہے بلکہ زندگی کی شاہراہ کے اوپر جو کاروانِ انسانیت چلا جا رہا ہے اس کے راستے میں جتنے بند دروازے ہیں ان کا کھولتے چلے جانا ہے یہ فتح ہوتی ہے۔ کہا کہ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ (110:1) جب خدا کی نصرت آئے یعنی جب یہ سامنے کے دروازے کھلیں۔ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا (110:2) پھر تم دیکھو کہ وہی انسانیت جس کا ہجوم پیچھے رکھا ہوا تھا وہ کس طرح سے فوج در فوج نظامِ خداوندی کی طرف چلا آ رہا ہے۔ یہ ہے فتح یعنی دروازوں کا کھل جانا۔ جو آپ ہی قید خانے میں ہوں وہ دوسروں کا دروازہ کیا کھولیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْفَتْحُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (32:28) اگر تم اپنے دعاوی میں سچے ہو تو بتاؤ کہ یہ کب ہوگا۔ کہا تم تو یہ اس طرح سے پوچھ رہے ہو اور اس کے لیے اس قدر انتظار کر رہے ہو کہ گویا وہ عید کا چاند ہے جو تمہارے لیے نکلے گا۔ پوچھتے ہو کہ ”انتیاں دا ہووے گا یا تہاں دا ہووے گا“^①۔ کہنے لگے کہ کیا تمہیں پتہ بھی ہے کہ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِيمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ (32:29) جب وہ وقت آئے گا تو یاد رکھو! اس وقت تو اگر تم یہ کہو گے کہ ہم ایمان بھی لائے ہیں تو یہ چیز بھی کوئی فائدہ نہیں دے گی اور پھر کوئی مہلت بھی نہیں ملے گی۔ وہ یوم الفتح ہے۔ اس سے پہلے سدھرنا ہے تو سدھر جاؤ، کم بختو! کیوں اس کے لیے شدت سے تقاضا کر رہے ہو کہ یوم الفتح کیوں نہیں آ رہا۔ ابھی وقت ہے پھر اس وقت مہلت نہیں ملا کرتی، اس وقت کا تقاضا نہ کرو، اس وقت تو پھر Final Settlement (آخری تصفیہ) ہو جاتا ہے اس سے پہلے پہلے باز آ جاؤ۔

نبی اکرمؐ کے لیے ہجرت کا حکم قوم کی تباہی کی آخری علامت تھی

عزیزانِ من! اب سورۃ السجدة کی آخری آیت آگئی۔ اس پروگرام میں یہ آخری مرحلہ آتا ہے۔ حضور ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ تم نے ان کو بہت کچھ سمجھا دیا، تمہارا ہی کام تھا کہ ان کی طرف سے اتنی ایذائیں برداشت کر کے تیرہ سال کی مکے کی زندگی میں ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کیں، تکلیفیں اٹھائیں۔ قلب کا اس قدر سوز و گداز تھا کہ قرآن کہتا ہے کہ ہمیں ڈر ہے کہ تو ان کے غم میں اپنی جان

① (عید کا یہ چاند) آنتیس کا ہو گا یا تیس کا۔

گھلا دے گا کہ یہ تباہی سے کیوں نہیں بچتے۔ کہا کہ تم نے سب کچھ کر لیا لیکن اس کے بعد اب یہ جو پروگرام ہے اس کی دوسری کڑی شروع ہو جائے گی، اب ان لوگوں کو چھوڑ دو: فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ (32:30)۔ ایک وقت ایسا آ جاتا ہے اور وہ وقت تو بڑا ہی مایوس کن ہوتا ہے کہ جب ڈاکٹر کسی مریض کے سر ہانے سے یہ کہہ کر اٹھ جائے کہ اب اس کی کوئی امید نہیں ہے۔ رسول کا اس قوم سے ہجرت کر جانا اس قوم کے لیے تباہی کی آخری علامت ہوتا ہے۔ کہا کہ اب ان سے اعراض بر تو۔ پھر اس کے بعد انہیں کہو کہ وَانْتَظِرْ إِنَّهُمْ مُنْتَظِرُونَ (32:30) تم اپنا پروگرام جاری رکھو، میں تمہارے پروگرام میں مزاحمت نہیں ہوتا، میں اپنا پروگرام جاری رکھوں گا۔ اِعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ (39:39) پروگرام کا نتیجہ فیصلہ کر دے گا کہ کون سچا تھا، کون جھوٹا تھا۔ اب میں تمہارے ساتھ وقت ضائع کرنے کی بجائے پورا وقت اپنے پروگرام کی تکمیل کے لیے صرف کروں گا اور تمہیں اجازت ہے کہ تم جو جی میں آئے، کرو۔ کیا بات ہے، یہ کتنا فیر پلے (عمدہ کھیل) ہے! جسے آپ Sports man Spirit کہتے ہیں۔ کہا کہ میرے کام میں تم دخل نہ دو، تمہارے کام میں، میں دخل نہیں دیتا۔ اپنے مشن کی سچائی کے اوپر اور اس کی نتیجہ خیزی کے اوپر اتنا یقین محکم ہے۔ کہا کہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔ وہ جو تم مانگتے ہو کہ یوم الفتح کب آئے گا تو یوم الفتح تو یوں آ جائے گا، مجھے میرا کام کرنے دو اور تم اپنا کام کرو اور اس کے بعد دیکھو کہ وہ یوم الفتح کتنی جلدی آتا ہے۔ میں نے تو اس لیے اتنا عرصہ تم میں گزارا کہ کسی طرح سے تم بچ جاؤ۔ تم مرنے پہ آئے ہوئے تو ٹھیک ہے، یہ کر کے دیکھ لیجیے۔

عزیزانِ من! سورۃ السجدة کی آخری آیت ختم ہوئی۔ اب آگے سورۃ الاحزاب آتی ہے اسے لیتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط

